گومتی کے ساحل پر

حسرت انگیز افسانہ

از جناب سید ارشاد حسین ازہر۔ بی اے

آسمان پر اودی اودی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ ابر لہرا رہے تھے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اور صبح صادق کا سناٹا تھا۔ نہ جانے کیوں میرا دل گھبرایا۔ سہانے وقت نے مجھے بستر کے آرام کو ترک کرنے پر مجبور کیا۔ میں مسہری سے اٹھا اور نزدیک بہتی ہوئی گومتی کے ساحل پر جا پہنچا۔ آنکھوں نے ایک تصویر دیکھی کانوں نے آواز کا نغمہ سنا۔

"پیارے۔ اب کیا تم اتنے خفا ہو۔ ۔ ۔ کیا اب کبھی نہ لوٹو گے ۔ ۔ ۔ میں نے تو تمہاری محبت پر بھروسہ کیا تھا۔ ۔ ۔ میں سمجھی تھی تمہارے دل میں بھی محبت کا سمندر اسی طرح لہریں مار رہا ہے۔ جس طرح میرے سینہ میں لیکن تم نے میرے خیال کو جھٹلا دیا۔ ۔ ۔ ۔ پیارے۔ یہ تم سے کیسے ہوا۔ ۔ ۔ آؤ۔ دیکھو! آسمان پر بادل جھوم رہے ہیں۔ صبح کے سکون میں ہوا دبے پاؤں چل رہی ہے لیکن میرے دل کو چین نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اے میرے دل میں بسنے والے تم مجھ سے کیوں روٹھ گئے۔ ۔ ۔ میرا دوسرے کی ملکیت پر کیا اختیار پیارے کیا تم میں انصاف نہیں۔ ۔ ۔ تم کو میری بے بسی پر ترس نہیں آتا۔ دیکھو تمہیں پر میرا اختیار نہیں جو میرے سب کچھ ہو۔ ۔ ۔ پھر کیوں خفا ہو۔ ۔ ۔ آؤ پیارے۔ تمہاری رضیہ آج بھی وہیں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ جہاں ہم ہمیشہ بیٹھا کرتے تھے۔ ۔ ۔ کیا تم مجھے اور کہیں ڈھونڈ رہے ہو۔ دیکھو۔ میں اور کہیں نہ ملوں گی یہ سیڑھیں یہ در۔ یہ دیواریں۔ یہ دریا۔ ہماری محبت کے رازدار ایسے ہی کیا کم ہیں کہ کسی اور جگہ تم سے ملنے کی آرزو کروں۔ ۔ ۔ ۔ نہیں پیارے میں تو یہیں ملوں گی۔ ۔ ۔ میری ضد پوری کر دو۔ ۔ ۔ مگر تم تو خفا ہو۔ اچھا آؤ تو اپنے روٹھے کو منا لوں۔ دیکھوں تو تم کیسے نہیں ملتے۔ ۔ ۔ آؤ پیارے اب تو بہت تو بہت دن ہو گئے۔ جدائی کی پہاڑ ایسی راتیں اس برسات میں اور بھی کاٹے نہیں کٹتیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

میں خاموش سنتا رہا۔ اور وہ غمزدہ عورت اپنے دل کے درد کو لفظوں کے سانچے میں ڈھالتی رہی۔ میں اس طرف کبھی نہیں آیا تھا۔ دنیا کی کشش نے قدم تھام لئے۔ میں ٹھٹک کر سنتا رہا۔ اس فضا میں محبت کی داستان تھی ۔۔۔ کوئل کی کوک سے زیادہ لطیف اور دلدوز معلوم ہوئی۔ اس حسین عورت کے سیاہ لباس میں ملفوف ہونے نے اس کی داستان کو بھی پُر اسرار کر دیا۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں باوجود کوشش کے اپنے کو وہاں سے نہ ہٹا سکا اور چھپ کر اس کی داستان سننے کا اخلاقی مجرم بنتا رہا۔ مجھ پر کیفیت طاری ہوئی۔ میں اپنے کو بھول گیا۔ تھوڑی دیر میں بانسری کی لے نے مجھے چونکا دیا

"پریتم۔ پریت کی ریت نہ جانے۔"

فضا میں آواز بلند ہوئی اور تھرتھرائی۔ میرے جسم نے اثر محسوس کیا اور دماغ نے اس شعر کی صداقت کی داد دی ؎

بشنو از نے چوں حکایت مے کند
از جدائیہا شکایت مے کند

چند سیکنڈ اور نہ سن سکا۔ اس کے بعد مجھ سے نہ رہا گیا میں سیڑھی سے اتر کر گھاٹ کے اس گوشہ میں جس کے آخری زینہ پر وہ سیاہ پوش بیٹھی بانسری کے سروں میں اپنی زندگی کی غم انگیز داستان گا رہی تھی پہنچا لیکن اسے مطلق خبر نہ ہوئی۔ آسمان پر ایک پرند نے اڑتے ہوئے "پی کہاں" کا نعرہ لگایا اور وہ عورت پھر اپنی دنیا میں آگئی۔ اب اسے میری موجودگی کا احساس ہوا۔ اور احساس ہوتے ہی بانسری ہاتھ سے گر گئی۔ قریب تھا کہ وہ لڑھکتی ہوئی پانی میں جا پہنچے۔ کہ میں نے اُسے تیزی سے لپک کر اٹھا لیا۔ عورت اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ میری اجنبیت نے اسے یکایک جانے کیلئے مجبور کر دیا

میں نے پوچھا۔

"کیا اب آپ چلی جائیں گی؟"

"جی ہاں"

"کہاں جاؤ گی؟"

"کیا کہوں؟"

"کیوں۔ کیا آپ کا کوئی گھر نہیں ہے؟"

"نہیں۔ اب گھر کہاں ہے"

میرے دل نے مجھے مجبور کیا کہ میں اسے روکوں اور اس کے اسرار زندگی معلوم کروں۔ وہ بھی بات کرنے پر آمادہ تھی اسلئے سلسلۂ کلام کو جاری رکھا۔

"آپ کی زندگی بہت پُر اسرار معلوم ہوتی ہے۔"

عورت خاموش رہی

"کیا آپ اپنا دردِ دل راز ہی رکھیں گی؟"

"راز کیا۔ میری داستان ان دیواروں سے پوچھیے بہتے ہوئے دریا سے دریافت کیجیے۔ میری رفیقۂ حیات میری بانسری سے سن لیجیے جس بات کے جاننے والے اتنے ہوں وہ راز کہاں۔ آپ کتنی دیر سے یہاں ہیں؟"

"خاتون مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں کچھ دیر سے یہیں ہوں۔ نادانستہ ادھر آ پہنچا۔ تو اس سناٹے میں آپ کی آواز نے پیروں کو واپسی کی اجازت نہ دی۔"

"تب تو میری بانسری کی طرح آپ بھی میرے رازداں ہو گئے جاننے والے سے کیا راز۔"

یہ کہہ کر اس نے بانسری کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے بانسری دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو کیا آپ مجھے محروم ہی رکھیں گی جس قدر میں نے آپ کی تنہائی کی گفتگو سنی ہے اس نے مجھے دریافت حال پر مجبور کر دیا ہے کیا میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

"آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں۔ یہ سیاہ کفنی اتارنے والا . . ."

اتنا کہہ کر وہ چپ سی ہو گئی نگاہیں جھکا لیں اور ہونٹوں پر مہر لگا لی

"آپ کہتے کہتے خاموش کیوں ہو گئیں؟"

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے رخسار پر آ گئے۔

"اچھا میں نہ پوچھوں گا ——— اگر آپ کو اس کے ذکر سے اس قدر تکلیف ہے تو نہ پوچھوں گا۔"

وہ بیٹھ گئی۔ چہرہ سے ظاہر تھا۔ جیسے اسے خاص اذیت ہو رہی ہے۔

"اچھا سن ہی لیجیے شاید اسی طرح دل کو کچھ سکون حاصل ہو جائے"

میں اس کے قدموں کے پاس بیٹھ گیا اور سیاہ ملبوس والی عورت اپنی داستان کہنے لگی ———

"وہ سامنے والی عمارت آپ جانتے ہی ہوں گے مقبرہ ہے اس میں میری زندگی کا بیوفا ساتھی دفن ہے۔ اس نے شادی ہونے کے تین سال بعد میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کے مرتے ہی مجھے اس ہستی کی جاں نثارانہ محبت کا دفعتاً ایسا احساس ہوا۔ کہ میں خود فراموش ہو گئی۔ کسی نے پاگل سمجھا۔ کسی نے [illegible] محبت کرنے والے اعزا کے طعنوں سے تنگ آ کر ترک وطن کیا اور لکھنؤ میں آ کر مقیم ہو گئی۔ اپنی پچھلی مسرت آگیں زندگی کی یادگار اس قبر کو قرار دیا۔ میں نے اپنا دستور بنا لیا۔ کہ روزانہ شام کی تاریکی میں آ کر اس کی قبر پر جاروب دوں بیٹھوں اور اس کی یاد کو عالم تصور میں باتیں کر کے باقی رکھوں۔ چنانچہ میں آتی رہی۔ یہ طرز عمل میری زندگی کا اصول ہو گیا۔ رات اسی قبر پر گذرنے لگی۔ اور مجھے اس میں کھوئی ہوئی محبت کے مزے ملنے لگے۔

ایک دن صبح ہونے سے پیشتر میری آنکھ کھلی۔ میں نے اس وقت گھر واپس جانے کا ارادہ کر لیا۔ مقبرہ سے نکل کر اسی پل سے گذر رہی تھی۔ دل چاہا کہ ذرا ان سیڑھیوں پر بیٹھ کر بہتے ہوئے دریا کے خاموش نغموں سے محظوظ ہو لوں۔ آئی اور اسی جگہ پانی میں پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ دکھے ہوئے دل کو خوشگوار ہوا اور پانی کی وسیع چادر کے منظر سے سرور پہنچا۔ اور میں انہیں سیڑھیوں پر سو گئی آنکھ کھلی تو سرہانے اسے دیکھا جس نے مجھے اس حال میں پہنچا دیا ہے۔ لیکن نہ یہ سیڑھیاں تھیں نہ یہ دریا۔ میں ایک خوشنما کوٹھی کے سجے ہوئے کمرے میں تھی۔ سر پر پٹی بندھی تھی۔ اور میٹھا سا درد تھا۔ میں نے آنکھ کھولی اور بند کر لی۔ میں سمجھی کوئی خواب دیکھ رہی ہوں لیکن کانوں میں آوازیں آتی رہیں۔ اور میں سمجھنے کی کوشش کرتی رہی مجھے خیال ہوا میں ہوش میں ہوں۔ اپنے چٹکی لی ہاتھوں سے پٹی ٹٹولی یقین ہو گیا۔ کہ خواب نہیں ہے۔ میں دنیائے آب و گل میں ہوں۔ لیکن یہ آخر ہوا کیا۔ میں چشم زدن میں آنکھ لگتے ہی گھاٹ کے زینوں سے محل کے کمرے میں کیسے پہنچ گئی۔ میں نے ہمت کر کے زبان کھولی اور سامنے بیٹھی ہوئی ایک سفید پوش عورت سے پوچھا میں کہاں ہوں۔ اس عورت نے جواب دینے کی بجائے بند ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا میں چپ ہو رہی۔ نقاہت سے آنکھیں بند کر دیں اس کے بعد مجھے اسی قدر یاد ہے۔ کہ گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا گیا۔ اور میں پھر خواب گراں کی آغوش میں تھی۔

اب کی میں جاگی تو درد بھی کم تھا۔ دماغ بھی ذرا درست تھا۔

غالباً وہی شخص موجود تھا اور سامنے بھی وہی سفید پوش عورت۔ میں نے پھر دریافت کیا۔ کہ یہ میرا کیا حال ہو رہا ہے اور اس مرتبہ اس عورت سے پوچھنے کی بجائے سرہانے بیٹھے ہوئے مرد سے پوچھا۔

"میں یہاں کیونکر آئی" جواب ملا

"ذرا صبر کیجئے۔ دماغ پر زور نہ دیجئے"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور میں پھر سوچنے لگی۔ دماغ گذشتہ واقعات کی تصویر کھینچنے میں مصروف ہو گیا۔ ہر واقعہ آنکھوں کے سامنے کتاب کی صورت میں آنے لگا۔ اپنا زینہ پر بیٹھنا اور سوچنا تو یاد آیا لیکن اس کے بعد عقل نے کام نہ کیا۔ جب حافظہ نے مدد نہ کی تو دماغ کمرہ کی آرائش کی طرف منتقل ہو گیا۔ میں نے خیال کیا میں کسی ہسپتال میں ہوں سامنے نرس کے لباس میں عورت موجود ہی تھی۔ اس لئے خیال ہوا کہ جو سرہانے ہیں۔ وہ ڈاکٹر ہوں گے لیکن۔ اس طرح کا ہے کو کسی ڈاکٹر نے کسی مریض کا علاج کیا ہوگا۔ میں نے کسی وقت سرہانے کے علاوہ اور کہیں نہ دیکھا۔ مجھے بار بار پہلو بدلتے دیکھ کر وہ شخص باہر چلا گیا۔ میں نے کمرہ میں صرف ایک ہم جنس کو پا کر ذرا آزادی سے گفتگو کرنی چاہی۔ میں نے پوچھا۔

بیگم آپ مجھے بتائیں گی۔ میں یہاں کیونکر آ پہنچی اور میں کہاں ہوں

اس عورت نے میری دلجوئی کی۔ اطمینان دلایا کہ میں ہمدرد دل کے درمیان ہوں۔ اور عنقریب اچھی ہو جاؤں گی۔ اس عورت نے مجھے حیات مکرر پانے پر مبارکباد دی اور کہا کہ ڈاکٹر رشید نے بیحد محنت اور جانفشانی سے میری تیمارداری کی ہے۔ میں دل ہی دل میں ممنون ہونے لگی اور اب کی ڈاکٹر رشید آئے تو میں نے ممنون نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ ڈاکٹر کے متبسم چہرہ نے مجھے لب کشائی پر آمادہ کیا لیکن غالباً وہ میرا منشا سمجھ گئے۔ انہوں نے پھر مجھے خاموشی کا اشارہ کیا۔ لیکن میں اب اپنے حواس میں تھی۔ میں نجات کرنے میں منتکی۔ آخر مجھے بتایا گیا۔ کہ میں کیونکر سو گئی تھی۔ لڑھک کر پانی میں گر گئی۔ سر زینہ کی اینٹوں سے ٹکرا گیا۔ اچانک گرنے سے سخت چوٹ آگئی۔ پانی کا بہاؤ مجھے لے ہی چلا تھا۔ کہ ڈاکٹر رشید دریا میں کشتی پر سیر کرتے ہوئے ادھر سے گذرے۔ ایک بیہوش جسم کو پانی کی سطح پر نکلتے اور پھر ڈوبتے دیکھا۔ فوراً ملاحوں کو تیز کھینے کا حکم دیا۔ لیکن کشتی کی رفتار سے اطمینان نہ ہوا۔ ہیراک تھے ہی۔ خود کشتی سے کود کر طوفانی تھپیڑوں کو عبور کیا۔ اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اس بیکس کو پانی سے نکال لیا۔ کشتی پر لانے سے قبل سے

خون برابر بہ رہا تھا۔ اور کثرت سے خون نکل چکا تھا۔ مجھے کشتی میں لٹا دیا گیا۔ رومال سے میرا سر باندھ دیا اور ملاحوں کو کشتی واپس لے چلنے کا حکم دیا۔ ڈاکٹر رشید نے جان بچا لی۔ لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ یہ سر وبال دوش ہے۔ یہ جسم بار زمین ہے۔ اس طرح جینے سے کہیں بہتر تھا۔ کہ اسی معبود کے قریب جس کی مجاوری کرنا میرا فرض تھا میں بھی پیوند خاک ہو جاتی ؎

ہوئی میں جو کے رسوا ہوئی کیوں نہ غرق دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اتنا کہہ کر عورت چپ ہو گئی۔ ہونٹوں پر خفیف سی لرزش اور آنکھوں کے پپوٹوں کی کپکپاہٹ نے اس خاص کیفیت کا اظہار کر دیا جو اس پر طاری تھی۔ وہ بھی خاموش تھی اور میں بھی لیکن سکوت تکلیف دہ تھا۔ داستان خود ہی دلکش تھی۔ لیکن انداز بیان نے اور بھی دل کھینچا میں نے تہیہ کیا۔ کہ اس داستان کو اختتام تک سن لوں۔ اسلئے میں نے سکوت کو توڑا۔

"اس کے بعد آپ ہسپتال پہنچا دی گئیں"

نہیں۔ وہ مکان ہسپتال نہ تھا۔ مجھے کشتی پر ہوش نہ تھا۔ بہرحال جس طرح بھی لائی گئی ہوں۔ میں اس مکان میں پہنچی۔ جسے میں ہسپتال سمجھتی تھی لیکن جو دراصل رشید منزل تھا۔ رشید نے نہ صرف جان پر کھیل کر مجھے پانی سے نکالا۔ بلکہ دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھ کر میری تیمارداری کی۔ نرس ملازم رکھی گئی۔ اور مجھے ناکام زندگی بسر کرنے کے لئے زندہ کر لیا۔

دن گزرتے گئے۔ میں تندرست ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ پاؤں میں طاقت آگئی۔ بدن میں خون آگیا۔ ڈاکٹر رشید اب بھی میری تیمارداری سخت جانفشانی کرتے رہے۔ روزانہ صبح کو کشتی پر بیٹھ کر دریا کی سیر کراتے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں۔ ایک بیکس عورت کا دل اس قدر بے پناہ محبت اور خاص توجہ کے اثر سے کس طرح کھنچتا ہوگا۔ میں رشید کی موجودگی میں اپنے کو ایک نئی دنیا میں پانے لگی۔ مجھے ان کی غیر حاضری میں اضمحلال اور موجودگی میں مسرت کی فضا محسوس ہونے لگی ان کی آواز کا ترنم میری زندگی کے ساز سے ہم آہنگ ہونے لگا۔ مجھ کو سیر دریا میں اور کوئی لطف نہ آتا تھا۔ سوا اس کے کہ رشید میرے پاس ہیں۔ مجھے اس کا بھی یقین تھا کہ ڈاکٹر رشید نے میرے نیم جاں جسم کو نذر آب ہو جانے سے بچا لینے میں چاہے صرف انسانی ہمدردی سے کام لیا ہو لیکن میری تیمارداری کی کیسے مجھے سوائے

زندگی دینے میں یقیناً وہ اپنے دل سے مجبور تھے۔ اس احساس نے مجھے اور کشمکش میں ڈال دیا۔ عورت کی فطرت او رجذبے جو کچھ گوارا کرے لیکن کسی کی محبت کا جواب اور احسان کا عوض محبت ہی کی شکل میں دینے پر مجبور ہے۔ رشید روزانہ اسی مقام پر مجھے لاتے جہاں میں ایک بار اپنی زندگی کو کھو چکی تھی۔ غالباً وہ اس واقعہ کی یاد میرے دل میں تازہ رکھنا چاہتے ہوں۔ ہم لوگ روزانہ اسی مقام پر فرحت ادیر بیٹھ کر اور صبح کی سہانی فضا سے لطف لے کر واپس ہو جاتے تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ اس جگہ آتے ہی مقبرہ کے گنبد مجھے اس معدوم ہستی کو یاد دلا دیتے تھے جو قضا کے ہاتھوں مجھ سے چھن گئی تھی۔ میری مسرت کی لہروں میں یکایک غم کی اس مخالف لہر کی وجہ سے تلاطم پیدا ہو جاتا تھا۔ اور غالباً میرا چہرہ بھی متغیر ہو جاتا تھا۔ اسلئے کہ رشید مجھے متفکر پاکر فوراً میری دلجوئی میں اور زیادہ منہمک ہو جاتے اور اگر میرا دل پھر بھی بشاش نہ ہوتا۔ تو فوراً واپس ہو جاتے غرض اس تمام عرصہ میں رشید نے مجھے برابر خوش رکھنے کی کوشش کی۔ میں بھی ان کے دل کے جذبات کا احساس کرتی رہتی اور دل ہی دل میں سوچتی کہ آخر اس کا کیا حشر ہوگا۔ ڈاکٹر رشید کی قربانیوں کا عوض دینا میرے بس کی بات نہ تھی۔ اکثر خیال کیا کہ اب صحت ہو گئی ہے۔ اجازت لے کر پھر اسی مقبرہ میں جا پہنچوں۔ جہاں میری حیات رفتہ کا انیس زمین کے آغوش میں آرام کر رہا ہے۔ لیکن کئی بار ارادہ کیا اور ہر بار زبان نے ساتھ نہ دیا کس قدر ناشکری ہو گی۔ اگر میں یہ الفاظ زبان سے نکالوں اب اور بھی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ کن لفظوں میں ان احسانات کا شکریہ ادا کروں۔ دوبارہ زندگی دلانے کا کیا صلہ دے سکتی تھی بجز ایک لفظ شکریہ۔ معہ چند قطرے آنسو کے مجھ بیکس کے پاس اور تھا ہی کیا۔ لیکن ہمت نہ پڑی۔ سوچا کہ کسی شب میں تاریکی سے فائدہ اٹھا کر غائب ہو جاؤں۔ زیادہ سے زیادہ مجھے نہایت ذلیل عورت سمجھ لیں گے تھوڑے دنوں میں بھول جائیں گے لیکن یہ خیال آتے ہی ضمیر نے پھر سرزنش شروع کر دی۔ واقعی یہ انتہائی کمینہ پن ہوتا۔ اگر کسی کے احسانات کا عوض ممکن نہ ہو تو کم از کم اس کے دل کو تکلیف تو نہ پہنچانا چاہئے میں اب اسی فکر میں رہنے لگی۔ اور غالباً رشید بھی میری بڑھتی ہوئی تشویش کو کچھ سمجھ گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایک صبح حسب معمول ہم لوگ اسی مقام پر بیٹھے تھے اور روانی دریا کے ترنم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے میرے افکار کا باعث پوچھا۔ میں نے انتہائی نسوانی ہمت سے کام لے کر کہہ دیا کہ اب مجھے اس کا احساس ہو رہا ہے کہ میں آپ کی بار بار ہوں آپ نے میری مسیحائی کی سب مجھے دوبارہ زندگی بخشی کا شکریہ میں کچھ اس کا صلہ دے سکتی لیکن میں جانتی ہوں کہ آپ نے محض انسانی ہمدردی سے ایسا کیا۔ نہ آپ کو کسی صلہ کی خواہش ہے۔ نہ یہاں گنجائش۔ آپ کے اخلاق۔ آپ کی محبت آپ سے الفراق کہنے میں اب تک ستر راہ ہیں۔ میں آپ کو کبھی نہیں بھول سکتی لیکن اب اگر اجازت ہو تو میں آپ کے ساتھ کی مسرت آمیز زندگی کو الوداع کہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں۔ کہ آپ کے ساتھ میری زندگی کے بہترین لمحے گزرے۔ مناسب تو یہ تھا کہ میں آپ کی خادمہ بن کر آپ کی خدمت کرتی لیکن میری مجبوریاں کاش مجھے اس کا موقع دیتیں۔ میں آنکھیں ملا کر ایسی باتیں کرنے کی تاب نہ پاکر دل پر جبر کئے سر جھکائے کہہ رہی تھی دفعتاً نگاہ جو اٹھی۔ رشید کا چہرہ مغموم پایا آنکھوں کے کٹوروں میں اشکوں کو چھلکتے دیکھا۔ مجھے فوراً محسوس ہوا۔ کہ میں نے سخت ظلم کیا۔ میرا دل مسوسنے لگا۔ لیکن اب بات کہہ چکی تھی۔ کر ہی کیا سکتی تھی۔ میں چپ ہو گئی لیکن پھر دل نے کہا۔ بات چھیڑی ہے تو ختم کر لینا چاہئے اس لئے جاری رکھا اور کہنے لگی۔ کہ میری گفتگو سے آپ کو بیحد تکلیف پہنچی میں سزا کی مستحق ہوں لیکن آپ یہ تو جانتے ہی رہے ہوں گے کہ ایک دن یہ کہنا ہی ہے۔ مجھے خود اس بات کے کہنے میں اسی قدر تکلیف ہو رہی ہے جس قدر آپ کو سننے میں۔ میں آپ کے گھر کو اپنا گھر اور آپ کو اپنی عزیز ترین متاع سمجھنے لگی تھی لیکن آپ ہی سوچئے دنیا ۔ ۔ ۔ ۔

میں اتنا کہنے ہی پائی تھی کہ رشید نے کلام قطع کر کے بھرائی آواز میں کہا۔ کہ دنیا کی کس کمبخت کو پرواہ ہے۔ میں تو تمہاری موجودگی میں دنیا کو بھولے ہوئے تھا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم میری ہو چکیں۔ تم اور جاہے جو کچھ کہو گی لیکن مجھ کو تنہا چھوڑ کر چلی جانے کا ذکر نہ کرو گی تم جانتی ہو گی کہ تمہاری موجودگی سے مجھے کس قدر مسرت حاصل رہتی ہے مجھے نہیں معلوم میرے دن کیونکر گذرتے ہیں میں بے خود رہتا ہوں تم میری دیوی ہو۔ میں تمہارا پجاری۔ لیکن خدا گواہ ہے۔ میں نے کس طرح دل کے جذبات کو چھپا کر تمہاری پرستش کی ہے یہ کہتے ہوئے رشید نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور میری طرف منہ کر کے کہا تم جانتی ہو میں تنہا ہوں۔ کیا تم مجھے تنہا چھوڑ دو گی کیا تم میری رفیقہ حیات بننے کی التجا کو رد کر دو گی میری محبت میری زندگی تمہارے قدموں پہ ہے چاہے ٹھکرا دو چاہے اپنا لو۔

اتنا سنتے ہی میرے جسم میں سنسنی پیدا ہو گئی۔ دل دھڑکنے لگا

خون کی روانی تیز ہوگئی۔ اور آنکھوں تلے اندھیرا آگیا۔ گویائی نے جواب دے دیا۔ ۔ ۔ دریا اپنی مستانہ روی کے ساتھ بہتا رہا۔ میں خاموش بیٹھی رہی۔ رشید نے میرے ہاتھ کو تھپتھپایا۔ میرے دل میں بجلی کی لہر سی دوڑ گئی کون عورت ہوگی۔ جو باوجود محبت کے ایک مسرت آمیز زندگی کو ٹھکرا دے گی لیکن یہ مقام مجھے میرے از خود عائد کردہ پیمان کو یاد دلا رہا تھا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں۔ میرے دل میں کیسا طوفان برپا رہا ہوگا۔ ایک طرف سامنے والا مقبرہ مرحوم کی گذشتہ محبت کو یاد دلا رہا تھا۔ مینار مجھے اپنی طرف کھینچ رہے تھے دوسری طرف دریا میرے ڈوبنے اور رشید کا کشتی سے کود کر مجھے طوفانی گومتی سے نکال لانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ایک جانب بیوگی کی دلسوز زندگی کا عہد مجھے وفا کی قسمیں دلا رہا تھا۔ دوسری جانب رشید کی محبت اور جاں نثاری مجھ کو عوض و ایثار کا سبق دے رہی تھی۔ میرے سینہ میں ہیجان تھا۔ آنکھیں بند ہوگئیں۔ دفعتاً مجھے معلوم ہوا۔ جیسے مرحوم کی روح میرے سامنے ہے۔ مجھ سے سوال کر رہی ہے۔ اس روح نے رفتہ رفتہ شکل اختیار کی۔ مرحوم کا مجسمہ میری آنکھوں کے روبرو نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر تقاضائے وفا کر رہا تھا۔ میں نے بے خودی میں اپنا ہاتھ رشید کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ اور زبان نے کہا۔

رشید۔ ایک بیوہ کا جسم مرحوم شوہر کی یاد میں فنا ہو جانے دو۔ مجھ دکھیا پر رحم کرو۔ میں اب اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ تم نے مجھے کیوں نہ ڈوب جانے دیا ———

مجھے اسی قدر کہنا یاد ہے۔ اس کے بعد مجھ پر غشی طاری ہوگئی۔ میں تصویر میں اب تک رشید کا زرد چہرہ اور نمناک آنکھیں دیکھتی رہتی ہوں لیکن اسوقت میری آنکھیں بند تھیں ورنہ شاید ارادہ میں لغزش ہو جاتی۔ ٹھنڈی ہوا سے آنکھ کھلی تو اپنے کو اننیس سیڑھیوں پر لیٹا ہوا پایا۔ تکیہ کی بجائے ایک رومال تہ کیا ہوا سر کے نیچے تھا۔ رشید اپنی یادگار مجھے دے گئے تھے دل میں کسک محسوس ہوئی رومال میں نے رکھ لیا۔ اور اب بھی مجھے اس سے سکون نصیب ہو جاتا ہے چھوٹی سی کشتی کو دور افق میں آنکھوں سے اوجھل ہوتے دیکھا۔ میں نے نحیف آواز میں رشید کو پکارا لیکن ہوا نے میری آواز رشید تک نہ پہنچائی رومال ہلا کر رشید کو بلایا لیکن فضا نے اسے تار نظر سے محسوس نہ ہونے دیا۔

سوگوار عورت یہ کہہ کر رونے لگی۔ میں بھی افسردہ دل خاموش رہا۔ دماغ خالی الذہن تھا۔ نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ بالآخر عورت نے ایک لمبی سانس لی اور داستان ختم کرتے ہوئے کہا اب میں ہوں اور عالم تنہائی زندگی کی صرف دو شاغل ہیں مرحوم کی قبر کو دل سے صاف کر کے اس مقام پر آتی ہوں اور اس جگہ کو صاف کرتی ہوں جہاں رشید بیٹھے تھے محبت کی پرچھائی ہوئی کونپل اپنے رازدار دریا اپنے ہمراز گھاٹ کی بھی مجاوری کرتی ہوں رشید بھی میرے لئے کھو گئے قبر کو بسا نہ اے تو پہلے ہی کھو چکے تھے۔ اس جوگن کی نگاہیں دونوں کو ڈھونڈتی ہیں اور کسی کو نہیں پاتیں سو زندگی مایوسیوں کا نام ہے + قبر ہی کی گود میں آرام ہے دیکھوں کب آرام نصیب ہوتا ہے . . . . . .

غزل

از

پاشا۔ جالندھری

جمالِ دوست کہتا ہے نظر تو دوربیں نکلی
نگاہِ شوق کہتی ہے کہ حسرت ہی نہیں نکلی

چراغِ دیر اور شمعِ حرم سے جو نہفتہ تھی
وہ صورت میرے ظلمت خانۂ دل میں مکیں نکلی

مرا ذوقِ جبیں سائی بھی آخر سازگار آیا
کسی مدہوش کا سنگِ آستاں میری جبیں نکلی

جدھر اُٹھی خدا شاہد، خدائی ہوگئی بسمل
نگاہِ حسن بھی کتنی ہلاکت آفریں نکلی

یہاں ہر روز رہتا ہے بپا اک حشر کا عالم
زمینِ کوچۂ جاناں قیامت کی زمیں نکلی

مرے دل میں رہی اور کر دیا برباد دل میرا
محبت جسکو کہتے ہیں وہ مارِ آستیں نکلی

عبد الحمید الکاتب

پہلی صدی ہجری کا ایک زبردست ادیب

از مولانا عبد القیوم ندوی

اُس وقت جبکہ ترقیاں مسلمانوں کے قدم لینے کے لئے بیچین اور کمالات ان کی پابوسی کے لئے بیتاب تھے۔ علم و کمال کے ایسے ایسے آفتاب و ماہتاب اُفق عالم سے طلوع ہو رہے تھے جن سے کرۂ عالم روشن اور اس جہان ارضی کا ذرہ ذرہ جگمگا رہا تھا۔

عربوں کی بلاغت اور فصاحت مسلم تھی۔ اور خود ان کو اپنی اس خصوصیت پر اس قدر ناز تھا۔ کہ اپنے علاوہ سارے عالم کو عجمی یعنی گونگے کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے قرآن حکیم آیا۔ تو ان کی فصاحت و بلاغت میں چار چاند لگ گئے یعنی اب وہ فصاحت و بلاغت کی اس منزل پر تھے کہ جس کے بعد پھر اور کوئی منزل نہیں۔ اور اس حد پر تھے جس کے بعد اور کوئی حد نہیں۔ یہ قرون اُولیٰ کا دور دورہ تھا اس وقت سرزمین عرب سے گویا ہر قسم کے علوم و حکم اور حقائق و معارف کے دریا اُبل رہے تھے جس سے ایک عالم سیراب ہو رہا تھا۔ اسی زمانہ میں ملک شام کے ایک قبیلہ میں عبد الحمید ابن یحییٰ پیدا ہوئے جن کے علم و معرفت اور فصاحت و بلاغت نے وہ کرشمہ دکھایا۔ کہ لوگ ان کی ادبی قابلیتوں کی قسمیں کھانے لگے اور آخر میں کئی فنون کے بانی اور موجد ثابت ہوئے۔

ولادت

آپ کی ولادت کے صحیح سنہ و تاریخ میں اختلاف ہے مصنف ادب المفرد نے ۸۰ھ بتایا ہے عقد الفرید میں ہے کہ یہ شام کے ایک قبیلہ میں یزید ابن معاویہ کی وفات کے بعد پیدا ہوئے اور گاؤں کے ایک غریب گھرانے میں تربیت پائی۔ ۔ ۔ الخ (عقد الفرید ذکر عبد الحمید ابن یحییٰ)

اسی طرح طبقات الادباء میں ہے کہ کربلا معلیٰ کے واقعہ ہائلہ کے بعد جب جنگ و جدال کے بادل چھٹ چکے تھے اس وقت عبد الحمید شام کے ایک قریہ دشمہ میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی پھر آگے چل کر آپ کی فصاحت و بلاغت کی وجہ لکھتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ وہ گاؤں ایک ایسے مقام پر واقع تھا جہاں سے گزر کر مکہ معظمہ

اور روم کو قبائل جایا کرتے تھے اس لئے بہود ہر قسم کے لوگوں سے ہر قسم کی گفتگو اور مباحث کا ان کو موقع ملتا جس سے ان کی علمی شان میں روزانہ ترقی ہوتی جاتی۔ ۔ ۔ الخ (طبقات الادباء)

بہرحال آپ کی سنہ پیدائش میں مؤرخین کا اختلاف ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے جیسا کہ مصنف کشف الظنون نے تصریح کی ہے کہ کیا معلوم تھا۔ کہ یہ بچہ جو دیہات کے ایک ادنیٰ درجہ کے خاندان میں پیدا ہوا ہے اور ایک نہایت غریب گھرانے میں تربیت و پرورش پائی ہے آگے چل کر وہ اس قدر شہرت پائے گا۔ کہ آسمان بلاغت پر مہر و ماہ بن کر چمکے گا۔ اور کئی فنون کا موجد اور بانی ثابت ہوگا۔ (کشف الظنون)

البتہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ۶۱ھ واقعہ کربلا کے بعد اور ۷۱ھ کے درمیان کسی سال پیدا ہوئے۔

علمی شہرت

شروع شروع آپ بچوں کو پڑھایا کرتے تھے اور وہ بھی کسی ایک جگہ نہیں بلکہ قریہ قریہ اور شہر شہر گھوم گھوم کر اور چکر لگا لگا کر جس سے اگرچہ آپ کو بہت سی زحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ مگر ادبی ذوق کی تکمیل میں بڑی مدد ملتی اور مشاہیر علماء و ادباء اور شعراء کی صحبتوں سے فیضیاب ہونے کا خاصہ موقع ملتا ایک عرصہ تک آپ کا یہی دستور رہا یہاں تک کہ آپ جملہ علوم میں عموماً اور فن بلاغت میں جو آپ کا طبعی فن تھا خصوصاً پورے کامل ہو گئے (ادبیات اللغۃ العربیہ جزء اول ص۶۱ مطبوعہ مصر)

ابھی آپ نوجوان ہی تھے کہ آپ کے ادبی جوہر کھلنے لگے تھے پھر جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ اس چیز میں نہایت سرعت سے ترقی ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ تیس سال کی عمر میں آپ اس قدر مشہور ہو چکے تھے۔ کہ قرب و جوار کا تذکرہ نہیں دُور دُور بھی اس پایہ کا کوئی ادیب موجود نہ تھا۔ رفتہ رفتہ آپ کی قابلیت کا شہرہ بادشاہ وقت تک پہنچا۔ اس نے آپ کی بلیغانہ اور فصیحانہ صلاحیتوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے دربار کا میر منشی مقرر کر لیا اس زمانہ میں دربار کا میر منشی ایک بڑا ہی اہم اور عظیم الشان عہدہ خیال کیا

جاتا تھا آپ ایک عرصہ تک اس مرتبہ پر فائز رہے۔ سب سے آخری زمانہ میں بنو امیہ کے آخری تاجدار مروان ابن محمد ابن مروان ابن حکم اموی کے میر منشی تھے۔ جو خود بھی اپنی ادبی اور بلیغانہ خوبیوں میں خاصہ امتیاز رکھتا تھا

منتہائے کمال

آپ کی فصاحت وبلاغت نے دنیائے علمی کرہ میں وہ مرتبہ حاصل کیا کہ اس کی ضرب المثل بیان کی جانے لگی۔ اور بڑے بڑے شعراء اور ادباء اس کی قسمیں کھانے لگے حتیٰ کہ بعد میں یہ مقولہ زبان زد عوام وخواص ہوگیا کہ فتحت الرسائل بعبد الحمید وختمت بابن العمید رسائل کی ابتدا عبد الحمید سے ہوئی اور ختم عبد الحمید پر ہوئے یعنی فن خطوط نویسی کے موجد اور بانی عبد الحمید قرار پائے۔ ابو بکر انباری نے آپ کو علم ادب کا امام لکھا ہے جاحظ جو بلاغت کا مسلم استاد خیال کیا جاتا ہے آپ کے متعلق لکھتا ہے کہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر عبد الحمید پیدا نہ ہوتے تو علم خطوط نویسی جو مسلمانوں کا ایک مایۂ ناز علم ہے موجود نہ ہوتا۔ علامہ مقریزی کا بیان ہے کہ یوں تو بڑے بڑے ادیب اور انشاء پرداز دنیا میں پیدا ہوئے لیکن اگر یہ سچ ہے کہ تقدم کو فضیلت حاصل ہوا کرتی ہے۔ تو یقیناً اس لحاظ سے علامہ عبد الحمید کو تمامی ادباء پر شرف اور فضیلت حاصل ہے آغانی نے مشاہیر ادباء کا تذکرہ کیا ہے۔ اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ ہر قوم میں کچھ افراد ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کی فصاحت وبلاغت سے قوم زندہ ہو جایا کرتی ہے۔ اور جن کی علمی جد وجہد سے اس میں چار چاند لگ جایا کرتے ہیں۔ گو مسلمانوں میں اس قسم کے افراد کی کمی نہیں۔ بلکہ ہر قوم سے زیادہ اس میں ایسے لوگ پیدا ہوئے۔ مگر اس صف میں عبد الحمید نے جو درجہ حاصل کیا۔ اس کو قیامت تک نہ بھلایا جائے گا۔

(آغانی تذکرہ عبد الحمید)

محمد عاطف بک مصری اپنی کتاب ادبیات اللغۃ العربیہ میں جو مصر کے مدارس میں داخل نصاب ہے آپ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

وكان في الكتابة وفي كل فن من العلم والادب اماما.... وعنه اخذ المترسلون ولطريقته لزموا ولآثاره اقتفوا وهو الذي سهل سبيل البلاغة في الترسل وهو اول من اطال الرسائل واستعمل التحميدات	آپ کتابت میں اور علم وادب کے تمام شعبوں کے امام تھے اور آپ ہی سے ادیبوں اور فن خطوط نویسی کے ماہروں نے علم پایا آپ ہی کے طریقہ کا التزام کیا اور آپ ہی کے قدم بقدم چلے۔ آپ ہی وہ ہیں جنہوں نے بلاغت کے راستے سہل کر دئے آپ پہلے شخص ہیں

في فصول الكتب فاستعمل الناس ذالك بعده.. ...الخ | جنہوں نے فن خطوط نویسی کی علمی حیثیت سے بنیاد ڈالی اور تحمیدات استعمال کیں جس کو بعد والوں نے بھی استعمال کیا۔

(ادبیات اللغۃ العربیہ جلد اول ص۱۹۵)

انشا پردازی کے چند نمونے

آپ نے انشا پردازی کے جو بیش قیمت جواہرات کاغذ کے صفحات پر مختلف اوقات میں بکھیرے۔ ضرورت ہے کہ ان کو یکجا کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ تاکہ اوائل صدی ہجری کی انشا پردازی کا اندازہ ہو سکے اور لوگ ادب وبلاغت کے ان لطائف ونکات سے بہرہ ور ہو سکیں جو یقیناً کہیں اور دستیاب نہیں ہو سکتے۔ یوں تو اس قسم کا انمول ذخیرہ عربی ادب میں بیشمار موجود ومحفوظ ہے مگر اس جگہ صرف چند نمونہ تحریر پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ خلیفہ مروان کو جس کے یہ میر منشی تھے اس کے کسی عامل نے ایک سیاہ فام غلام ہدیہ بھیجا مروان کو ناگوار ہوا۔ اس نے ان کو بلایا اور کہا کہ عامل مذکور کو ایک مختصر خط لکھو جس میں میری ناپسندیگی اور اس کے اس فعل کی مذمت کا اظہار ہو آپ نے فوراً بلا غور وفکر کے یہ الفاظ کاغذ پر تحریر فرمائے۔

لو وجدت لونا شرا من السواد وعددا اقل من الواحد لاهديته والسلام	کاش تو سیاہ سے زیادہ بدتر کوئی رنگ پاتا اور ایک سے کمتر کوئی عدد پاتا۔ تو تو ہدیہ بھیجتا۔ والسلام

یہ تھی آپ کی فی البدیہ تحریر اور یہ تھا اس کا اعلیٰ نمونہ۔

آپ اکثر فرمایا کرتے کہ "قلم درخت ہے اور الفاظ اس کے پھل ہیں فکر دریا ہے اور حکمت اس کے موتی ہیں"۔ اس کے علاوہ بھی بیشمار بلیغانہ اقوال ہیں مگر بنظر اختصار ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں۔

وفات

۱۳۲ھ میں جب بنو امیہ کو زوال آیا اور بنو عباس تخت خلافت کے وارث ہوئے تو انہوں نے چن چن کر بنو امیہ کے سرداروں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اس ڈر سے آپ نے اپنا قدیم مسکن شام کو چھوڑ کر مصر کے ایک گاؤں میں پناہ گزیں ہو گئے۔ مگر اجل کا پیغام آچکا تھا۔ اس لئے کہیں بھی پناہ نہ تھی۔ ایک دن اپنے مفرور خلیفہ مروان کے ساتھ مصر کے ایک گاؤں بوسیر میں جو الفیوم کے صوبہ میں واقع ہے مقیم تھے کہ خلیفہ ابو العباس سفاح بانی سلطنت عباسیہ کے آدمیوں نے خلیفہ کے ساتھ ان کو بھی قتل کر دیا۔ اور علم وادب اور بلاغت وفصاحت کا یہ روشن آفتاب ہمیشہ کیلئے غروب ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ اہل عصر نے مرثیے کہے شاگردوں نے نالہ وشیون کیا مستفیضین نے آہ ونالہ سے آسمان سر پر اٹھالیا مگر بے سود ۔ وہ مخالف کو جلنے سے ملا جا بجھ گیا تھا لیکن ان کا ادبی سرمایہ اوراق کتب کی زینت آج بھی ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے ۔ افلت شموس الاولین وشمسنا ؛ ابداً علی افق العلا لا تغرب

میرا دل

تمہارا دل بھی رفتہ رفتہ میرا دل نہ ہو جائے

از جناب عاصم جے پوری

جنونِ جستجو وابستۂ منزل نہ ہو جائے
محبت میں جو حاصل ہے وہ لاحاصل نہ ہو جائے

نظر اپنی نگاہِ ناز میں حائل نہ ہو جائے
کہیں برہم اداؤں کی بھری محفل نہ ہو جائے

کہیں آئینہ بدلا لے نہ اربابِ محبت کا
تمہارا دل بھی رفتہ رفتہ میرا دل نہ ہو جائے

میں دل ہی دل میں رو سکتا ہوں لیکن دل یہ کہتا ہے
وہ ظالم آہ کی تاثیر سے غافل نہ ہو جائے

کرو تم میرے آنسو پونچھ کر دامن نہ تر اپنا
یہ مرہم بھی شریکِ سوزِ داغِ دل نہ ہو جائے

مرا دل توڑنے ہی کیلئے ہے توڑ دو لیکن
یہی آئینہ آخر پیار کے قابل نہ ہو جائے

کبھی دیکھا کہ غمزہ کیا اسیرِ آئینہ ہوگا
کبھی سوچا کہ پیدا آئینہ میں دل نہ ہو جائے

تمناؤں سے دل زندہ ہے لیکن میں یہ ڈرتا ہوں
تمناؤں سے دل کی زندگی مشکل نہ ہو جائے

انہیں پا کر رہوں میں کچھ منتظر سوائے حیرانی
کوئی گم اس طرح آ کر سرِ منزل نہ ہو جائے

خسِ گرداب پر رقصِ طرب طاری ہے اور ہم کو
یہ غم ہے زندگی طوفان ہے ساحل نہ ہو جائے۔

پلائے جا اگر ہے پاسِ رازِ میکدہ ساقی
کسی سے کچھ کہے عاصم پھر اس قابل نہ ہو جائے

پستول کا نشانہ

روسی معجز نگار الیگزنڈر پشکن کا افسانہ

ترجمہ جناب سید اصغر علی صاحب

"ہم نے ایک دوسرے پر فائر کئے" —— بارا تنسکی

"میں نے اس کو ڈوئیل میں قتل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ اور ایک گولی اس کے لئے بچا رکھی۔"

—— بیواک

ہم —— کے چھوٹے سے قصبہ میں ٹھہرے ہوئے تھے فوجی افسر کی زندگی سے ہر شخص واقف ہے۔ صبح کے وقت —— قواعد۔ سواری کا اسکول۔ رجمنٹ کے کمانڈر یا کسی یہودی کے ہوٹل میں ناشتہ شام کو مے نوشی اور تاش —— میں ایک بھی کشادہ مکان نہ تھا۔ اور نہ کوئی قابل عقد لڑکی۔ ہم ایک دوسرے کے کوارٹروں پر جمع ہوا کرتے تھے۔ اور یہاں ہم اپنی وردیوں کے سوا کسی ساز و سامان کو نہ دیکھتے تھے۔

ہماری سوسائٹی میں صرف ایک ہی آدمی تھا جو فوجی نہ تھا۔ اس کی عمر تقریباً پینتیس سال تھی۔ ہم اس کو تقریباً بوڑھا آدمی سمجھتے تھے۔ تجربات و مشاہدات کی وجہ سے اس کو ہم پر برتری حاصل تھی۔ جس کے ساتھ ساتھ اس کے مستقل تیکھے پن۔ سنجیدہ طبیعت اور طنز آمیز گفتگو میں ہمارے جیسے رجحان رکھنے والے نوجوانوں پر زبردست اثر ہوتا تھا۔ کوئی نہ کوئی راز اس کے تقدیری امور سے وابستہ تھا۔ اس کی شکل و شباہت روسیوں کی سی تھی لیکن پھر بھی اس کا نام غیر ملکی تھا ایک زمانہ میں اس نے رسالہ کی خدمات انجام دی تھیں۔ اور وہ بھی امتیاز کے ساتھ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کیا وجہ تھی جس نے اسے ملازمت چھوڑنے اور ایک چھوٹے سے غیر معروف گاؤں میں بود و باش اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ جہاں وہ غربت کی حالت میں رہتا تھا۔ اس پر بھی وہ خرچ کے معاملہ میں محتاط نہ تھا۔ وہ ہمیشہ ایک پرانا کالا فرغل پہنے پیدل جایا کرتا تھا لیکن ہماری رجمنٹ کے افسروں کے لئے ہمیشہ اس کا دسترخوان کھلا رہتا تھا۔ یہ درست ہے کہ اس کا کھانا دو یا تین قسم کا ہی ہوتا تھا۔ یہ کھانا ایک بوڑھا سپاہی تیار کیا کرتا تھا لیکن پھر بھی فرانسیسی شراب افراط سے ہوتی تھی۔ اس کے وسائل اور آمدنی صیغۂ راز میں تھے۔ اور اس کی بابت اس سے دریافت کرنے کی کسی کو جرأت بھی نہ ہوتی تھی۔ اس کے پاس بہت سی کتابیں تھیں جن میں اکثر فوجی تصانیف اور ناول تھے۔ وہ انہیں لوگوں کو بخوشی پڑھنے کو دے دیتا تھا اور کبھی واپس نہ مانگتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اس کتاب کو کبھی اس کے مالک کو واپس نہ کرتا تھا۔ جسے وہ منگا لاتا تھا پستول سے نشانہ بازی کرنا اس کا خاص تفریحی مشغلہ تھا۔ اس کے کمرے کی دیواریں گولیوں سے چھلنی ہو رہی تھیں۔ اور سوراخوں کی کثرت سے شہد کے چھتہ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اس معمولی سے لپے ہوئے چھوٹے مکان میں جس میں وہ رہتا تھا۔ تکلفات کی مد میں پستولوں کا شاندار مجموعہ ہی تھا پستول چلانے میں اس نے جو مشق حاصل کی تھی وہ حیرت انگیز تھی۔ اگر اس نے کسی سپاہی کی ٹوپی کی گھنڈی کو اڑانا چاہا ہے۔ تو ہماری رجمنٹ میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو تجربہ کے لئے اپنا سر پیش کرنے سے پس و پیش کرتا۔

ہماری گفتگو اکثر ڈوئیل پر ہوا کرتی تھی۔ سل وی یو (کیونکہ میں اس کا یہی نام لوں گا۔) اس میں کبھی حصہ نہ لیتا تھا۔ یہ دریافت کرنے پر کہ کیا تم بھی کبھی لڑے ہو۔ وہ روکھے پن سے جواب دیتا تھا۔ کہ میں نے ایسا کیا ہے لیکن میں تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ اور یہ ظاہر تھا کہ اس قسم کے سوالات اس کو ناگوار ہیں۔ ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کے دماغ میں اس کی خطرناک مشق کے کسی بد قسمت شکار کی یاد تازہ ہے۔ بہر حال ہمارے دل میں اس پر یہ شبہ کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں گذرا کہ اس میں بزدلی کے قریب کی کوئی چیز ہے۔ بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جن کی ظاہری صورت ان کے متعلق عام شبہات رفع کر دیتی ہے لیکن غیر متوقع طور پر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہم سب کو متحیر کر دیا

ایک شام ہمارے تقریباً دس افسر سل وی یو کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے ہم نے معمول کے مطابق خراب پی —— یعنی بہت۔ کھانے کے بعد ہم اپنے میزبان کو اس پر آمادہ کرنے لگے کہ وہ ہمارے لئے جوے کی بازی کھیلے۔ بہت دیر تک وہ انکار کرتا رہا کیونکہ وہ شاذ سے ہی کبھی جوا کھیلتا تھا۔ لیکن آخر کار اس نے تاش لانے کے لئے کہا۔ میز پر سونے کے ڈیڑھ سو روبل[عہ] پھیلا دئے اور بانٹنے کیلئے

عہ روبل ایک روسی سکہ ہے۔

بیٹھ گیا۔ ہم اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اور کھیل شروع ہوا۔ کھیل کے درمیان سل ویو کو قطعی خاموش رہنے کی عادت تھی۔ وہ کبھی جھگڑا یا صفائی پیش نہیں کرتا تھا۔ اگر شرط لگانے والا غلط گن جاتا تھا۔ تو وہ فوراً یا تو کمی کو پورا کر دیتا تھا یا نوا فتی میں کمی کر دیتا تھا۔ ہم اس بات کو جانتے تھے اور اسے اس کی نشانہ کے مطابق گننے کی اجازت دے دیتے تھے لیکن ہمارے ساتھ ایک افسر تھا جو ہماری رجمنٹ میں حال ہی میں تبدیل کیا گیا تھا کھیل کے درمیان اس نے خیالات کی پراگندگی کی وجہ سے ایک نمبر کئی مرتبہ لکھ دیا۔ سل ویو نے گھرمالی اور اپنے قاعدہ کے مطابق نمبر درست کئے۔ یہ خیال کر کے کہ اس نے غلطی کی ہے۔ افسر صفائی پیش کرنے لگا۔ سل ویو خاموشی سے بانٹتا رہا۔ جب صبر کا یارا نہ رہا۔ تو افسر نے جھاڑن اٹھایا۔ اور جو اسے غلط لکھا ہوا معلوم ہوا اسے مٹا دیا۔ سل ویو نے کھریا اٹھائی اور پھر وہی لکھ دیا۔ شراب، کھیل اور اپنے ساتھیوں کے قہقہے سے برافروختہ ہو کر افسر نے اس کو اپنی توہین خیال کیا۔ اور غصہ میں میز پر سے پیتل کا شمعدان اٹھا کر سل ویو کی طرف دے مارا سل ویو بروقت جھک کر بال بال بچا۔ ہم سراسیمہ ہو گئے۔ سل ویو غصہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے وہ کھڑا ہو گیا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"جناب عالی۔ مہربانی کر کے چلے جائیے اور خدا کا شکر کیجئے۔ کہ یہ واقعہ میرے گھر پر ہوا ہے۔"

ہمیں اس کے متعلق کہ کیا ہونے والا ہے۔ کچھ شبہ نہ تھا اور ہم اپنے نئے ساتھی کو ابھی سے مردہ سمجھنے لگے تھے۔ افسر یہ کہہ کر چلا گیا۔ کہ وہ اس توہین کا ہر اس طریقہ سے جس طرح کہ جوا کھلانے والا چاہے جواب دینے کو تیار ہے۔ کھیل چند منٹ اور جاری رہا۔ لیکن یہ خیال کر کے کہ اب ہمارے میزبان کو کھیل سے مزید دلچسپی نہیں رہی ہے ہم ایک ایک کر کے اجازت چاہنے لگے اور اپنی رجمنٹ میں آئندہ خالی ہونے والی آسامی پر بحث کرتے ہوئے اپنے کوارٹروں کو واپس آ گئے

اگلے دن سعدی کے اسکول میں ہم دریافت کر رہے تھے۔ کہ کیا غریب لفٹنٹ ابھی تک زندہ ہے جبکہ وہ خود ہی ہمارے درمیان آ گیا ہم نے پھر وہی سوال اس سے پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے سل ویو کے متعلق معمولی سی خبر بھی نہیں سنی ہے۔ اس سے ہم متعجب ہوئے ہم سل ویو کو دیکھنے کے لئے گئے اور دیکھا کہ وہ صحن میں کھڑا ایچوں کے ایک سلوہے پر جو دروازے پر لگے ہوئے تھے گولیوں پر گولیاں چلا رہا تھا۔ اس نے رات کے واقعہ کے متعلق ایک لفظ بھی نہ ادا کرتے ہوئے حسب معمول ہمارا استقبال کیا۔ تین دن گذر گئے اور لفٹنٹ ابھی تک زندہ تھا۔ متعجب ہو کر ہم نے سوال کیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ سل ویو لڑنا نہیں چاہتا؟"

سل ویو نہیں لڑا۔ اس نے اپنے آپ کو بہت ہی ہلکی صفائی سے مطمئن کر لیا۔ اور جھگڑا ختم کر دیا۔ اس سے ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ ہم (جوانوں) کی نظروں میں گر گیا۔ جوان آدمیوں کی نظروں میں ہمت کی کمی سب سے زیادہ ناقابل معافی ہے۔ ان کے نزدیک شجاعت مردانہ خصوصیات کی معراج ہے اور تمام ممکن کمزوریوں کا بہانہ۔ بہرحال رفتہ رفتہ سارا واقعہ بھلا دیا گیا اور سل ویو نے پھر اپنی پرانی فوقیت حاصل کر لی۔

میں ہی تنہا ایسا تھا جو اس سے پھر بے تکلف نہ ہو سکا قدرتی طور پر رومان پسند ہونے کی وجہ سے میں پہلے دوسرے شخصوں سے زیادہ اس شخص سے مانوس تھا۔ جس کی زندگی ایک چیستان تھی۔ اور جو مجھے کسی غیر معروف حادثہ کا مجاہد معلوم ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا —— کم از کم یہ صرف میرے ہی ساتھ تھا۔ کہ وہ اپنے مستقل طنز آمیز لہجہ کو چھوڑ دیتا تھا اور مختلف موضوعات پر سنجیدگی اور غیر معمولی دلچسپ انداز میں گفتگو کیا کرتا تھا۔ لیکن اس افسوسناک شام کے بعد یہ خیال کہ اس کی عزت کو بٹہ لگ گیا ہے۔ اور یہ کہ اس نے اپنی ہی مرضی سے اپنے آپ پر دھبہ لگا رہنے دیا ہے —— یہ خیال مجھ کو نہیں چھوڑتا تھا۔ اور مجھ کو اس سے وہی رویہ اختیار کرنے سے روکتا تھا۔ جیسا کہ مجھے عادت تھی۔ میں اس کی طرف دیکھنے تک میں شرم محسوس کرتا تھا۔ سل ویو اس کا خیال نہ کرنے اور وجہ معلوم کرنے کے لئے بہت تیز فہم تھا۔ یہ بات اس کو رنجیدہ کرتی ہوئی معلوم ہوئی —— میں نے کم از کم ایک یا دو مرتبہ ایسا محسوس کیا کہ وہ مجھ سے صفائی پیش کرنا چاہتا ہے لیکن میں نے اس کو اس کا کوئی موقعہ نہ دیا۔ اور سل ویو منفعل واپس چلا گیا۔ اس کے بعد سے میں اس کے یہاں صرف اپنے ساتھیوں کے ساتھ جایا کرتا تھا اور ہماری رازدارانہ گفتگو کا خاتمہ ہو گیا۔

دارالسلطنت کے باشندوں کو جن کی توجہ مبذول کرانے کیلئے اتنی ساری چیزیں ہیں ان خیالات کے ہجوم کا گمان بھی نہیں ہے جو صرف انہیں معلوم ہیں۔ جو گاؤں یا چھوٹے قصبوں میں رہتے ہیں —— مثال کے طور پر ڈاک آنے کے دن کا انتظار سہ شنبہ اور جمعہ کو ہماری رجمنٹ کا دفتر افسروں سے بھرا رہتا تھا بعض روپیہ کے انتظار میں رہتے تھے۔ اور بعض خطوط یا کاغذات کے۔

پلندے عام طور سے وہیں کھولے جاتے تھے۔ خبریں ایک دوسرے کے ذریعہ پھیلا دی جاتی تھیں۔ اور دفتر بہت ہی دلکش منظر پیش کرتا تھا۔ سل دیو ہماری رجمنٹ کے پتہ کی معرفت اپنے خطوط منگایا کرتا تھا۔ اور عام طور سے ان کا دفتر میں انتظار کرتا تھا۔ ایک دن انہوں نے اس کو ایک پلندہ دیا جس کی مُہر اس نے بڑی ہی بے صبری سے توڑی۔ جب وہ خط پڑھ رہا تھا۔ تو اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں افسروں نے جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے خطوط میں مشغول تھا۔ کچھ نہ دیکھا

"حضرات" سل دیو نے کہا۔" واقعات میری فوری روانگی چاہتے ہیں میں آج رات کو چلا جاؤں گا۔ میں امید کرتا ہوں۔ کہ آپ میرے ساتھ آخری مرتبہ کھانا کھانے کو منع نہ کریں گے۔ میں آپ کے آنے کی بھی امید کرتا ہوں۔ اس نے میری طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا" میں آپ کے یقینی آنے کی امید کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ جلدی سے چلا گیا۔ اور سل دیو کے مکان پہ ملنے کے لئے متفق ہو کر ہم اپنے اپنے کام میں لگ گئے

میں سل دیو کے مکان پر وقت مقررہ پہ پہنچا۔ اور تقریباً تمام رجمنٹ کو وہاں اکٹھا پایا۔ اس کا تمام سامان پہلے ہی سے بندھا ہُوا تھا ۔۔۔۔ وہاں صرف گولیوں سے چھدی ہوئی خالی دیوار رہ گئی تھی ہم میز پہ بیٹھ گئے۔ ہمارا میزبان غیر معمولی طور پہ خوش تھا۔ اور جلد ہی تمام محفل اس کی زندہ دلی سے محفوظ ہونے لگی۔ ہر منٹ پر کاگ کھلنے کی آواز آ رہی تھی۔ ساغروں میں متواتر جھاگ اور حباب اُٹھ رہے تھے اور نہایت گرم جوشی سے ہم نے مسافر کو خدا حافظ کہا اور ایک خوشگوار سفر کی دعا دی۔

اس وقت تک جب کہ ہم میز پر سے اُٹھے کافی رات ہو چکی تھی جب ہم اپنی ٹوپیاں چھانٹ رہے تھے تو سل دیو نے جو اپنے مہمانوں کو الوداع کہہ رہا تھا میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اس وقت جبکہ میں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ مجھے روک لیا۔" مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ میں پیچھے رہ گیا۔

مہمان چلے گئے تھے۔ اکیلے رہ کر ہم ایک دوسرے کے بالمقابل بیٹھ گئے۔ اور خاموشی سے اپنے پائپ پینے لگے۔ سل دیو خیال میں مستغرق تھا۔ اس کی تشنجی زندہ دلی پہلے ہی سے غائب ہو چکی تھی اس کی مردہ کی سی زردی اور چمکدار آنکھیں اور گھنا دھواں جو اس کے منہ سے نکل رہا تھا۔ اس کو حقیقی عفریت کی شکل بنائے ہوئے تھا۔

چند منٹ گذر جانے کے بعد سل دیو نے خاموشی توڑی

"یہ ہو سکتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو آئندہ نہ دیکھ سکیں" اس نے کہا۔" اور جدا ہونے سے قبل میں تم سے تشریح کرنا چاہتا تھا۔ تم نے غور کیا ہوگا۔ کہ میرے دل میں دوسروں کی رائے کی کوئی وقعت نہیں ہے لیکن مجھے تم سے رغبت ہوگئی ہے اور تمہارے دماغ میں غلط خیال چھوڑنا میرے لئے باعث تکلیف ہوگا۔"

وُہ رکا اور اپنے پائپ کو جھاڑنے لگا۔ میں نیچی نظریں کئے خاموش رہا

"یہ تمہیں تعجب خیز معلوم ہوا۔" اس نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔" کہ میں نے بیہودہ۔ بدمست ۔۔۔۔ سے کفارہ نہ چاہا۔ تم اس سے اتفاق کرو گے کہ چونکہ مجھے ہتھیار پسند کرنے کا اختیار تھا۔ اس کی زندگی میرے ہاتھ میں تھی جبکہ میری اپنی زندگی قطعی خطرہ میں نہ تھی۔ میں اپنے تحمل کو صرف عالی ظرفی پر محمول کر سکتا تھا۔ لیکن مجھے غلط بیانی کی کوئی خواہش نہیں۔ اگر میں اپنی زندگی کو بغیر کسی خطرہ میں ڈالے ہوئے ر۔۔۔۔ کو سزا دے سکتا تو میں اس کو تمام دنیا کے عوض بھی معاف نہ کرتا۔"

میں نے حیرت سے سل دیو کی طرف دیکھا۔ اس قسم کے اعتراف نے مجھے بالکل بدحواس کر دیا۔ سل دیو نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا

"یہ درست ہے۔ مجھے اپنے آپ کو موت کے خطرہ میں ڈالنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ چھ سال کا عرصہ ہوا کہ میرے منہ پر ایک تھپڑ مارا گیا اور میرا دشمن اب تک زندہ ہے۔"

میری دلچسپی بے طرح بڑھ گئی۔" تو تم اس سے نہیں لڑے؟" میں نے دریافت کیا۔" بلاشبہ واقعات نے تمہیں علیٰحدہ رکھا۔؟"

"ہاں۔ میں اس سے لڑا۔" سل دیو نے جواب دیا۔ اور یہ ہماری ڈوئیل کی یادگار ہے۔"

سل دیو اُٹھا اور بیٹھنے کے صندوق میں سے ایک سرخ ٹوپی نکالی۔ جس پر بیل ٹنکی ہوئی تھی۔ اور جو سنہری پھندنے سے مزین تھی۔ (اس قسم کی ٹوپی جسے اہل فرانس پولیس کا سرخ کلاہ کہتے ہیں) اس نے اسے اوڑھا۔ یہ پیشانی سے تقریباً دو انچ کے فاصلے سے گولی سے چھدی ہوئی تھی۔

"تمہیں معلوم ہے" سل دیو نے کہا۔" کہ میں نے رسالے کی ۔۔۔۔ رجمنٹ میں ملازمت کی ہے۔ میری عادت تمہیں معلوم ہے میں ہر معاملہ میں اول جگہ لینے کا عادی ہوں۔ لیکن میری جوانی میں یہ جذبہ میرے لئے عشق کی حد تک تھا۔ ہمارے زمانے میں شوریدہ سری عام رواج تھا ۔۔۔۔ اور میں فوج میں سب سے زیادہ خود سر اور چھیڑ خانی کرنے والا تھا۔ ہم اپنی بدمستی پر شیخی بگھارا کرتے تھے ۔۔۔۔ اور

میں مشہور ہوسٹ سیوسے زیادہ پیار کرتا تھا جس کی شجاعت کا راگ ڈینس ڈیفینیوسے گایا ہے۔ ہماری رجمنٹ میں ڈوئیل آئے دن کا واقعہ تھا ——— ان سب میں میں یا تو دوسرا ہوتا تھا یا خاص۔ میرے ساتھی میرا بے حد احترام کرتے تھے اور افسر کمان جو آئے دن تبدیل ہوتے رہتے تھے مجھے یقینی نقصان رساں سمجھتے تھے

"میں سکون سے ——— قدرے بے امنی سے ——— اپنی شہرت کا لطف اٹھا رہا تھا جبکہ ہماری رجمنٹ میں ایک مالدار اور عالی مرتبہ خاندان کا ایک جوان تعینات کیا گیا (میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا) میں اپنی تمام زندگی میں ایسے شاندار اور خوش قسمت شخص سے نہیں ملا ہوں! تم ذرا خود تصور کرو۔ جوانی۔ ذہانت۔ انتہائی زندہ دلی۔ انتہائی بے معرکہ ہمت۔ ایک مشہور نام۔ دولت جس کی مقدار کا اندازہ اس کو خود نہ تھا۔ اور جس کے متعلق معلوم کرنے کی اس نے کبھی زحمت بھی گوارا نہ کی ——— اور غور کرو کہ اس نے ہمارے درمیان کس قسم کا اثر پیدا کیا ہوگا۔

"میری فوقیت کو ٹھیس لگی۔ میری شہرت سے رنجیدہ کر اس نے مجھ سے دوستی کرنا چاہی لیکن میں اس سے سرد مہری سے ملا اور بغیر کسی افسوس کے وہ مجھ سے علیحدہ رہنے لگا۔ میں اس سے نفرت کرنے لگا۔ اس کی رجمنٹ اور عورتوں کی سوسائٹی میں کامیابیوں نے مجھے قطعی ناامیدی کے درجہ کو پہنچا دیا۔ میں اس سے لڑائی کا بہانہ ڈھونڈنے لگا۔ میرے چٹکلوں کا جواب وہ دوسرے لطیفوں سے دیتا تھا۔ جو مجھ کو اپنوں سے زیادہ برجستہ پسند اور طنزیہ معلوم ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ مذاق اڑاتا تھا اور میں عداوت سے گھٹتا تھا۔

"آخرکار ایک شام پولینڈ کے سفیر کے یہاں محفل رقص میں اس کو تمام خواتین کے التفات کا مرکز دیکھ کر اور خاص کر میزبان کی جس سے کہ ایک مرتبہ میری سازباز ہو چکی تھی۔ میں نے ایک ادنیٰ سی ہتک آمیز بات اس کے کان میں کہہ دی۔ وہ آگ ببھوکا ہو گیا۔ اور میرے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔ ہمارے ہاتھ تلواروں پر پہنچے۔ خواتین بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔ ہم کھینچ کر علیحدہ کر دیئے گئے۔ اور اسی رات کو ہم لڑنے کے لئے گئے۔"

"صبح نمودار ہو رہی تھی۔ میں مقررہ جگہ پر اپنے تین منتخب حامیوں سمیت کھڑا تھا۔ میں ناقابل بیان بے صبری کے ساتھ اپنے حریف کا انتظار کر رہا تھا۔ موسم بہار کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔ اور اس وقت تک سورج میں گرمی آگئی تھی میں نے اس کو دور سے دیکھا۔ وہ مع اپنے اکیلے حامی کے پیدل آ رہا تھا۔ اور اس کی تلوار اس کے فوجی کوٹ کے نیچے تھی۔ ہم اس کے پاس گئے۔ وہ ولایتی سرخ لکھ سے بھری ہوئی فوجی ٹوپی لئے قریب آیا۔ ہمارے حامیوں نے ہمارے واسطے بارہ قدم ناپ دیئے۔ مجھے پہلے گولی چلانی تھی۔ لیکن حسد نے میرے دل میں اس قدر انتہائی اضطراب پیدا کر دیا تھا کہ میں اپنے ہاتھ کی یکسانی کا یقین نہ کر سکتا تھا۔ اور اپنے آپ پر قابو پانے کے لئے وقت دینے کی وجہ سے میں نے اس سے پہلے فیر کرنے کو کہا۔ میرا مخالف اس پر راضی نہ ہوتا تھا۔ یہ قرار پایا۔ کہ ہم قرعہ اندازی کر لیں۔ پہلا نمبر جو خوش قسمتی کا مستقل ساتھی تھا اس کو ملا۔ اس نے نشانہ تاکا۔ اور میری ٹوپی میں گولی پار کر دی۔

"اب میرا نمبر تھا۔ بالآخر اس کی زندگی میرے ہاتھ میں تھی میں نے اس کی طرف متجسسانہ نگاہوں سے گھبراہٹ کی صرف ایک جھلک معلوم کرنے کے لئے دیکھا۔ وہ میرے پستول کے مقابل کھڑا ہوا اپنی ٹوپی میں سے پکی ہوئی مکوہ چھانٹ رہا تھا اور بیج تھوک رہا تھا جو اس جگہ تک آ رہی تھی۔ جہاں میں کھڑا تھا۔ اس کی بے اعتنائی نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ مجھے اس کو اس کی زندگی سے محروم کرنے میں کیا فائدہ ہوگا۔ میں نے سوچا۔ جب کہ وہ اس کی ذرا بھی پروا نہیں کرتا ہے؟ میرے دماغ میں یکایک ایک بیہودہ خیال پیدا ہوا۔ میں نے اپنا پستول نیچا کر لیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ تم اس وقت موت کے لئے تیار نہیں ہو۔ میں نے اس سے کہا تم اپنا ناشتہ کرنا مناسب سمجھ رہے ہو۔ مجھے دخل اندازی کرنے کی کوئی خواہش نہیں۔

تم قطعی مزاحم نہیں ہو رہے ہو۔ اس نے جواب دیا۔ براہِ مہربانی فیر کیجئے ——— بلکہ جو آپ کے دل میں آئے کیجئے۔ فیر تمہارا رہ تک ہے۔ اور میں آپ کا حکم بجا لانے کو ہر وقت تیار ہوں۔

"میں یہ کہتے ہوئے کہ میں اس وقت فیر کرنا نہیں چاہتا حامیوں کی طرف مخاطب ہوا اور اس پر ڈوئیل ختم ہو گئی۔"

"میں نے ملازمت چھوڑ دی اور اس چھوٹی سی جگہ چلا آیا اس وقت سے کوئی دن ایسا نہیں گزرا۔ کہ میں نے انتقام کا خواب نہ دیکھا ہو۔ اب میرا وقت آگیا ہے۔ . . ."

سل وِیو نے اپنی جیب سے وہ خط نکالا۔ جو اسے صبح ملا تھا اور مجھے پڑھنے کے لئے دیا۔ لکھنے والے (مہربان) اس کا گماشتہ نے اس کو ماسکو سے اطلاع دی تھی کہ ایک شخص عنقریب ہی ایک جوان اور خوبصورت لڑکی سے جائز طور پر شادی کرنے والا ہے۔

"تم غور کرو گے" مسل ویو نے کہا "کہ یہ ایک شخص کون ہے میں اسکو چلتا پھرتا ہم دیکھیں گے کہ وہ موت سے اسوقت بھی جبکہ اس کی شادی ہونے والی ہے ساری بے اعتنائی سے ہی آغوش ہوگا۔ جیسا کہ کبھی وہ اپنی کوہ پیمائی کے دوران اس کا منتظر تھا۔"

یہ الفاظ کہتے ہوئے مسل ویو اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی ٹوپی زمین پر پھینک دی اور اس طرح کمرے میں ادھر ادھر گھومنے لگا۔ جیسے کوئی چیتا اپنے کٹہرے میں گھومتا ہو۔ میں اس کی باتیں بغیر اثر پذیر ہوئے سن رہا تھا میں تعجب انگیز اور متضاد جذبات کی وجہ سے پریشان ہوگیا۔

ملازم داخل ہوا اور اطلاع دی کہ گھوڑے تیار ہیں۔ مسل ویو نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا۔ ہم بغلگیر ہوگئے۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گیا جس میں دو تھیلے رکھے ہوئے تھے۔ ایک میں پستول تھے۔ اور دوسرے میں اس کا سامان۔ ہم نے ایک مرتبہ پھر الوداع کہا۔ اور گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔

کئی سال گذر گئے اور گھریلو معاملات نے مجھ کو ضلع ن ——— کے چھوٹے سے غیر معروف گاؤں میں مقیم ہونے پر مجبور کر دیا۔ اپنے آپ کو کاشتکاری میں لگا کر میں نے اپنی پہلی تند و تیز اور آزاد زندگی کو یاد کر کے افسوس کرنا بند نہیں کیا۔ مجھے سب سے زیادہ جو چیز گراں گذرتی تھی وہ یہ تھی کہ موسم بہار اور خزاں کی شامیں مکمل تنہائی میں گذارنے کا عادی ہوتا جاتا تھا۔ میں شام کے کھانے تک کارندہ سے گپیں لڑا کے گھوڑے پر سوار ہو کر یہ دیکھنے کے لئے کہ مختلف کام کس طرح انجام دئے جا رہے ہیں گھوم کر یا نئی عمارتوں کی سیاحت کر کے کسی نہ کسی طرح وقت گذار دیتا تھا لیکن جونہی جھٹ پٹا سا ہونے لگتا تو یہ معلوم کر کے کہ اب کچھ کرنے کو نہیں ہے میں مجبور سا ہو جاتا تھا۔ چند کتابیں جو میز کی دراز اور گودام میں رکھی تھیں مجھے ازبر ہو گئی تھیں وہ تمام کہانیاں جو میرے گھر کی منتظمہ کیریلو ونا یاد کر سکتی تھی مجھے کئی کئی مرتبہ سنائی جا چکی تھیں۔ دیہاتی عورتوں کے گانوں سے میں افسردہ ہو جاتا تھا۔ میں نے خالص شراب کی روح پینی شروع کر دی اور اس سے میرے سر میں درد رہنے لگا۔ اور مجھے اعتراف کرنا پڑے گا۔ کہ میں افسردگی کی وجہ سے پکا شرابی بننے سے کچھ کچھ ڈرتا تھا — یعنی انتہائی قسم کا مستقل شرابی جس کی مثالیں میں نے اپنے ضلع میں کتنی ہی دیکھی تھیں سوائے ان دو تین شرابیوں کے جن کی گفتگو اکثر آہوں اور ہچکیوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ کوئی میرا قریبی ہمسایہ نہ تھا۔ میری تنہائی اس سے بھی کہیں زیادہ تھی

میرے مکان سے تقریباً ڈھائی میل کے فاصلہ پر ایک نواب کی بیوی ب ——— کی جائداد تھی لیکن وہاں صرف منتظم رہتا تھا کیونکہ نواب کی بیوی اپنی شادی کے پہلے سال میں اپنی جائداد کو صرف ایک مرتبہ دیکھنے کے لئے آئی تھی۔ اور تب بھی وہ وہاں ایک ماہ سے زیادہ مقیم نہ رہی تھی تاہم میری عزلت گزینی کے دوسرے سال میں ایک افواہ اڑی کہ نواب اور اس کی بیوی موسم گرما گذارنے کے لئے اپنے گاؤں میں تشریف لا رہے ہیں اور واقعی وہ اوائل جون میں آگئے۔

ان لوگوں کے لئے جو دیہاتوں میں رہتے ہیں دولتمند ہمسایہ کی آمد ایک نئے دور کا آغاز کرنے والی ہوتی ہے۔ زمینداران اور ان کے گھرانے کے لوگ تقریباً دو ماہ قبل اور تقریباً تین برس بعد تک اس پر بحث کرتے ہیں جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے اقرار کرنا چاہئے کہ ایک جوان اور خوبصورت ہمسایہ کی موجودگی نے مجھ پر زبردست اثر کیا میں اس کو دیکھنے کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہا تھا چنانچہ اس کی آمد کے بعد پہلے یک شنبہ کو میں ناشتہ کے بعد موضع ——— کو ان سے اپنا تعارف بحیثیت سب سے قریبی ہمسایہ اور فرمانبردار خادم کے کرانے کے لئے روانہ ہوگیا۔

ایک خدمتگار نے مجھے نواب کے خلوتخانہ میں بٹھا دیا۔ اور پھر میری اطلاع دینے کے لئے گیا کشادہ خلوتخانہ نہایت پر تکلف سامان سے آراستہ تھا۔ دیواروں کے برابر الماریاں لگی ہوئی تھیں جن میں سے ہر ایک پر کانسی کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ سنگ مرمر کے آتشدان پر ایک بہت بڑا آئینہ رکھا تھا۔ اور فرش پر سبز کپڑا بچھا ہوا تھا جس پر قالین پڑے تھے۔ اپنے چھوٹے سے غریب مکان پر تکلفات کا عادی نہ ہونے اور عرصہ دراز سے دوسروں کی دولت نہ دیکھنے کی وجہ سے مجھ پر خوف کا غلبہ طاری ہوگیا۔ اور نواب کا اسی گھبراہٹ سے انتظار کرنے لگا۔ جیسے علاقہ سے آنیوالا مدعی منصف کی آمد کا انتظار کرتا ہے۔

دروازہ کھلا اور تقریباً بتیس سال کا ایک بہت حسین آدمی اندر داخل ہوا۔ نواب میرے پاس بے تکلفانہ اور بہت تپاک انداز سے آیا۔ میں نے اپنی ہمت بندھانے کی کوشش کی اور اپنا تعارف کرانے لگا لیکن اس نے مجھ سے پیشقدمی کی۔ ہم بیٹھ گئے۔ اس کی خوشگوار اور بے تکلف گفتگو نے میری جھجک کو ختم کر دیا۔ میں اپنا سکون بحال ہی کر رہا تھا۔ کہ یکایک نواب کی بیوی داخل ہوئی۔ اور مجھ پر پہلے سے زیادہ گھبراہٹ مسلط ہوگئی۔ درحقیقت وہ حسن کا عمدہ نمونہ تھی نواب نے مجھے اس کے سامنے پیش کیا۔ میں اپنے کو بے تکلف ظاہر

کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے میں اطمینان کی وضع قطع بنانا چاہتا تھا مجھے زیادہ گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ مجھے بحال ہونے اور نئے ملاقاتیوں سے بے تکلف ہونے کے لئے وقت دینے کیواسطے مجھ سے ایک اچھے ہمسایہ اور بلا کسی نازبرداری کا سلوک کرتے ہوئے وہ ایک دوسرے سے گفتگو کرنے لگے۔

اسی دوران میں میں کمرے میں کتابیں اور تصویریں دیکھنے کیلئے ادھر ادھر گھومنے لگا۔ میں تصاویر کا نقاد نہیں ہوں لیکن ان میں سے ایک نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ یہ سوئٹزرلینڈ کا ایک نظارہ پیش کرتی تھی لیکن جس نے مجھے سب سے زیادہ متوجہ کیا وہ نقاشی نہیں تھی۔ بلکہ یہ واقعہ تھا کہ تصویر دو گولیوں سے چھید دی گئی تھی جو ایک دوسرے کے اوپر پڑی تھیں۔

"وہ اچھا نشانہ باز تھا" میں نے نواب کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں" اس نے جواب دیا "بحیثیت کل غیر معمولی نشانہ باز اور کیا تم اچھا نشانہ لگاتے ہو؟" اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا

"خاصی اچھی طرح" میں نے خوش ہو کر جواب دیا۔ گفتگو کا موضوع اب ایسا تھا کہ میرے لئے کافی دلنشین تھا۔ "میں تیس قدم کے فاصلے سے ایک دفعہ بھی بغیر چوکے ہوئے تاش کے پتے کی بندی اڑا سکتا ہوں ـــــ بے شک پستول کو استعمال کر کے جس سے میں زیادہ مانوس ہوں۔"

"فی الحقیقت؟" نواب کی بیوی نے نہایت متفکرانہ انداز سے کہا "اور تم میرے پیارے۔ کیا تم بیس قدم سے تاش پر نشانہ لگا سکتے ہو؟"

"کسی دن" نواب نے جواب دیا "ہم امتحان کریں گے میں اپنے زمانہ میں کوئی برا نشانہ باز نہیں تھا۔ لیکن مجھے پستول ہاتھ میں لئے چار سال کا عرصہ ہوا۔"

"اوہ" میں نے کہا "اس صورت میں میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ جناب عالی بیس قدم سے بھی تاش پر نشانہ نہیں لگا سکتے پستول چلانا روزانہ مشق چاہتا ہے۔ یہ میں تجربہ کی بنا پر جانتا ہوں میں اپنی رجمنٹ میں بہترین نشانہ بازوں میں گنا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ پورے ایک مہینہ میں نے پستول نہیں چھوا۔ کیونکہ میرا پستول مرمت کے لئے گیا تھا۔ اور آپ کیا خیال کرتے ہیں۔ جناب عالی؟ پہلی مرتبہ جو میں نشانہ لگانے لگا تو میں پچیس (۲۵) قدم سے لگاتار ایک بوتل پر نشانہ نہ مار سکا۔ ہمارے یہاں ایک کپتان تھا۔ جو زندہ دل اور مسخرہ تھا۔ وہ اسی وقت اتفاق سے ادھر آنکلا اور کہنے لگا بھائی میں بتاؤں گا کہ یہ کیا چیز ہے۔ تمہارا ہاتھ بوتل کے خلاف نہیں اٹھے گا۔ نہیں حضرت مشق کرنے کو کسرِ شان سمجھنا کام نہیں دیگا۔ ورنہ آپ اپنی مہارت ختم کر دیں گے۔ بہترین نشانہ باز جو میں نے اپنی عمر میں دیکھا وہ روزانہ نشانہ لگایا کرتا تھا ـــــ شام کا کھانا کھانے سے پہلے کم از کم تین مرتبہ۔ یہ اس کے لئے ایسا ہی ضروری تھا۔ جیسے شراب کا گلاس پینا۔"

نواب اور اس کی بیوی یہ دیکھ کر خوش ہوئے کہ گفتگو کرنے کے لئے میں نے ایک موضوع پا لیا ہے۔

"اور وہ نشانہ کیسے لگاتا تھا؟" نواب نے دریافت کیا

"میں آپ کو بتاؤں گا جناب! وہ دیوار پر مکھی کو اترتے ہوئے دیکھ لیتا تھا۔ بیگم آپ ہنس رہی ہیں؟ خدا کی قسم یہ حقیقت ہے ہاں وہ مکھی دیکھ لیتا ہے اور آواز دیتا ہے۔ کوزکا! پستول! کوزکا اس کو ایک بھرا ہوا پستول لا کر دیتا ہے۔ وہ فائر کرتا ہے اور مکھی کو دیوار پر کچل دیتا ہے!"

"یہ تعجب خیز ہے!" نواب نے کہا "اور اس کا کیا نام تھا؟"

"سل ویو۔ جناب عالی۔"

"سل ویو!" نواب نے اچھلتے ہوئے متعجبانہ کہا۔ "تم سل ویو کو جانتے تھے؟"

"میں اس کے جاننے پر مجبور تھا جناب؟ میں اس کا دوست تھا۔ وہ ہماری رجمنٹ میں ہمارا اپنا بھائی اور ساتھی مانا جاتا تھا لیکن مجھے اب اس کی کوئی خبر ملے ہوئے پانچ سال ہو گئے۔ تو میرا خیال ہے کہ جناب بھی اس کو جانتے ہوں گے؟"

"ہاں میں اس کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ کیا کبھی اس نے تم سے کسی عجیب حادثہ کے متعلق ذکر نہیں کیا؟"

"کیا جناب کا مطلب اس تھپڑ سے ہے جو کسی پاگل آدمی نے محفل رقص میں اس کے منہ پر مارا تھا؟"

"اور کیا اس نے اس پاگل آدمی کا نام تمہیں بتایا؟"

"نہیں جناب۔ اس نے یہ کبھی نہیں بتایا۔۔۔ آہ جناب" میں نے حقیقت تاڑتے ہوئے کہا "معاف کیجئے۔۔۔ مجھے معلوم نہیں۔۔۔ یقیناً وہ آپ نہیں تھے؟"

"ہاں وہ میں ہی تھا!" نواب نے غیر معمولی پریشان کن

انداز میں جواب دیا" اور اس تصویر میں گولیوں کے نشان ہماری آخری ملاقات کی یادگار ہیں۔ ۔ ۔ ۔"

"آہ! میرے پیارے" نواب کی بیوی نے کہا: "خدا کے واسطے اس حادثہ کا ذکر مت کرو۔ اس کو سننا میرے لئے باعث تکلیف ہو گا"

"نہیں" نواب نے جواب دیا "میں ہر چیز کا ذکر کروں گا۔ یہ جانتے ہیں کہ میں نے کس طرح ان کے دوست کی بے عزتی کی۔ ان کو بھی سن لینے دو کہ سل ویو نے کس طرح اپنا انتقام لیا۔"

نواب نے دستہ دار کرسی میرے قریب کھینچ لی۔ اور میں نے مندرجہ ذیل قصہ کو انتہائی دلچسپی سے سنا۔

"پانچ سال ہوئے کہ میری شادی ہوئی۔ پہلا مہینہ ——— ماہ عروسی ——— ہم نے اس گاؤں میں گزارا۔ میں اپنی عمر کے بہترین لمحات کیلئے اس مکان کا مرہون منت ہوں۔ اور انتہائی تکلیف دہ یادداشتوں میں سے چند کے لئے بھی۔

"ایک دن ہم دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر باہر گئے۔ میری بیوی کا گھوڑا قدرے بے قابو ہو گیا۔ وہ خوفزدہ ہو گئی۔ لگام مجھے تھما دی اور گھر کو پیدل چل دی۔ جبکہ میں سوار ہو کر اس سے آگے نکل آیا۔ دروازے کے باہر میں نے ایک سفری گاڑی دیکھی۔ انہوں نے مجھے اطلاع دی کہ میرے تخلیہ خانہ میں ایک شخص میرا انتظار کر رہا ہے جس نے یہ کہہ کر اپنا نام بتانے سے انکار کر دیا ہے کہ اسے مجھ ہی سے کام ہے۔ میں اس کمرے میں داخل ہوا اور میں نے تاریکی میں ایک آدمی دیکھا جو گرد میں اٹا ہوا تھا اور جس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ بالکل یہاں آتشدان کے پتھر کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ میں اس کی شکل پہچاننے کے لئے اس کی طرف گیا۔

"کیا مجھے نہیں پہچانتے نواب؟" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا

"سل ویو۔ میں پکار اٹھا اور مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ میں نے یکایک اپنے بال کھڑے ہوتے ہوئے محسوس کئے۔

"استحقاق کے مطابق۔ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا میری ایک گولی واجب ہے اور میں اپنے پستول کا فیر کرنے آیا ہوں کیا تم تیار ہو؟"

"اس کی بغل کی جیب میں سے پستول باہر کو ابھرا ہوا تھا۔ میں نے بارہ قدم ناپے اور اس سے جلدی کرنے اور اپنی بیوی کے آنے سے قبل فیر کرنے کی التجا کرتے ہوئے وہاں کونے میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیر کی ——— اس نے روشنی کے لئے کہا۔ ملازم شمع اندر لائے میں نے دروازہ بند کیا۔ ہر شخص کو اندر آنے کو منع کر دیا۔ اور اس سے فیر کرنے کی درخواست کی۔ اس نے اپنا پستول نکالا اور نشانہ لیا۔ ۔ میں نے سیکنڈ گنے۔ ۔ ۔ میں نے بیوی کا خیال کیا۔ ۔ ۔ اس طرح سے ایک خوفناک منٹ گذر گیا! سل ویو نے اپنا ہاتھ جھکا لیا۔

"مجھے افسوس ہے" اس نے کہا "کہ پستول چاتی کو سے کیوں سے بھرا ہوا نہیں ہے۔ ۔ ۔ گولی زیادہ ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں ڈوئیل نہیں لڑ رہے ہیں۔ بلکہ قتل کر رہے ہیں مجھے نہتے آدمی کی طرف نشانہ لینے کی عادت نہیں۔ ہم کو پھر سے طے کرنا چاہئے ——— کہ پہلے کون فیر کرے۔ ہم قرعہ اندازی کریں گے

"میرا سر چکرا رہا تھا۔ ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں رضامند نہیں ہوں گا۔ ۔ ۔ آخر کار ہم نے دوسرا پستول بھرا اور کاغذ کے دو ٹکڑے موڑے جن کو اس نے اسی ٹوپی میں رکھ دیا جو میری گولی سے پہلے چھد چکی تھی۔ ایک مرتبہ اور میں نے پہلا نمبر حاصل کیا۔

"نواب تمہاری شیطان کی سی قسمت ہے۔ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے کہا جسے میں کبھی نہیں بھولوں گا مجھے معلوم نہ تھا کہ مجھ پر کیا سحر ہو گیا تھا۔ اور اس نے مجھے ایسا کرنے پر کیوں کر مجبور کیا لیکن۔ ۔ ۔ میں نے فیر کیا اور گولی اس تصویر میں لگی۔"

نواب نے اپنی انگلی سے چھدی ہوئی تصویر کی طرف اشارہ کیا اس کا چہرہ آگ کی مانند سرخ تھا۔ اس کی بیوی کا رنگ اپنے رومال سے بھی زیادہ سفید ہو رہا تھا۔ میں چیخ کو نہ روک سکا۔

"میں نے فیر کیا" نواب نے آگے کو کہا "اور خدا کے شکر سے وہ خالی ہو گیا تب سل ویو ——— اس لمحہ وہ حقیقتاً نہایت خوفناک تھا ——— سل ویو میری طرف نشانہ لینے لگا ——— یکایک دروازہ کھلا اور ماشا دوڑتی ہوئی اندر آئی اور چیخ کر اپنا سر میری گردن پر رکھ دیا۔ اس کی موجودگی سے میری ہمت عود کر آئی "کیا تمہیں دکھتیں پیاری" میں نے اس سے کہا "کہ ہم مذاق کر رہے ہیں؟ تم پر کیا خوف طاری ہو گیا ہے۔ جاؤ اور پانی کا گلاس پیو۔ اور ہمارے پاس واپس آؤ میں تم سے ایک پرانے دوست اور ساتھی کا تعارف کراؤں گا۔

"ماشا میرا اعتبار نہ کر سکی۔ "مجھے بتاؤ کہ کیا میرا خاوند سچ بول رہا ہے؟" اس نے سخت دل سل ویو کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ حقیقت ہے کہ آپ دونوں تفریح کر رہے ہیں؟

"خاتون یہ ہمیشہ تفریح کرتے رہتے ہیں" سل ویو نے جواب دیا "ایک دن جب یہ مذاق کر رہے تھے۔ تو انہوں نے میرے منہ پر تھپڑ مارا مذاق کرتے ہوئے ہی انہوں نے میری اس ٹوپی میں سے گولی پار کر دی۔

خلق میں ہی یہ مجھے گولی سے مار دینے میں چوک گئے ہیں۔ اور اب دل لگی کرنے کی میری خواہش ہے۔

”چونکہ کروہ میری طرف نشانہ لینے ہی والا تھا ۔۔۔ اس کی بیوی گی میں! ماشا نے اپنے آپ کو اس کے قدموں میں گرا دیا۔

”و کھڑی ہو جاؤ۔ ماشا! لعنت ہے! میں غصہ میں چلایا۔ اور آپ جناب کیا آپ ایک غریب عورت سے تمسخر کرنے سے باز آئیں گے؟ کیا تم فیر کر رہے ہو یا نہیں؟“

”نہیں میں نہیں کر رہا ہوں سِل ویو نے جواب دیا۔ میں مطمئن ہوں میں نے تمہاری گھبراہٹ اور مصیبت دیکھ لی ہے جب میں نے تمہیں اپنے پر فیر کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔ اور میں مطمئن ہوں۔ میں تمہیں تمہارے ضمیر پر چھوڑتا ہوں۔“

”یہ کہہ کر وہ جانے والا تھا لیکن دروازے میں رکا۔ تصویر کو جو میری گولی سے چھد گئی تھی۔ بغور دیکھا۔ تقریباً بغیر نشانہ لئے اس پر فیر کیا اور غائب ہو گیا۔ میری بیوی بیہوش پڑی تھی ملازموں کو اس کے روکنے کی ہمت نہ ہوئی اور انہوں نے خوف سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سیڑھیوں پر گیا۔ اپنے گاڑیبان کو بلایا اور اس سے قبل کہ میں اپنے حواس درست کر سکوں وہ چلا گیا۔“

نواب نے بولنا بند کر دیا۔ اس طرح سے مجھے اس قصہ کا اختتام معلوم ہوا جس کی ابتدا نے مجھے کبھی اس قدر متاثر کیا تھا۔ اس کے ہیرو کو میں نے آئندہ کبھی نہ دیکھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ سکندر یسی لانٹی کی بغاوت کے زمانہ میں سِل ویو نے وحشیوں کے ایک دستہ کی کمان کی اور اسکولیانی کی لڑائی میں مارا گیا۔

کیفیات

کچھ دل کا تقاضا ہے کچھ اُن کا اشارہ ہے

از حضرت کوکب شاہجہانپوری

(۱)

جلتا ہوا آنسو ہے یا کوئی شرارہ ہے
یا آج سرِ مژگاں قسمت کا ستارہ ہے

اب کون اُٹھائے گا ناز اُن کی تمنّا کے
جس دل پہ بھروسہ تھا وہ آج دوپارہ ہے

یہ تشنگیٔ دل ہے بس رہنے بھی دے ہمدم
یہ درد وہ ہے جس کا درماں ہے نہ چارہ ہے

اب وہ بھی جو چاہیں تو تسکین کہاں ممکن
دریائے محبّت کا کیا کوئی کنارہ ہے؟

مٹنے کیلئے ہے دل جلنے کے لئے ہے جاں
کام آئیں اگر ان کے کیا اپنا خسارہ ہے

مجبورِ تمنّا ہوں، بے بس ہوں میں، بے خود ہوں
دنیا ہے مرے دل کی اور ان کا اجارہ ہے

دن رات تڑپنے کا یارا تو نہیں لیکن
کچھ دل کا تقاضا ہے کچھ ان کا اشارہ ہے

تکمیلِ تصوّر بھی امکان سے ہے باہر،
اے ذوقِ نظر اب کیا تدبیر نظارہ ہے

اس پردۂ حائل پر کیوں حرف نہیں آتا
ہر موجِ نظر شعلہ، ہر آہ شرارہ ہے

(۲)

نومیدی و حسرت کا چڑھتا ہوا دھارا ہے
ژولیدہ تمنا کیا! تنکے کا سہارا ہے

مژدہ کہ سرِ انجام افسانہ ہمارا ہے
لٹکا ہوا پلکوں میں اب صبح کا تارا ہے

ناکامِ تمنا نے محرومِ تسلّی نے
ہنسنے کا زمانہ بھی رو رو کے گزارا ہے

کیا واسطہ اس دل کو راحت سے مسرّت سے
جو درد رسیدہ ہے جو عشق کا مارا ہے

اندازِ توجہ ہو، یا نازِ تجاہل ہو،
مجروحِ محبت کا ہر زخم گوارا ہے

تھا رنگ تمنا کا ویسے بھی بہت چوکھا،
ناکامیٔ پیہم نے کچھ اور نکھارا ہے

کونین کے جھگڑے تھے اور اک دلِ سرگشتہ
قربانِ محبت کے کیا بوجھ اتارا ہے

آنسو آ گئے آنکھوں میں، دم آ گیا ہونٹوں پر
تم نے بھی سُنا دل نے کس طرح پکارا ہے

آسان ہے گھُٹ گھُٹ کر جینا غمِ فرقت میں
کچھ خوف ہے دُنیا کا، کچھ پاس تمھارا ہے

نازی دستور اساسی

سیاسیات

از شبلی، بی، کام!

برسرِ اقتدار ہو کر ہٹلر نے جو طرزِ حکومت اختیار کیا اُسے "ہم آمریت" یا کلیت کہہ سکتے ہیں۔ "آمریت" کا مطلب یہ ہے کہ حکمرانی کے تمام اختیارات ہٹلر کے ہاتھ میں ہیں اور وہ ملکی نظم و نسق چلانے یا جرمنی کی خارجہ پالیسی متعین کرنے میں عوام کے مشورہ کا پابند نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ روسیو کے خیالات سے متاثر ہو کر فرانس کی طرح جرمنی میں بھی جمہوریت پسندانہ خیالات پھیل چکے تھے اور جرمن شہنشاہ مجبور ہو گئے تھے کہ عوام کے مشورہ کے لئے ایک ریشتاغ (پارلیمنٹ) قائم کریں۔ لیکن واقعات شاہد ہیں کہ ضرورت کے وقت جرمن شہنشاہوں نے رائے عامہ کی کوئی پروا نہیں کی اور ان کا مطمح نظر ہمیشہ یہی رہا ہے کہ حکومت کی باگ ڈور بلکل ان کے ہاتھ میں آجائے چنانچہ قیصر ولیم نے پارلیمنٹ کے اختیارات کم کر کے اسے کمزور کر دیا تھا۔ اسی طرح ولیم اول کے زمانہ میں بسمارک عرصہ دراز تک رائے عامہ سے کھیلتا رہا۔ ہٹلر بھی اپنے طرزِ عمل سے بسمارک اور قیصر ولیم کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ خود نازی اپنے طرزِ حکومت کو کلیت پسند نہیں کہتے اس کے جواز میں وہ اپنے دستور اساسی کو پیش کرتے ہیں جس میں شہری حقوق، شخصی آزادی اور حق رائے دہی کے اصول تسلیم کئے گئے ہیں لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ جرمنی میں:-

(۱) شہری حقوق بہت محدود ہیں۔

(۲) رائے عامہ کے حصول کے لئے تشدد اور طاقت کا استعمال کیا جاتا ہے اس لئے عوام کی حقیقی رائے کا علم نہیں ہو سکتا۔

(۳) صدر کے اختیارات بہت وسیع ہیں اور وہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں سے نہ صرف اپنے مطالبات جبراً منوا سکتا ہے بلکہ ان کے فیصلوں کو اپنی مرضی کے مطابق مسترد بھی کر سکتا ہے۔

(۴) اہم مسائل (مثلاً جنگ وغیرہ) میں عوام کی رائے نہیں لی جاتی۔

(۵) نازی ازم تنقید اور مخالفت برداشت نہیں کر سکتا یہی وجہ ہے کہ نیشنل سوشلسٹ پارٹی کے علاوہ اب کوئی سیاسی جماعت نہیں ہے۔

ان سب باتوں سے ظاہر ہے کہ نازیوں کا دستور حکومت جمہوری نہیں بلکہ آمرانہ ہے۔

حکومت کے متعلق نازیوں کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تمام انفرادی مفاد کو ملکی مفاد پر قربان کر دینا چاہئے۔ دوسرے الفاظ میں نازی ازم کے ماتحت تمام اختیاراتِ حکومت کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور عوام کو اپنے جملہ افعال اور اعمال فرامینِ حکومت کے ماتحت رکھنے پڑتے ہیں۔

ہٹلر کو اکثریت کی حکومت یا جمہوری نظام کے خلاف جو اعتراضات ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ اکثریت نے کبھی انسان کی رہنمائی نہیں کی۔ دوسرے الفاظ میں ملک کی سیاسی اور معیشی ترقی بہت سے لوگوں کے غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ انفرادی ذہانت کا نتیجہ ہوتی ہے۔

۲۔ اکثریت "حقیقی آدمی" کا بدل نہیں ہو سکتی۔ جس طرح سو بیوقوفوں کا اجتماع ایک عقلمند آدمی کا بدل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح پارلیمنٹوں اور کونسلوں کے سینکڑوں بزدل ایک دلیر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

۳۔ اکثریت کی ہستی کا انحصار دولت اور جائداد پر ہوتا ہے اس لئے یہ ضروری نہیں کہ پارلیمنٹ یا کونسل کے ممبر لائق بھی ہوں۔

۴۔ تمام ممبر ہر معاملہ میں دلچسپی نہیں لے سکتے اس لئے ان کے سامنے ملک کے تمام مسائل رکھنا ہی فضول ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر ہٹلر کا خیال ہے کہ جمہوری نظام قائم کرنے کی بجائے ایک ایسا آدمی منتخب کر لینا چاہئے جو اپنے اچھے یا بُرے کاموں کا خود ہی ذمہ دار ہو اور کوئی اس کے طریق کار میں مداخلت نہ کرے ایسے طرزِ حکومت میں اس کا خیال ہے کہ کوئی ناقابل یا نالائق شخص پس پردہ حکومت نہیں کر سکتا بلکہ جو شخص ذمہ داری اپنے کاندھے پر اُٹھائے گا۔ وہ قدرتی طور پر بیوقوفوں کی باتیں ماننے سے انکار کر دیگا۔ اور ان کا ساتھ چھوڑ دیگا۔

الغرض نازی ازم کا مدعا یہ ہے کہ مشاورت کے خلاف ایک زبردست جنگ آزمائی کی جائے اور کسی فرد واحد کو حکومت کے تمام اختیارات سونپ دیئے جائیں۔ ہٹلر نے اپنی کتاب "میری جد و جہد" میں بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ ہمیں "شخصیت" کو مضبوط کرنا چاہئے اور اسی کی تعظیم و تکریم دنیا میں قائم کرنا چاہئے۔ اس کے بغیر ہٹلر کے خیال میں ملک و ملت کی ترقی محال ہے چنانچہ ایک دفعہ ہٹلر نے اپنی قوم کو جمع کیا اور ان سے یوں مخاطب ہوا۔

"مسلمانو! اگر تم عزت اور بڑائی کے خواہاں ہو تو آؤ میں تمہیں ترقی کا ایک راز بتاؤں:"

سب لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے تو ہٹلر نے ترقی کا راز صرف تین الفاظ میں یہ بتایا کہ "ہٹلر — ہٹلر — ہٹلر" جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر کوئی قوم ترقی کرنا چاہتی ہے تو اسے ہٹلر کی شخصیت کو مضبوط کرنا چاہیے۔

الغرض جرمنی میں رائے عامہ جبراً حاصل کی جاتی ہے۔ شہری حقوق بہت کم ہیں۔ اکثریت کی بجائے صرف ایک شخص کی حکومت ہے۔ اہم معاملات میں عوام کی رائے نہیں لی جاتی۔ افراد پر کئی قسم کی پابندیاں ہیں اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نازیوں کا طرز حکومت جمہوری نہیں بلکہ آمرانہ ہے۔

نازی حکومت سے پہلے برطانیہ اور فرانس اگرچہ اپنے اپنے نظام حکومت کو جمہوری سانچے میں ڈھال چکے تھے لیکن جرمنی میں انیسویں صدی تک جمہوریت کا نفاذ نہ ہوا آخر نپولین کے حملوں نے ریاستوں کی شخصی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور پہلے آسٹریا اور بعد ازاں پروشیا کی قیادت میں فیڈریشن کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۸۷۱ء میں قرار پایا کہ جرمن کانفڈریشن کو جرمن ایمپائر کی صورت دے دی جائے۔ چنانچہ پروشیا کا بادشاہ جرمنی کا شہنشاہ بن گیا جس نے آہستہ آہستہ اپنے اختیارات بہت بڑھا لئے۔ ملک میں ۲۵ ریاستیں تھیں۔ پہلے ہر ریاست اپنی جگہ آزاد، خودمختار اور مطلق العنان تھی۔ اور اپنا الگ نظام حکومت رکھتی تھی فیڈریشن کے بعد ان کی خودمختاری اور شہنشاہی کے بعد ان کی مطلق العنانی بھی جاتی رہی۔ ۱۸۷۱ء کے دستور کے مطابق مرکزی اور ریاستی نظام کا علیحدہ علیحدہ دائرہ حکومت مقرر کیا گیا ہے لیکن قیصر ولیم نے آگر اپنے اختیارات بہت بڑھا لئے اور آہستہ آہستہ ریاستی نظام کی طاقت کمزور ہو گئی ۱۸۷۱ء میں چانسلر کا عہدہ قائم کیا گیا جو اپنے افعال و اعمال کا جوابدہ کابینہ یا عوام کے بجائے بادشاہ کے سامنے تھا۔ اس کے ساتھ ہی فیڈرل کونسل بنائی گئی۔ جو دراصل جرمنی کی شاہی حکومت کا حکمران انتظامی ادارہ تھی۔ اس کے ممبر ریاستوں اور آزاد شہروں کے ڈیلیگیٹ ہوتے تھے۔ فیڈرل کونسل کے علاوہ ایک "ریشتاغ" بنائی گئی، جس کے ممبروں کا انتخاب عوام کی بلاواسطہ رائے دہی سے پانچ برس کے بعد ہوتا تھا۔ ریشتاغ کے اختیارات بہت محدود تھے اور حکمرانی کے اختیارات زیادہ تر فیڈرل کونسل ہی کو حاصل تھے۔ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد ضروری ہو گیا کہ ذمہ دار حکومت قائم کی جائے۔ چنانچہ قیصر جرمنی "ریشتاغ" کی برتری کو قبول کرنے پر مجبور ہوا اور ۱۹۱۹ء میں تمام اختیارات "ریشتاغ" کو سونپ دیئے گئے۔ نازی دستور اساسی کی بنا اسی تاریخی فیصلہ پر ہے۔

نازی دستور اساسی کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ کم سے کم تحریراً عوام کے بنیادی حقوق کو (خواہ وہ کتنے ہی محدود ہیں) تسلیم کر لیا گیا ہے۔ دستور کا

رو سے تمام جرمن بالغ سے یکساں ہیں اور بنیادی طور پر کسی کو خاص مراعات حاصل نہیں ہیں۔ تحریری و تقریری آزادی سب کو دی گئی ہے ایسی جماعتیں جو قومیت کے منافی نہ ہوں اور امن عامہ میں رخنہ نہ ڈالیں ملک میں قائم کی جا سکتی ہیں مذہبی جماعتیں قائم کرنے کی اجازت ہے گو حکومت ان کی مدد نہیں کرتی۔ مخصوص حالات میں ہر شخص کے لئے فوجی خدمت لازمی ہے۔

تعلیم پر کوئی پابندی نہیں۔ کثیر الاولاد خاندانوں کی امداد حکومت کرے گی قانونی حدود کے اندر رہ کر ہر شخص کو معاشی آزادی حاصل ہے۔ معاہدات اور ذاتی ملکیت پر کوئی پابندی نہیں تقسیم اراضی اور زمین کا استعمال حکومت کی زیر نگرانی ہوتا ہے۔ مگر اراضی پر ذاتی ملکیت کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ تمام قدرتی وسائل حیات (مثلاً پانی) حکومت کے ماتحت ہیں۔ مزدوروں کے حقوق کا تحفظ حکومت کرتی ہے۔

نازی دستور میں ریاستیں خود مختار نہیں بلکہ وہ دولت آمریہ جرمنی کی قیادت قبول کرنے پر مجبور ہیں۔ ہر ریاست کے لئے جمہوری نظام قائم کرنا ضروری ہے۔ خارجی معاملات، نوآبادیوں، سکہ سازی، ڈاک، محاصل، دیوانی اور فوجداری قانون، صحت عامہ، امداد غربا، کان کنی اور ریلوے وغیرہ پر مرکزی حکومت کو پورا پورا اختیار ہے۔ ہر وہ ریاست جس کی آبادی ایک کروڑ ہے اپنا ایک نمائندہ "قومی کونسل" میں بھیج سکتی ہے۔

نیشنل اسمبلی کا صدر آمریہ جرمنی کا صدر سمجھا جاتا ہے جو عوام کی رائے سے سات سال کے لئے منتخب ہوتا ہے۔ وہ ۲/۳ ممبروں کی اکثریت سے معطل ہو سکتا ہے۔ وہ تمام سول اور ملٹری عہدہ داروں کے تقرر اور انہیں برخاست کرنے کا مجاز ہے۔

۳۰ جولائی ۱۹۳۳ء سے ہٹلر جرمنی کا آمر ہے۔

غالبؒ

رباعیات

از جناب عطا کلیانوی

(۱)

غالب کا اچھوتا ہے بہت رنگ سخن — نام اُس کا ہے دنیائے ادب میں روشن
گلشن میں کوئی خار نہیں ہے اُس کے — واللہ گل و غنچہ ہیں دامن دامن

(۲)

غالب نے لٹائے ہیں سخن کے گوہر — بھر بھر کے پلائے ہیں ادب کے ساغر
ہمپایہ نہیں شعر میں کوئی اس کا — اللہ کا اسد اور ہے غالب سب پر

(۳)

گُل علم کے گلشن میں کھلائے ہیں نئے — بخشے رُخِ معنی کو ہزاروں جلوے
ایجاد کی وہ طرز نئی غالبؒ نے — اردو ہوئی "اردوئے معلیٰ" جس سے

شکایاتِ دوستانہ

رُباعیات!

از سیّد محمد عسکری طباطبائی۔ بی اے

دوستی ترک کروگے، مجھے معلوم نہ تھا
چاہ کا نام نہ لوگے، مجھے معلوم نہ تھا
غیر کے ہوکے رہوگے، مجھے معلوم نہ تھا
مجھ سے بچ بچ کے چلوگے، مجھے معلوم نہ تھا

یادِ ایام کہ تم تھے مرے دل کے بس میں
تم سے تازہ تھیں محبّت کی قدیمی رسمیں
یا وفا نام پہ کھاتی تھی تمہاری قسمیں
یا جفا بھی نہ کروگے، مجھے معلوم نہ تھا

رسم و رہ چھوڑے ہوئے رنگِ پریدہ کیطرح
دل سے منہ موڑے ہوئے اشکِ چکیدہ کیطرح
رشتے سب توڑے ہوئے صیدِ رمیدہ کیطرح
دور ہی دور پھروگے، مجھے معلوم نہ تھا

حدِ اقلیمِ محبت سے۔ نکل جاؤگے
ذکر آئے گا کہیں میرا تو ٹل جاؤگے
رنگ بدلے گا زمانہ، تو بدل جاؤگے
وقت کے ساتھ چلوگے، مجھے معلوم نہ تھا

دل مجھے کوچۂ و بازار میں لایا بھی اگر
چرخِ بدخواہ۔ رہِ راست پہ آیا بھی اگر
کبھی قسمت نے سرِ راہ ملایا بھی اگر
اجنبی بن کے ملوگے، مجھے معلوم نہ تھا

چاہ سی چاہ تھی جسدن سے سنبھالا تھا ہوش
باہمی لطف و مروّت میں برابر کا تھا جوش
گامزن راہِ محبت تھے۔ ہم دوش بدوش
تا بہ منزل نہ چلوگے، مجھے معلوم نہ تھا

چھائی رہتی تھی دلِ زار پہ صورت پیاری ‌‌‌‌ ‌ سانس کوئی نہ تھی ایسی کہ ہو تم سے عاری
خون کی طرح رگ و پے میں تھے جاری ساری ‌ رنگِ رُخ بن کے اُڑ گئے، مجھے معلوم نہ تھا

عشقِ شوریدہ عدم سے مجھے یاں لایا تھا ‌ پہلے ہی دولتِ کونین لٹا آیا تھا
ہو کے بیگانہ دو عالم سے تمہیں پایا تھا ‌ تم بھی اپنے نہ رہو گے۔ مجھے معلوم نہ تھا

چھا گئی ہے مری ہستی پہ بلائے فرقت ‌ اشکِ خوں سے مرے رنگیں ہے فضائے فرقت
خوب راس آئی تمہیں آب و ہوائے فرقت ‌ چھُٹ کے یوں شاد پھرو گے، مجھے معلوم نہ تھا

زندگی بھر کے مزے عشق میں ناحق کھوئے ‌ تخمِ اُمّیدِ عبث کشتِ عمل میں بوئے
میرا افسانۂ غم سن کے عدو بھی روئے ‌ تم سنو گے تو ہنسو گے، مجھے معلوم نہ تھا

زندگی عیش در آغوش تھی تم سے مل کے ‌ اک تمہیں باعثِ رونق تھے مری محفل کے
تم گلِ تازہ شگفتہ تھے، چمن میں دل کے ‌ خار بن بن کے چبھو گے مجھے معلوم نہ تھا

درد سے دل کے بہلنے کا سہارا پایا ‌ روئے نامِ وفا لے کے جو دل گھبرا لیا
تم سے بچھڑے تو نہ یاں لب پہ تبسم آیا ‌ تم جُدا ہو کے ہنسو گے، مجھے معلوم نہ تھا

ملنے جُلنے کی کچھ اس طرح پڑی تھی عادت ‌ چین دم بھر کو نہ آتا تھا جو ہوئی فرقت
آخری بار ہوئے کون گھڑی سے رخصت
اب کے بچھڑے نہ ملو گے۔ مجھے معلوم نہ تھا

راگ کا بادشاہ

نائک بیجو باورا کی سحر آفرینیاں

از جناب امجد علی خاں یوسف زئی عثمانیہ

بیجو سورت کے قریب دجوار میں پیدا ہوا۔ اور وہیں پرورش پائی۔ اس وقت گجرات میں سلطان عمر بہادر حکومت کرتا تھا۔ اور مغلوں کی شوکت وسطوت کا سکہ تمام ہندوستان میں بیٹھا ہوا تھا۔ تخت دلی پر ہمایوں متمکن تھا۔ بیجو کا لقب "باورا" تھا۔ اور اکثر لوگ اس کو اسی نام سے پکارتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ گاتا تو اس میں اس قدر محو ہو جاتا کہ گرد وپیش کے مناظر بھی اس کی محویت کو شکست نہ دے سکتے تھے بیجو عوام کا گویا تھا۔ اور ان کے سوز وگداز اور خوشی کا احساس رکھتا تھا

سلطان عمر بہادر موسیقی کا بڑا سرپرست تھا۔ اور اس کے دربار میں نامی گرامی گویے تھے۔ بیجو بھی درباری گویے کی آسامی پر ملازم ہو گیا اس وقت ہمایوں اپنی سلطنت کی وسعت کے لئے خونریز لڑائیوں میں مصروف تھا۔ گجرات بھی اس کے ہاتھوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اور اس نے گجرات پر حملہ کر دیا ظفر بن منظفر "تحفۃ الہند" میں رقمطراز ہے کہ جب میدان جنگ میں ہمایوں نے سبز لباس پہنا۔ تو لوگوں پر ایک وحشت طاری ہو گئی۔ کیونکہ قدیمی روایات کے مطابق یہ قتل عام کی نشانی تھی۔ تھوڑی دیر میں تمام مغل سپاہی موت کا رقص کرنے لگے۔ اور چند ہی گھنٹوں میں ہزاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

اس خطرناک وقت میں بیجو بے یار ومددگار شہر کی گلیوں میں پناہ لینے کے لئے بھاگ رہا تھا اور اسے اب زندگی کی کوئی امید باقی نہیں تھی۔ کہ راستے میں ایک خون کا پیاسا مغل سپاہی آیا اور اسے پکڑ لینے قریب تھا کہ وہ اسے قتل کر ڈالتا لیکن بیجو نے کہا "میرا سر کاٹ لینے سے کیا فائدہ ہوگا۔ بہتر تو یہ ہے کہ تم میرے سر کے وزن کے برابر سونا لے لو اور مجھے چھوڑ دو"۔ مغل سپاہی کی آنکھیں دولت سے چندھیا گئیں اور اس نے اس گرانبہا سودے کو قبول کر لیا اور کہا کہ میں اس وقت تک تجھے رہا نہیں کروں گا جب تک کہ تو سونا نہ دے اس کے بعد اس کے گھر روانہ ہوا تاکہ سونا لے۔

ہمایوں کی فوج میں ایک ہندو راجہ اعلیٰ خدمت پر مامور تھا اس نے جب بیجو کی یہ گت بنتی دیکھی تو فوراً حکم دیا کہ اسے رہا کر دیا جائے۔ اور اس کو اپنے ہمراہ ہمایوں کے دربار میں لے جانے لگا مغل سپاہی فوراً دربار میں حاضر ہوا اور فریاد کی کہ راجہ نے میرے مخلص کو رہا کر دیا ہے۔ جو گردن زدنی ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ سلطان عمر بہادر کے خیر خواہوں میں سے ہے اور اس کا ہم مذہب بھی ہے۔ ہمایوں اپنے غصہ کو ضبط نہ کر سکا۔ شہنشاہ کو غصہ میں دیکھ کر دربار میں سناٹا چھا گیا سپاہیوں کو حکم دیا۔ کہ فوراً دونوں کو دربار میں حاضر کریں۔ راجہ حاضر دربار ہوا اور کہنے لگا کہ خداوندا میں نے اس کو اس وجہ سے نہیں رہا کیا ہے کہ وہ ہندو ہے۔ بلکہ یہ ہندوستان کا ایک مایہ ناز گویا بیجو باورا ہے اور کس طرح ایک فن کا ایسا استاد جو ہندوستان میں اپنا ثانی نہ رکھتا ہو کس طرح قتل کیا جا سکتا ہے"

شہنشاہ کچھ دیر خاموش رہا اور کہا کہ مجھے کس طرح معلوم ہو کہ تمہارا بیان صحیح ہے"

راجہ صاحب نے جواب دیا۔ کہ خداوند کو ابھی معلوم ہو جائے گا اور بیجو سے کہا کہ وہ شہنشاہ کی تعریف میں ایک پیر گائے۔

بیجو کو ایک ایسے شخص کی تعریف میں گانے پر مجبور کیا گیا جس نے اس کے پیارے وطن کی کایا پلٹ دی تھی۔ عوام کو قتل کیا تھا کئی عورتوں کو بیوہ اور ہزارہا بچوں کو یتیم واسیر کر دیا تھا۔ بیجو گایا لیکن شہنشاہ کی تعریف میں نہیں۔ اس کا دل جذبات سے پُر تھا۔ اور وہ برانگیختہ ہو کر گائے چلے آ رہے تھے۔ اس کے گانے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گویا دنیا کے تمام مصائب اسی پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ اس نے ہندوستانی راگ نہیں بلکہ ایک فارسی نغمہ چھیڑا جو یہ تھا

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی

مگر تو زندہ کنی عالمی و باز کشی

اس زمانہ کے مورخین جنہوں نے اس واقعہ کو دیکھا ہے۔ بیان کرتے ہیں۔ کہ اس نغمہ نے عجیب وغریب اثر کیا تمام مغل بیجو کو دیکھ رہے تھے اور سب پر سکوت کا عالم طاری تھا۔

ہمایوں اپنی جگہ خاموش بیٹھا تھا گویا وہ سکتے کے عالم میں تھا۔

اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ آہستہ آہستہ تخت سے اترا۔ اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بیجو برابر گاتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک دریا جاری تھا۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ دریا رخساروں پر سے کبھی نہ تھمے گا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمایوں آیا۔ قتل عام کی ممانعت کی۔ اور بیجو کو شہزادہ کا لباس پہنایا۔ ایک سفید گھوڑے پر سوار کر کے کہنے لگا کہ میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم جسے چاہو قتل کر ڈالو اور جسے چاہو رہا کر دو۔

بیجو نے سب سے پہلے اپنے آقا سلطان عمر اور اس کے اقربا کو رہا کرایا۔ رنج و غم نے خوشی کو جگہ دی اور لڑائی امن سے بدل گئی۔ خوشیوں کے شادیانے بجنے لگے۔ یہ سب بیجو کے صرف ایک نغمے کا اثر تھا۔

بیجو اپنے زمانہ کا بے بدل استاد تھا۔ اس کے متعلق بہت سی روایات مشہور ہیں مثلاً یہ کہ بیجو کی آواز سے پتھر میں اتنی نرمی پیدا ہو جاتی تھی کہ وہ اس میں اپنا منجیرہ پیوست کر دیتا تھا۔ اور پھر اسی ترکیب سے اس کی لڑکی منجیرے نکال لاتی تھی۔ یا اس کے گانے پر جنگلی اور وحشی جانور جمع ہو جاتے تھے۔

موسیقی میں بیجو کو اس قدر مہارت حاصل تھی کہ تان سین کی اس کے آگے کوئی حقیقت نہیں تھی۔ اکبر کو اس بات کا بڑا فخر تھا۔ کہ تان سین سے بڑھ کر ہندوستان میں کوئی گویا نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن ایک درباری امیر نے جمنا کے کنارے بہت سویرے بیجو باورا کو بھیرویں راگ گاتے سنا اور اس کی کیفیت سے بے ہوش ہو گیا۔ اکبر نے اس واقعہ کی اطلاع پا کر تلاش کا حکم دیا۔ تلاش کرنیوالے سپاہیوں کے ایک دستہ نے تیسرے روز شام کے وقت ایک جنگل میں دور سے گانے کی آواز سنی قریب گئے۔ اور دیکھا کہ ایک بڑھا سادھو ایک درخت کی شاخ پکڑے کھڑا ہے۔ آنکھیں آسمان سے لگی ہیں اور مستی و بیخودی کے عالم میں ایک بھجن گا رہا ہے۔ اور جنگل کے ہرن کچھ اس کے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں۔ اور کچھ ارد گرد کھڑے ہیں۔

کہتے ہیں کہ جب تان سین اور بیجو باورا کا مقابلہ ہوا تو تان سین نے سارنگ راگ گایا۔ مگر ایک ہرن اس چمن میں آ گیا۔ تان سین نے موتیوں کا وہ ہار جو شہنشاہ نے اسے راگ کا استاد تسلیم ہونے پر دیا تھا اپنے گلے سے اتار کر ہرن کی گردن میں ڈال دیا اور راگ بند کر دیا۔ اور ہرن ہار سمیت جنگل کی طرف بھاگ گیا۔ بیجو نے فوراً سارنگ راگ گانا شروع کیا۔ اور ہرن واپس آ گیا۔ بلکہ کئی ایک ہرن اور بھی مست ہو کر مجلس میں گھس آئے۔ بیجو نے ہار ہرن کے گلے سے اتار کر تان سین کے گلے میں ڈال دیا۔

اپنی باری پر بیجو نے مالکوس میں ایک ترانہ گایا اور اپنے سر کی کنگھی بالوں سے نکال کر طبلہ والوں کے پتھر میں جو پگھل کر نرم ہو گیا تھا ٹھونک دی تمام اہل دربار بے خودی کے عالم میں تھے۔ اور کسی کو اس واقعہ کا ہوش نہ تھا جب گانا بند ہوا تو بیجو نے مجلس میں وہ پتھر پیش کیا اور خواہش ظاہر کی کہ جسے گانے کا دعویٰ ہو میری کنگھی پتھر سے نکال دے لیکن تان سین کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہ پتھر کو نرم نہیں کر سکتا۔ اس پر بیجو باورا نے پھر سے وہی چیز گا کر کنگھی نکال لی اس کے بعد اس نے ایک ایسا راگ گایا کہ تمام حاضرین دربار بے خود ہو گئے یکایک بیجو راگ بند کر کے کسی طرف نکل گیا اور پھر کبھی نظر نہ آیا

غزل

از جناب مخمور جالندھری

محوِ جمالِ دوست بھی کیا بے خبر ہے آج — اپنے قدمِ شوق پہ اپنا ہی سر ہے آج
کیوں کھول دوں ارض و سما کی حقیقتیں — میری نگاہ شہپرِ جبریل پر ہے آج
اب بھی مرا نیاز نہیں کیا امینِ ناز؟ — جو پاؤں پر تھا دل پہ تیرے وہ سر ہے آج
پروا نہیں جو ہوش نہیں مجھ کو عشق میں — کیا کم ہے یہ خوشی مجھے تیری خبر ہے آج
پھر کیوں نہ ہر قدم پہ ہوں منزل سے ہمکنار — منزل خیال بن کے مری ہمسفر ہے آج

حالِ زبوں دوا و دعا سے گذر گیا
مخمور تیرا درد ترا چارہ گر ہے آج

اگر وہ آجائیں!

بنگالی افسانہ کا ترجمہ

از جناب محمد یونس احمر کلکتہ

۔۔۔ ۱ ۔۔۔

درخت کی ہری بھری پتیاں جھڑتی جا رہی تھیں۔ بہار کا موسم آخری سانس لے کر وداع ہو رہا تھا۔ تاریک آسمان کے ایک گوشہ سے بادل کا ٹکڑا چھپ کر دیکھ رہا تھا ـــ کل شام کو ایک طوفان سا اُٹھا تھا۔ شاید آج بھی ویسا ہی طوفان اٹھیگا؟ کچھ بھی ہو اس سے کیا؟

دامودر ندی کا پانی بالکل خشک ہو گیا تھا۔ بہت دور تک ریت کے چمکیلے ذرّے سونے کے دانے کی طرح چمک رہے تھے ـــ اس سے کچھ پرے پانی کی ایک پتلی دھار ریت کے ذرّوں سے مس ہوتی ہوئی دوشیزہ کی ساری کی کشادہ ڈوری کی طرح چمکتی ہوئی ـــ دنیا کے شور و شر میں گم ہوتی جا رہی تھی

لیکن موسم برسات میں اسی دامودر ندی کی شکل کتنی بھیانک ہو جاتی ہے اس وقت ہماری آنکھیں اسے دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتی ہیں ـــ ندی بہت کشادہ اور عمیق ہے۔ جب موجیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوشیزہ کی چوڑی کی جھنکار پیدا ہو رہی ہے۔ اس کے دل کی بانسری سے کتنا حسین اور دلکش راگ نکلتا ہے۔

جب شام کی تاریکیاں دامن مشرق سے تیز قدموں آتی ہیں اُس وقت اطراف و اکناف کے مکان کی بہو بیٹیاں نازک اور پتلی کمر پر کلسی رکھے ندی میں پانی بھرنے جاتی ہیں۔ پانی بھرتے وقت ان کے گورے اور پتلے ہونٹوں سے کتنے دلفریب گیت تھرتھرا کر نکلتے ہیں۔ لیکن ـــ چند دنوں کے بعد وہی ندی کا کنارہ سوکھ کر کیسا بُرا معلوم ہوتا ہے۔

کاش! ندی کی جوانی ہمیشہ یکساں رہتی ـــ!

۔۔۔ ۲ ۔۔۔

تقریباً آٹھ سال سے میں یہاں نظر بندی کے آلام و مصائب سے بھری زندگی گزار رہا ہوں ـــ حکومت نے مجھے نظر بند کر دیا۔ قید ہونے سے قبل میرے جسم کے ہر تار رگ میں گرم خون کی دھارا بہتی تھی ـــ اور آج بھی وہی دھارا لگا ہے گا ہے میری مقید زندگی میں ایک درد ٹیس بن کر اٹھتی ہے ـــ لیکن آہ اب وہ پہلی سی قوت کہاں؟ آج نہ جانے کس کی یادیں دل کے اندر ٹیس سی اُٹھ رہی ہے جس سے طوفان بپا ہو جاتا ہے،

میرے جسم کا گرم خون سرد ہو گیا آنکھوں کی سرخ چنگاریاں سفید برف بن گئیں اور قوت و طاقت میں کمزوری آگئی اول اول میری بہت نگرانی ہوتی تھی ـــ اور اب تو تنہا ایک کمرہ کے اندر زندگی کی مسافت طے کر رہا ہوں۔ قید کی ناقابل برداشت مصیبتیں میری زندگی کا خون پی رہی ہیں ـــ

دامودر ندی کے بغل میں ایک ٹین کا چھوٹا سا مکان ہے، اس سے کچھ دور ایک تھانہ ہے اور اسی تھانہ کے اندر میں قید کی سختیں جھیل رہا ہوں۔ رات کے وقت باہر کے برآمدہ میں ایک بوڑھا کانسٹبل سوتا ہے۔ اگر چاہوں تو بآسانی فرار ہو سکتا ہوں لیکن یہ سوچ کر قدم رک جاتے ہیں کہ اس کی زندگی کا سہارا ٹوٹ جائیگا۔

کتنے دنوں سے میں یہاں ہوں شاید آٹھ سال کا طویل عرصہ ہو گیا لیکن اس آٹھ سال کے لمبے عرصے میں بھی ماں کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں مجھے یاد آرہی ہیں ـــ وہ وقت کتنا حسرت زا تھا جب ماں مجھے ٹوٹے ہوئے دل اور اشک ریز آنکھوں سے رخصت کر رہی تھیں، اگرچہ میں موت کے دروازے کی طرف لپکتے ہوئے جا رہا تھا ـــ تاہم ایک چیز مجھے رہ رہ کر یاد آرہی تھی ـــ اور وہ تھیں میری پیاری ماں کی پرنم آنکھیں ـــ جن میں میری جوانی کی تمنائیں اور حسرتیں رقص کر رہی تھیں۔ مگر آہ! ان کی ساری تمنائیں میں نے خاک میں ملا دیں نہ جانے کس منحوس ساعت میں میری پیدائش ہوئی تھی۔ کاش اس وقت کوئی مجھے گلا دبا کر مار ڈالتا۔

جب میں تنہا ہوتا ہوں اور ہر طرف سکوت و خاموشی کا عالم ہوتا ہے اس وقت بھی ماں کی ممتا کی ڈوری میرے دل کو باندھ دیتی ہے، آج بھی ـــ آسمان کی طرف دیکھ کر میں اُن آنکھوں کے بارے میں کچھ سوچ رہا تھا کہ یکایک اسی وقت ایک پُرانا پوسٹ کارڈ ہوا سے اڑ کر میرے پاؤں میں آگرا۔

اسی خیال میں مستغرق، میں نے کاغذ کو زمین سے اٹھا لیا۔ دھیمی روشنی میں میری کمزور آنکھوں نے کئی ٹیڑھے حروف دیکھے۔ شاید کسی [illegible]

تحریر کی تحریر میں لکھا تھا ——!

"پیارے! تم لوٹ آؤ، میری آنکھیں تمہارے لئے ہر وقت برستی رہتی ہیں۔ دل کے اندر درد و کرب کی چنگیاں بیکل بنا رہی ہیں —— رات کی تمام گھڑیاں آنکھوں ہی آنکھوں میں گزار دیتی ہوں —— لیکن کیا مجھے بھی تم یاد کرتے ہو؟ پیارے محبوب! بھول نہ جانا —— تم لوٹ آؤ ——"

تمہاری کنیز شیلا

ٹوٹے ٹوٹے حروف کو میں نے بمشکل پڑھا۔ شاید کسی برہ کی ماری دوشیزہ نے اپنے پتی کو یہ خط لکھا تھا۔ شام کی تاریکی میں دو بڑی بڑی پرنم آنکھیں میرے سامنے ناچ اٹھیں اور دور سے ایک سریلی آواز میرے کان میں آکر تیرنے لگی: "لوٹ آؤ —— پیارے لوٹ آؤ ——"

اپنے پتی کو یہ خط لکھ کر شاید آج بھی وہ ندی کے کنارے کھڑی ہو کر انتظار کر رہی ہوگی اور خوفناک رات کو جب نیند ٹوٹ جاتی ہوگی اس وقت شاید کان کھڑا کئے اپنے شوہر کے پیر کی آواز سننے کے لئے دروازہ کھول کر آنگن میں آجاتی ہوگی۔ وہ گھر کی بہو ہے —— اُسے منہ کھول کر کچھ کہنے کا حق نہیں —— دل کے آنسو دل کے اندر ہی ساری حسرتوں اور تمناؤں کو سمیٹ کر سوکھ جاتے ہونگے ——!

—— ۳ ——

اس کی عمر بہت کم تھی —— شاید بارہ سے گزر کر اس نے تیرہ میں قدم رکھا تھا جب گھر اور بر اچھا ہو تو بہو کی زندگی مزے سے کٹ جاتی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہار رو نے رتن کو خوب پسند کیا تھا۔ رتن کی عمر اٹھارہ یا بیس کے لگ بھگ ہوگی۔ گٹھیلے جسم کا ایک خوشرو نوجوان تھا۔ سر پر سیاہ گھونگھر والے بال تھے۔ جائداد بھی کافی تھی۔ اس دنیا میں وہ صرف دو بھائی تھے —— پران اور رتن ——!

دو سال ہوئے پران کی شریک حیات بیما کا انتقال ہو چکا تھا اب وہ دونوں تنہا رہتے تھے۔ گھر کے اندر ایک بہو کی سخت ضرورت ہوتی ہے پران زمینداری کے شعبے میں کوئی کام کرتا اور رتن بالکل بیکار تھا۔

وہ صرف رات دن بانسری لیکر ندی کنارے گھومتا رہتا اور بانسری کی درد بھری آواز سے ساکت فضا کو معمور کر دیتا —— پھر اس نے اپنی جماعت کو لیکر ایک تھیٹریکل کمپنی قائم کی اس کا ارادہ تھا کہ پوجا کی تعطیل میں "ہلات" نامی ایک ناٹک کھیلے گا اور خاص کام اسی کا ہوگا۔

—— ۴ ——

شیلا کی دیدی سرلا دو برس ہوئے ودھوا ہو گئی اور اپنے باپ کے

پاس رہنے لگی۔ ایک دن سرلا نے تیلا سے کہا۔ "کیا شیلا کی شادی اتنی جلدی کر دو گے پتا جی۔ ابھی تو اس کی عمر بہت کم ہے؟"

ہارو نے اپنی لڑکی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ "کیا کہتی ہو اس کی عمر بہت کم ہے۔۔۔ دیکھ لینا قلیل عرصہ کے اندر کتنا بڑھ جائیگی۔۔۔ تم دیکھتی رہو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

رات بالکل سیاہ تھی۔ دونوں بہنیں خواب شیریں کی آغوش میں غرق تھیں۔ یکایک شیلا ڈر کر سرلا سے چمٹ گئی۔ سرلا چونک اٹھی اور نہایت محبت کے ساتھ شیلا کے گھنے بالوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔ "تم اتنی ڈرپوک ہو شیلا۔ چھی! چند دنوں کے بعد جب تمھاری شادی ہو جائیگی اس وقت مجھکو چھوڑ کر کیسے رہوگی؟"

بہن کی چھاتی کے اندر منہ چھپا کر شیلا نے جواب دیا۔۔۔ "ہونھ مجھسے شادی کون کریگا؟ اگر کسی نے ہمت کی تو میں اسے کاٹ لونگی۔"

سرلا یہ سن کر ہنس دی اور بولی۔۔۔ "کاٹ لوگی۔ کیا شادی تو ہر کسی کو کرنی پڑتی ہے۔ شادی نہ کروگی تو پھر تم کیا کروگی؟"

شیلا نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "میں شادی نہیں کرونگی۔ کسی حال میں بھی۔"

سرلا کا شوہر رمیش ایک پاٹ کے گودام میں کام کرتا تھا۔ شادی کے بعد سرلا نے اس سے تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا سیکھا تھا اتنا کہ وہ کسی طرح خط و کتابت کر سکتی تھی۔۔۔ اس لئے ایک دن سرلا نے شیلا کو محبت سے اپنی آغوش میں کھینچتے ہوئے کہا۔۔۔ "بہن! تم نے تو لکھنا پڑھنا بالکل سیکھا ہی نہیں۔۔۔ دور چلے جانے پر تم کبھی رہو یہ لیسے مجھے [illegible]؟"

شیلا نے گردن ہلا کر جواب دیا "جب جاؤنگی دور۔۔۔ تب دیکھا جائیگا۔"

—— ۵ ——

شیلا کی شادی ہو گئی۔ گھر سے جدا ہونے کا وقت آگیا۔ اس کی آنکھوں سے قطرات اشک برساتی بوندوں کی طرح گرنے لگے۔ دل کے اندر دھڑکن بے چینی اور اضطراب پیدا ہو گیا۔

ندی کنارے کشتی کھڑی تھی۔ اور شیلا پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ آج کلیجہ کٹ کٹ کر باہر نکل جائے گا۔ شہنائی کی سریلی آواز اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھی۔۔۔ شاید وہ بھی شیلا کی جدائی میں اشک ریز تھیں۔

سرلا نے رتن کو علیحدہ لیجا کر کہا۔ "شیلا بہت کم سن ہے۔ اس کے ساتھ درازی سے پیش آؤگے بھائی۔ اس کی آنکھوں میں نیند بہت جلد آجاتی ہے اس لئے اس کی ان حرکتوں پر خشم آلود نہ ہونا۔"

رتن نے "بہت اچھا" کہہ کر سرلا کو اطمینان دلا دیا۔

—— ۶ ——

شب عروسی کے قیمتی لمحات۔۔۔!

کھڑکی کے سوراخ سے شبنم سے بھیگی ہوئی ہوا گھر کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ جس سے گھر کا سہرا چراغ کانپ رہا تھا۔ بچھونے کے ایک طرف سمٹی ہوئی شیلا محو خواب تھی۔ چاند جیسے چہرے سے نہ جانے اس کا گھونگھٹ کیسے ہٹ گیا۔ جس سے پھول سا رخسار چراغ کی روشنی میں چمک رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کیوپڈ نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔

بچھونے کے چاروں طرف پھول کا حسین زیور منتشر تھا جس کی خوشبو سے کمرہ کی ہوا مستی پر جھوم رہی تھی۔ رتن نے شیلا کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں نیند کو خواب کی آغوش میں دیکھ کر ناچ اٹھیں وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب گیا اور اس کے کان میں منہ لے جا کر آواز دی "شیلا! شیلا!!"

—— ۷ ——

شام کی تاریکی میں چراغ جلا کر شیلا گھر کے ادھر ادھر گھوم رہی تھی یکایک رتن نے شیلا کے پیچھے چپکے سے آکر ایک بلند چیخ ماری۔ یہ سن کر شیلا ڈر کر بھاگنے لگی اس کا دل دھڑکنے لگا اور ہاتھ سے چراغ تھر تھرا کر زمین پر گر گیا۔ رتن یہ دیکھ کر کھلکھلا اٹھا اور اس کے دھڑکتے ہوئے دل کو اپنی چھاتی سے چمٹا کر کہا۔۔۔ "کیا تم ڈر گئیں شیلا؟"

[illegible] اس کی آنکھیں خوف کے مارے تنگ [illegible]

[illegible]

[illegible] سو گئی۔۔۔ [illegible] نیند کتنی پیاری ہے۔ جوانی کی کچھ آدرشیں۔ جہاں شباب کی مستیاں رنگوں میں عیش و عشرت کے ترانے گا رہی ہیں۔ جہاں تفکرات اور مصائب ڈر کر نہیں آتے۔ اسی کا نام زندگی ہے۔ جبھی زندگی کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔" رتن انھیں خیالات کی دھارا میں بہا جا رہا تھا۔ یکایک وہ اس کے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔ "شیلا! تم سو گئیں۔ اتنی جلدی؟ سنو بھی۔" مگر شیلا خواب کی شیریں اور متوالی دنیا میں مدہوش تھی۔ پھر رتن نے اس کے کنول جیسے جسم کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔۔۔ "کتنی اچھی نیند ہے تمھاری شیلا! اتنے سویرے سو گئیں۔"

"چاند کی سنہری اور ٹھنڈی روشنی کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے۔" رتن شیلا کی بغل میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ اس نے سوچا۔۔۔ "میری امید کی اندھیری دنیا میں بھی اس کا عکس پڑ رہا ہے۔" یکایک وہ کھڑا ہو گیا اور بانسری بجانے لگا۔ اف! کتنا درد بھرا تھا اس کا راگ۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ساری دنیا میں رنج و غم کا سیلاب امنڈ آیا ہے۔۔۔ بانسری کی آواز ساعت کی خاموشی

کو چیرتی ہوئی بہت دور نکل گئی۔ لیکن شیلا کی نیند نہ ٹوٹی۔

—— ۸ ——

شیلا کی بہن سرلا کا کبھی کبھی خط آتا۔ رتن اس کو پڑھکر سُناتا جس کو سُن کر شیلا کی دونوں آنکھوں سے محبت کے آنسو ڈھلک جاتے۔

جو رتن ایک لمحہ کے لئے بھی گھر کے اندر رہنا پسند نہیں کرتا تھا اب چوبیس گھنٹے گھر ہی میں رہتا۔ دوست واحباب آتے اور گھوم کر چلے جاتے اس کی زندگی بالکل بدل گئی تھی۔ وہ تھا اور شیلا تھی۔ شیلا تھی اور وہ تھا شیلا اُس کی دنیا تھی' اس کی زندگی تھی۔ اس کی روح تھی۔

ایک دن رتن میلا دیکھنے گیا وہیں سے اُس نے ایک ہوا خریدا اُسے پہنکر چپکے چپکے گھر میں داخل ہوا۔ شیلا اس وقت باورچی خانہ میں کچھ کام کر رہی تھی۔ رتن نے دروازے سے جھانکا۔ دیکھتے ہی شیلا کی ایک چیخ نکل گئی۔ اس وقت پران باہر سے آیا تھا اور مُنہ ہاتھ دھوکر تمباکو نوش کر رہا تھا۔ یکایک اُس نے شیلا کی چیخ جو سنی وہ دوڑ کر گیا۔ اور "کیا ہوا؟" کہتا ہوا پران باورچی خانہ تک آگیا۔ رتن اس وقت شیلا کو دونوں ہاتھوں سے دبائے سینہ سے لپٹائے ہوئے تھا، یہ دیکھ کر پران شرم وحجاب میں گڑ گڑا آہستہ آہستہ وہاں سے چلا گیا۔

بہت عرصہ بعد ایک دن کے لئے شیلا اپنے میکے گئی۔ مگر بیچین رتن کے لئے شیلا کی ایک روز کی جدائی ناقابل برداشت تھی۔ آخر اندھیری رات میں تن تنہا ناؤ کو کھیتا ہوا سسر کے گھر پہنچا —— اس وقت شیلا سوچکی تھی لیکن سرلا ابھی تک جاگ رہی تھی۔ رتن نے آہستہ آہستہ دروازے پر دستک دینی شروع کی۔

"کون ——؟" گھر کے اندر سے سرلا نے پوچھا۔

"بہن! میں ہوں رتن ——!"

"اتنی رات اور رتن ——" سرلا متعجب ہوگئی لیکن اس نے دروازہ کھولدیا اور رتن کے شرمیلے چہرہ کی طرف دیکھکر مسکراتے ہوئے بولی ——

"آؤ بھائی ——!"

جب دوسرے دن پران کام پر جانے کے لئے باہر نکلا اس وقت رتن کے پیچھے پیچھے شیلا کو آتے ہوئے دیکھکر اس نے تعجب سے پوچھا۔

"یہ کیا ہورانی ——؟"

رتن جلدی سے بھائی کی نظروں سے چھپ جانے کیلئے اندر چلا گیا۔

—— ۹ ——

پران نے ایک دن رتن کو بلا کر کہا۔ "تم کب تک اسی طرح بیکاری کی زندگی بسر کرتے رہوگے؟ تم ہی بتاؤ۔ کوئی کام کرو۔ کم سے کم زمینداری ہی کی دیکھ بھال کرو۔ میری عمر زیادہ ہوچکی ہے۔ میرے قویٰ اب جواب دے رہے ہیں۔"

لیکن رتن نے اپنے بھائی کی بات سنی ان سنی کر دی۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر ایک روز پران نے رتن کو بہتیرا سمجھایا لیکن رتن پہلے کی طرح ٹال گیا۔ سچ مچ پران کی صحت بالکل گرتی چلی جارہی تھی اس کی شکل بتا رہی تھی کہ اس کے جسم میں پہلی سی طاقت اور قوت نہیں رہی۔ اس لئے ایک دن چار و ناچار پران نے رتن کے بارے میں شیلا سے ساری باتیں کہہ سنائیں —— یہ سن کر اسی روز رات کے وقت شیلا نے رتن سے کہا۔ "تم نوکری کیوں نہیں تلاش کرتے؟ آخر بھائی کی کمائی ہم لوگ کب تک کھاتے رہیں گے اب تو ان کی عمر بھی زیادہ ہوچکی ہے۔" لیکن رتن نے پھر ہنسکر اُڑا دیا۔

مکان سے چار کوس کے فاصلے پر الیس پور کی کچہری میں جگہ خالی ہوئی۔ پران نے زبردستی بڑے بابو سے سفارش کرکے رتن کی ملازمت ٹھیک کردی اور دوسرے ہی دن رتن کو وہاں لے جاکر کام پر لگادیا۔ لیکن تین دن بعد رتن کسی سے ایک لفظ کہے بغیر وہاں سے بھاگ آیا۔

جب پران کو معلوم ہوا تو اس نے پوچھا۔ "یکایک تم وہاں سے کیوں چلے آئے رتن؟ کیا بابو نے تمہیں چھٹی دیدی؟"

رتن نے اداس ہوکر کہا۔ "میں نے ملازمت چھوڑدی ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم ——؟"

"درست کہہ رہا ہوں۔ وہ کام میرے لائق نہ تھا۔"

یہ سن کر پران خاموش ہو گیا لیکن اس کے تیور بتا رہے تھے کہ آج وہ واقعی رتن کی اس حرکت ناز یبا سے اپنے جیسے دل کے پھپھولے پھوڑیگا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے باآواز بلند کہا۔ "تمہیں شرم نہیں آتی رتن اتنے بڑے ہو گئے اور اپنے بھائی کی کمائی کھاتے ہو۔ لعنت ہے تمہاری زندگی پر۔ تم اپنی بیوی کو بیکر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہو۔ جاؤ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔" یہ کہہ کر پران بغیر کھائے پیئے باہر چلا گیا۔

لیکن اتنی سخت اور ترش باتیں بھی رتن پر اثر پذیر نہ ہوئیں۔ اس کا دل نہیں ٹوٹا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آئے۔ اس کا دل اب بھی کنول کی طرح شگفتہ اور خندہ تھا۔ اس کے ہونٹوں سے اب بھی موسیقی کے مقناطیسی نغمات تھرتھرا رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے عقب سے آکر شیلا کی دونوں آنکھوں کو بند کر دیا۔ شیلا نے ایک بیزار جھٹکے سے رتن کے ہاتھوں کو ہٹا دیا۔ یہ دیکھ کر رتن کچھ متعجب سا ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔ "کیوں؟ کیا ہوا؟"

"چھی ——! تمہیں شرم نہیں آتی —— آخر کب تک بھائی کی کمائی پر قانع رہو گے، کیا تم مرد نہیں ہو؟"

شیلا کی ان ترش باتوں نے رتن کے دل کو پاش پاش کر ڈالا۔ اس کی انسانیت پر زبردست دھکا لگا۔ اس نے ایک کڑی نظر سے اپنی پتنی کی طرف دیکھا۔ شیلا نے پھر کہا۔

"آخر تم اس طرح کب تک رہو گے؟ —— اب اس کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے تھے۔

رتن نے آخری بار اپنی پتنی کی طرف دیکھا اور گھر سے باہر ہو گیا۔ دن ختم ہو گیا۔ رات آئی لیکن رتن کا پتہ نہ تھا۔ پران کے کلیجہ پر سانپ لوٹ رہا تھا وہ اپنے غصہ پر بیحد نادم تھا۔ تذبذب اور اضطراب میں گھبرا کر وہ پکار اُٹھتا۔ "رتن آیا! بہو رانی کیا رتن آیا؟"

کمرہ کے ایک گوشہ میں شیلا سرنگوں رنج و غم کی چھاؤں میں بیٹھی تھی۔ چیزوں کی آہٹ سے وہ چونک سی جاتی اور دل ہی دل میں کہتی —— "شاید اب وہ آ گئے!"

رات کی تاریکیاں مٹ چکی تھیں۔ دوسری صبح کی سفیدی نمودار ہوئی لیکن رتن اب تک مکان واپس نہیں لوٹا۔ پران نے اس کو کہاں کہاں نہ تلاش کیا لیکن اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ اس طرح دیکھتے دیکھتے دو ماہ کی سخت گھڑیاں ختم ہو گئیں۔ شیلا کی آنکھیں روتے روتے سرخ ہو گئیں —— اور وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھی ——!

شام کی تاریکی میں جب چاروں طرف خاموشی چھا جاتی ہے اس وقت اسے ایسا معلوم ہوتا کہ رتن آ رہا ہے۔ یہ سوچ کر اُس کا جسم کانپ اُٹھتا اور آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھرکنے لگتے لیکن وہی ناکامی، وہی جدائی —— اور غم و الم کے تفکرات ——!

گہری رات کو جب پیپل کے درخت کی آواز فضا میں گونجتی تو شیلا تڑپ اُٹھتی۔ اُسے پتے کی آوازوں سے رتن کے پیر کی چاپ کا دھوکہ ہوتا ساتھ ہی بڑ کے گھنے جنگل کے پتوں سے بھی یہ آواز نکلتی۔ "شیلا! شیلا!" جیسے رتن شیلا کو محبت سے پکار رہا ہے۔

پران نے جب دیکھا کہ شیلا رتن کی جدائی میں بالکل گھلی جا رہی ہے تو اس نے ایک دن سمجھا کر کہا۔ "بہو رانی! یقین مانو وہ ضرور آئیگا۔ نہیں تو پھر جائیگا کہاں —— ؟ میرا بھائی مجھ سے روٹھ گیا ہے۔ میری باتیں اسے کڑوی لگی ہیں۔ اب میں اس کے ساتھ اس طرح پیش نہیں آؤں گا گھبراؤ نہیں بہو رانی۔ رتن آئیگا اور ضرور آئیگا۔"

ایک رات آسمان میں چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ شیلا رتن کے غم میں صحن میں بیٹھی ہوئی تھی —— یکایک اس کے کان میں ایسی آواز آئی جیسے رتن پکار رہا ہو۔ یہ سن کر فوراً اس نے دروازہ کھول دیا۔ لیکن تھوڑے فاصلہ پر درخت کی شاخ میں بیٹھا پپیہا چلا اُٹھا —— "پی کہاں ——!"

ایک گہری سانس لے کر شیلا کہنے لگی۔ "پیارے لوٹ آؤ۔ اب میں تمہیں کچھ نہیں کہونگی —— چلے آؤ میرے من کے راجہ!"

—— ۱۰ ——

پران نے شیلا کے میکے میں رتن کے متعلق ایک خط لکھا جسے دیکھکر ہارو اور سرلا، شیلا کو لینے آئے۔ ان لوگوں نے کہا —— "چلو ہمارے گھر میں دو دن رہکر آنا ——"

شیلا نے گردن ہلا کر جواب دیا۔ "نہیں میں نہیں جاؤنگی۔ اگر میری غیر حاضری میں وہ آ جائیں تو مجھے نہ پا کر پھر کہیں چلے جائیں گے۔" سرلا اور ہارو وہیں ٹھہر گئے۔

اسی دن رات کے وقت شیلا نے سرلا کے گلے میں بانہیں ڈالکر کہا —— "بہن مجھے لکھنا سکھاؤ گی؟" اتنا کہہ کر شیلا کو یاد آیا۔ کچھ دن کی بات ہے سرلا نے شیلا سے پڑھنے لکھنے کے متعلق کہا تھا مگر اُس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔ "مجھے اس کی ضرورت نہیں ——" اور آج ——؟

آخر کار بڑی بڑی مشکلوں سے سرلا نے شیلا کو لکھنا پڑھنا سکھایا اب وہ مزے سے خط و کتابت کر سکتی تھی۔

ایک دن شیلا نے ایک لڑکے سے پوسٹ کارڈ منگایا اس میں چند ٹیڑھے حروف لکھے۔ اس نے جنون کی حالت میں پتہ میں "رتن" اور "کلکتہ"

لکھ کر کسی لڑکے کی معرفت بھیج دیا۔ آہ! محبت کی کشش نے کہاں سے کہاں خط بھیجنے پہ اسے مجبور کیا۔ لیکن خط بھیجے ہوئے کئی دن گزر گئے نقوش امید دل کی گہرائیوں سے مٹنے لگے۔ جب کبھی وہ ڈاکیہ کو دیکھتی اس کے دل میں خوشی و مسرت کی لہریں اٹھتیں۔ "شاید جواب آیا ہو" لیکن جب معلوم ہوتا کہ خط نہیں ہے اس وقت وہ ایک سرد آہ کھینچ کر رہ جاتی۔ ڈاکیہ بھی شیلا کی آنکھوں میں ناامیدی کے آنسو دیکھ کر تڑپ اٹھتا۔ کتنی مرتبہ تو اس نے خط کے بیگ کو الٹ پلٹ کر دیکھا "شاید خط نکل آئے" لیکن وہ لمبی سانس لے کر کہہ دیتا۔ "نہیں بہن! خط نہیں ہے۔"

"ایک مرتبہ اور تلاش کرو بھائی" غم آلود لہجہ میں ڈاکیہ سے شیلا التجا کرتی۔ شیلا کی اس التجا کو سن کر وہ پھر دیکھنے لگتا۔ مگر وہی ناامیدی کی سیاہ گھٹائیں! — وہی جدائی کی مغموم ساعتیں!

خط نہ آنے پر شیلا نے اپنے پژمردہ دل کو اس طرح تسلی دینا شروع کیا "شاید وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے" لیکن یہ سوچ کر اس کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں "اچھا اگر وہ آ جائیں تو میں ان سے روٹھ جاؤں گی۔ لاکھ مجھے منائیں گے میں نہیں مانوں گی — انھوں نے ایسا کام کیا ہے جو کسی حال میں بھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔"

جب شیلا خواب کے آغوش میں ہوتی اس وقت بھی اس کی درد و کرب سے بھری ہوئی چیخ نکل جاتی اس چیخ کو سن کر پران کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔

کبھی کبھی وہ اپنے دل میں اس طرح بڑبڑا اٹھتی — "نہیں! میں ان سے کبھی نہیں بولوں گی — اُف! ان کا اس طرح مجھ سے روٹھ جانا میرے پریتم آہ!"

نیند میں بھی شیلا اپنے دل ہی دل میں کہتی "لوٹ آؤ! پیارے لوٹ آؤ" رات کی خاموش فضا کو چیرتی ہوئی بھیگی بھیگی ہوا میں یہی آواز سنائی دیتی "لوٹ آؤ، پیارے لوٹ آؤ!" دوسری طرف پپیہے کی شیریں اور دردناک آواز ہوا کی لہروں پر تیرتی ہوئی آتی۔ "پی کہاں؟ — پی کہاں —؟"

محبت

از جناب عبد الغنی سحنی

عالم ارواح میں ایک فرشتہ نے سوال کیا — "محبت کیا ہے —؟"
ایک مصور کی روح نے کہا — "صحرا میں ایک خوشنما پھول . کوہستان میں ایک خوبصورت شجر . سمندر میں ایک شاداب جزیرہ . ریگستان میں ایک شیریں چشمہ . آسمان پر چودھویں کا چاند . . . تاریکی میں ایک روشن چراغ . . ."
ایک عاشق کی روح نے کہا . "حسن کی دلربائی . جوانی کی وارفتگی . رقص کی بیخودی . نغمہ کی دلکشی . فرقت کی بیقراری . . . تصور کی رنگینی ."
ایک درویش کی روح نے کہا — "چشموں سے بہنے والی ایک آبجو . . دو آوازوں سے مل کر بننے والی ایک صدا . . . دو روشنیوں سے مل کر بننے والا ایک نور ."
ایک اخوت پرست کی روح نے کہا — "درد کا احساس . . ایثار کا جذبہ . . . . قربانی کی آرزو ."

سب سے آخر میں ایک شاعر کی روح تڑپ کر بولی — "محبت میں ہوں — میں سراپا محبت ہوں۔ میں نے جو کچھ دیکھا وہ محبت ہے — میں نے جو کچھ سنا وہ محبت ہے — میں نے جو کچھ کہا وہ محبت ہے میں نے جو کچھ کیا وہ محبت ہے۔ میں محبت ہوں — میں خدائے محبت ہوں —"
جب یہ الفاظ فضائے لاہوتی میں گونجے تو فرشتوں کے حلقہ میں بھی ایک جنبش پیدا ہوئی اور کسی نے بلند آواز سے کہا — "بیشک! بیشک!!"

رفتارِ زمانہ

یہ باون ہفتے

آتش کدۂ یورپ کو شعلہ فشاں ہوئے پورا ایک سال گزر چکا ہے اور ابھی تک جنگل کی اس آگ کے مدھم ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ گزشتہ سال یکم ستمبر کو سگفرڈ لائن کے عقب میں ایک فتنہ پیدا ہوا جو ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک خونریز طوفان بن کر یورپ کے طول و عرض پر چھا گیا اور اب بحر اوقیانوس سے لیکر بحر الکاہل تک تمام مشرقی کرۂ ارضی کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے اس عرصہ میں جرمنی نے پہلے تو پولینڈ کو اپنی استعماری چھری سے ذبح کیا۔ پھر ڈنمارک، ہالینڈ اور بلجیم کو پامال کرتا ہوا فرانس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور اب انگلستان کی طرف غیظ و غضب کی نظروں سے گھور رہا ہے۔ یوں تو جون کے دوسرے ہفتے کے اواخر ہی سے جرمنی نے برطانیہ پر ہوائی حملوں کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے مگر ۸ اگست سے اس نے یہ حملے شدید تر کر دیئے ہیں چنانچہ ۱۸ اگست کو تقریباً ایک ہزار جرمن طیاروں نے برطانیہ پر حملہ کیا لیکن بحیثیت مجموعی نازیوں کے یہ فضائی حملے بالکل ناکام رہے اور جس قدر نقصان انھوں نے برطانیہ کو پہنچایا اس سے کہیں زیادہ انھوں نے خود اٹھایا۔ چنانچہ ۱۸ جون سے تادمِ تحریر جرمنی کے قریباً ایک ہزار طیارے اپنی موت مر چکے ہیں اور درجنوں کی تعداد میں روزانہ ضایع ہو رہے ہیں۔

پہلے خیال تھا کہ ۱۵ اگست کو ہٹلر ایک "برق آسا حملہ" برطانیہ پر کرے گا لیکن غالباً رائل ایرفورس کی روزافزوں طاقت کے پیش نظر اسے یہ تجویز ملتوی کرنی پڑی۔ اب ہٹلر کا پروگرام یہ معلوم ہوتا ہے کہ۔

(۱) جزائر برطانیہ کا ہر چہار طرف سے محاصرہ کر لیا جائے تاکہ باہر سے اسے کسی قسم کی امداد نہ پہنچ سکے۔

(۲) انگلستان کے جنوب مشرقی ساحل پر بمباری کر کے انگریزوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ اسے بالکل خالی کر دیں تاکہ ہٹلر کو اپنی فوجیں اتارنے میں آسانی ہو چنانچہ نازی طیارے نہ صرف انگلستان کے ساحلی علاقہ پر بمباری کر چکے ہیں بلکہ کرائیڈن اور وہاں سے ویلز تک پہنچنے میں بھی کامیاب ہو چکے ہیں لیکن کیا ہٹلر بحیثیت مجموعی اپنی سکیم میں کامیاب ہوگا؟ اس کے جواب میں مسٹر چرچل کی وہ معرکہ آرا تقریر پڑھ دینی کافی ہوگی جو انھوں نے ۲۰ اگست کو دارالعوام کے سٹیج سے کی۔

عالمگیر واقعات پر پارانہ تبصرہ

از شبلی بی۔ کام!

مسٹر چرچل کی تقریر

مسٹر چرچل نے حالات کی نزاکت کا اظہار کرتے ہوئے کہا— "بلجیم پر حملہ کر کے اسے مغلوب کر لیا گیا۔ ہماری اپنی فوج جس کو شاہ لیوپولڈ نے مدد کے لئے بلایا تھا بمشکل تمام بچ کر آسکی۔ ہمارا دوست فرانس ہمارا ساتھ چھوڑ گیا۔ اٹلی ہمارے خلاف ہے۔ تمام فرانس اور اس کے حربی و معیشی وسائل دشمن کے قبضہ میں ہیں۔ وشی کے مقام پر فرانسیسیوں نے ایک حکومت قائم کی ہے۔ جو کٹ پتلی کی طرح نازیوں کے اشارہ پر ناچ رہی ہے راس شمال سے لیکر ساحل ہسپانیہ تک یورپ کا تمام مغربی ساحل جرمنوں کے قبضہ میں ہے اور اس محاذ کی تمام بندرگاہوں اور ہوائی اڈوں کو ہمارے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے۔ پھر جرمنوں کی ہوائی طاقت ہم سے بہت زیادہ ہے اور یہ سب کی سب ہمارے جزیرے کے اتنے قریب پہنچ چکی ہے کہ بمبار طیاروں کے لئے یہاں چند ہی منٹوں میں پہنچ کر پہنچنا مشکل نہیں ہے۔ اگر ہمیں اس خطرے کا مقابلہ سنہ میں کرنا پڑتا تو شاید اس وقت ہماری ہستی خطرے سے باہر نہ ہوتی۔"

اس کے برعکس اس وقت کیا حالت ہے؟ مسٹر چرچل نے کہا کہ اب ہماری طاقت پہلے سے بہت زیادہ ہے اور ہمیں اپنی کامیابی کا پورا یقین۔ اپنے نصب العین پر پختہ ایمان اور اپنی قوت پر پورا بھروسہ ہے برطانیہ اس وقت ہر حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر طرح سے تیار ہے۔ دشمن کے پاس جنگی طیارے تعداد میں اس وقت زیادہ ہیں مگر برطانیہ کے جنگی طیارے اور جنگی ہوا باز جرمنی کے طیاروں اور ہوا بازوں سے زیادہ بہتر ثابت ہوئے ہیں۔"

مسٹر چرچل نے نعرہ ہائے تحسین کے درمیان اعلان کیا کہ برطانیہ کی طاقت اس وقت اتنی زیادہ ہے کہ دشمن جب تک جنگ جاری رکھنا چاہے برطانیہ اس کے لئے تیار ہے

مسٹر چرچل نے کہا۔ میں نے اخباروں میں پڑھا ہے کہ ہٹلر جزائر برطانیہ کا محاصرہ کرنا چاہتا ہے۔ ہم اس کی شکایت نہیں کرتے۔ مجھے یاد ہے گزشتہ جنگ کے دوران میں قیصر جرمنی نے بھی ایسا کرنے کی کوشش کی تھی البتہ شکایت جب ہوگی کہ ہم نازیوں کا پیٹ بھرنے کے لئے اغذیہ کو یورپ میں جانے دیں بعض لوگوں نے تجویز پیش کی ہے کہ ہمیں شکست خوردہ لوگوں کی خاطر خوراک

یورپ میں بھیجنی چاہیئے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ ہم اس تجویز پر عمل نہیں کر سکتے کیونکہ یہ خوراک بچارے محکوموں کے کام نہیں آئیگی بلکہ ان سے نازی چھین کر لے جائیں گے۔ گویا اب مسٹر چرچل کی تجویز یہ ہے کہ جرمنی کا محاصرہ پہلے سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ کیا جائے تاکہ اسے اپنے زندہ رہنے کیلئے سامان معیشت کہیں سے بھی میسر نہ آسکے۔

امریکہ اور جنگ

بحر اوقیانوس میں رفتار جنگ کی موجوں کی کروٹ نے امریکہ کے وائٹ ہاؤس میں بھی کپکپی پیدا کر دی ہے اور اب مسٹر روزویلٹ نے حالات کی نزاکت کا پوری طرح سے احساس کر لیا ہے۔ چنانچہ ان کے علاوہ امریکہ کے باقی مقتدر اصحاب بھی بر سر عام اعلان کر رہے ہیں کہ ہماری ہمدردی برطانیہ کے ساتھ ہے اور جب بھی موقع ہوا ہم نازی ازم اور فاشزم کے خلاف صف آرا ہو جائیں گے۔ سر دست امریکہ نے فیصلہ کیا ہے کہ پچاس جنگی جہاز برطانیہ کے ہاتھ فروخت کر دیئے جائیں علاوہ ازیں وہ بحر اوقیانوس کے برطانوی جزائر میں ہوائی اور بحری اڈے بھی قائم کرنے والا ہے تاکہ نازی ازم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا بحر اوقیانوس کے شمال ہی میں سدباب ہو سکے۔ اس ضمن میں سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ مسٹر روزویلٹ اور کنیڈا کے وزیر اعظم مسٹر میکنزی نے ایک ملاقات کے موقع پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ امریکہ کے تحفظ کے لئے ایک مشترکہ دفاعی بورڈ بنایا جائے جس میں کینڈا اور جماہیر امریکہ کے گیارہ نمائندے ہوں خیال کیا جاتا ہے کہ اس طریقے سے مغربی کرۂ ارضی دشمنوں کی یلغار سے محفوظ رہیگا۔

برطانیہ کی طرح امریکہ نے بھی فیصلہ کیا ہے کہ جرمنی کے مقبوضہ ممالک میں سامان خوراک نہ بھیجا جائے کیونکہ خطرہ ہے کہ اسے نازی فوجیں ہڑپ کر جائیں گی۔ الغرض جیسا کہ امریکہ کے مدبروں نے بھی اعلان کیا ہے وہ اخلاقی طور پر جرمنی کے خلاف میدان جنگ میں کود چکا ہے صرف "اعلان جنگ" کی رسم باقی ہے۔

سقوط سومالی لینڈ

سیاسیات حاضرہ کے طالب علموں سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ مسولینی روما الکبریٰ کی عظمت کو دوبارہ واپس لانا چاہتا ہے لیکن وہ اکیلا اس مہم کو سر انجام نہیں دے سکتا۔ چنانچہ اس نے یورپ کے موجودہ صورت حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شمالی افریقہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور اپنی فوجیں لیکر برطانی سومالی لینڈ پر چڑھائی کر دی۔ انگریز ملکی مصائب میں گرفتار رہتے اس لئے وہ مزاحمت نہ کر سکے نتیجہ یہ ہوا کہ اطالوی فوجیں سمالی لینڈ کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک قابض ہو گئیں اور اب لیبیا کے رستے مصر پر حملہ آور ہونا چاہتی ہیں۔ برطانیہ کو سومالی لینڈ کے تخلیہ کی ضرورت کیوں پیش آئی اس کا جواب دفتر حرب کی زبانی سنئے :۔

" ابتدائی سکیم یہ تھی کہ سومالی لینڈ کی حفاظت برطانیہ و فرانس کی مشترکہ فوجیں کرینگی۔ چنانچہ قرار پایا کہ دائیں بازو کی مدافعت جبوتی میں متعین فرانسی فوجیں کرینگی۔ لیکن حکومت فرانس نے چونکہ اچانک ہتھیار ڈالدیئے۔ اس لئے صورت حال بہت نازک ہو گئی اور اب برطانی فوجوں کے سامنے تین ہی رستے تھے۔

(۱) سومالی لینڈ میں برطانی فوج کافی مقدار میں بھیج دی جائے لیکن اس سے خطرہ تھا کہ جنگ کے دوسرے مقامات پر فوج بہت کم رہ جائیگی۔

(۲) سومالی لینڈ کو فوراً خالی کر دیا جاتا لیکن اس طرح دشمن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانا ممکن نہ تھا۔

(۳) تھوڑی بہت فوج جو سومالی لینڈ میں موجود تھی اس سے دشمن کا مقابلہ کیا جاتا۔

چنانچہ تیسرے متبادل طریقہ ہی پر عمل کیا گیا اور دشمن کو کافی زک پہنچا کر ڈنکرک کی طرح برطانیہ نے اپنی باقی ماندہ فوج واپس بلا لی، اس سے بہتر رستہ حکومت برطانیہ کے سامنے کوئی نہ تھا اور اب ہمارا خیال ہے کہ اطالویوں کو اتنا نقصان پہنچ چکا ہے کہ وہ اپنے اگلے پروگرام کو معرض تعویق میں ڈالنے پر مجبور ہونگے۔

مصر خطرہ میں

تخلیہ سومالی لینڈ سے بیک وقت تین خطرے پیدا ہو گئے ہیں۔

(۱) لیبیا کے رستے مسولینی مصر پر حملہ کریگا۔

(۲) عدن پر قبضہ کر کے وہ ممالک عربیہ میں داخل ہونے کی کوشش کریگا۔

(۳) نہر سویز کو بند کر کے وہ برطانیہ کا مشرقی رستہ مسدود کرنے کی کوشش کرے گا۔

مصر پر حملہ کرنے کے لئے اٹلی نے لیبیا اور مصر کی سرحد پر پانچ لاکھ فوج جمع کر رکھی ہے لیکن باردیا کی بندرگاہ پر برطانوی بمباری کی وجہ سے وہ اسے پیچھے ہٹانے پر مجبور ہو گیا۔ دوسرے لیبیا میں پانی کی بہت قلت ہے اس لئے اطالوی فوجوں کو پانی کا کافی ذخیرہ لیکر لیبیا کی مصری سرحدات کے ارد گرد نقل و حرکت کرنی پڑیگی۔ تیسرے جنگ کے لئے پٹرول کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اٹلی اس نعمت سے محروم ہے۔ بیشک وہ رومانیہ کے

چشموں سے مستفید ہو سکتا ہے۔ لیکن جب تک جرمنی کو پٹرول کی ضرورت ہے۔ یہ امر مشکوک ہی ہے کہ وہ اپنے دوست کو اس باب میں کچھ مدد دے سکیگا چوتھے مشرقی بحیرۂ روم کے متعلق اٹلی اور جرمنی میں اختلافات پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے مسولینی کے لئے اپنی تمام تر توجہ مصر کی جانب مبذول کرنی آسان نہ ہوگی۔ پانچویں صحراؤں میں فوجی نقل و حرکت آسان نہیں ہوتی برطانیہ کی رائل ایر فورس آسمان سے بموں کی بارش کر کے اطالوی فوجوں کو بہت حد تک تباہ کر سکتی ہے۔ چھٹے لیبیا کے مسلمان اتنے وفادار نہیں ہیں جتنے مسولینی ان کو سمجھتا ہے۔ ساتویں اگر حبش میں بغاوت ہو گئی تو مسولینی کی تمام تمناؤں کا خون ہو جائیگا۔

انھیں وجوہ کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ اٹلی اپنی تازہ مہم میں بہت زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ تاہم اس ضمن میں آخری خبر یہ ہے کہ اٹلی کے طیاروں نے اسکندریہ کی مشہور بندرگاہ پر بمباری کی ہے اور ادھر حسن صابری پاشا اور دوسرے مصری قائدین نے عزم صمیم ظاہر کیا ہے کہ وہ اطالوی فوجوں کا پوری جوانمردی سے مقابلہ کرینگے اور جب تک برطانوی فوجوں کی امداد ان کی پشت پر ہے ان کی کامیابی میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

بلقان کی سیاست

مسولینی کی نگاہیں اگر ایک طرف شمالی افریقہ کے صحراؤں کی طرف اٹھ رہی ہیں تو دوسری طرف وہ مشرقی بحیرۂ روم پر بھی مکمل اقتدار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ بحیرۂ روم کے اس حصہ میں برطانیہ کو کافی دخل حاصل ہے۔ چنانچہ اٹلی ایک مدت سے برطانوی مفاد کے خلاف پروپیگنڈا کر رہا ہے پچھلے دنوں البانیہ کے ایک شخص "ڈاٹ ہوگیا" کا قتل ہوگیا۔ اٹلی نے شور مچانا شروع کیا کہ یہ قتل حکومت برطانیہ کے ایما پر حکومت یونان نے کیا ہے لیکن مبصرین کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ اس طرح کا بے بنیاد پروپیگنڈا کر کے اٹلی دراصل اپنے اس پرانے عناد کا اظہار کر رہا ہے جو اسے مشرقی بحیرۂ روم میں برطانیہ سے ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ "ڈاٹ ہوگیا" کوئی ڈاکو تھا یا جیسا کہ حکومت اطالیہ کا بیان ہے کوئی بہت بڑا قومی لیڈر تھا مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یونان کے خلاف پروپیگنڈا کر کے ایک طرف تو مسولینی البانیہ اور یونان کی سرحد پر بسنے والے مسلمانوں کے درمیان منافرت پھیلانا چاہتا ہے اور دوسری طرف اس کا مدعا یونان پر حملہ آور ہونے کیلئے کوئی وجہ جواز قائم کرنا ہے۔ خبر نہ معلوم ہوا ہے کہ اطالیہ کی فوجیں یونان کی طرف پیشقدمی کر رہی ہیں لیکن برطانیہ نے اعلان کیا ہے کہ اگر یونان پر حملہ ہوا تو وہ اس کی پوری مدد کریگا۔ اس کے یہ بھی معنی ہیں کہ ترکی کو اب چوکس رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ اتحاد بلقان کی رو سے وہ یونان کی مدد کرنے پر مجبور رہے۔

رومانیہ اور بلغاریہ میں معاہدہ ہوگیا ہے جس کی رو سے نہ صرف بلغاریہ میں رہنے والے تمام رومانوی بلکہ دبروجا کے تمام رومانوی بھی جن کی تعداد پچاس ہزار ہے رومانیہ میں منتقل کر دیئے جائینگے۔ اس معاہدہ کی رو سے دونوں ممالک کی وہی سرحدات مقرر کی گئی ہیں جو ۱۹۱۲ء میں تھی گویا رومانیہ نے بلغاریہ کا وہ مطالبہ منظور کر لیا ہے جو اس نے روس کے مطالبہ کے ساتھ ہی دبروجا کی واپسی کے لئے کیا تھا۔

مشرق بعید

گزشتہ اشاعت میں ہم نے لکھا تھا کہ مشرق بعید میں جاپان وہی حقوق حاصل کرنا چاہتا ہے جو "منظریہ منرو" کی رو سے جنوبی امریکہ کے متعلق ممالک متحدہ امریکہ کو حاصل ہیں۔ چنانچہ ایک طرف وہ چین کی آزادی کو پامال کرنا چاہتا ہے تو دوسری طرف اس نے تمام مغربی طاقتوں کو بحرالکاہل سے بیدخل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے فرانسی ہند چینی کو نوٹس دیا کہ وہ اسے اپنے علاقہ میں نہ صرف فضائی اور بحری مستقر قائم کرنے کی اجازت دے بلکہ صوبہ یناّن تک پہنچنے کے لئے جاپانی فوجوں کو بھی گزرنے دے۔

فرانسی ہند چینی نے اگرچہ ان مطالبات کو مسترد کر دیا ہے لیکن پیتاں گورنمنٹ نے جو نازیوں کے اشارے پر کٹ پتلی کی طرح ناچ رہی ہے ان مطالبات کو منظور کر لیا ہے۔ دراصل چینی فوجیں صوبہ یناّن میں محصور ہیں اور جاپان چاہتا ہے کہ فرانسی ہند چینی کے رستے سے گزر کر ان پر حملہ آور ہو۔ لیکن جب تک درمیان میں پہاڑ حائل ہیں اور رستے کی ریلوے کو چینی اکھیڑ سکتے ہیں جاپان کے لئے اس مقصد میں کامیاب ہونا محال ہے۔

نیز جاپان جزائر فلپائن پر بھی دانت تیز کر رہا ہے لیکن امریکہ کو چونکہ ان جزیروں سے بہت زیادہ دلچسپی ہے اس لئے ناممکن ہے کہ وہ جاپانی استعمار کا مقابلہ پوری قوت سے نہ کرے۔

سیاسیات ہند

سیاسیات کی گتھی ابھی لاینحل ہے۔ پچھلے دنوں وائسرائے نے اعلان کیا کہ جنگ کے بعد نیا دستور اساسی مرتب کیا جائے گا اور فی الحال مرکزی ایگزیکٹو کونسل میں توسیع کی جاتی ہے تاکہ ہندوستان کے تمام مختلف الخیال نمائندے وائسرائے کو اپنے مشورہ سے مستفید کر سکیں۔

اس اعلان پر جہاں اقلیتوں نے اظہار طمانیت کیا ہے وہاں کانگرس نے اسے بالکل ہی قرین التفات نہیں سمجھا۔ چنانچہ واردھا میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کا جو اجلاس ہوا اس میں حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی۔

"وائسرائے اور سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کی تجاویز نہ صرف جمہوریت کے اصول کے خلاف ہیں بلکہ ہندوستانی مفاد کے بھی منافی ہیں اس لئے کانگرس ایسی تجاویز منظور نہیں کرسکتی ——"

دراصل کانگرس کو غصہ یہ ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کا اعلان کیا کیوں گیا؟ اور تمام اختیارات کانگرسی ارباب سیاست ہی کو کیوں نہیں سونپ دیئے گئے؟ بہر حال کانگرس کی "نہیں" نے برطانیہ کے رستہ میں بہت سی مشکلات پیدا کر دی ہیں اور اب دیکھنا یہ ہے کہ کانگرس اگلا قدم کیا اٹھاتی ہے؟

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سول نافرمانی کرے گی لیکن یہ قدم اٹھانے سے قبل اسے بہت سی باتوں کا فیصلہ کرنا ہوگا۔

(۱) کیا کانگرس گاندھی جی کے نظریہ عدم تشدد اور دوسرے خیالات سے بغاوت کرسکتی ہے؟

(۲) کیا کانگرس میں اتنا ڈسپلن اور ضبط و نظم موجود ہے کہ وہ عصیان مدنی کی تحریک جاری کر سکے؟

(۳) کیا سول نافرمانی سے ہندوستان کو کوئی ٹھوس فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

(۴) کیا وہ اقلیتوں کے حقوق کا خیال رکھے بغیر حکومت برطانیہ کو کسی نئے دستور اساسی کے مرتب کرنے پر مجبور کرسکتی ہے؟

میاں احمد شاہ بیرسٹرایٹ لا کے اعلان کے ساتھ ہی خاکسار تحریک کی فوجی حیثیت ختم ہوگئی ہے چنانچہ انھوں نے علامہ مشرقی سے مشورہ کرنے کے بعد اعلان کیا ہے کہ:-

(۱) خاکسار مرکزی حکومت کی پابندیوں پر عمل کرتے ہوئے ڈرل بند کر دیں گے۔

(۲) مسجدوں میں ہفتہ وار اجلاسوں میں وہ شامل ہوسکیں گے لیکن ایسے طریقہ سے نہیں کہ ان کا اجتماع فوجی ڈرل سے کوئی مناسبت رکھتا ہو۔

(۳) وہ بیلچہ اٹھا سکیں گے لیکن ڈرل کرنے کی ان کو اجازت نہ ہوگی۔

(۴) یونیفارم میں کسی قدر تبدیلی کر دی جائیگی تاکہ فوجی یونیفارم سے مماثلت نہ رہے۔

(۵) ادارہ علیہ کی اجازت سے گاہے گاہے خاکساروں کا اجتماع ہوتا رہے گا۔

عورت کو سفید پانی

جو عورتیں سفید پانی کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ یعنی وقت بے وقت زردی مائل یا سفید رطوبت انکے خفیہ جسم سے نکلتی رہتی ہے وہ اپنی بھری بھری جوانی کو چند دنوں میں خاک کر دیتی ہیں کیونکہ سفید پانی کی بیماری سے غفلت برتنا اور اس کا علاج نہ کرنا بیحد خطرناک ہوتا ہے۔ یہی سفید رطوبت دراصل جوانی اور شباب کا جوہر ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ بدن سے خارج ہو جاتا ہے اور عورت کو بیکار کر دیتا ہے۔ اس بیماری کے شروع میں عورت کے تمام بدن میں سستی اور پنڈلیوں، کمر ناف کے نیچے میٹھا میٹھا درد ہوتا ہے۔ پھر سر چکرانے لگتا ہے۔ کام کی زیادتی چلنے پھرنے سے بیحد تکان اور کمزوری محسوس ہونے لگتی ہے۔ اسکے بعد ماہواری ایام میں کچھ ایسی گڑبڑ پڑ جاتی ہے جو بعض وقات عورت کی صحت کا بالکل ہی خاتمہ کر ڈالتی ہے۔ پس ایسی حالت میں اس سفید بیماری (یعنی سیلان الرحم) سے عورت کو غفلت ہرگز نہ کرنا چاہیئے۔

سفید پانی کو روکنے کی ترکیب

اگر کوئی عورت سیلان الرحم کی مریض ہے اور اس کے خفیہ جسم سے سفید پانی یا رطوبت نکلتی رہتی ہے تو اسکو روکنے اور اس کا علاج کرنے کی سب سے آسان اور سب سے سستی ترکیب یہ ہے کہ وہ ایک شیشی دوا "روک" استعمال کرے۔ یہ دوا تقریباً بارہ سال سے تجربہ میں آ رہی ہے۔ اور سیلانِ رحم کی بیماری کو تیسرے دن ختم کر دیتی ہے۔ ہزارہا عورتوں نے اس دوا کے ذریعہ اس بیماری سے نجات حاصل کی ہے۔ دوا شروع کرنے کے تیسرے دن ہی مریضہ بول اٹھتی ہے کہ دوا "روک" نے کتنی جلدی مجھے صحت کا یقین دلا دیا۔ کیونکہ استعمال شروع کرنے کے تیسرے روز سفید رطوبت کا خارج ہونا بند ہو جاتا ہے۔ اور پھر پوری شیشی ختم ہونے تک مرض کی بنیاد ختم ہو جاتی ہے پس جن عورتوں کو سفید پانی کی بیماری ہو انہیں چاہیئے کہ اپنی جوانی کی حفاظت کریں اور

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے۔ بی نمبر ۲۴۳ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر دوا روک کی ایک شیشی بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا کر استعمال کریں۔ سفید رطوبت سے نجات مل جائے گی۔ ایک شیشی دوا روک کی قیمت صرف تین روپے ہے (۳ ہے) سات آنے محصول لگتا ہے۔)

عورت کو ماہواری ایام میں درد ہوتا ہے

ہر عورت کو ماہواری ایام کا باقاعدہ اور بغیر درد کے آنا ضروری ہے۔ اگر کسی باعث ایام کم آتے ہوں یا درد اور سخت تکلیف دے کر آتے ہوں بند ہو گئے ہوں یا مہینہ میں دو بار۔ رک رک کر آتے ہوں یا ایام ماہواری کی اور کوئی خرابی ہو۔ دورے وغیرہ پڑتے ہوں۔ تو یقین کیجئے کہ ماہواری ایام کو درست اور باقاعدہ اور ہر ماہ وقت مقررہ پر لانے کے لئے سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ مریضہ کو ایک شیشی دوا کورس استعمال کرا دی جائے دوا کورس کا حیرت انگیز اثر دیکھ کر ہر شخص خوش ہو جاتا ہے۔ اس دوا کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ماہواری ایام کو باقاعدہ کر دیتی ہے۔ اور پھر بغیر تکلیف کے ہر ماہ ایام ماہواری آتے ہیں۔ اور پھر ایام کے دنوں میں درد وغیرہ کی کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ بڑی معرکہ کی دوا ہے۔ اور سالہا سال سے ہندوستان میں شہرت حاصل کر رہی ہے۔

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے بی ۲۴۳ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر دوا کورس کی ایک شیشی بذریعہ وی پی پارسل منگا لیجئے۔ ایک شیشی دوا کورس کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے (۲ ۸) اور سات آنے اس پر محصول ڈاک کے علیحدہ خرچ ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ دوا ماہواری ایام کی ہر خرابی اور ہر تکلیف میں اپنا پورا اثر دکھاتی ہے۔

دھڑکنیں!

از مجید لاہوری

گماں ہوتا ہے دل کی دھڑکنوں پہ مجھکو آہٹ کا

تصور میں ابھی محفوظ ہیں دھندلی سی تصویریں
نگاہوں میں ابھی باقی ہیں کچھ مانوس تنویریں

ابھی سینے میں باقی ہے خلش سی بیقراری کی
ابھی بیتاب آنکھوں کو ہے چاہت اشکباری کی

ابھی تنہائیوں کے دل میں حسرت ہے رفاقت کی
کہ ہے احساس غم کو آرزو آغوش راحت کی

اُمنگیں مضطرب ہیں بے بسی کا ماجرا کہدیں
ہیں بیکل اشک بن کر نطق روداد وفا کہدیں

ابھی تک دیکھتی ہوں خواب عہد کامگاری کی
ابھی بھولے نہیں منظر مجھے فصل بہاری کی

ابھی تک چپکے چپکے رات کا رونا نہیں جاتا
ابھی تک یاس کی بستی میں جاں کھونا نہیں جاتا

ابھی تک درد میں ڈوبے ہوئے سے گیت سنتی ہوں
گلستان محبت سے وفا کے پھول چنتی ہوں

جو دل پر ہاتھ رکھ کر آہ ٹھنڈی آہ بھرتی ہوں
یقیں جانو سکھی! میں اس گھڑی محسوس کرتی ہوں

الم کی تیرگی پر نور سا برسا رہے ہیں وہ
دبے پاؤں مرے حسرتکدے میں آ رہے ہیں وہ

گماں ہوتا ہے دل کی دھڑکنوں پہ مجھکو آہٹ کا!

اولاد پیدا کرنے کی ترکیب

ایک ہندوستانی لیڈی ڈاکٹر کا عجیب و غریب کمال

ہندوستان میں ایسے ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جنکے پاس مال و دولت سب کچھ ہے مگر ان کے ہاں اولاد نہیں ہوتی اور وہ اولاد کیلئے ہزاروں جتن کرتے ہیں مگر ناکامی ہوتی ہے۔ اس ضرورت کو سائنس والے سالہا سال سے محسوس کر رہے تھے اور اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح کوئی ایسی ایجاد کیجائے جسکے ذریعہ انسان اولاد کی کمی پر قابو پا سکے۔ چنانچہ برسوں کی لگاتار کوشش اور تجربہ کے بعد آخر کار سائنس نے ایک کروٹ بدلی اور ان لوگوں کو کامیابی حاصل ہو گئی۔ سائنس کا یہ زندہ کارنامہ کئی سال سے تجربہ میں آرہا ہے اور ہر جگہ کامیابی ہوئی ہے۔

اولاد پیدا کرنے کی ترکیب سائنس کے اصولوں پر ایک خاص دوا تیار ہوئی ہے۔ ہندوستانی زبان میں اس دوا کا نام "محافظ اولاد" ہے اور اسمیں عجیب اثر یہ ہے کہ یہ دوا مسلسل سات رات تک عورت کو کھلائی جاتی ہے۔ ان سات دن میں وہ مرد سے بالکل علیحدہ رہتی ہے اور ٹھیک آٹھویں رات عورت مرد اس پرہیز کو توڑ دیتے ہیں تو اسی رات عورت کو حمل رہ جاتا ہے اور ٹھیک نو مہینے بعد ایک جیتا جاگتا بچہ عورت کی گود میں ہوتا ہے۔ تجربہ کے دوران میں بھی اس عجیب دوا کی بدولت ہزارہا عورتوں کے ہاں اولاد ہونا شروع ہو گئی۔ ایجاد کرنے والے کو اپنی اس ایجاد پر بڑا فخر ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس نے دنیا کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ لہذا اس اعلان کے ذریعہ اطلاع دیجاتی ہے کہ اگر کسی عورت کے ہاں اولاد نہ ہوتی ہو اور نہ ہونیکا کوئی سبب ہو تو اسے چاہئے کہ مسلسل سات رات تک "محافظ اولاد" کی ایک ایک خوراک استعمال کرے اور ان سات دن تک مرد سے بالکل علیحدہ رہے اور ٹھیک آٹھویں رات پرہیز توڑ دے یعنی مرد عورت ایک جگہ ہو جائیں تو اسی رات حمل قائم ہو جائے گا — "محافظ اولاد" کی ایک شیشی میں ایک عورت کے لئے پوری سات خوراک دوا ہوتی ہے۔ اور ایک شیشی کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔ جسے ضرورت ہو ——— وہ

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے۔ بی نمبر ۳۴ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر یہ دوا بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لے۔ پارسل پر سات آنے محصول لگتا ہے۔

امساک

اگر مردانہ طاقت میں کمی ہو تو سرعت انزال وغیرہ کی شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایسے لوگوں کے ہاں اولاد بھی نہیں ہوتی۔ مردانہ طاقت کا وقت کچھ دیر قائم رہنا ضروری ہے۔ جو لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں یعنی مردانہ طاقت فوراً ختم ہو جاتی ہے، انہیں چاہئے کہ سائنس کی نئی ایجاد سے امداد لیں۔ یہ ایک دوا ہے جس کا نام **فارلانگ** ہے یہ عجیب و غریب ایجاد نہ کھائی جاتی ہے نہ لگائی جاتی ہے بلکہ اس دوا کا ایک قطرہ مرد اپنی ناک کے نیچے مونچھوں کی جگہ پر لگا لیتا ہے۔ دس منٹ کے اندر اندر یہ دوا مرد کے جسم میں مردانہ قوت کو کافی مضبوط اور دیرپا کر دیتی ہے اور ضرورت کے وقت قوت مردمی **مناسب وقت تک قائم رہتی ہے**۔ اسکے علاوہ اس دوا کا اثر مرد کے جسم میں تقریباً سات گھنٹہ تک برقرار رہتا ہے۔ اس دوا کی زیادہ وضاحت مناسب نہیں ہے۔ عقلمندوں کے لئے اشارہ کافی ہے۔ ایک شیشی فارلانگ جو عرصہ کے لئے کافی ہوتی ہے کی قیمت صرف تین روپے سات آنے ہے پارسل پر سات آنے محصول لگتا ہے۔ ہر قسم کے نشہ کی آمیزش سے یہ دوا پاک ہے اور کسی حال میں نقصان نہیں کرتی۔ کمزور مردوں کو چاہئے کہ وہ

مینیجر آل انڈیا میڈیکل سٹور اے بی پوسٹ بکس نمبر ۱۵ دہلی

کے پتہ پر خط لکھ کر بذریعہ وی پی پارسل منگا لیں

داستاں میری

از جناب ایم۔ اسمٰعیل فہمی صدیقی

میں انساں ہوں نہیں ہے دسترس آخر کہاں میری
یہ صبح و شام میرے، چاند میرا کہکشاں میری

شب تاریک کے سینے سے اُٹھیں نور کی موجیں
وہ غم خانے میں آئیں ایسی قسمت ہے کہاں میری

سنانے کو سنا دوں میں فسانہ دکھ بھرے دل کا
مگر یہ تو کہو سن بھی سکو گے داستاں میری

نہ جانے کیوں شب غم جب لب فریاد ہلتے ہیں
نظر رہ رہ کے اُٹھ جاتی ہے سوئے آسماں میری

میں اُس پر گُل کھلاؤں گا میں اس پر گنگناؤں گا
کوئی لا دے قفس میں مجھکو شاخ آشیاں میری

وہ محفل میں رکھیں محدود لطف خاص کو اپنے
نہ جانے کیا سمجھ لے یہ نگاہ بدگماں میری

انہیں اک گیت سازِ دل پہ اُلفت کا سُناتا ہے
ذرا سی دیر کو ہو جائے فطرت ہمزباں میری

ہیں ہر اک لفظ میں اس کے ہزاروں لذتیں پنہاں
مجھے ہے ناز اے فہمی کہ ہے اُردو زباں میری

دھرتی ماتا!

شہرۂ آفاق امریکن مصنفہ پرل بک کے مشہور ناول گڈ ارتھ کا اُردو ترجمہ

(اس کتاب پر مصنفہ کو نوبل پرائز مل چکا ہے!)

(یہ کتاب تمام دنیا کی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے!)

(اس کی فلم دنیا کے تمام شہروں میں دکھائی جا چکی ہے!)

(اس کتاب کا ترجمہ پنجاب کے نوجوان ادیب ابو سعید قریشی بی۔اے نے کیا ہے!)

(قیمت ... 1/12/)


لاہور
ہندوستان کا بہترین ماہوار رسالہ



اس مشہور و معروف کتاب میں بادشاہ سے لیکر فقیر تک کا اپنا اپنا روزنامچہ درج ہے کتاب کے پڑھنے سے تمام دنیا کے پر اسرار راز آپکے سامنے آ جائینگے۔

آج ہی آرڈر روانہ کریں، قیمت صرف ایک روپیہ

(ملنے کا پتہ عالمگیر بکڈپو مسجد متّھا بازار لاہور)

زینت آرا بیگم: جی نہیں۔ کوئی خیر کی بات نہیں ایک شریف گھرانے کی عورت کو بیاہ لائیں۔ پھر اسے اپنی بے حد بے پروائی سے مومی موت کے دن بتیر کرنے پر مجبور کردیں۔ اور خود کسی بیسوا کے ہولیں بس یہی خیر کی بات ہے

آصف بیگ: کیا معنی؟

زینت آرا بیگم: آپ معنی سمجھ چکے۔

آصف بیگ: تو کیا تمہارا یہ مطلب ہے۔ کہ میں تمہاری دلجوئی میں کوتاہی سے کام لیتا ہوں؟

زینت آرا بیگم: جی نہیں تو اور کیا؟ دن احباب میں گزرتا ہے۔ رات گھر سے باہر بسر ہوتی ہے رہی میں اور میری دلجوئی تو اس کے لئے آپ کا ہمزاد، یہ خاموش سنگدل دیواریں اور یہ سنسان حویلی ہے۔ میں بے شک اس میں بے تکلفی رہوں۔

آصف بیگ: اوف، ہندوستانی عورتیں کیسی جلی کٹی باتیں بنانے کی عادی ہیں

زینت آرا بیگم: آپ یہ کلمات زرنگار کے کان میں کہئے! وہ تو شیدہ فرنگن ہے مجھے صاف صاف کہئے کہ آپ کا ارادہ کیا ہے!؟

آصف بیگ: ارادہ؟ یہ میرے ارادے کی تمہیں کیا سوجھی؟

زینت آرا بیگم: مجھے؟ مجھے آپ کے ارادے ہی کی نہیں اس کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں کی سوجھی ہے۔ مجھے بیاہنے سے پہلے آپ نے کیوں نہ صاف بیانی سے کام لیا اور کیوں نہ بتایا۔ کہ آپ کسی بیسوا کے بن چکے ہیں؟ اب میرے نہیں ہو سکتے۔

آصف بیگ: مجھے اپنی شرافت برقرار رکھنے اور پردہ پوشی کے لئے ایک خاندانی عورت مطلوب تھی۔

زینت آرا بیگم: یہ غلط ہے آپ کے پاس فقط چند خادماؤں کی ضرورت تھی

آصف بیگ: یہ ہے تو ان خادماؤں کی نگرانی کے لئے ایک معزز بیوی کی ضرورت تھی۔

زینت آرا بیگم: مجھے آج زندگی کا اہم فیصلہ کرنا ہے۔ میں جرأت سے پوچھتی ہوں کہ آپ میرے حق میں کیا سلوک روا رکھیں گے؟

آصف بیگ: سلوک؟ کیا موجودہ سلوک تمہارے نزدیک مشکوک ہے؟

زینت آرا بیگم: آپ زیادہ متانت سے کام لیں میں زندگی کا قطعی فیصلہ مانگتی ہوں۔ مجھے اب آئندہ آپ کے رحم و کرم پر نہیں جینا۔ آپ میرے حقوق پورے کر سکتے ہیں یا نہیں؟

آصف بیگ: حقوق؟ کیا مامائیں تمہاری خدمت میں کوتاہی کرتی ہیں۔ یا میں ماہانہ خرچ کم دیتا ہوں۔؟

زینت آرا بیگم: آپ ابھی میری باتوں کو پوری اہمیت نہیں دے رہے میں اپنی تنہائی ختم کرنے پر تلی ہوں۔ آج مجھے قدرت کے روزنامچے میں اپنی مرضی کے مطابق اندراج کرنا ہے۔ آپ مجھے طرح دینے کی کوشش نہ کریں! میں نہیں چاہتی کہ آپ کو ایک بامروت انسان کی شکل میں دیکھوں آپ میرے لئے "اکھل کھرے" ہو جائیں! ریاکاری اور زبانی دلجمعی ترک کردیں! میں آپ کے چنگل سے رہائی چاہتی ہوں۔

آصف بیگ: (متعجب ہو کر) رہائی؟ کیا تمہیں طلاق کی ضرورت ہے؟

زینت آرا بیگم: یقیناً طلاق کی ضرورت ہے۔ شادی کرتے وقت جو آپ نے زندگی مجھ سے لی تھی۔ وہ مجھے سونپ دیں اور اپنی زندگی آپ سونپ لیں!! "مرد بیوی کا لباس ہے اور بیوی مرد کا" ہم اپنے اپنے لباس اتار دیں اور ایک دوسرے کے حوالے کردیں

آصف بیگ: نہیں نہیں! شریف گھرانوں میں یوں نہیں ہوا کرتا۔

زینت آرا بیگم: شریف گھرانوں میں بیسواؤں سے بھی ناطہ نہیں جوڑا جاتا۔

آصف بیگ: ٹھہرو ٹھہرو!! جلدبازی سے کام نہ لو!

زینت آرا بیگم: تین برس کے صبر آزما انتظار کو آپ جلدبازی نہیں کہہ سکتے

آصف بیگ: پھر کیا میں طلاق دے دوں؟

زینت آرا بیگم: ضرور۔ طلاق میری مشکلات کا حل ہے

آصف بیگ: لیکن طلاق لے کر تم کہاں جاؤگی؟

زینت آرا بیگم: بہار میں۔

آصف بیگ: آخر میں بھی تو جانوں۔

زینت آرا بیگم: "جب لومڑیوں کے بھٹ ہوتے ہیں اور ہوا کے پرندوں کے گھونسلے تو کیا حوا کی بیٹیوں کیلئے سر دھرنے کی بھی جگہ نہیں؟"

آصف بیگ: نہیں نہیں یہ وسوسے دور کرو! بے کار باتیں باؤلا کر دیتی ہیں۔ نیک خیالی اور نیک خصالی اختیار کرو۔

زینت آرا بیگم: جیسا کہ آپ کرتے ہیں۔ براہ عنایت آپ دور جانے کی کوشش نہ کریں! مجھے طلاق چاہئے۔

آصف بیگ: اس کے لئے وقت کی ضرورت ہے۔ مجھے سوچنا ہے

زینت آرا بیگم: بس سوچ چکے۔ اگر سوچتے تو یہ نوبت ہی کیوں آتی آپ مجھے مساوات کا درجہ دیں اور۔ کام آپ نے کیا دوسرے کا اختیار مجھے دیں شادی آپکی رضامندی سے ہوئی طلاق میری رضا سے ہو

آصف بیگ: (پیچھا چھڑانے کی غرض سے) سب کچھ ہو جائے گا لیکن ابھی نہیں اسوقت تو میں باہر جانے کو تیار ہو کر آیا ہوں

زینت آرا بیگم: غلط۔ اب آپ کو نہیں مجھے باہر جانا ہے۔

آصف بیگ: خیر اس وقت مجھے باہر جانے دو۔ میں ابھی اُلٹے پاؤں لوٹا آتا ہوں۔

زینت آرا بیگم: یہ آنا جانا بند کریں! ورنہ مجھے بتائیں۔

آصف بیگ: واہ! اتنی بیتابی! کوئی منہ کا نوالہ تھوڑی ہے ذرا دم لو! میں واپس آیا جاتا ہوں بس آ ہی لیا۔

زینت آرا بیگم: لیکن . . . . !

مرزا آصف بیگ یہ جا وہ جا۔

مرد کی بے پروائی کتنا بڑا عذاب ہے۔ عورت کی جگر سوزی اس کا خاتمہ کرنے پر قادر نہیں۔ بیوی بیوی ہے شوہر شوہر کیا میں زرنگار سے بھی گئی گزری ہوں۔ بازار میں بکنے والی جنس ایسی ہی نایاب ہے کہ اس کیلئے عزت، بیوی اور گھر بار اجاڑ دیا جائے ؟ آہ ! میں کتنی بے دست و پا ہوں! کس منہ سے کہوں کہ میں حوصلہ مند ہوں؟ میں ابھی تک شوہر کی پابندی میں ہوں آج کی رات بھی گذر جائے گی اور میں ویسی کی ویسی رہ جاؤں گی۔ آج کی رات میری شادی ہوئی اور آج ہی کی رات اس شادی کا انجام ہونا چاہئے مجھے آصف کے دوزخ میں زیادہ دیر تک نہیں رہنا چراغوں کی آخری لو سے پہلے پہلے سب کچھ ہو جائے گا اور میں ان کی جلتی ہوئی آنکھوں سے اوجھل ہو جاؤں گی! میرے نصیب !

اُٹھ کھڑی ہو جاتی ہے

دوسرا منظر

نگار منزل کا بالائی کمرہ۔

زرنگار گہری سوچ میں، گاؤ تکیے پر سر رکھے، اوندھی پڑی ہے۔ آہستہ آہستہ سر کو بلند کرتی ہے

زرنگار: رقاصہ کی زندگی گناہ کی پوشش ہے۔ جس میں پرہیزگاری نام تک کو نہیں۔ آہ!

زندگی کا پہلا اختیار فطرت کے ہاتھ میں تھا کہ میں نے بیچ گھر میں جنم لیا۔ لیکن دوسرا اختیار میں اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہوں اور وہ یہ کہ میں بدی کی راہ سے ہٹ جاؤں اور نیکی کی راہ پکڑ لوں۔ فی الحال میری زندگی کتنی شرمناک ہے ادنیٰ اور اعلیٰ ہر درجے کے انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مجھے اپنی ہوس کا آلہ بنا لے۔ میں کسی کے بڑھتے ہوئے حوصلے کی روک تھام نہیں کر سکتی۔ آہ! ہمارا سماج کس حقارت کے لائق ہے؟ وہ مجھے کامل بے غیرتی سے اخلاق سوز زندگی بسر کرنے کی راہ دیتا ہے اگر زندگی اسی کم ظرفی کا نام ہے تو مجھے

اس کی ضرورت نہیں۔ کتنا غضب ہے کہ ہر اہل و نااہل کی بے باکانہ نظریں مجھے والہانہ گھورتی ہیں اور ہر کس و ناکس کی آرزو میری جانب قدم بڑھاتی ہیں کیا میں گناہ کا اشتہار ہوں؟ کیا مجھے دیکھتے ہی لوگوں کے دل میں شیطانی وسوسہ پیدا ہو جاتا ہے؟ ان کی پارسائی کہاں گئی؟ کیا میں حیادار عورت نہیں بن سکتی؟

غفور داخل ہوتا ہے۔

غفور: کیوں نہیں؟ ضرور بن سکتی ہیں۔ انسان جب چاہے نیکی اختیار کرے

زرنگار: تم میرے ملازم ہو تاہم میں تمہاری قدر کرتی ہوں۔ جبکہ دنیا میری آنکھوں میں اندھیر ہو رہی ہے۔ تم مجھے ہراساں ہونے سے بچا رہے ہو تمہارے الفاظ مجھ ڈوبتی کو تنکے کا سہارا ہیں۔

غفور: بائی صاحبہ میں ملازم سہی لیکن تھوڑی سی سمجھ ضرور رکھتا ہوں آپ کی فلاح کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ آپ پردہ دار ہو جائیں

زرنگار: آہ! یہ راہ تو دور ہے۔ میں تو فی الحال فقط اس اُجلے کپڑے اور آرائشی زندگی کے گناہوں سے رہائی پانا چاہتی ہوں! اس کے بعد اگر مجھے گلی کی نکڑ پر کھڑے ہو کر بھکارن کی صدائیں لگانی پڑیں تو غنیمت ہے

غفور: بھکارن!؟ (کانوں پر ہاتھ دھر کر) توبہ! توبہ! جلتی ہوئی قندیل ہوا کے جھونکے سے بجھنے کو گلی میں نہیں رکھی جاتی۔ بلکہ دل میں روشن کی جاتی ہے

زرنگار: غفور! یہ ٹھیک سہی لیکن بھکارن بننا عیب نہیں۔ بھکارن رقاصہ سے اچھی ہے میں بھکارن بنی تو خود سے اچھی ہو جاؤں گی بھکارن پارسا رہ سکتی ہے لیکن رقاصہ کے لئے یہ دشوار ہے میں گناہ کے حصار سے آزاد ہوا چاہتی ہوں گناہ نیکیوں کو کھا جانے والی بلا ہے۔ ایک حیوان سوئی کے ناکے سے گذر سکتا ہے لیکن گناہگار خدا کی بادشاہت میں قدم نہیں دھر سکتا۔ جب تک وہ گناہ سے توبہ نہ کرے۔

غفور: خدا کی قسم آپ بدل چکی ہیں۔ جس نے نیکی کا ارادہ کیا۔ اس نے نیکی کر لی آپ پارسا ہیں اب گناہ کی موجودہ زندگی میں آپ کے لئے گنجائش نہیں

زرنگار: ہاں اب گناہ کا لباس مجھے اتارنا ہوگا یہ ریشم کی ساڑھیاں میرے جسم کو کیل کانٹا بن کر چبھتی ہیں۔ یہ گدے، یہ تکیے یہ توشک . . . . اوہ! ہر چیز پتھر سے زیادہ سخت ہے۔ اے کاش! میں گناہ کی کینچلی اتار پھینکنے کے قابل ہو جاؤں۔



دارا شکوہ ۔ مراد بخش ۔ اورنگ زیب عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ

لغزش

ڈراما

از جناب رحمٰن مذنب

افرادِ تمثیل

مرزا آصف بیگ .... ایک جاگیردار
زینت آرا بیگم .... جاگیردار کی اہلیہ
زرنگار .... رقاصہ
غفور .... ملازم
امیرن بائی .... رقاصہ کی والدہ

مقام ایک ترقی یافتہ شہر
زمانہ چند سال ادھر، کاظمی بل سے پہلے

پہلا منظر

شام سے کچھ پہلے:-

زرد زرد آفتابی کرنیں آخری بار بلندیوں کا جائزہ لے رہی ہیں لمبے لمبے سائے تاریکی کی پیشوائی کر رہے ہیں شب برات کی خوشی میں کڑوے تیل کے دیئے جلنے لگے زینت آرا بیگم اپنے کمرے میں غمگین بیٹھی ہے۔

زینت آرا بیگم:- کیا یہی زندگی قدرت کا شاہکار ہے ہائے کاش! وہ مجھ میں زندگی کی رسوائی کا معرکہ دیکھ لے! آج میری شادی کا تیسرا باب لوحِ محفوظ پر ختم ہوتا ہے میرے نصیب کو آصف کے پلے پڑے تین سال ہو لئے ظالم نے بیدردی سے میرے کرم پھوڑ دیئے۔ اب میں آصف کی بجائے کسی اور نامراد کے ہاتھ لگ جاؤں تو میں گلہ نہیں کروں گی۔ مجھے خوب سزا ملی لیکن میری خطا کیا ہے؟ یہی کہ کچھ خطا نہیں کیا قدرت کے کارخانے میں بے گناہ ہونا بھی جرم ہے؟ نہیں تو پھر سزا کیوں؟ شاید سزا اس لئے ہے کہ آدمی گناہ کرے میرے لئے گناہ کا راستہ صاف ہے آج مراد کی رات ہے (دعا مانگتی ہے) اے فرشتگانِ قضا! میرے موجودہ حالات بدل دو اگر تمہارے جی میں آئے تو بیشک انہیں پہلے سے بھی بدتر کر دو! میں بہ دل راضی ہوں مجھے ابن مریم نہ سمجھو جو موت کو فریب دیکر کہہ اٹھے "اے باپ! اگر ہو سکے۔ تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے!" میں بد سے بدتر حالت دیکھنا قبول لیتی ہوں

دوسرے کمرے سے آصف بیگ سیاہ اچکن پہنے، رومی ٹوپی سر پر دھرے اور ہاتھ میں چاندی کی چھڑی لئے آجاتا ہے۔

آصف بیگ:- بیگم! بھلی کئی آرزوئیں نہ کرو! یہ قبولیت کی رات ہے بارگاہِ ربی میں شنوائی ہو رہی ہے۔

زینت آرا بیگم:- پھر میں مسرت بھری آرزوئیں کس دل سے کروں؟ ہاں یہ تب ممکن ہے کہ قدرت آپ کے بخت مجھے اور میرے بخت آپکو دیدے

آصف بیگ:- توبہ! توبہ! آج کی رات یوں مت کہو! تمہارا بخت تمہارے اور میرا بخت میرے ساتھ رہے۔

زینت آرا بیگم:- جی ہاں آپ کیوں بخت پلٹوانے لگے۔ آپ تو مطمئن ٹھیرے ہمیں نے کسی کا کچھ بگاڑا ہے کہ اڑائی گھٹوائی پڑے دن کاٹ رہے ہیں

آصف بیگ: اوہو! میرا یہ مطلب نہیں کہ میں مطمئن ٹھیرا اور تم . . . .

زینت آرا بیگم: (بات کاٹتے ہوئے) ہاں، ہاں، آپ تکلیف نہ کریں! میں سمجھ گئی۔ یہی کہ میں مطمئن ٹھیری اور آپ نامطمئن۔ پروردگار رحم کیا کرے

آصف بیگ: لاحول ولا قوۃ۔ سب دعائیں آج ہی کے لئے اٹھا رکھی ہیں کوئی خیر کی بات ہی نہیں؟

غفور:- بائی صاحبہ! اگر آپ گستاخی پر محمول نہ کریں۔ تو میں کچھ کہوں!

زرنگار:- غفور! کہو! تمہارا کیا مطلب ہے؟

غفور:- یہی کہ آپ کو اسی ساعت گناہ کے چنگل سے چھڑا لوں۔

زرنگار:- وہ کیسے؟

غفور:- وہ ایسے کہ۔ ۔ ۔ آپ مجھے زوجیت کا شرف بخشیں!

زرنگار:- ہائیں! غفور! کیا تم میری مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی فکر میں ہو

غفور:- نہیں تو۔

زرنگار:- پھر تم مجھے اپنی حالت پہ کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟

غفور:- بائی صاحبہ! یہ بھی تو ایک نیکی کا راستہ ہے۔

زرنگار:- لیکن مجھے اس کے لئے مجبور نہیں کرنا چاہئے۔ میں پوری سوچ کے بعد اسے اختیار کروں گی۔

غفور:- تو بائی صاحبہ! معاف فرمائیں! میں آپ کی اس سوچ کو بہت جلد ختم کر دوں گا۔

زرنگار:- کیا معنی؟

غفور:- یہ کہ آپ میرے بس میں ہیں۔

زرنگار:- وہ کیونکر؟

غفور:- وہ کیونکر؟ (قہقہہ لگاتے ہوئے) آپ نہایت سادہ لوح ہیں۔ کیا آپ جانتی نہیں کہ آپ کی زندگی کا اختیار امیرن بائی کی گرفت میں ہے جن کی صورت سے شیطان تک کانپتا ہے۔

زرنگار:- تو پھر؟

غفور:- میں ابھی جا کر ان کے کان بھر دوں گا۔ اور پھر وہ آپ کے تمام خیالی گھروندوں کو "تہس نہس" کر کے رکھ دیں گی

زرنگار:- نہیں نہیں! غفور! مجھے تباہی کے گڑھے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مت دھکیلو! میں عذاب سے تنگ آ چکی ہوں۔

غفور:- ہرگز نہیں اگر تنگ آ چکیں تو لیت و لعل نہ کریں۔

زرنگار:- غفور! بغیر سوچے کوئی کام کرنا حماقت ہے۔ جلد بازی شیطان کا شیوہ ہے۔

غفور:- خیر آپ کو پتہ لگ جائے گا کہ دیر کرنا اس سے بھی بدتر ہے۔

نچلی سیڑھیوں پر سے امیرن بائی کے اوپر آنے کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ غفور چپ چاپ زرنگار کے کمرے سے کھسک جاتا ہے۔ زرنگار ہوشیار ہو جاتی ہے۔ امیرن بائی داخل ہوتی ہے۔

امیرن بائی:- کیوں بیٹی! تو ابھی یہیں ہے۔ میں نے تو غفور کو بھیجا تھا کہ تجھے بلا لائے۔ نیچے مرزا آصف بیگ آئے بیٹھے ہیں بیچارے کو کتنی دیر ہو گئی۔ وضعداری اچھی چیز ہے ہمارا تو پیشہ وضعداری ہے ان کا دل رکھنا چاہئے آج ہی انہوں نے تین سو کی رقم میری نذر کی ہے

زرنگار:- جانتی ہی کہ ہوں طبیعت کی ناسازی کے باعث یہاں بیٹھی ہوں۔ ورنہ کبھی کی نیچے جا چکی ہوتی۔

امیرن بائی:- کیا کریں؟ بیٹی! یہ کام ہی ایسا ہے۔ ہمیں اپنا وقت یاد ہے بیمار ہیں آنا رہیں۔ لیکن دوسرے تو اچھے بھلے ہیں۔ سب کی خاطر داری ضروری جانی۔

زرنگار:- ماں! جب یہی ہے تو کیوں نہ پھر ہم کسی دوسرے راستے ہو لیں

امیرن بائی:- تمہیں بیٹی! میرا یہ مطلب تھوڑی تھا کہ ہم اپنا آبائی پیشہ ترک کر دیں۔ بلکہ ہمیں ہر حال میں خوش رہنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔ زندگی کی خوشی ہر کہیں ملتی ہے۔ ذرا عقل اور کوشش کی ضرورت ہے ہم کتنے بڑے ہی مگر بڑے بڑے نیم تمندوں کی پگڑیاں ہمارے قدم لیتی ہیں آخر ہزاروں سے اچھے ہیں آرام تو شہزادوں سا نصیب ہے۔ تمہارا اور شرفا شوق سے ہمارے ہاں آتے ہیں اور زر و زمن برساتے ہیں۔ تُو تو باؤلی ہے۔ جا نیچے مرزا صاحب کی تشفی کر آ!

زرنگار:- ہاں، یہ فن تو میں نے پیدائش ہی سے سیکھا ہے۔ یہی تو ہمارا مقصد زندگی کا بازاری مقصد ہے

نیچے چلی جاتی ہے۔ مرزا آصف بیگ استقبالاً مسکرا پڑتے ہیں۔

آصف بیگ:- آخا! تم آ گئیں۔ اوپر سے یوں اتر آئی ہو۔ جیسے زہرہ آسمان سے یہاں آ گئی ہو۔

زرنگار:- جی ہاں، یہ آپ اپنے بہلاوے کی خاطر فرما رہے ہیں۔

آصف بیگ:- نہیں تو، زرنگار! تم میرے بہلاوے کے لئے نہیں ہو۔ بلکہ میری زندگی کا قیمتی جوہر اور میری تقدیر کا لوح محفوظ ہو میرا دل گواہ ہے۔ مجھے دنیا میں سب سے زیادہ تمہاری قدر ہے۔

زرنگار:- یہ سب درست ہے مرد عورت سے ہر کام لفاظی سے لیا کرتا ہے اور لفظ۔ ۔ ۔ معنی سے خالی کیا معنی رکھتا ہے۔ ۔ ۔ ۔

ہم اپنی گری ہوئی زندگی کے باعث حقیر ہیں۔ ہماری زندگی گناہ کی منڈی ہے۔ گناہ کے سوداگر یہاں آ کر گناہ کا بیوپار کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ نفع کی کمائی کر رہے ہیں۔

آصف بیگ:- ہم تو پھر گناہ کے سوداگر ٹھیرے؟

زرنگار:- کیوں نہیں؟ ہماری زندگی گناہ کی دنیا ہے۔ اور ہماری چار دیواری گناہ کی پناہ گاہ۔ نیکی کی صعوبت سے بھاگ کر آئے

ہوتے انسان یہاں آکر جان بچاتے ہیں۔ آہ! وہ زندگی کی کھیتی میں
گناہ کی کاشت کرتے ہیں۔

آصف بیگ:۔ نہ جانے یہ نئی پٹی تمہیں کس نے پڑھائی ہے۔ کہ بے رُخی
کی باتیں کر رہی ہو؟

زرنگار:۔ بے رُخی؟ ہاں زندگی کا کوئی رخ نہیں۔ سیدھی بے رخ
ہے آج میں آپ سے دل کی کہنا چاہتی ہوں—
آئیے! یہاں سے چلیں!! اس جگہ آزادی سے گفتگو نہیں ہو سکتی
پچھلے کمرے میں چلتے ہیں!

آصف بیگ:۔ ہاں، ہاں، اٹھو! چلتے ہیں۔

اٹھ کر سامنے دالان میں سے گزرتے ہوئے دائیں پہلو کے
ایک کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ کمرہ اُجلا ہے اور نہایت سادہ

زرنگار:۔ گناہ کی دنیا اندھیرے کمرے کی مانند ہے۔

زرنگار بٹن دبا کر بجلی روشن کرتی ہے۔

جب اس میں نیکی کی قندیل جلتی ہے تو یہ نورانی ہو جاتی ہے

آصف بیگ:۔ تعجب ہے کہ تم آج ضرورت سے زیادہ پارسا بن رہی ہو

زرنگار:۔ پارسا؟ پارسا بننے میں عیب نہیں ہر ایک پارسا بن سکتا
ہے صرف اتنا فرق ہے کہ شریف کیلئے زیادہ سہولت ہے۔ اور
رذیل کیلئے کم۔ پارسائی کسی کا اجارہ نہیں۔

آصف بیگ:۔ پارسائی؟ زرنگار! پارسائی کا ذکر مت کرو! شراب
سے بہکے ہوئے آصف کیلئے پارسائی بدترین گناہ ہے۔

زرنگار:۔ اُف! اُف! آپ کی شراب خرابی کے لئے ہے۔

آصف بیگ:۔ زرنگار! تم بھول رہی ہو۔ آج تم پارسا بن گئی ہو حالانکہ
تمہیں نے سکھایا تھا۔ کہ پارسائی ایک روکھی پھیکی چیز ہے۔ اور
گناہ ایک رنگیں خواب۔

زرنگار:۔ افسوس! آپ سوئے رہے۔ میں تو بھول کے بعد وہ بننا
چاہتی ہوں جو کبھی آپ گناہ کی سرحد میں داخل ہونے سے پہلے
ہوں گے اور آپ بھول سے وہ بن رہے ہیں جو میں آجتک تھی

آصف بیگ:۔ نہیں نہیں۔ میں ایک آرٹسٹ ہوں۔ آرٹسٹ کے نزدیک
گناہ اور پارسائی ایک برابر ہیں۔

زرنگار:۔ توبہ۔ توبہ۔ آرٹ اور گناہ۔ بیسویں صدی میں اتنا بوسیدہ
خیال کتنی گھٹیا بات ہے گناہ اور پارسائی ہرگز ایک برابر نہیں
ایک سے زندگی کو زوال اور ایک سے کمال ملتا ہے آپ کیونکر
زوال کو برداشت کرتے پڑتے ہیں۔ زندگی کمال کی جانب پرواز
کرتی ہے اور آپ اسے پسند نہیں کرتے۔

آصف بیگ:۔ حیرت ہے کہ تم پارسائی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہو

زرنگار:۔ ہاں۔ ہاں مرزا صاحب! آپ آرٹسٹ ٹھیرے مگر اور نئے
دیجئے کہ آپ ذرا بلند ہو جئے! پارسائی بھی ایک خوبی ہے۔ اور
آرٹ کی جان ہے اسلئے کہ یہ لازوال ہے اور اس کا تعلق تخریب سے
نہیں بلکہ تعمیر اور تکمیل سے ہے آپ اسے ضمیر کی پاکیزہ بصیرت سے
دیکھئے! کتنی صاف اور بے عیب ہے! زندگی کا مقصد اس سے
بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ ہم پارسا بنیں؟

آصف بیگ:۔ کون فرشتہ ہے جو تمہارا سینہ شق کر کے اسے روشن
کر گیا ہے؟

زرنگار:۔ فرشتہ؟ آدمی کے اندر سب کچھ ہے۔ جبریل بھی اور عزازیل
بھی۔ یہ اللہ کا دین ہے کہ وہ نیک راستے پر آجائے۔

آصف بیگ:۔ میں آج تمہیں بالکل نئے لباس میں دیکھ رہا ہوں

زرنگار:۔ یہ میری خوش بختی ہے کہ میں نئے لباس میں ہوں۔ یہی کمرہ
جس میں آپ بیٹھے ہیں اللہ کی رحمت کے نزول کی بارگاہ ہے میں
یہاں چوری چھپے ربّ العزت کے حضور میں فریاد رس ہوا کرتی
ہوں اور میری ہدایت کا پہلا سبب کتابِ الٰہی ہے۔ جس نے مجھے
زندگی کا صراطِ مستقیم دکھایا۔

آصف بیگ:۔ زرنگار! تم پارسا ہو میرا یا ہدایت ہو۔ اللہ تمہیں اپنے
مہربانی کے سائے میں رکھے! آمین! تم مجھے بھی نئی زندگی دے رہی
ہو۔ میں نے غفلت میں گناہ کی کیاری بوئی تھی اور بدی کی درانتی
سے نیکی کی فصل کو کاٹ دیا تھا شکر الحمد للہ تم نے کم نصیب آصف کو
جہنم کی آگ سے بچالیا۔ کیا ہم ہمیشہ تک کیلئے ایک ہو سکتے ہیں؟

زرنگار:۔ یقیناً اللہ کا راستہ ہر کسی کے لئے ایک ہی ہے۔ ہم دونوں بھی
اس پر چل سکتے ہیں

آصف بیگ:۔ تو آؤ! گناہ کی اس شیطانی سلطنت سے باہر چلے جائیں
خدا کی بادشاہت کا دروازہ ہم پر کھل جائے گا۔

زرنگار:۔ ہاں۔ ہاں!! ضرور چلئے!

گناہ کی دنیا کا سہاگ لٹ گیا۔ وہ ابلیسی بہشت اُجڑ گئی جس
کی رونق ایک حور سے قائم تھی۔ نہیں! نہیں! ایک پری سے جو اب
حور بن گئی تھی۔ وہ رہزن جو پرہیزگاری پر چھاپا مارتی تھی وہ فرائض
جو نیکی کو ایک گھونٹ میں گٹکا جاتی تھی۔ اور وہ ناگن جو زندگی کی شہد

کوڈستی تھی آج خدا دست بن گئی ہے

پہلا شخص غفور ہے جسے یہ پتہ چلتا ہے کہ زرنگار تائب ہوکر اپنے نیک ارادے کی تکمیل کیلئے الوداعی طور پر داغِ مفارقت دے گئی اب وہ اور ایرن بائی اکیلے اس عزا زیلی کائنات میں دوزخ کے سانس لینے کو رہ گئے ہیں۔

. . . دونوں بدحواس ہوکر دالان کے برآمدے میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

ایرن بائی: چلی گئی؟ وہ نکٹی! جھاڑو پٹی، چلی گئی؟

غفور: ہاں، اماں! چلی گئی۔ اس کی روپہلی جوتی، زمردی ساڑھی جمپر زیور ویور سب اترے پڑے ہیں۔

ایرن بائی: غفور! بھلا اسے کیا سوجھی؟ کیا اب وہ نہ آنے کیلئے دفعہ ہوئی ہے؟

غفور: ہاں، اماں! نہ آنے کے لئے۔

ایرن بائی: آخر وہ کیوں یہاں سے گئی؟

غفور: اس کی پارسائی اسے بھگا لے گئی۔

ایرن بائی: پگلی لونڈی ایک ناچنے والی کو پارسائی سے کیا واسطہ؟

غفور: اماں! زرنگار پارسا بن گئی تھی۔ میں نے اسے کئی بار پچھلی رات خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگتے دیکھا۔

ایرن بائی: دعا مانگتے دیکھا۔ ہائے غفور! اس کی دعاؤں نے میری کمائی غارت کر دی وہ میرا دل کھینچ کر لے گئی۔ وہ میرا بیوپار تباہ کر گئی۔

غفور: اماں اس نے کسی کی پروا نہ کی۔ یہ بڑھیا سامان، یہ قندھاری قالین، یہ ایرانی پردے یہ گلابی بتیوں ایسے کپڑے سب اسے کاٹ کھانے کو چھپے

ایرن بائی: بیٹا وہ دیوانی تھی۔ اس نے ہماری آبادی کو اجاڑ دیا۔ آ! اس باؤلی کو ڈھونڈیں! شاید وہ واپس آجائے۔

دونوں اندھیری رات میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

آخری منظر پبلک پارک میں رات کے بھیانک لمحات

شمالی سرے کے اونچے اونچے یوکلپٹس بھوت کی طرح ہیں دہشت اور تنہائی ہیں نہ یہاں زندگی کا پیغام ہے اور نہ ہی کسی کیلئے دعوت۔ قدرت اپنی چشم مروت بند کئے بیٹھی ہے تیز ہوا ہچکی ہچکی پھر رہی ہے۔ آوارہ جھونکے تندی دکھا رہے ہیں۔ آسمان کی تاروں بھری محفل پر بادل جھونپ ہو جاتے ہیں، اور نور کی جمالی کائنات کا سہاگ لوٹ لیتے ہیں۔ تاریکی بڑھ جاتی ہے۔ شہر کے اندرون سے گھڑیال آدھی رات کے گزر چکنے کی منادی کرتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ ایسے خوف و ہراس میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسرافیل قیامت سے پہلے ایک دم جاگ اٹھا اور صورِ حشر پھونکنے لگ گیا۔

مغربی سمت سے کالے ملبوس میں لپٹی لپٹائی کوئی عورت آ رہی ہے۔ ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ گرتی ہے۔ جنوب مغربی گوشے سے ایک بڑھیا اور ایک نوجوان مرد بھٹکتے بھٹکتے آجاتے ہیں یہ ایرن بائی اور غفور ہیں۔ ایرن بائی ٹھوکر کھاتی ہے اور عورت پر گر جاتی ہے فی الآن ایرن بائی کی چیخ نکل جاتی ہے۔ اور وہ ناآشنا عورت بھی چلا اٹھتی ہے۔

ایرن بائی: ارے غفور! یہ کون؟

؟ اور آپ کون؟

ایرن بائی: (نسائی آواز پہچان کر) بیٹی! شکر ہے تو عورت ذات نکلی۔ تو یہاں کیوں پڑی ہے؟

عورت: میرے نصیب یہاں گڑے ہیں۔ انہیں کھوجنے آئی ہوں۔

ایرن بائی: لیکن رہزنوں کا خوف نہ ہوا؟

عورت: رہزنوں کا خوف؟ دنیا میں زندگی سے بڑھ کر اور کوئی خوف والی چیز نہیں۔

ایرن بائی: لیکن اتنی رات گئے تیرا آنا کیسے ہوا؟

عورت: جیسے آپ کا ہوا۔

ایرن بائی: ہم تو نصیب کھو بیٹھے ہیں۔ اللہ نے ایک جوان بیٹی دی تھی نہ جانے وہ کہاں بھاگ کر چلی گئی ہے۔

عورت: میں بھی جوان ہوں اور کہیں سے بھاگ کر چلی آئی ہوں۔

ایرن بائی: بھاگ کر؟

عورت: ہاں بھاگ کر۔ جب عورت کو جانوروں کی طرح چار دیواری پنجرے میں قید رکھا جائے تو انسانیت اس کی مدد نہیں کرتی مرد ہمدردی سے دور چلا جاتا ہے۔ ایسے میں بھاگنا ہی آخری علاج ہے۔ زندگی بھاگنے والی بلا ہے۔

ایرن بائی: اوہ! مرد ایک خاص درندہ ہے۔ جو عورت کو اپنے منہ کا نوالہ سمجھتا ہے۔ خدا پناہ! بھلا تو ہے کون؟

عورت: قسمت کی ہیٹی، بدبختی کی بیٹی۔ آج دنیا جہاں میں شب برات کے چراغ جل رہے ہیں لیکن میں ایک گھر سے بے چراغ ہو کر آئی ہوں

ایرن بائی: تو تو کوئی غمزدہ معلوم ہوتی ہے؟

عورت: عورتیں ہوتی ہی غمزدہ ہیں۔ ناانصافی اسے پنپنے نہیں دیتی۔

مرد اسے اپنے برابر نہیں سمجھتا۔ مرد مرد ہے۔ عورت عورت۔ تاہم اب میں آزاد ہوں۔ میں جوگن بن سکتی ہوں۔ پجارن بن سکتی ہوں۔ بھکارن بن سکتی ہوں۔

امیرن بائی:۔ توبہ! تیری بلا بنے قدرت نے خود ہی تیرا مِلن ہم سے کرا دیا ہے۔ اس میں کوئی راز ہے۔ میری بیٹی کہیں چلی گئی ہے۔ اس کے عوض تو مل گئی ہے۔ میں تجھے اپنی بیٹی ہی سمجھوں گی!

عورت:۔ تو کیا میں تجھے ماں کہوں؟

امیرن بائی:۔ ہاں، بیٹی!

عورت:۔ ماں!

امیرن بائی:۔ ہاں، بیٹی!

عورت:۔ ماں! کیا تو بھی اللہ کے گھر گئی ہوئی ماں کیطرح رحمدل ہو گی؟

امیرن بائی: ہاں، بیٹی!

عورت:۔ ماں! تجھ میں مامتا بھی ہو گی؟

امیرن بائی:۔ ہاں، بیٹی!

عورت:۔ ماں! اس میں تو قدرت نے روح اور لہو سے محبت کا خمیر اُٹھایا تھا

امیرن بائی:۔ بھولی بھالی بیٹی! تو نادان ہے۔ تجھے پتہ نہیں کہ میری بیٹی کھو گئی ہے اور میری شہ رگ میں کسی نے غضب کا خنجر بھونک دیا ہے اب مجھ میں نہ تیزی ہے نہ سختی۔ میرے پاس رحمدلی شفقت اور محبت کے سوا اور کیا ہے؟ تجھے دینے کو میری یہی پونجی ہے۔

عورت:۔ بھلا ہو تیرا ماں! میں دکھی دل۔ کیا تیرے پاس مجھے بھٹک مانگو اور دکھوں کی طرح فاقوں کا شکار رہنے دینے کیلئے پیٹ کی دوزخ کا کافی دھندا ہے؟

امیرن بائی:۔ کافی ہے میری چاہیتی! میں تجھے شہزادی بنا سکتی ہوں میری مٹھی میں عیش و آسائش کے دریا بند ہیں مگر مجھے بیٹی کی ضرورت ہے

عورت:۔ ماں

امیرن بائی:۔ ہاں بیٹی!

عورت:۔ میں بڑی تھکی ہوں۔

امیرن بائی:۔ کیوں بیٹی!؟

عورت:۔ میں آدم زادوں سے ڈرتی ہوں مجھے کہیں مرد سے پالا تو نہیں پڑیگا؟

امیرن بائی:۔ مرد سے؟ باؤلی ہے تو بیٹی! تو بالکل اپنی بہن کی سی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ مرد عورت سے ناانصافی کرتا ہے۔ اور عورت کو اپنا زر خرید غلام بنایا چاہتا ہے۔ جسے اپنی زندگی قیدی بن کر گزارنی پڑتی ہے لیکن یہ عورت کی اپنی بھول اور بزدلی ہے۔ میں تجھے وہ داؤں سکھاؤنگی۔ کہ مرد تیری غلامی کا دم بھریں گے۔

عورت:۔ ماں! کیا یہ سچ ہے؟

امیرن بائی:۔ بیٹی! پوری طرح سچ ہے۔

عورت:۔ تو ماں! پھر چل اور مجھے اس شاہراہ پر پہنچا دے جہاں مرد میرے غلام بن کر رہنا قبول کریں گا

امیرن بائی:۔

آ بیٹی!!

تینوں نفوس ہیلک پارک سے چل دیتے ہیں۔

زندگی کے ڈرامہ میں ایک نیا ناٹک کھیلا جانے کو ہے۔ نذہت آرا بیگم گناہ کی قلمرو میں محصور ہونے جا رہی ہے۔ آہ! معصوم روحیں کس خباثت سے بے راہ ہو جاتی ہیں۔

غنچہ

پھول ہے لاریب اس گلشن کا کوئی حادثہ   خالقِ غنچہ سے خود مشکل تھی جسکی روک تھام
اس میں ہے اعجاز ساقی کا نہ میکش کا ہُنر   ٹوٹ جانے سے صبوحی کے اگر بن جائے جام

(از سید عطاء اللہ ..... لودھیانوی)

بہارِ تغزل

از حضرت نفیس دہلوی

مٹا نہ گردشِ لیل و نہار رہنے دے ۔ مٹے ہوؤں کی ہیں ہم یادگار رہنے دے

نمودِ ہستیٔ ناپائدار رہنے دے ۔ نہ پھونک اے نفس شعلہ بار رہنے دے

نہ توڑ توبہ کو ابرِ بہار رہنے دے ۔ کوئی تو عہد مرا استوار رہنے دے

نہ پونچھ اشک مرے غمگسار رہنے دے ۔ مجھے خدا کے لئے اشکبار رہنے دے

کسے دماغِ غمِ روزگار ہے یارب ۔ ہمیں کو صرفِ غمِ روزگار رہنے دے

وہ حشر تک مرے مرنے پہ سوگوار رہیں ۔ اگر رقیب انہیں سوگوار رہنے دے

تجھے خبر بھی ہے کیا کچھ گذر گئی مجھ پر ۔ یہ التفات فراموش کار رہنے دے

چو مستحقِ کرامت گناہ گار آنند ۔ تو محتسب مجھے تو بادہ خوار رہنے دے

بجا ہو وعدۂ فردا، مگر یقین نہیں ۔ کہ زندہ ہم کو دلِ بے قرار رہنے دے

امیدِ وصل پہ کب تک کوئی جئے جائے ۔ فریبِ وعدہ تغافل شعار رہنے دے

جو اُن کے دل پہ مرا یارب اختیار نہیں ۔ تو میرے دل پہ مرا اختیار رہنے دے

زیاں ہے اس میں ترا گیا زمین کوچۂ یار ۔ جو آپڑا ہے کوئی خاکسار رہنے دے

وہ کہہ رہے ہیں کہ دنیا میں کر دیا رسوا ۔ یہ اضطرابِ دلِ بے قرار رہنے دے

رہوں میں آپ کے وعدہ پہ حشر تک زندہ ۔ اگر یہ زندگیٔ مستعار رہنے دے

مجھے بھی دیکھنی ہے تیری استواریٔ عہد ۔ جو زندہ مجھ کو غمِ انتظار رہنے دے

خدا کے سامنے جانا ہے روزِ حشر نفیس
بتوں سے تو یہ محبت یہ پیار رہنے دے

تنقید اور اردو شاعری

ادبی مقالہ

از جناب میرزا محمد بشیر ایم۔ اے۔ بی ٹی

تنقید کا ظہور تخلیقِ ادب کے بعد ہوتا ہے۔ اردو شاعری کی ابتدا شمالی ہند میں گنج شکرؒ و خسروؒ کے بابرکت ہاتھوں ہوئی لیکن اس کی نشو و نما کا فخر دکن کو حاصل ہے۔ دکن میں اردو شاعری نے تمام وہ اصناف و انداز اختیار کئے جو فارسی میں رائج تھے اور انہیں کے ساتھ ساتھ ان کے حسن و قبح کے معیار اور حک و اصلاح کے طریقے بھی لے لئے چنانچہ استادی اور شاگردی کا طریقہ، لفظی بحثیں، اساتذہ کے کلام کا تتبع وغیرہ اس بیان کی تائید میں پیش کئے جا سکتے ہیں فارسی کا رنگ اسوقت اردو شاعری پہ اور بھی زیادہ چڑھا جب ولی اورنگ آبادی دہلی آئے اور شاہ گلشن سے ملے شاہ صاحب نے ولی کو یہ صلاح دی کہ فارسی کے مضامین کو اردو کا جامہ پہنائیں۔ ولی کو اس میں بہت کامیابی ہوئی اور ان کا یہ طرز اتنا مقبول ہوا کہ شمالی ہند میں لوگ ان کی پیروی کرنے لگے اردو شعر گوئی کا چرچا شمال میں اس دکھنی "ناوکِ انداز ادب" کی بدولت عام ہو گیا۔ جب ادب کی تخلیق شروع ہو گئی تو تنقید نے بھی سر اٹھایا لیکن شروع شروع ادب و تنقید دونوں گہوارۂ طفولیت میں رہے۔ ہم شمالی ہند کے مختلف ادوار پر نظر ڈالیں گے اور تنقید کے ارتقائی رجحانات سے بحث کریں گے۔

وہ لوگ بڑا ستم کرتے ہیں جو موجودہ مغربی تنقید کو پیش نظر رکھ کر اردو تنقید کو دیکھتے ہیں اور جب ان کو اس میں وہ بلند معیار اور اعلیٰ نظریوں کا فقدان نظر آتا ہے تو اردو کو موردِ الزام قرار دیتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ خود یورپ میں تنقید آہستہ آہستہ درجہ بدرجہ ارتقائی منازل طے کر کے آج بلند رتبہ کو پہنچی ہے۔ اردو فارسی کا دودھ پی کر پلی بڑھی اور جب خود فارسی حقیقی تنقید سے ناآشنا تھی تو اردو کہاں سے سیکھتی۔ اس کے علاوہ اردو کی جس فضا میں نشو و نما ہوئی یعنی ہندوستان وہاں تنقید عنقا تھی۔ پھر ایسے ماحول میں اردو کا تنقید سے بے بہرہ رہنا بے جا نہ تھا۔ فارسی میں تنقید کا جو طرز و معیار تھا وہی ملک میں رائج ہوا استاد نے شاگرد کے کلام کو اصلاح دی لفظی و معنوی غلطیوں سے اسکو آگاہ کیا۔ یہ طریقہ آج تک رائج ہے لفظی بحثیں، معاصرہ اور معاصرین کے متعلق جو ہنگامہ آرائیاں ہوئیں۔ انہوں نے بھی تنقید کا کام دیا چنانچہ اٹھارویں صدی میں خان آرزو نے "غرائب اللغات" کے الفاظ پر اعتراضات کئے اور ان کو صحیح کر کے ایک لغت "نوادر الالفاظ" شائع کی۔ حاتم نے "دیوان زادہ" میں تمام دکنی اور ہندی الفاظ خارج کر دئے۔ غرض اس عہد میں تنقید نے استادوں کی اصلاح اور الفاظ کی تراش خراش سے باہر قدم نہیں نکالا۔

میر و سودا کے عہد سے تنقید نے ترقی کے زینے طے کرنا شروع کئے۔ اول تو اس عہد میں ایہام گوئی جو بقول مولانا محمد حسین آزاد "مادۂ فاسد" کی طرح آبرو و ناجی کے عہد میں عام تھی ترک کر دی گئی بہت سے الفاظ مثلاً جون، سمدر وغیرہ ترک ہو گئے۔ سودا و میر نے فارسی محاوروں کے ترجمے کئے اور محاوروں میں اضافہ کیا۔ سب سے پیشتر اس عہد میں وہ تحریریں ملتی ہیں جن پر تنقید کا کچھ اطلاق ہو سکتا ہے۔ میر تقی میر نے ۱۷۵۲ء میں "نکات الشعراء" شائع کی۔ یہ اردو شعرا کا تذکرہ ہے۔ جو فارسی میں میر نے لکھا ہے۔ اس میں شعراء کے کلام کے متعلق رائے بھی دی ہے اور کہیں کہیں اعتراض بھی کئے ہیں۔ تذکرہ نویسی کا دستور فارسی میں بہت قدیم تھا۔ اب اردو میں بھی اس کی داغ بیل پڑ گئی۔ "نکات الشعراء" کو تنقید کا کارنامہ تو نہیں کہہ سکتے ہاں اس میں ایک جھلک ہے تنقید کی۔ اسی طرح سودا نے جو اعتراضات میر کے مرثیے پر کئے ہیں۔ وہ بھی تنقید کے ابتدائی دور کی مثال قرار پا سکتے ہیں۔

انشا، مصحفی کے عہد میں بھی تنقید کا وہی رنگ رہا جو قدما کا تھا مصحفی نے ایک تذکرہ شائع کیا جس کا وہی طرز ہے جو میر حسن، قائم اور میر کے تذکروں کا ہے۔ انشا نے "دریائے لطافت" میں اپنے ظریفانہ طرز میں کچھ شعرا کے کلام پر نکتہ چینیاں کیں مثلاً مثنوی میر حسن کے متعلق یہ لکھا کہ "غضب کیا ہی ہے سالے کا تیل نچ رہے ہیں"۔ لیکن یہ سب ان کی ستم ظریفی کے کرشمے تھے۔

جب لکھنؤ میں شاعری کا شباب تھا اس وقت آتش و ناسخ کا طوطی بول رہا تھا۔ اس وقت زبان بہت پیش پیش تھی۔ ناسخ نے زبان کی کانٹ چھانٹ پر بہت توجہ کی۔ میر کے زمانے سے جو ہندی یا دکنی

الفاظ کا اخراج شروع ہوا تھا اس کی تکمیل ناسخ نے کی۔ انہوں نے عروض و قافیہ کی پابندیاں عائد کیں۔ میر و سودا کے عہد کے اس قسم کے فقرے اور الفاظ مثلاً "اسے ہے" "جاسے" "اتیاں" "جاتیاں" وغیرہ متروک قرار دئے۔ الفاظ کی چھان بین پر زور دیا۔ ایک بات جو خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ غزل کے دائرے کو وسیع کیا اور مختلف قسم کے مضامین غزل میں لائے۔ اسی زمانے میں غالب کی دہلی میں بڑی شہرت تھی۔ مرزا غالب کا نام تنقید کے سلسلے میں بڑی آب و تاب سے آتا ہے اپنے خطوط میں انہوں نے اکثر شعر کے متعلق رائے زنی کی ہے اب تک تذکرے عموماً فارسی میں لکھے گئے تھے اور ان میں شعرا کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا۔ وہ فارسی میں تھا مگر اب مرزا نے سلیس و شستہ اردو میں دوسرے شعرا یا خود اپنے کلام کی خوبیاں اور برائیاں اس اسلوب کے ساتھ پیش کی ہیں جو سچی تنقید کی پیش خیمہ ہیں۔

میر کے عہد میں تذکرہ نویسی کا آغاز ہوا تھا۔ اس فن کا عروج تکمیل مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کی معرکہ آرا تصنیف "آب حیات" ہے تذکروں میں یہ ہوتا تھا کہ شاعر کا حال اس کے کلام کی تعریف اور کبھی کبھی محاسن کے ساتھ ساتھ کچھ عیوب بھی پیش کر دئے جاتے۔ "آب حیات" میں آزاد نے بھی سب باتیں لکھی ہیں۔ مگر وضاحت کے ساتھ اور پھر ان کے جادو نگار قلم نے گلکاریاں کی ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اب تک تنقید کی صبح کاذب تھی۔ تنقید کی صبح صادق کا ظہور اُس وقت ہوتا ہے جبکہ ۱۸۸۰ء میں مولانا حالی کا مقدمہ شعر و شاعری "نقیب نور" بنکر جلوہ گر ہوتا ہے یہ پہلی کتاب ہے جس کو ہم صحیح معنی میں تنقید کہہ سکتے ہیں۔ اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ چاروں طرف سے غلغلہ بلند ہو گیا۔ اور قدیم شاعری کے جانبدار برچھیاں اور بھالے ٹیک ٹیک کر کھڑے ہو گئے لیکن رفتار زمانہ کے سامنے کچھ نہیں چلتی مولانا حالی مرحوم نے شاعری کے رُخ کو پلٹ دیا اور قدیم طرز کی خامیاں ایسی دلیری سے بیان کیں کہ حق پسندوں کے دل پر اس کا بہت اثر ہوا۔ خامیوں کے ساتھ جو واقعی خوبیاں تھیں ان کا اظہار بھی کیا اور شاعری کو نئے قالب میں ڈھالنے کے جو راستے تجویز کئے آج ہماری شاعری ان ہی پر گامزن ہے

اس سے پیشتر کہ ہم موجودہ تنقید کے متعلق کچھ لکھیں یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے۔ کہ مشاعروں نے بھی تذکروں کی طرح کچھ نہ کچھ تنقید کا کام انجام دیا مجلسیں جہاں خراج تحسین حاصل کیا جاتا ہو وہاں یہ امید کرنا کہ کسی کے کلام پر نکتہ چینی ہوگی بے جا ہے۔ کیونکہ شعرائے کرام کے فکر و ماحفہ گو ہر کچھ ہو ... [illegible] لیکن ... [illegible]

جلا بھنا حق بات کہہ گزرتا تھا۔ چنانچہ مرزا دبیر کے ایک طولانی مرثیے کو سن کر آتش سے نہ رہا گیا اور وہ بول اٹھے "مرثیہ تھا یا الندھور بن سعدان کی داستان" اس قسم کے فقرے گو صحیح تنقید کے احاطے سے باہر ہیں۔ لیکن پھر بھی بعض وقت ان فقروں میں وہ صداقت ہوتی ہے کہ دل لطف اٹھا لیتا ہے۔ مشاعرے ہمیشہ سے شعرا کی مختلف جماعتوں کی زور آزمائیوں کے اکھاڑے بنے ہوئے ہیں۔ یہاں سچی تعریف یا بجا تنقید کی امید رکھنا عنقا و سیمرغ کی تلاش سے کم نہیں لیکن پھر بھی یہاں بعض اوقات ایسے فقرے یا جملے کہے گئے ہیں جن کی حقیقت سے کسی کو انکار نہیں مثلاً امیر صاحب کا جرأت سے یہ کہنا کہ شعر کہنا تو تم جانتے نہیں ہو اپنی چوما چاٹی کر لیا کرو۔ مشاعروں میں چونکہ عوام کا اجتماع ہوتا ہے لہٰذا ایسے فقرے بہت جلد عوام میں پھیل جاتے ہیں اور لوگوں کو اس شاعر کے کلام کا بہت کچھ صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔

مقدمہ حالی نے تنقید کا دروازہ کھول دیا۔ اور اس کے بعد بہت سی گرانمایہ کتابیں شائع ہوئیں۔ چنانچہ خود مولانا حالی کی تصنیف "یادگار غالب" مولانا شبلی کی "شعر العجم" محمود شیرانی کے مضامین قابل قدر تصانیف ہیں۔ اردو تنقید پر جب ہم ایک ناقدانہ نظر ڈالتے ہیں۔ تو پتہ چلتا ہے کہ موجودہ تنقید چند مخصوص خیالات اور نظریوں کے باہر قدم نہیں نکالتی اودھ پنچ کا رنگ تنقید بے حد چھایا ہوا ہے اودھ پنچ نے جو "طوفان اٹھائے" وہ اب بھی اٹھا کرتے ہیں کبھی تو یہ فخر ؎

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

اور کبھی وہ مباہات ؎

نکلا جو رن میں پنچ کا خنجر غلاف سے
اُڑنے لگے شرر دمِ غارِ اشگاف سے

نوٹ:۔ اودھ پنچ میں ان اشعار کے تحت میں شرر و حالی کے خلاف مضامین شائع ہوتے۔ یہ تنقید یں تنقیص کے رنگ میں شرابور ہوتیں جب کسی کا خاکہ اڑایا جاتا ہے تو دل آزار اور بعض اوقات بازاری اور رکیک الفاظ کا استعمال کئے جاتے۔ ذاتیات پر حملے ہوتے۔ اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی حق گوئی و بے باکی بھی پنچ کی تنقیدوں میں جھلکتی۔ لیکن ذاتی عناد کا غبار حقیقت پر چھا جاتا۔ آج تک اردو میں اسی تنقید یا تنقیص کا رنگ جاری و ساری ہے۔

مولانا حالی نے مغربی تنقید سے متاثر ہو کر ایک نئی روش نکالی ان کے بعد اس روش پر چلنے والے بہت سے پیدا ہو گئے جنہوں نے معیار تنقید کو اور بلند کیا۔ مولانا عبد الحق صاحب، تلمیذ ... [illegible]

[redacted]

صاحب مرحوم وغیرہم کے علاوہ اور بزرگوں نے بھی ملک کو تنقید کے صحیح مذاق سے آشنا کیا۔ اردو ادب کی تاریخیں مثلاً شعر الہند، تاریخ ادب اردو (اسکیڈ) وغیرہ بھی تنقید کی علمبردار ہیں۔ رسالوں میں رسالہ اردو، ہندوستانی اور عالمگیر وغیرہ نے تنقید کی گرانقدر خدمت کی ہے۔ فی زمانہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مغربی اصول و تاریخ تنقید کے تراجم اردو میں پیش کر رہے ہیں، ایسے لوگوں کی جماعت ملک میں روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ ان تراجم سے گو اور کسی قسم کے فوائد مترتب نہ ہوں لیکن کم از کم اردو دان طبقے کی معلومات میں ضرور اضافہ ہوتا ہے اور یہ احساس ہوتا ہے ؎

یاران تیز گام نے منزل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

اردو تنقید ابھی تشنہ ہے۔ اس میں ایسے ہمہ گیر اصول اور متحرک نظریوں کی کمی ہے جن میں تعمیم کی خوبی ہو۔ جو حسن و قبح، حق و دروغ، حقیقت و سراب کے امتیاز میں پورے اتریں اگر ہماری تنقید میں جمود کی شان پیدا ہو گئی۔ اور شاعری کے قدم بقدم نہ چل سکی۔ تو علم و ادب کے بھرے دربار میں تنقید کا سر نیچا ہوگا۔ اور شاعری کہتی ہوگی ؎

ہاں اہل حشر ہے کوئی نقاد نقد دل
لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے

(فانی)

غزل

رخسار گرم

از جناب سید دل محمد فضا جالندہری فاضل السنہ شرقیہ

خاک دل ہے زیر پائے یار گرم
کس قدر تھی شوخیٔ رفتار گرم

عشق نے برق مجسم کر دیا!!
ہے مزاج عاشق بیمار گرم

اللہ اللہ جلوۂ حسن فرنگ
ہر جگہ ہے مصر کا بازار گرم

جیسے چنگاری ہو کوئی آگ کی
یوں ہیں اشک دیدۂ خونبار گرم

دیکھئے اب ہمت اہل نظر
حسن والوں کا ہوا بازار گرم

میں نے کب کھینچی تھی یہ آہ سرد
بے سبب پھر کیوں ہوئے سرکار گرم

دیکھئے اب کیا ہو گلچیں کا مآل!
ہے نگاہ نرگس بیمار گرم

آتش تر دو ما کر برف میں
بزم ساقی میں ہے ہر مے خوار گرم

صحن گلشن میں بھڑک اٹھی اک آگ
تھی فغان عندلیب زار گرم

چیں بہ ابرو ہے کوئی ہنگام دید
ہو گیا اب شربت دیدار گرم

میں نے کب ڈالی محبت کی نگاہ
ہو گئے کیوں آپ کے رخسار گرم

دیکھئے رفتار عمر بے ثبات
اے فضا کتنا ہے یہ رہوار گرم

ضمیر کی آواز

افسانہ

از جناب سید اخلاق حسین رضوی

ونود کی میز پر سبز غلاف سے ڈھکا ہوا ایک برقی قمقمہ محدود دائرہ میں اپنی روشنی پھیلا رہا تھا جس کے گرد دو چار پروانے چکر لگا رہے تھے ورنہ دفتر کے بڑے ہال میں ہلکی ہلکی تاریکی چھائی ہوئی تھی سامنے کی کھڑکی کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا جس میں تاروں بھرا آسمان صاف دکھائی دے رہا تھا کبھی کبھی سیاہ و زریں سحاب پارے گم کردہ راہ مسافر کی طرح بھٹکتے ہوئے آتے اور ایک لمحہ کیلئے منور ماہتاب کو اپنی آغوش میں چھپا کر فضا میں تیرتے ہوئے دوسری طرف نکل جاتے تھے۔ برق پرستاروں سے بھی آپس میں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے ہوا کی لطیف سرسراہٹ کبھی کبھی ایک ترنم پیدا کرتی ہوئی کھڑکی سے نہایت خوشی اندر داخل ہوتی تھی مگر ہال کی تاریکی اور سکوت سے گھبرا کر پچھلے قدم واپس چلی جاتی تھی۔ عمارت کے باہر احاطہ میں آراستہ گل بیز روشیں اور رنگا رنگ کے پھولوں سے لدی ہوئی بیلیں شمیم فرحت افزا سے مست و بیخود ہو ہو کر جھوم رہی تھیں۔

ونود میز کے سامنے دستی کرسی پر بیٹھا ہوا اپنے دل و ضمیر کی نبرد آزمائی کے کرشمے محسوس کر رہا تھا۔ اس کا دل اسے بار بار اپنے مقصد کو کامیاب بنانے کی دعوت دے رہا تھا۔ اور اندر ہی اندر وہ کہہ رہا تھا ——— ایسے مواقع شاذ و نادر ہی آیا کرتے ہیں۔ . . . ملتی ہوئی چیز کو ٹھکرانا سب سے بڑا کفران نعمت ہے . . . . ایک ذرا سی ہمت سے کام لے۔ تو چشم زدن میں رئیس بن جائے گا . . . .

دل کہہ کر خاموش ہوا تو ضمیر بول اٹھا ——— نہیں نہیں ——— تیرا مشیر نادان ہے ——— یہ تجھے آقا کا نمک حرام ہونے کی دعوت دے رہا ہے ——— شریفوں کا یہ شیوہ نہیں کہ جس ظرف میں کھائیں اسی میں چھید کریں ؟ ——— تیرے پائے صداقت میں لغزش نہیں آنی چاہئے ——— چاہے تیری موجودہ زندگی میں کبھی فرحت افزا انقلاب رونما نہ ہو ——— اپنے قوت بازو پر اعتماد رکھ اور میرے مشورہ پر عمل پیرا ہو ———

دل نے یہ باتیں سنیں۔ پھر ایک بار گویا ہوا ——— تیرا ضمیر تجھے دھوکا دے رہا ہے . . . اگر تو اس کی نصیحتوں پر عمل کرے گا تو یاد رکھ۔ تو اپنے دوست پرستوں سے جھوٹا بھی نے گا اور دنیا کی لطافتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم رہ جائے گا . . . . شرافت ؟ . . . . عزت ؟ . . . . خلوص . . . . نمک حلالی ؟ . . . . ایمانداری ؟ . . . . یہ سب چیزیں دولت کے زور سے خریدی جا سکتی ہیں ! . . . . عاقبت نااندیش ہیں وہ لوگ جو آئے ہوئے سنہری موقع کو ہاتھ سے جانے دیں . . . .

وہ گھبرا کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے ! وہ سوچ رہا تھا۔ کہ دل کے مشورہ پر تجوری کھول کر ڈائرکٹر شانتا رام کے نام کے رکھے ہوئے لفافہ کو نکال کر رات کو گیارہ بجے کی ریل سے بھرت پور کیلئے روانہ ہو جائے ——— ایک لاکھ کے نئے نئے نوٹ ! ——— ہاں اس طرح وہ پرسفوی کے ساتھ کوئلہ کی کان میں شرکت کر کے تھوڑے دنوں میں رئیس ہو جائے گا ——— کیا مضائقہ ہے ؟ ——— پھر تو ڈائرکٹر شانتا رام کو وہ رقم واپس بھی کر سکتا ہے ———

مگر ضمیر اس کے دل کے خلاف محاذ قائم کئے ہوئے تھا ———

وہ بھاری بھاری قدم رکھتا ہوا کھڑکی کے قریب گیا ایک لمحہ کے لئے اس نے آسمان کو دیکھا۔ رات کا ابتدائی حصہ ——— پھر اس کی نگاہیں رفتہ رفتہ شہر کی سر بفلک عمارتوں پر پڑیں ——— بڑی بڑی حویلیاں ——— ان کے رہنے والے رئیس اور دولت کی آغوش میں کھیلنے والے سرمایہ دار ——— عیش و عشرت کے نشہ میں سرمست و سرشار ——— ان کے دن اعیانیت کی ہنگامہ آرائیوں سے لبریز ان کی راتیں دلچسپیوں اور دلفریبیوں سے بھری ہوئی ——— ہر طرف مسرت و شادمانی کا دور دورہ ———

دل نے کہا :- دیکھ ! . . . . . آنکھیں کھول کر دیکھ ! . . . . . انسان انہیں لطافتوں کیلئے پیدا کیا گیا ہے اور یہ لطافتیں انسان کے لئے . . . . کیوں نادان بنتا ہے ! چل . . . ہمت کر ذرا دیر میں یہی مسرت و انبساط تیرے حصہ میں فراوانی کے ساتھ آ جائے گی . . . اور ابھی ! وہ تجھ سے دور بھاگتی ہے ! . . . . ونود پر دل کا جادو چل گیا۔

سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی سرعت سے وقت کے گزرنے کا

اعلان کر رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ میز کے قریب گیا اور برقی قمقمہ کا بٹن دبا دیا ہال میں گھپ اندھیرا ہوگیا۔ بعد ازاں اس نے کھڑکی کا پٹ بند کر کے چٹخنی لگا دی اور تجوری کی طرف بڑھا۔ گھبراہٹ میں اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرات مجتمع ہو گئے تھے۔ مگر اس کا دل اس کی معاونت کر رہا تھا۔ ضمیر کے تاثرات غلبہ نہ پا سکے تاکہ وہ ونود کی انگلیاں پھرتی سے مصروف عمل تھیں مگر اس کا دماغ بے قابو ہو رہا تھا۔ چاہتا تھا کہ کام آسانی اور عجلت کے پیش نظر اس نے اندرونی جیب سے ایک برقی لیمپ نکالا اور اس کی مدد سے اس نے تجوری کے کھٹکے میں چابی ڈال کر گھمائی۔ تجوری کھول کر اس نے اپنا ہاتھ اندر ڈالا۔ ٹارچ کی مدھم روشنی کی مدد سے اس نے زرد مہر شدہ سرخ فیتے سے بندھا ہوا لفافہ دیکھا۔ جو تجوری کے اندرونی خانہ میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے بدحواسی میں لفافہ نکال کر کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا اور جلد جلد تجوری کو بند کرتے ہوئے وہاں سے ہٹ آیا۔

اب اس کے دل نے اپنے قریب ہی وزنی لفافہ کو رکھے ہوئے محسوس کر کے اظہارِ اطمینان کیا —— دل اپنے مقصد میں کامیاب و سرخرو ہو چکا تھا ——

ایک لاکھ کے نوٹ! . . . . بینک کے مختار کی ذاتی ملکیت . . . . وہ ان روپوں کو اپنے تصرف میں لا کر بہت جلد اصل کا اصل ایک قلیل عرصہ کے کاروباری رد و بدل کے بعد شانتا رام کو کوڑی کوڑی ادا کر دیگا

دل نے ونود کو اطمینان دلایا اب تیری قسمت چمک اٹھی . . . .

حاسدین تیری خوشگوار زندگی دیکھ کر کڑھیں گے۔ اور تیرے دوست مسرور ہوں گے . . . . روپیہ روپیہ کو کھینچتا ہے۔ چند ہی ماہ کی مسلسل تگ و دو میں ہزاروں کا اضافہ ہو جائے گا . . . . . زندگی میں ایسے مواقع آیا ہی کرتے ہیں! . . . . صحیح معنوں میں زندگی کا اب سے آغاز ہوگا . . . .

گداگری اور غلامی بھلا زندگی میں شمار کی جا سکتی ہے؟

وہ انہیں خوشگوار خیالات میں شاداں و فرحاں باہر کی طرف اندھیرے میں بڑی احتیاط سے ٹٹولتا ہوا دیوار کے سہارے چلا جا رہا تھا کہ تصویر کے دوسرے رخ نے نمایاں ہو کر اپنا عکس لطیف دکھایا۔

خاندانی روایات کو پس پشت ڈال کر اخلاق اور فرائض سے بے بہرہ اور بے نیاز، ایک تعلیم یافتہ نوجوان اگر دوسروں کی گاڑھی کمائی سے ناجائز فائدہ اٹھائے —— اپنے آقا کی نمک حرامی کر کے اس کی لاعلمی میں اس کی دولت پر قبضہ کر کے ناجائز سرور حاصل کرے —— اندھیرے میں دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر فرار ہو، اسے عرف عام میں کیا کہیں گے؟

—— چور!

ونود آخری لفظ پر چونکا اور ٹھٹک کر اسی مقام پر کھڑا ہو گیا۔ ایک مرتبہ پھر اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر لفافہ ٹٹولا —— اس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی دوسرا ہاتھ اندرونی جیب میں لفافہ کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا۔ اس کا ضمیر اس کے مرے ہوئے باپ کی شبیہ بن کر اس کی نظروں کے سامنے تھا جو اپنی ایمانداری اور نیک نیتی کا بہترین نمونہ تھا۔ وہ باپ جس کی زندگی دوسروں کے لئے درس عبرت تھی اور اس ایماندار اور مخلص باپ کا بیٹا —— ایک ادنیٰ چور —— ؟

ونود نے وزنی لفافہ اپنی جیب سے نکال لیا۔ اندھیرے میں اپنی متنفر تحقیر آمیز نظریں اس پر جما دیں۔ وہ تجوری کی طرف مڑا —— ہال میں لگی ہوئی گھڑی نے اس کے تخیلات کو اپنی ٹک ٹک ٹک ٹک سے منتشر کر دیا

ضمیر کی ملامت، نصیحتوں اور مردہ باپ کی شبیہ پر پانی پھیرنے کیلئے دل ایک مرتبہ پھر آمادہ بہ پیکار نظر آیا۔ اور آخر اسی کی فتح ہوئی . . . . !

جلد جلد قدم بڑھاتا ہوا باہر کے دروازے کی طرف جھپٹا مگر جب وہ ڈائرکٹر شانتا رام کے کمرے کے قریب سے گزر رہا تھا۔ تو اسے ایک دبی ہوئی نسوانی چیخ سنائی دی اور ایک ہی لمحہ بعد شیلا کے منہ سے نکلی ہوئی مبہم آواز اور بے ربط الفاظ سنائی دیئے۔ ونود کے قدم بھاری ہو گئے اس کا سر چکرانے لگا اور نہ معلوم کون سا خیال اس کیلئے سوہان روح بن گیا

اگر شیلا نے اس کی تمام کارروائی دیکھ لی ہو تب؟ اس کے ضمیر نے اسے بروقت متنبہ کیا۔ وہ ہنوز کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ کمرے کے اندر سے کسی نے سوال کیا

"کیا ہال میں کوئی ہے —— ؟"

"ہاں۔ میں —— !" ونود موقع کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے بولا۔

شیلا کمرے سے گھبرائی ہوئی نکلی اور بے تحاشا ونود سے لپٹ گئی ونود نے اسے تشفی آمیز انداز میں اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"کیا ہوا مس شیلا! کیا آپ اندھیرے سے ڈر گئیں —— ؟"

شیلا کو ونود کی موجودگی سے گرنہ ڈھارس ہوئی اب وہ اپنے ہوش و حواس میں آ چکی تھی۔ وہ جلدی سے ونود کی آغوش سے علیحدہ ہوتے ہوئے بولی:—

"مسٹر ونود میں تنہائی کی غرض سے پاپا کے کمرے میں بیٹھ کر ایک

باقی

ناول کا مطالعہ کر رہی تھی۔ مجھے دفتر میں کسی کی موجودگی کا علم نہ تھا۔ مگر یکایک جب میری میز کی برقی روشنی گل ہوگئی تو میں چونکی ——— پہلے تو میں اس کے وجوہ کے متعلق غور کرنے لگی۔ مگر جب مجھے تاریکی میں کوئی سبب نہ معلوم ہو سکا تو مجھے ڈر لگا اور خوف سے میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی

اب یہ دونوں باتیں کرتے کرتے دفتر سے نکل کر روشوں پر آچکے تھے۔ شیلا کی گفتگو ختم ہوتے ہی ونود بولا۔

"مس شیلا! مجھے واقعی اپنی غلطی کا ازحد افسوس ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے سوا آفس میں کوئی دوسرا نہیں ہے اور میں حسب معمول دیر سے اپنا کام ختم کرکے روشنی بجھا کر مکان جا رہا تھا ——— اگر اجازت دیجئے تو میں آپ کو بنگلہ تک پہنچا دوں ——— بھلا ڈائرکٹر صاحب ہماری یہ نیت بھری حرکت دیکھیں تو مضحکہ ہی تو اڑائیں ———؟" ونود نے زہریلی ہنسی کے ساتھ اپنا جملہ تمام کیا۔

"مگر میں . . . . . ." شیلا کے جملہ کو ونود نے قطع کر لیا۔

"رات کافی ہو گئی۔ صاحب بہتر ہے آپ کے نقش قدم پر چلا جاؤں گا!"

"مگر میں اس وقت بنگلہ پر جانا نہیں چاہتی ——— مسٹر ونود! چلئے کسی فرحت افزا مقام پر بیٹھ کر ہم اس پریشان کن حادثہ کو محو کر دیں" شیلا نے ونود پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالتے ہوئے بڑی معصومیت سے کہا۔

شیلا اور ونود اس سے پیشتر بھی کئی بار مل چکے تھے مگر ان کی ابتدائی ملاقاتیں آقا زادی اور ملازم کے امتیازات کی حامل تھیں مگر جب سے کہ ایک مرتبہ ونود نے شیلا کو ایک موٹر کے حادثہ سے بال بال بچایا تھا اس وقت سے رفتہ رفتہ یہ لوگ ایک دوسرے سے زیادہ قربت حاصل کرنے لگے تھے شیلا اور ونود تقریباً ہم عمر تھے اور ان دونوں کا ذوقی اشتراک حیرت انگیز نہ تھا۔ مگر ونود کاروباری مصروفیات میں اس قدر الجھا رہتا تھا کہ وہ شیلا کی محبت کے معاملہ میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی دلچسپی نہ لے سکا۔ شیلا بھی ونود کے مردانہ حسن اور ذاتی محاسن و قابلیت کی دل ہی دل میں والہ و شیدا تھی مگر نسوانی حیا اس کے اظہار خیال پر غلبہ پائے ہوئے تھی چنانچہ نہ ادھر سے کبھی ابتدا ہوئی نہ ادھر سے ——— !

آج حسن اتفاق نے ان دونوں پرستاروں کو اپنی اپنی محبت کے اظہار کا موقع دے دیا تھا۔ اگرچہ ونود کا دل شیلا کی تجویز پر عمل پیرا ہونے کی اجازت نہ دیتا تھا مگر ونود انکار بھی نہ کر سکا ——— !

کیوپڈ کا تیر دل میں پیوست ہو چکا تھا ——— یہ لوگ اسی طرح ٹہلتے ہوئے ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے وقت کے ایک خوشنما باغیچہ میں پہنچے جو ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع تھا۔

اب ماہتاب بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ سارے عالم پر نور کی بارش کر رہا تھا۔ دونوں باغیچہ کے سبز مخملی فرش پر بیٹھ کر فطرت کی رنگینیوں میں کھو گئے

رات کا وقت ——— تقوی شکن سماں! خوشگوار چھٹکی ہوئی چاندنی ——— بادِ صبا کے لطیف جھونکے! ونود بظاہر خوش تھا مگر نہ معلوم اس کی کونسی فطری قوت اپنی کبیدگی کا اظہار کر رہی تھی ——— !

بہت دیر تک دونوں نقرئی چاندنی کی مستی و سرشاری سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ بعض اوقات ونود فطری طور پر اپنی ہم جلیس کے انتہائی قرب کے احساس سے اپنی رگوں میں تلاطم جذبات اور جوشش ترنگ کی سیمابی کیفیت پیدا ہوتی ہوئی محسوس کرتا تھا ——— !

شیلا نے ونود کو پیام محبت دیا۔ ونود نے عجز ذی میں سر آنکھوں پر اسے قبول کیا اور کچھ لمحہ اور یہ لوگ فطرت کی رنگینیوں میں جذب رہ کر پیمانِ وفا کا اقرار کرتے ہوئے اپنی اپنی جائے قیام کو واپس ہوئے

ونود باغیچہ کی واپسی پر بڑی تیز گامی سے گھر کی طرف جا رہا تھا اس کے متجھے ہوئے قدم مکان کی طرف اٹھ رہے تھے اور اس کا دل مسرت و انبساط میں ڈوبا ہوا تھا۔ مگر ان کا ضمیر تصویر کے بھیانک پہلو پر روشنی ڈال رہا تھا۔ اسی فرحت و وحشت کی کشمکش میں مبتلا نہ جانے وہ کن کن تخیلات کا سامنا کرتا ہوا مکان پہنچ گیا۔ اس نے جلدی جلدی سامانِ سفر کی تیاری کی اور شیلا کو ایک پہلا اور آخری خط لکھنے بیٹھ گیا۔ اس نے تقریباً نصف خط لکھا پھر نہ معلوم کن جذبات سے متاثر ہو کر اس کے پرزے پرزے کرکے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ پھر اسی نے اپنی اندرونی جیب سے وزنی لفافہ نکال کر رکھ دیا ——— ونود کی آنکھیں پتھرا گئیں جیسے عالم نزع کی کیفیت طاری ہوتے وقت ہو جاتی ہے ——— "

اور شیلا ——— ؟

وہ ونود سے رخصت ہو کر جس وقت مکان پر پہنچی۔ تو ڈائرکٹر شانتا رام دارالمطالعہ میں تھے۔ انہوں نے شیلا کے آنے کی چاپ سنی۔ معاً ان کی نگاہیں دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف اٹھ گئیں ——— "اچھا گیارہ بجنے والے ہیں۔ آج یہ خلاف معمول دیر سے کیوں آئی؟" انہوں نے دل سے سوال کیا۔ مگر میری شیلا کی تعلیم نے اسے اس قدر پختہ کار و دور اندیش بنا دیا ہے کہ وہ معمولی لڑکیوں کی طرح موجودہ فضا سے متاثر نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی زمانہ کی [illegible]

——— زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو" ——— ان خیالات کے آتے ہی انہوں نے شیلا کو آواز دی تا کہ اسے نصیحتاً چند جملے سمجھائیں۔ کاش اس کی ماں زندہ ہوتی۔ انہوں نے شیلا کو اپنی طرف آتا دیکھ کر ایک آہ سرد کھینچتے ہوئے کہا۔

"بیٹی شیلا ——— !"

"ہاں پاپا ———" شیلا معصومیت سے بولی۔

"بیٹا ——— تم آج خلاف معمول ابھی تک سیر گشت کر رہی تھیں یا اپنی پڑوسن چچی کے ہاں تھیں ——— ؟"

"نہیں پاپا! میں نہ چچی کے ہاں تھی اور نہ سیر گشت ہی کر رہی تھی ———"

"تو پھر تمہیں آج گھر آنے میں اتنی دیر کیوں ہوئی ——— ؟"

"پاپا! آج میری زندگی کی سب سے بڑی اور سب سے مسرور کن شب ہے ——— میں آج اس شخص کے ہمراہ تھی۔ جسے میں مستقبل قریب میں اپنا بناؤں گی ———" شیلا نے نیچی نظریں کر کے قدرے شرماتے ہوئے کہا۔

"شادی ؟" ——— شانتا رام نے غیر ارادی طور پر زیر لب کہا

یہ الفاظ شیلا کی زبان سے وہ عمر میں پہلی بار سن رہے تھے انہیں اس کی جسارت پر کچھ حیرت بھی ہوئی اور تھوڑی خوشی بھی۔ وہ مغربی خیالات کے انسان تھے اور حقوق نسواں کے معاملہ میں بہت فراخ دل واقع ہوئے تھے شیلا نے انہیں کچھ کہنے کا موقع نہ دیا۔ بلکہ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھے انتہائی بے لوثی اور سادگی کے ساتھ بولی

"ویل پاپا ——— اس ضمن میں بحث غیر موزوں ہے۔ میں انہیں ایک عرصہ سے جانتی ہوں اور آپ بھی ——— مگر پاپا آج رات ——— ابھی ابھی نقرئی چاندنی میں وہ میرے اظہار خیال پر ورطۂ استعجاب میں غوطہ زن ہو گئے ——— بالکل سکتہ کے عالم میں ——— پہلے شانتا رام کی پیشانی پر شکنیں پڑیں ——— اس کے بعد ان کے چہرہ کا رنگ متغیر ہوا ——— غصہ، نفرت، حقارت، خوف، امید، حسرت، آرزو ——— تمنا۔ یہ تمام ملے جلے جذبات یکے بعد دیگرے طوفان کی طرح ان کے دل میں امنڈے اور آناً فاناً معدوم ہو گئے ——— آخر کار انہوں نے بڑی نرمی سے استفسار کیا۔

"کون ہے وہ شیلا ——— ؟"

ناامیدی کا ایک دھندلا نقش شیلا کی نگاہوں کے سامنے آیا۔ مگر فوراً ہی مفقود ہو گیا وہ پھر اپنی پوری معصومیت کے انداز میں بولی۔

[illegible]

ایسا شوہر منتخب کرنا پڑے جس میں صفائی قلب، خلوص، ایمانداری، وجاہت، قابلیت، خاندانی عظمت، حسن اور جملہ اوصاف حمیدہ ہوں تو آپ اپنی اکلوتی بیٹی کی قسمت کو کس سے وابستہ کریں گے ——— ؟"

شانتا رام نے اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے غور کیا پھر گویا ہوئے :-

"بیٹی! ——— میری دانست میں تو اس کے لئے ونود سے بڑھ کر دوسرا موزوں شخص نظر میں نہیں جچتا بشرطیکہ وہ اقتصادی طریقہ پر بھی موزوں ہوتا ———"

"مگر ڈیڈی! ان کی اقتصادی مشکل کا حل تو آپ کے ہاتھوں میں ہے! ———" شیلا نے خوشی سے اچھل کر کہا "پاپا! لو مجھے اب یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں نے انہیں اپنی قسمت سے وابستہ کرنے کے لئے منتخب کر لیا ہے ———"

شانتا رام شیلا کی باتوں پر متبسم ہو کر بولے۔

"تمہارے انتخاب میں تو کوئی مضائقہ نہیں بیٹا مگر ونود تمہاری ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے سے ہمیشہ قاصر رہے گا۔ کیونکہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق ترقی کی آخری منزل پر پہنچ چکا۔ جہاں اسے صرف دو سو روپے ماہوار ملتے ہیں۔ اب اس سے زیادہ ترقی کرنا اس کی دسترس سے باہر ہے ——— بھلا تمہیں بتاؤ کہ ان حالات کے پیش نظر وہ تمہارے لئے کیسے موزوں ہو سکتا ہے ——— ؟"

"نہیں پاپا! ان میں ترقی کے اور مدارج طے کرنے کی صلاحیت موجود ہے ———" شیلا نے بضد ہوتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں بیٹا! تم ان سب باتوں کو کیا جانو! ونود میں کاروبار فروغ اور سرمایہ کی گردش کے طریقے تجارت کا الٹ پھیر اور اس کی ترکیبوں کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے ——— وہ ان لوگوں میں سے ہرگز نہیں جو قطرہ کو دریا اور ذرہ کو آفتاب بنانے کے طریقوں پر دسترس رکھتے ہوں"

"یہ آپ کیسے کہتے ہیں پاپا! ——— ہے ان میں یہ صلاحیت ابھی بمشکل ایک گھنٹہ گذرا ہو گا۔ کہ مجھ سے انہوں نے بینک کی ایک شاخ بھرت پور میں قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی ——— دوران گفتگو میں اپنے ایک انجینئر دوست مسٹر بریقوی کا بھی تذکرہ کیا۔ جو بھرت پور میں کوئلہ کی کان دریافت کر کے ایک بہت اعلیٰ پیمانہ پر اپنا کام شروع کروانے میں لگے ہیں۔ میں نے ان کی تمام منظم گفتگو کی تفصیل پر ایسی توجہ نہ مبذول کی پھر بھی مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ وہ ان معاملات

[illegible]

کو عملی جامہ پہنانے میں دلچسپی سے کام لیا جائے تو وہ دن دور نہیں کہ چند ماہ کے الٹ پھیر میں رہ اپنی لگائی ہوئی پونجی میں کئی گنا کا اضافہ کر لینگے ——— مگر یہ صورت تو آپ کے تعاون ہی سے ہو سکتی ہے تاکہ انہیں اپنی قابلیت کے اظہار اور اپنے کو پروان چڑھانے کا موقع مل سکے ۔"

ڈاکٹر شانتا رام شیلا کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اسکی تمام باتیں سنا کئے اس کے بعد انہوں نے اس معاملہ پر ایک لمحہ کے لئے خاموشی سے غور کرنا چاہا کہ باہر کی برقی گھنٹی نے ان کے سلسلۂ فکر کو منقطع کر دیا۔

"ڈیڈی! میرا خیال ہے کہ وہ باتونی ڈاکٹر ——— آپ کا دوست آپ کا مغز چاٹنے آ گیا۔ بہر صورت جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر آپ غور و خوض فرما کر کسی نتیجہ پر ضرور پہنچیں ——— اور میں تو اب سونے چلی ..... گڈ نائٹ ڈیر ڈیڈی!" یہ کہتی ہوئی شیلا اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلدی

اسے اپنے باپ کے پرانے دلچسپ دوست ڈاکٹر وبھیاکر کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ وہ شیلا کے خیال میں باتونی اور بعض اوقات نضا۔ ڈاکٹر حسب معمول روزانہ شب کو ڈاکٹر شانتا رام کی دلچسپی کا مرکز بنتا تھا۔ مگر شیلا ان کی صحبتوں میں کبھی حصہ نہ لیتی تھی۔

رات بھیگ چکی تھی، فضا ساکن تھی۔ ہر طرف سکون مطلق چھایا ہوا تھا۔ جبکہ ونود نے ڈاکٹر شانتا رام کے بنگلہ کی گھنٹی بجا کر اپنی آمد کا اعلان کیا۔ شیلا کے خیال کے مطابق آنیوالا بڈھا باتونی ڈاکٹر وبھیاکر نہ تھا۔ بلکہ اس کی جگہ ونود کھڑا ہوا تھا۔ جو اپنے ضمیر کی آواز پر کشاں کشاں اتنی رات گئے اپنی لغزش کے اظہار کیلئے آیا تھا۔

وہ اندر بلا لیا گیا۔ اس کی ذہنی کیفیت ناقابل بیان حد تک خراب ہو گئی تھی آنکھیں پتھرائی ہوئی سے بے نور سی زرد چہرے پر شکنیں پڑی ہوئیں تمام اعضا میں اضمحلال، شانتا رام نے خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کیا اور شیلا والی کرسی اس کی طرف بیٹھنے کے لئے بڑھا دی مگر اس نے اس پر بالکل توجہ نہ کی۔ بلکہ اپنی نظریں فرش پر گاڑتے ہوئے بولا:۔

"سب سے پہلے مجھے اتنی رات گئے مخل انداز ہونے پر معاف فرمایا جائے" وہ کہتا رہا "در اصل معاملہ کی نزاکت کے سبب مجھے اسوقت آپ کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا تاکہ حتی الامکان اس کا ازالہ کر سکوں ——— اور جہاں تک ممکن ہو سکا میں اخفاء برتوں گا۔ مگر آپ متوجہ ہو کر سنیں ——— آج شام کو میں نے آپ کی تجوری سے آپ کے سورگباشی پچا کملا پت جی کے وہاں سے آئے ہوئے مہر شدہ لفافہ کو نکال لیا۔

[illegible]

ابھی نصف گھنٹہ قبل مجھے شدت سے اپنی لغزش کا احساس ہوا جس سے میرا سارا بدن لرز اٹھا ———"

ڈاکٹر شانتا رام ونود کی گفتگو سن کر اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا ونود کے متعلق! ایک ایسے لڑکے کے متعلق جو اس کی تمام تر توقعات اور شیلا کی تمام تر توجہات کا مرکز بنا ہوا ہو! ایک ایماندار اور شریف لڑکا جو اپنی خاندانی روایات کے مطابق ہر چیز میں برتری اور فوقیت لے گیا ہو ——— شانتا رام ایک خواب دیکھ رہا تھا ——— گویا نمود سحر سے قبل ہی فضا کی تمام رعنائیاں دور ہو گئی ہیں اور طلسم خواب کے ٹوٹتے ہی وہ اس دنیائے آب و گل میں آ گیا ہو جہاں

ع آدمی کو میسر نہیں انساں ہونا ——— !

تجربہ کار ڈاکٹر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور ایک لمحہ تک وہ کوئی جواب نہ دے سکا پھر بولا:۔

"تو اب تم میرے پاس کس لئے آئے ——— ؟"

"اس لئے کہ میں مس شیلا سے عہد و پیماں کر چکا ہوں اور اس کے بعد میں نے احساس کیا کہ مجھ سے ایسی لغزش سرزد نہ ہونی چاہئے تھی جو میری تباہی کا پیش خیمہ بنے۔" ونود نے بے تابی کے لہجہ میں جواب دیا۔

ڈاکٹر شانتا رام نے اس کے جواب کو بڑی توجہ سے سنا، اس کا دماغ شیلا کی گفتگو کو دوسری مرتبہ دہرا رہا تھا ———

"ڈیڈی! میں نے انہیں اپنی قسمت سے وابستہ کرنے کے لئے منتخب کر لیا ہے ——— نہیں پاپا! ان میں ابھی ترقی کے مدارج طے کرنے کی صلاحیت موجود ہے ..... وہ شدت سے اس معاملہ میں آپ کی سرپرستی کے محتاج ہیں اور یہ چیز صرف آپ کے تعاون سے ہو سکتی ہے تاکہ انہیں اپنی قابلیت کو پروان چڑھانے کا موقع مل سکے"

ان تمام خیالات کے آتے ہی شانتا رام نے نہایت نرمی سے کہا:۔

"مگر ونود میرے پاس آنے سے تو بہتر تھا۔ کہ تم جرأت پیدا کر کے اپنی تجاویز کو عملی جامہ پہنا کر قسمت آزمائی کرتے ۔ ؟!"

جواب میں ونود کی زبان لڑکھڑا گئی ——— "مے ... لیکن ... لفافہ میں ... نوٹوں کے بجائے ... وصیت نامہ تھا ———" یہ کہتے ہوئے اس نے تھرتھراتے ہوئے ہاتھ سے لفافہ جیب سے نکال کر شانتا رام کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

"بندۂ خدا! تم بھی عجب آدمی ہو ——— ارے سمجھدار انسان! جب لفافہ نوٹوں سے خالی تھا۔ تو تم لغزش اور الزام سے صاف بری الذمہ ٹھیرے!

[illegible]

"یہ ٹھیک ہے کہ میں نے اپنی چوری میں کچھ دستیاب نہ کیا —— یہ بھی درست ہے کہ میں اپنے مقصد میں ناکام رہا مگر اس سے میری نیت کا وہ فعل ہرگز نظر انداز نہیں ہو سکتا جس سے پشیمان ہو کر میں اعتراف کے لئے آپ کے سامنے آنے پر مجبور ہوا ہوں —— میں کامیاب رہا یا ناکام مگر —— میں نے چوری کا قصد ضرور کیا تھا۔ اور مقصد ہی ارتکاب جرم کا اپنی ہو کر مجھے ملزم قرار دینے کو کافی ہے ——"

شانتا رام نے اپنی سنہری سگریٹ کیس سے دو سگریٹ نکالے۔ اور ان میں سے ایک ونود کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا

"لو سگریٹ پیو۔ یہ چیز شیطانی وسواس کو رفع کرنے کا واحد علاج ہے —— اب رہی وہ رقم جو لفافہ میں تھی۔ اسے میں نے آج شام کو گوکل پورہ کی اس سہ منزلی عمارت کو خریدنے میں لگا دی جسے تم جانتے ہو —— وہ عمارت میں نے شیلا کے نام سے خریدی ہے اور وہ اس کی ملکیت قرار دی جا چکی ہے۔ میری دانست میں میرا اقدام تو ایک حد تک مستحسن اور عمدہ رہا اب پس پشت ڈالو اور اب مجھے اپنی اس تجویز کا خلاصہ بتاؤ جس کا ذکر تم نے شیلا سے کیا تھا —— میرا مطلب پرتھوی والی کوئلہ کی کان سے ہے —" شانتا رام نے سگریٹ کا کش لیکر اس کا نیلگوں دھواں بہ تمقم کے اوپر پھینکتے ہوئے دریافت کیا۔

"وہ تجویز! —— یہ تو کسی قدر قابل توجہ مگر —— مگر میں ہنوز اپنے تئیں ان انسانوں کی صف میں پاتا ہوں جو اپنا وقار کسی رکیک حرکت سے تبدیل کر چکے ہوں —— میں چور ہوں —— یہ میری سمجھ کی آتا نہیں ——" قریب تھا کہ ونود شدت غم سے رو پڑے مگر شانتا رام نے اس کے شانے پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا اور نظریں ونود کی نگاہوں میں گاڑ کر بولے۔ ان کا لہجہ نہایت نتیمی اور پر قوت تھا

"سنو ونود! میں نہیں چاہتا کہ تم اس ضعیف خیال کو زیادہ اہمیت دینے پر مصر رہو۔ بس تمہاری اصلاح کے لئے یہی احساس کافی ہے جو تمہیں تمام عمر کبھی ایسی لغزش پھر کرنے سے مجتنب رہنے کی دعوت دیتا رہے گا۔ مجھے تم سے اب بھی گہری ہمدردی اور انس ہے جن میں دو وجوہ زیادہ قابل اہمیت ہیں۔ پہلا شیلا کو تمہیں اپنا شریک حیات منتخب کر لینا اور دوسرا تمہاری ذاتی قابلیت اور خاندانی عظمت ——"

ونود کے ہونٹوں پر زہریلا تبسم تھا۔ اور نگاہوں میں انتہائی حقارت وہ بولا۔

"خاندانی عظمت تو میں اپنی رکیک الحرکتی سے کھو بیٹھا۔ اب ... ..."

[illegible]

کرنے سے منقطع اور مسترد ہو سکتا ہے۔ —— ڈاکٹر صاحب! میں اب شیلا کو منہ نہیں دکھانا چاہتا اور نہ آج شب کے بعد آپ کو ......"

"نہیں ونود! تم نادان ہو —— اس کے علاوہ تم شیلا کے مزاج سے کلیتہً ناواقف۔ شیلا کی ماں کے انتقال کے بعد سے میں نے اس کی نگہداشت کر کے اتنا بڑا کیا۔ جہاں تک مجھے یقین ہے وہ یہ کہ باوجود سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے اور زندگی کے ہر شعبہ میں شرکت کر کے اپنی علمی قابلیت اور تجربات میں اضافہ کرنے کے وہ آج تک سوائے میرے کسی غیر شخص سے کبھی مانوس نہ ہوئی اور نہ ہی کبھی دلچسپی لی۔۔ مگر اب جبکہ وہ تم سے دلچسپی لینے لگی ہے تو یہ اس کا پہلا اور آخری فیصلہ ہوگا۔"

"مگر مجھے صبح کی گاڑی سے بھرت پور جا کر پرتھوی سے ضرور ملنا ہے کیونکہ اس کو میری طرف سے اب اقتصادی معاونت سے معذور ہونے سے واقف ہونا ضروری ہے۔"

"ونود! —" شانتا رام نے قدرے بھاری آواز میں کہا۔ "تم شیلا کو چاہتے ہو یا نہیں —— ؟"

"چونکہ میں اب انسانیت کے دائرہ سے گذر کر صرف چور کے لقب کا حقدار رہ گیا ہوں۔ اس لئے میں دست بستہ معذرت خواہ ہوں۔ محبت کا معاملہ تو مس شیلا کو جب معلوم ہو جائے ......" شانتا رام اس کا جملہ قطع کرتے ہوئے بولے

"مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری یہ بات شیلا کو کبھی معلوم نہ ہوگی۔ اگر تم خود اس سے نہ کہو —— اور یاد رکھو کہ جو انسان عورت کو اپنا ہمراز بنائے اس سے بڑھ کر احمق تو بتا میں چراغ لے کر تلاش کرنے سے بھی دستیاب نہ ہوگا —— بتاؤ اب تمہارا کیا خیال ہے ——؟"

ونود ایک لمحہ تک گردن جھکائے کھڑا رہا۔ شانتا رام نے اس سے دوبارہ سوال کیا۔

"اب تمہاری تجویز کے سلسلہ میں کیا ہونا چاہیئے —— ؟"

"کونسی تجویز —— ؟"

"وہی جس کا تم نے شام کو شیلا سے ذکر کیا تھا —— دیکھو میں تمہیں ماہروں کے ایک جتھے کے ساتھ بھرت پور جا کر اپنے دوست مسٹر پرتھوی سے تعاون کرنے کو کوئلہ کی کان کے متعلق پوری معلومات حاصل کرنے کا مشورہ دوں گا اور اگر حالات مفید ثابت ہوئے تو تم وہاں بینک کی ایک شاخ بھی جاری کر سکتے ہو ... تمہیں پورے پورے اختیارات دیے جائیں گے۔ تاکہ معاملات کو تم اپنی نوعیت اور مرضی کے مطابق کر ... ..."

[illegible]

[redacted]

تمہیں اپنی قابلیت کے اظہار کا پورا پورا موقع مل سکے اور اگر وہاں تمہیں حسبِ دلخواہ کامیابی ہوئی تو تم تین سال کے بعد اس بینک کے بھی شریکِ کار بنا دیئے جاؤ گے ——"

ونود کا دماغ چکرانے لگا۔ وہ ڈائرکٹر شانتارام کی گفتگو سن کر شادیٔ مرگ ہوا جا رہا تھا۔ مگر اس کے ضمیر نے اس کی بروقت مدد کی —— ایک مرتبہ پھر اس نے محسوس کیا کہ میں وہی ونود ہوں جس نے شام کو اپنے آقا سے نمک حرامی کر کے "چور" کا بدنما لقب حاصل کیا ہے آخرکار لڑکھڑاتے ہوئے یہ الفاظ اس کی زبان سے نکلے

"کاش! —— آپ نے مجھے اس چیز سے صبح ہی مطلع فرما دیا ہوتا تو میں کیوں اس ملامت کا شکار ہوتا —— ؟ میں نے تو یہ تجویز سہ پہر کو پرتھوی کے خط ملنے کے بعد مرتب کی تھی —— آہ! اس وقت تک میں باعزت اور باوقار تھا۔ اور اب! —— ایک بے عزت کمینہ چور ——" یہ کہتا ہوا وہ لڑکھڑا کر کرسی پر گر پڑا۔ شانتارام نے کہنا شروع کیا

"ونود! اب ضرورت اس کی مقتضی ہے کہ میں تم سے اپنے اس راز کا انکشاف کر دوں جسے میں اپنے دل کی گہرائیوں میں اب تک پوشیدہ کئے ہوئے تھا —— زمانہ گذرا جب کہ میں بھی ایک دن اتفاقات کا شکار ہو کر تمہاری جگہ کھڑا تھا۔ مجھ میں اور تم میں بس اتنا امتیاز تھا کہ حسنِ اتفاق سے میرا لفافہ گوہرِ مراد سے پُر تھا اور تمہارا خالی۔ اس کے بعد حالات نازک سے نازک تر صورت اختیار کرتے چلے گئے اور اپنے جرم کی پاداش کی بھیانک تصویر میری نظروں کے سامنے منڈلانے لگی۔ مگر خوش بختی سے میں صاف بچ گیا اور —— ؟ فرار ہو کر دور ... بہت دور ...... قید و بند کی خطرناک بندشوں سے آزاد ہو کر اپنی زندگی کے ایام فرحت و شادمانی میں گذارنے لگا اور چونکہ مجھ میں طبعاً روپوں کے صحیح مصرف کی عادت تھی۔ اس لئے میں نے جلد ہی اس رقم کا صحیح مصرف تلاش کر کے اپنے تئیں ارتقائی منازل تک پہنچانے کی سرتوڑ کوشش شروع کر دی اور ایک قلیل عرصہ میں میں نے ان روپوں کو دگنا کر کے چرائی ہوئی رقم کی پائی پائی بلکہ بہت کچھ اس سے زیادہ ادا کر دی —— میرے بچے! دنیا میں ہزارہا متنفس اس قسم کی لغزشوں میں مبتلا ہو چکے ہیں یہ ضرور ہے کہ جن کا طالع عالی ہوتا ہے وہ اس کی ادائیگی بھی مختلف عنوانات سے کر دیتے ہیں مگر —— ؟ میرے نظریہ سے اس قسم کی ادائیگی سے زیادہ اہم یہ ہے کہ ہم اپنی لغزشوں کو زندگی کی کسی منزل پر بھی دل سے محو نہ کریں جس سے ہم میں یہ جذبہ ضرور بیدار رہے گا کہ ہم حاجتمندوں اور ضرورتمندوں کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے ہمارا ضمیر پکار پکار کر ہمیں ان کی دستگیری اور سرپرستی پر آمادہ و مجبور کرے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح میں تمہارے ساتھ تعاون برت رہا ہوں —— ان تمام باتوں کو محض اپنے تک رکھنا اور شیلا یا کسی دوسری ہستی پر کبھی منکشف نہ کرنا —— صرف اس لغزش کے احساس کو زندہ رکھنا تمہارے لئے مشعلِ ہدایت ہوگا"

ونود کو تجربہ کار ڈائرکٹر کی باتوں سے بہت کچھ نصیحت ملی اسے اپنی لغزش سے ایک سبق ملا اب اسے گونہ ڈھارس ہوئی اور وہ بولا۔

"تو کیا آپ درحقیقت اب بھی مجھ پر شفقت فرمائیں گے ؟ اور شیلا ؟ آہ! آپ کی عنایات کا معاوضہ میں تمام عمر کی تگ و دو میں بھی ادا نہیں کر سکتا۔"

"میں سمجھتا تھا کہ جذبات سے مغلوب ہو کر تم ان الفاظ کا استعمال جائز سمجھو گے ونود! مگر چھوڑو ان فروعی باتوں کو! اپنی بقا کے پیشِ نظر نہایت جانفشانی سے اپنے فرائض کی بجا آوری پر زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرو۔ اسی میں تعمیرِ حیات کا راز مضمر ہے شیلا تمہاری ہے اور تم اس کے —— میرے بچے! مجھے ابھی تھوڑی نصیحت اور کرنے دو —— انسان بذاتِ خود ایک پاکیزہ ہستی ہے اسے بدنام اور خراب کرنے کی ذمہ داری اس کے کردار پر عائد ہوتی ہے۔ یہاں اسے اپنی عقلِ سلیم سے مدد لینی چاہئے تاکہ بجائے وہ خود کو موردِ الزام قرار دینے کے اپنے عیوب کو دور کرنے کے وسائل پر غور و خوض کر سکے۔ اس طرح وہ نہایت اعلیٰ صفات کا حامل ہو سکتا ہے اور یہ چیز ہمیں بآسانی دستیاب ہو سکتی ہے کیونکہ ایک فطری قوت ہماری پشت پناہ بھی ہے۔ اور ہم میں کارفرما بھی! جو ہمیں اچھی باتوں سے روشناس کرتی رہتی ہے۔ مگر اس کیلئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان عناصر سے اس پاکیزہ قوت کو حاوی کر دیں جن سے تعمیرِ حیات ہوتی ہے —— اس لغزش میں زیادہ دیر تک الجھے رہنے کی ضرورت نہیں —— دوسری صبح تمہارے لئے کامیابی کے دروازے کھول دے گی اور تم اپنی قابلیت کو پوری شدت سے عمل میں لانے کی سعی کر سکو گے ——" یہ کہتے ہوئے شانتارام نے ونود کی نظروں سے نظریں ملائیں —— ونود کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکل کر اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے تھے ——

شانتارام نے ونود کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھ دیا —— : شفقت کا —— !!

عورت کا سینہ

عورت کا سینہ یعنی پستان، بہت بدنما ہو کر نیچے کو ڈھلک جاتے ہیں ان میں سستی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں مشہور دوا "بریسٹین" کا استعمال کرنا چاہئے۔ پستان اپنی اصلی حالت پر آکر گول اور سخت ہو جائینگے اور عورت از سرِ نو جوان معلوم ہوگی۔ بیحد قیمتی دوا ہے۔ اور بہت جلد اثر کرنے والی ہے۔ اس دوا کے استعمال سے دودھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا یعنی گود کا بچہ برابر دودھ پی سکتا ہے۔ ایک شیشی بریسٹین کی قیمت چار روپے پندرہ آنے ہے۔ اور محصولڈاک اس پر سات آنے لگتا ہے۔

منگانے کا پتہ

جنرل منیجر زنانہ دواخانہ اے بی ۳۴ دہلی

آپ کو دمہ کا مرض ہے

مگر آپ ناحق تکلیف اُٹھا رہے ہیں کیا آپ کو معلوم نہیں کہ دوا "سانسول" نے ہزاروں مریضوں کو تندرست کر دیا۔ دمہ کا دورہ، سانس کی پریشان کن تکلیف اور بلغم اور کھانسی کی زیادتی سے آپ کو یہ دوا بہت جلد چھٹکارا دلا سکتی ہے۔ اس دوا کے ہزارہا سارٹیفکٹ ہمارے پاس موجود ہیں۔ اور ملک میں سالہا سال سے ڈاکٹر اور طبیب دمہ کے مریضوں کو اکثر یہی دوا استعمال کرا کے مکمل تندرست کر دیتے ہیں۔ ایک شیشی سانسول کی قیمت صرف ایک روپیہ چھ آنے ہے۔ اور اس پر محصولڈاک سات آنے لگتا ہے۔ تین شیشی ایک ساتھ منگانے پر محصولڈاک معاف۔

جنرل منیجر زنانہ دواخانہ اے بی ۳۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھ کر بذریعہ وی پی پارسل منگا لیجئے۔ اور ترکیب کے مطابق استعمال کیجئے دمہ کا مرض اس دوا کے استعمال سے دیکھتے دیکھتے ختم ہو جائے گا۔

دو روپے میں فوٹو کیمرہ

ہزاروں آدمی یہ فوٹو کیمرہ خرید چکے ہیں۔ اتنا سستا اور ایسا کارآمد فوٹو کیمرہ صرف دو روپے میں فروخت ہو رہا ہے یہ انتہائی حیرت کی بات ہے، ہر قسم کی تصویر جب چاہو لے لو۔ گھر میں بچوں کے بڑوں کے جیسے چاہو فوٹو خود اتار لو۔ ترکیب استعمال بیحد آسان ہے۔ سیکھنے کی ضرورت ہی نہیں اس کیمرے کے ہندوستان میں آنے کے بعد بڑی قیمتوں کے فوٹو کیمرے بکنے یقیناً کم ہو جائیں گے۔ اگر آپ کو فوٹو لینے کا شوق ہو تو

منیجر کامیاب بکڈپو اے بی ۳۴ دہلی

کو ایک خط لکھ کر فوٹو کیمرہ بذریعہ وی پی پارسل منگا لیجئے کیمرہ کے ساتھ فلم کاغذ فوٹو دھونے کا مسالہ اور ترکیب استعمال وغیرہ سب کچھ مفت ملتا ہے یعنی یہ کیمرہ مکمل روانہ کیا جاتا ہے قیمت مکمل کیمرہ دو روپے محصولڈاک سات آنے لگتا ہے

سفید بال سیاہ ہو گئے

ہندوستان کے متعدد ڈاکٹر حیران ہیں کہ ایک ہندوستانی نے عجیب غریب خضاب ایجاد کر دیا جس سے سفید بال ایک ہفتہ میں سیاہ ہو جاتے ہیں یہ خضاب لگایا نہیں جاتا۔ کھایا جاتا ہے یعنی کھانے کی دوا ہے اس دوا کے استعمال سے سر اور داڑھی کے بال بھی رفتہ رفتہ کالے ہو جاتے ہیں جن لوگوں نے ابھی تک اس حیرت انگیز دوا سے فائدہ نہیں اٹھایا وہ فوراً منگا کر دیکھیں صرف ایک ہفتہ کے استعمال کے بعد اس دوا کا زندہ ثبوت وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینگے یعنی جو بال اب تک سفید ہو گئے ہیں ان کی جڑیں بھی سیاہ ہو جائینگی۔ اور آئندہ سے سیاہ بال پیدا ہوں گے۔ ہندوستان کے ہزاروں مرد اور عورتیں اس عجیب ایجاد سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ اور ہر جگہ اس دوا نے زندہ ثبوت پیش کیا ہے اس دوا کا نام کیشول ہے ایک شیشی میں پندرہ روز کی دوا ہوتی ہے۔ قیمت فی شیشی چار روپے محصولڈاک گیارہ آنے جن لوگوں کو ضرورت ہو وہ آج ہی

منیجر صاحب زنانہ دواخانہ اے بی ۳۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھ کر کیشول کی ایک شیشی بذریعہ وی پی پارسل منگائیں۔

وسعتِ داماں

اک سعیٔ رازداریٔ پیماں ہے اور ہم

از حضرت عابد شاہجہانپوری

اک بیخودی ہے جلوۂ تاباں ہے اور ہم
رسوائی نگاہ کا ساماں ہے اور ہم

اکثر نگاہِ شوق کو محسوس یہ ہوا
جیسے کہ ہاتھ میں ترا داماں ہے اور ہم

دامن کو چاک کر کے کچھ آگے نہ بڑھ سکا
اے جوشِ غم جنونِ پشیماں ہے اور ہم

جیسے پکارتا ہو کوئی اے فریبِ شوق
اک بیخودی سی ہے دلِ حیراں ہے اور ہم

صحرائے دلنواز تھا نظروں کے سامنے
سمجھے یہ ناشناس کہ زنداں ہے اور ہم

ساحل کا احترامِ نگاہوں سے اُٹھ گیا
اے چشمِ شوق حاصلِ طوفاں ہے اور ہم

عالم وداعِ ہوش کا دیکھیں تو آپ بھی
دشتِ جنوں ہے چاکِ گریباں ہے اور ہم

ناکامیٔ نگاہ نے ساحل بدل دیا
اک کیفِ دلنوازیٔ طوفاں ہے اور ہم

وہ بھی سہی جو حوصلۂ نازِ حسن ہو
اے چشمِ شوخ وسعتِ داماں ہے اور ہم

اکثر ہوئی ہے چشمِ سخنگو سے گفتگو
اک سعیٔ رازداریٔ پیماں ہے اور ہم

تسکین کیا نظر کو ہوائے کاوشِ جنوں
حدِّ خیال تک درِ زنداں ہے اور ہم

ناکامیاں بدل نہ سکیں فطرتِ وفا
عابدؔ نظر میں وسعتِ داماں ہے اور ہم

قران السعدین

ایک تاریخی منظر

از جناب سید مجتبیٰ حسین نوگانوی

جلوس کو پورا سال بھی نہیں ہوا۔ ہمایوں ابھی کہ بیجر کے راجہ کو زیر کر کے بیٹھا ہے کہ اسے میں خبر آئی کہ والئے گجرات کی بے اعتدالیاں گوشگذار کیجاتی ہیں مغل شہنشاہ کو جلال آیا اور گجرات کو فتح کرنے کے ارادے سے چل پڑا کامیابی نے قدم چومے اور گجرات قبضہ میں آ گیا۔

تھوڑے ہی عرصہ میں قندھار سے بہار تک تمام شمالی ہند میں ہمایوں کے نام کا سکہ و خطبہ جاری ہو گیا۔ بادشاہ پھر ایک بار اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ کہ ناگاہ شیر شاہ کے خروج کی خبر آتی ہے مغلیہ فوج حرکت میں آ جاتی ہے شیر شاہ نے جب یہ سنا کہ ہمایوں نے بڑی زبردست فوج مقابلہ کیلئے بھیجی ہے تو دست بدست لڑنے سے گریز کیا اور شاہی لشکر پر شبخون مارا۔

اپنے لشکر کی پسپائی معلوم کر کے ہمایوں خود ایک بحر صفت فوج لے کر آگے بڑھا۔ بنگالہ کے آس پاس گھمسان کا رن پڑا۔ ہمایوں نے پھر شکست کھائی۔ اور اکبر آباد پہنچا۔ شیر شاہ نے پیچھا کیا اور پھر کچھ جوٹیں ہوئیں اس دفعہ بھی ہمایوں کی کامیابی معلوم۔

ناچار ہندوستان کو خیرباد کہہ کر کابل کا رخ کیا۔ شیر شاہ نے یہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ اور پھر جا دبایا۔ ہمایوں جان بچا کر امرکوٹ پہنچا۔ خلیق رانا اس کو ڈرے لعل کی قدر اور مناسب حال ضیافت کا انتظام کرتا ہے۔ ہمایوں ذرا دم لینے کے لئے ٹھیر گیا۔

پے در پے افتاد مصائب سے بجھے ہوئے دل کو قدرت کچھ شگفتہ کرنا چاہتی تھی۔ اسلئے اکبر اعظم جیسا جلیل القدر بیٹا عطا کیا گیا۔ عجیب عالم ہے بیکسی و ادبار کے وقت مسرتیں بھی کچھ سہمی سہمی رہتی ہیں۔

جلیسی چلہ کی رسوم کے بعد قندھار کے لئے گھوڑے کسے جانے لگے۔ قندھار پہنچ کر اہل و عیال کو یہیں چھوڑا اور خود ہرات کی راہ لی بے سر و سامان بھائی کو لوٹنے کا شاید اس سے بہتر موقع میرزا عسکری کے ہاتھ نہ آتا۔

لیکن اب ہمایوں دنیا سے تقریباً اکتا چکا ہے دو تین دن سے ہر شخص سے دنیا کی بیوفائی اور سلسلۂ ظاہر کی بے اعتباری کے موضوع پر گفتگو ہو رہی ہیں۔ اصحاب تعلق کو دنیا کی دوڑ دھوپ سے باز رہنے کی تلقین کی جا رہی ہے اسباب آسائش و تنعم گھلتے اور لوازم تفرید و تجرید بڑھتے جا رہے تھے با ایں ہمہ فرزانگی جوانمردی کبھی کبھی نشانہ ہلا کر چونکا دیتی ہے

"ہمایوں کیوں ہے ——— مگر مسلسل ناکامیاں بہم مایوسیاں ——— معاذاللہ ——— ولولے اٹھنے نہیں پاتے دبا دیتی ہے۔ یہ تلاش سکون پھر حجاز کی سمت باگیں پھیر دیں۔

بیرم خاں خانخاناں ہمرکاب تھے مشورہ دیا" ایران سے موروثی دوستی ہے قریب پہنچ ہی چکے ہیں۔ ایک آخری کوشش یہ بھی سہی"

بات معقول تھی۔ اسلئے رخ بدل دیا سیستان کی راہ میں بلوچ گھیر بیٹھے لیکن اب برے دن نکل چکے تھے حالات مساعد ہوتے جا رہے تھے کامرانیاں جہاں تک رہی تھیں خدا کی قدرت دیکھئے خون آشام قزاق درندہ صفت رہزن انسانیت کش لٹیرے شرائط مدارات بجا لاتے ہیں۔ اور نہ صرف ضیافت بلکہ ملک و خطہ اپنے سرداروں کی حفاظت میں ولایت گرم سیر تک پہنچاتا ہے

ملک اگرچہ یہ بھی دشمن کا ہے لیکن حافظ حقیقی مددگار اور نصیب یاور ہے یعنی دشمن ہی کا خادم اپنی جنباتی بیچ کر ہمایوں کو ممکنہ آسائش بہم پہنچاتا ہے۔ بھائی کی خاطر مدارات کا یہ صلہ خادم کو میرزا کامران کی سرکار سے ملا تھا۔ کہ بے چارے کی آنکھیں نکلوا لی تھیں۔

ولایت گرم سیر سے روانہ ہو کر ہمایوں سیستان پہنچا۔ بادشاہ مشوش تھا کہ اختلاف مذہب بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ دیکھئے کیا ہو۔ لیکن پہلے ہی قدم پر اسے معلوم ہو گیا۔ کہ دنیا فراخ حوصلہ اور عالی ظرف نفوس سے خالی نہیں ہوتی اغیار اپنوں سے زیادہ ہمدرد ہو سکتے ہیں

احمد سلطان شاملو کو جب معلوم ہوا۔ کہ ہمایوں شہنشاہ ہند آ رہا ہے۔ تو امرا کو ساتھ لے کر شایان شان استقبال کیا۔ مہمانی میں احمد سلطان مع اراکین مصروف ضیافت تھا۔ اور زنانے میں سلطان کی والدہ وغیرہ دیگر خواتین مریم مکانی کی دلداری میں لگی ہوئی تھیں۔ یہاں سے ہمایوں نے ایک خط بیرم خاں کے ہاتھ شاہ عباس صفوی والئ ایران کی خدمت میں بھیجا۔ یہ خط موجود کسی تاریخ میں نہیں ملتا۔ اکبرنامہ وغیرہ تقریباً سب میں

یہ شعر لکھا ہے ؎

بگذشت از سرِ ما آنچہ بگذشت

چہ بکوہ و چہ بصحرا چہ بدشت !

بلمن میں یہ خط تمام و کمال فضیلت مآب جناب حکیم سید مظفر حسین صاحب
از حیدر آباد دکن کے کتاب خانہ میں نظر آیا۔ موصوف کے پاس ایک
بلد قدیم نسخہ میسور نامی کی ہے۔ یہ اصل میں تو میسور کی ایک جامع
ہے جو ٹیپو سے متعلق اپنی تاریخ میں بہت سے ڈ لے نا سفتہ
ہے لیکن آخر میں کاتب نے ان خطوط کو بھی جمع کیا ہے جو ہمایوں نے
زرنالی ایران نے جن کا جواب دیا اور بعض شاہان مغلیہ کے
اس حصہ میں موجود ہیں۔ یہاں ہمایوں کا خط اور شاہ ایران کا جواب
نقل کیا جاتا ہے جس سے شاہ ایران کے پُرخلوص خیر مقدم کا اندازہ ہوگا
نامہ محمد ہمایوں بادشاہ کہ بعد شکست یافتن از شیر شاہ بادشاہ بہ شاہ
والئ ایران نوشتہ بود۔"

بعد از وصفِ نظیفہ اخلاصیکہ مسبوق مرضیہ اصحاب اخصاص ست
رقلت بندگی وکثرت شرمندگی خود را ذرہ مثال در نظر مہر سپہر حشمت و
حضرت شاہی کہ منظر گاہ اوصاف کمال است در آوردہ نمودہ می آید
اگرچہ جہرخود را با مانت جملہ خدام عالی مقام انتظام نمادہ، ما سرا
رابطہ محبت واخلاص بر قبضہ قلب چوں رماں ہمیشہ متعلق ساختہ بے
۔۔ بسوئے حضور موفور السرور وخالص النور کہ موجب حصول
انواع سعادت وکرامات است مستفیض و ہر لحظہ توجہ وجیہہ بوجہ موجہ
تمہید لطیف جدید ے می بخشید۔ تا آنکہ از ممر گردوں وگردش چرخ بوقلموں
۔۔ سواد اعظم ہند بہ تنگنائے سندھ رسیدہ

درگذشت از سرِ ما آنچہ گذشت

چہ بہ ہاموں چہ بکوہ و چہ بدشت

اکنوں بجانبِ قبلہ بر شاہرہ نیز خیال نیز عظمت و اجلال در ایران است
و امیدوار مرحمت حضرت کہ بعد دریافت صحبت ۔ ۔ ۔ بس مراد ہا لیست
مقالات و حالات سانحہ آنچہ واقع است بعرض باشد بعرض رساند انشاء اللہ
تعالیٰ الحمد محرومی محمد ہمایوں

شادیانوں اور نقاروں کی گونج میں خانخاناں کا استقبال کیا جاتا
ہے۔ بعد عزو احترام باریاب کیا گیا۔ شہنشاہ نہایت مسرت انگیز پیرایہ میں
ہمایوں کا خط پڑھتا اور فوراً دوات قلم منگا کر اپنے ہاتھ سے جواب لکھتا ہے

جواب شاہ عباس صفوی والئ ایران

گوہر یکتائے پیگیری صفا آوردہ
لعلے از کان بدخشاں آوردہ

خیر مقدم مرحبا اے شاہ ترکستاں زمیں
ہمچو باید شرطِ یک رنگی بجا آوردہ

کردہ طوفِ حریم مرقد موسیٰ رضا
حرمتِ آلِ پیمبر را بجا آوردہ

گر ترا دردیست بر دل از حوادث غم مخور
زانکہ رو بر درگہِ آلِ عبا آوردہ

من سلیمانم و لے خدام علی المرتضیٰ ست
زاں سبب شاہا بدیں در التجا آوردہ

ہمایوں کس عزو احتشام سے داخل ایران ہوتا ہے۔ اور شاہ عباس
کس طرح مہماں نوازی کرتا ہے؟ یہ سب پھر کبھی۔

غزل

دل کو ہے تیرِ نظر کی آرزو — آرزو! تری نظر کی آرزو
مندمل ہونے لگے ہیں زخمہا دل — پھر ہے اک تیرِ نظر کی آرزو
لوٹ لی جس نے میری دنیائے ہوش — دل کو ہے اس فتنہ گر کی آرزو
نقش سجدوں کے جبیں سے مٹ چلے — آج پھر ہے ان کے در کی آرزو
دل کو اس ترچھی نظر کے سامنے — ہیچ ہے تیغ و تبر کی آرزو
آج پھر ہے درد کچھ دل میں سوا — آرزو ہے چارہ گر کی آرزو

- اک نظر رہ دیکھ لیں مجھ کو عزیز
ا ۔۔۔ ۔۔۔

حُسن کی آرزو ہے زیست

از حضرت امین حزیں سیالکوٹی

حُسن کی آرزو ہے زیست — حُسن کی گفتگو ہے زیست
حسن کی جستجو ہے زیست — حسن سے مُشکبو ہے زیست
حُسن ہے وہ مئے طہور جس کا حیات جام ہے

حُسن کا اہتمام دیکھ! — حسن کا انتظام دیکھ!
حسن کا فیضِ عام دیکھ! — منظرِ صبح و شام دیکھ!
حسن کی دید سے حیات آئینۂ دوام ہے

حسن نمودِ ذات ہے — سلسلۂ صفات ہے
حسن سے دن ہے رات ہے — حسن سے کائنات ہے
حسن سے ہی حیات کا دہر میں ننگ و نام ہے

حسن سے زندگی کی قدر — حسن سے زندگی ہے صدر
حسن سے یہ ہلال بدر — اسکو اتیں! مجالِ غدر؟
حسن کی جو اسیر ہے حسن کی جو غلام ہے

گم شدہ کاغذ

کھانڈیکر کے ایک مضمون کا ترجمہ

از جناب امجد علی یوسف زئی

کھانڈیکر مرہٹی زبان کے مایۂ ناز ادیب ہیں۔ آپ ایک افسانہ نگار اور ناول نویس کی حیثیت سے مرہٹی ادب میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ تقریباً پچیس۲۵ بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں مرہٹی کے ایک معیاری ماہنامہ جیوتسنا کے ایڈیٹر بھی ہیں۔ ذیل کا مضمون آپ ہی کی ذہنی فکر کا نتیجہ ہے۔ امجد یوسف زئی

آج مجھے افسانہ بھیجنا تھا۔ ڈاک چھ بجے نکالی جاتی ہے۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ پانچ بج چکے تھے۔ نقل نویس کے لائے ہوئے کاغذ کو میں جلدی جلدی دیکھنے لگا۔ دو کاغذوں کو دیکھ کر میں نے تیسرا کاغذ لیا۔ میں کیا پڑھ‌ رہا ہوں! مجھے خبر نہ تھی۔ میری حالت ویسی ہی تھی۔ جیسے کہ دیہات میں کسی کی ان فلموں کو دیکھ کر ہوتی ہے جو عموماً درمیان سے کٹے ہوئے ہوتے ہیں۔

میں نے تمام کاغذات دیکھے کہ کہیں صفحے تو اُلٹے نہیں لگ گئے۔ لیکن نہیں ایک صفحہ کا دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ افسانہ ہے یا کچھ اور اس کا خود مجھے بھی پتہ نہ تھا۔ میں نے اپنی بیاض دیکھی۔ اس میں تین چار ہی کاغذ تھے۔ گھڑی میں سوا پانچ ہو گئے تھے۔ میں نے نقل نویس کو بلایا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ میرے پاس جتنے کاغذات آئے تھے۔ میں نے ان کی نقل کر دی تھی۔

میں پریشان ہو گیا۔ آج کی ڈاک سے افسانہ بھیجنا ضروری تھا۔

لاحول ولاقوۃ کل کیسے رنگ میں آکر میں نے یہ افسانہ لکھا تھا۔ اب اگر پھر لکھنے بیٹھوں تو وہ رنگ کس طرح آسکے گا۔ میرا لکھا ہوا کاغذ آخر کدھر گیا ہے؟ احمد نے اس کا پتنگ نہیں بنایا۔ بیگم نے پھینکا ہو! بچہ کر اس کو پارہ پارہ تو نہیں کر دیا۔

غصہ میں آکر میں وہ کاغذ ڈھونڈنے لگا۔ اس طرف اخبارات کی ردی کے دو تین ڈھیر پڑے تھے۔ کچھ پرانے اخبارات کے تراشے بھی تھے۔ جن کو میں نے ابھی تک ضائع نہیں کیا تھا — وہ الٹ پلٹ کرنے لگا۔ اس میں بہت سے دوسرے افسانے ملے لیکن ان سے مجھے کیا کرنا تھا۔

اپنے افسانہ میں میں نے ایک بوڑھے شخص کی تصویر کھینچی تھی کہ کس طرح اس کا دل جوان بیوی کے لئے جوان بنتا ہے۔ اخبارات کو ٹھوکر لگا کر الماری کو کھڑکھڑاتے ہوئے کھولا اس میں سے کتابیں نکالیں اس دوران میں غصہ سے دو چار باتیں بھی کہیں۔ تاکہ بیوی کو سنائی دیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بات بھی سودمند ثابت نہ ہو سکی۔ مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔ خیال کیا کہ میری قسمت ہی میں یہ باتیں لکھی ہیں۔ کہاں کی کہانی شاید خدا کو منظور نہ تھا۔ کہ وہ منظر عام پر آسکے۔

میری زندگی کے بہت سے واقعات میری آنکھوں کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ دو دفعہ بخار میں مبتلا ہوا۔ کئی دفعہ تفریح کر گیا۔ لیکن تنہا رہا دوست احباب پہلے چلے جاتے یا جلد واپس ہو جاتے۔ اس وقت میرے دل میں یہ خیال گزرا کہ ہی سے مل کر کیا کرنا ہے۔ خود کو تکلیف ہوتی ہے

اب پھر وہ افسانہ کل لکھنا پڑے گا۔ لیکن کیا وہ اسی طرح کا ہو گا؟ نہیں پہلی تحریریں کچھ نہ کچھ دلکشی ضرور ہوتی ہے اور یہ باتیں دوسری مرتبہ کے لکھنے میں محال ہوتی ہیں۔

کل لکھنا گویا نقل کرنا ہو گا۔ اس میں کل کا مضمون یقیناً نہیں آسکتا کسی نے کیا سچ کہا ہے۔ کہ آرٹ بھی ایک دفینہ ہے۔ ایک اچھی باورچن سے ہمیشہ اچھے کھانے پکانے کی توقع فضول ہے تو پھر لکھنے ہی کی بات کچھ نرالی ہے

تمام رات مجھے اسی گم شدہ کاغذ کی فکر رہی۔ میں نے اسے بیگ میں تو نہیں رکھ دیا۔ یہ خیال آتے ہی میں بچھونے پر سے اُٹھا۔ چراغ روشن کیا۔ بیگ کھول کر دیکھا۔ اور ناامید ہو کر پھر بچھونے پر دراز ہو گیا صبح اٹھ کر خاموش لکھنے بیٹھ گیا۔ لیکن دل جل رہا تھا میری حالت ویسی ہی تھی۔ جیسے کسی نئے ایکٹر کی اسٹیج پر آتے وقت ہوتی ہے۔ میں نے کسی نہ کسی طرح کہانی ختم کی لیکن ہمیشہ کی طرح لکھنے کا سرور مجھے حاصل نہ ہو سکا شام کو اسے پوسٹ میں ڈال کر تفریح کے لئے چلا گیا۔ دل پر ایک قسم کی اداسی اور نفرت سی چھائی ہوئی تھی۔ آسمان پر غروب کے وقت پھیلی ہوئی شفق کو دیکھ کر میری ذہنی فکر بیدار ہو گئی۔ میں نے خیال کیا۔ جب دیکھو شام کا حسن کبھی کم دکھائی نہیں دیتا لیکن دل کی حالت خود اس پر موقوف ہے۔ یہاں کل کی لکھی ہوئی کہانی آج لکھنے کے برابر نہیں ہے۔

میں گھر آیا۔ تو بیوی نے کہا۔ کہ کل کا گم شدہ کاغذ مل گیا ہے۔ لیکن یہ سنتے ہی بجائے خوش ہونے کے میں اور زیادہ کبیدہ خاطر ہوا۔ اگر وہ کاغذ پڑھوں اور آج کا لکھا ہوا کچھ خراب معلوم ہوا تو؟ . ڈرتے ڈرتے میں

[illegible]

معافت نہ کیا۔ اپنے کمرہ میں جاکر اطمینان سے پڑھنے لگا مجھے ایسا معلوم ہوا گویا میں عدالت کے کٹہرے سے ابھی باہر آیا ہوں یا میعادی بخار میں مجھے پسینہ آگیا ہے۔

کل کے افسانہ اور آج کے افسانہ میں بہت فرق تھا لیکن آج کا افسانہ کل سے بہتر تھا کہ دو تین مقامات پر جو باتیں میں نے معمولی طور سے بیان کی تھیں آج انہیں نہایت رنگینی کے ساتھ لکھا تھا۔

ڈاکٹر کہتے ہیں کہ جرمن ڈاکٹر کرنوشن کی ایک قیمتی کتاب نذر آتش کر دی لیکن اس کے باوجود اس ماہر ریاضی نے سکوت اختیار کیا۔ اب اسکی حقیقت مجھے معلوم ہوئی۔ میں نے جو لکھا تھا وہی دوبارہ لکھ سکوں گا۔ بلکہ اس سے زیادہ اچھا لکھ سکوں گا۔ اس کا یہی خیال تھا۔ وہ صرف تماشائی نہ تھا کہ خاموش بیٹھ جاتا بلکہ وہ مستقبل کی طرف مسکراتے ہوئے دوڑنے والا تھا۔

میں نے خیال کیا کہیں سن لی

"Home they brought warrior dead"

نظم شاید اسی ایک تجربہ کی پیداوار ہے۔ اس میں بیوی خاوند کے نقصان کو دیکھ کر آنسو نہیں بہاتی۔ لیکن چھوٹے بچے کو ران پر رکھے ہوئے اسکی آنکھوں میں آنسو دکھائی دینے لگتے ہیں۔ ماضی مردہ ہے۔ اور مستقبل شاندار ہے۔ یہی خیالات اس کے ان آنسوؤں میں چمکتے ہیں۔

کل رات بھر میرا دل اس گم شدہ کاغذ کے لئے غمگین تھا۔ اس پر مجھے خود ہنسی آگئی کل شام کو مجھے ایسا معلوم ہوا تھا۔ کہ شام کا حسن کبھی کم نہیں ہوتا لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ دل کی دنیا شام سے بھی زیادہ دلفریب ہے اس میں رنگ رنگ کی تصاویر کھینچ آتی ہیں۔ انسان جنگلوں میں وحشیانہ زندگی بسر کرنے والا اب بنگلوں میں پہنچ گیا۔ چقماق سے آگ روشن کرنے والوں نے بجلی کی روشنی اور حرارت پر بھی دھاوا مارا۔ پیٹ میں درد ہو جائے تو خدا کے آگے صرف گڑگڑانے کی بجائے اب دوا دارو کی فکر کرنے لگا۔ یہ انسان کے تجسس اور مستقبل کی شاندار ترقی کے جذبہ کی بدولت ہے مگر پھر مجھے اس کا احساس کل کیوں نہیں ہوا۔ کہ میں گم شدہ کاغذ سے بہتر آج لکھ سکوں گا۔؟ کمزوری کے احساسات نے مجھ پر یہ جذبات طاری کیوں نہیں کر دیئے مستقبل آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا اس لئے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن امید کو تو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔

"شارڈول" ناول میں ایک کوئلہ کی کان میں ایک جگہ ایک مزدور کی حالت ایسی بتائی گئی ہے۔ کہ وہ سخت مجروح ہے۔ اور جب تک اس کا ہاتھ نہ کاٹ ڈالے وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ ڈاکٹر ہاتھ کاٹنے کے لئے کلوروفارم کی بوتل تلاش کرتا ہے۔ بوتل بیگ میں بھولی ہوئی رہتی ہے۔ اس وقت وہ انہیں کا انجکشن دے کر اس مزدور کا ہاتھ کاٹ ڈالتا ہے۔ تو وہ کہتا ہے "یہاں کتابیں کس کام کی ہیں؟" کیا ماضی کتابوں کے علم کے مانند نہیں ہے؟

اس ڈاکٹر کی ذہنی فکر مجھے حاصل ہوتی۔ تو میں گم شدہ کاغذ پہ مغموم ہو کر وقت نہ گنواتا۔ اور فوراً ہی لکھنے بیٹھ جاتا۔ ایسے مواقع زندگی میں اکثر دفعہ آتے ہیں۔ لکھا ہوا کاغذ ہی کیا اس سے قیمتی اشیا ضائع ہو جاتی ہیں۔ کسی کی عمر تعلیم میں ضائع ہو جاتی ہے کوئی تعلیم سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھاتا تو کہتے ہیں۔ کہ یہ سب مشیتِ ایزدی ہے کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ تقدیر ہی سب کچھ ہے۔ اور تدبیر فضول؟ کہ اگر انسان کچھ نہیں کرتا۔ تو کیا سارے انسان اسی طرح اپنے ماضی پر رونے بیٹھیں؟

—— (ترجمہ)

ایک شعر

از جلال ملیح آبادی

فسانۂ عشق کا رنگیں بنا رہا ہوں میں
ٹپک رہا ہے لہو مسکرا رہا ہوں میں

نوائے درد

از:۔
جنابِ محمد معین الدین دردؔ لکھنوی شاگرد حضرت خلیل بگویرائی

ہمیں بھی جانچنا ہے حشر میں کچھ شانِ یزداں کو
لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

نہاں کیا کیا پریروؤں کی شکلیں ہیں مرے دل میں
لئے پھرتا ہوں پہلو میں دبائے اک پرستاں کو

جنابِ شیخ پر کیوں کر ہنسی آئے نہ رندوں کو
مسلماں ہیں مگر کافر سمجھتے ہیں مسلماں کو

کہاں رکھوں چھپا کر دہر میں کافر اداؤں سے
متاعِ زہد و تقویٰ کو، متاعِ دین و ایماں کو

خوں میں دل کے بہلانے کو اچھا شغل ہاتھ آیا
کبھی سیتا ہوں دامن کو کبھی چاکِ گریباں کو

یہ میرے بعد ویرانے میں کیسا ہُو کا عالم ہے
غزالِ دشت بھی حسرت سے تکتے ہیں بیاباں کو

نکالا پاؤں پھر جوشِ جنوں نے موسمِ گُل میں ؟
نہ کیوں ہو دیکھ کر وحشت مجھے خارِ مغیلاں کو

نہیں تھے یہ۔ تو پھر رونق کہاں تھی کچھ بھی دنیا میں
پریزادوں نے مل جُل کر سنوارا بزمِ امکاں کو

جہاں پایا، نکالی مئے کی بوتل اپنی جھولی سے
سفر میں بھی لئے پھرتا ہوں مئے نوشی کے ساماں کو

ہوا یہ رتبہ عالی۔ ہماری جبہہ سائی سے
بنایا آسماں ہم نے۔ زمینِ کوئے جاناں کو

خبر کیا دردؔ کی۔ وہ بھی سمجھتے ہیں تخلص ہے
کہاں جاؤں میں لیکر مدعائے ذوقِ درماں کو

حجاز کا دورِ جدید

معلومات افزا مقالہ

از الحاج مولانا عبدالقیوم ندوی

حجاز کا نظام کئی اہم شعبوں پر منقسم ہے محکمہ خارجہ۔ شعبہ حرب (فوج) شعبہ پولیس، تعلیم، آثار قدیمہ، اوقاف، صحت عامہ، تعمیر آبپاشی محکمہ شرعی۔ عدل مالیات۔ رسل و رسائل وغیرہ۔ ان کے ماتحت کمیٹیاں قائم ہیں جن کی نگرانی اس محکمہ کے افسرِ اعلیٰ سے متعلق ہے اور وہی اس کی فلاح و بہبود کا ذمہ دار ہے۔ اس جگہ ان میں سے بعض کا اختصار سے تذکرہ کیا جاتا ہے۔

حجاج کے ساتھ برتاؤ

موجودہ حکومت سعودیہ اپنے سابقہ تلخ برتاؤ کی وجہ سے جو اس نے حجاج کے ساتھ روا رکھے سخت بدنام ہو چکی ہے اور بجا طور پر بدنام ہوئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس نے نتیجہ پر بلا غور و فکر ایک مہرے سے سارے قبّوں اور مزارات کو خاک میں ملا دیا تھا ظاہر ہے یہ چیز عام اور جمہور مسلمانوں کے لئے قابل برداشت نہ تھی نتیجہ یہ ہوا کہ سارے عالم میں یکلخت کہرام مچ گیا اور حجاج آنے کم ہو گئے حتیٰ کہ ایک سال ایک لاکھ دو لاکھ کی بجائے صرف ۲۰ ہزار آئے۔ اس چیز نے حکومت پر اسکی غلطی کو جلدی ہی واضح کر دیا۔ مگر اب تیر ترکش سے باہر ہو چکا تھا رفتہ رفتہ یہ احساس اور بڑھتا گیا یہاں تک کہ اب حکومت کی طرف سے جنت البقیع میں پختہ سنگ سیاہ کے مقامات بن گئے سید الشہداء کے مزار کو بھی اسی طرح بنوا دیا۔ اور بعض اور مقامات پر بھی تجدید کا کام جاری ہے۔ اکثر مقامات پر پولیس کا پہرہ لگا رہتا تھا جو حجاج کو زیارت کرنے یا کسی متبرک مقام میں داخل ہونے سے سختی سے روکتے مگر اب اس پہرہ میں بھی تخفیف ہے اور جو باقی ہے وہ بھی نرم اور آسان ہے کہ اگر یہ صورت چند سال اور رہی۔ تو عجب نہیں کہ اعتدالی صورت قائم ہو جائے اور کسی کو شکایت کا موقع باقی نہ رہے۔ غرضیکہ حجاج کے ساتھ اب اس قسم کا برتاؤ نہیں کیا جاتا جو آج سے ۴ - ۵ سال قبل کیا جاتا تھا۔ جالی مبارک پر بھی اب نظر بچا کر لوگ بوسے پاتے ہیں۔ اور مار پیٹ کی تو قطعاً ممانعت کر دی گئی ہے جیسا کہ پہلے ہوا کرتا تھا۔ مزارات پر فاتحہ پڑھنے کی بھی ممانعت نہیں رہی اور نہ دیر تک کھڑے رہنے کی کوئی روک ٹوک ہے۔ اسی طرح ممنوعہ مقامات پر جہاں صرف جانا بھی مار پیٹ کے لئے کافی تھا۔ اب لوگ ہو آتے ہیں۔ اور بالکل صحیح و سالم واپس آ جاتے ہیں۔

ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت کے حجاج کے ساتھ زیارت قبور و آثار شریف کے معاملہ میں برتاؤ انہیں سے نرم ہوتا جا رہا ہے۔ جو خوشگواری اور تعلقات کی استواری کی دلیل واضح ہے۔ البتہ بہت سے مقدس زمینوں پر کسی قسم کا ٹیکس کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا ہے۔ حکومت کو چاہئے کہ جلد از جلد اس ٹیکس کی وصول یابی بند کرے اور مہاجرین کی ہجرت میں سہولت کی باعث بنے کیونکہ مکہ اور مدینہ میں ہر مسلمان کو بلا کسی ٹیکس اور محصول کے رہنے کا قدرتی اور فطری اور مذہبی حق ہے جس پر کسی قسم کی پابندی نہیں عائد کی جا سکتی ہے۔ پھر یہ کہ جو وطن سے بے وطن ہو کر حجاز ایسے دور افتادہ سرزمین میں آباد ہوتا ہے ظاہر ہے کہ اس حالت میں اس پر یہ جدید ٹیکس بہت پریشانی کا باعث ہوگا۔

جو امن و امان وہاں آج کل قائم ہے یقیناً اس کی بڑی قیمت ہے پھر حکومت کے ارکان اور خود سلطان اس کے لئے ہمہ تن کوشاں ہیں کہ کسی نہ کسی طرح سے عالم اسلامی آبادی سے اپنے گہرے تعلقات جوڑیں اور مسلمانوں کے دلوں میں گھر کریں اس کیلئے وہ ہر سال حج کے موقعہ پر ایک خاص دعوت کرتے ہیں جس میں ہر ملک کے چُنے ہوئے حجاج مدعو ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے جو تقریر ہوتی ہے اس میں اس کا خاص طور سے تذکرہ ہوتا ہے اسکے علاوہ منیٰ میں دربار عام ہوتا ہے اس میں داخلہ کا اذن عام ہوتا ہے۔

"اقتصادی حالت"

ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب کہ ترکوں کے زمانہ میں اہل حجاز اس قدر مالدار اور غنی تھے کہ اشرفیاں پھینکتے تھے بڑے بڑے اوقاف ان کیلئے مخصوص تھے۔ عراق، شام اور مصر کے محاصل حجاز اور اہل حجاز کی خدمت

کے لئے وقف تھے اور طرح طرح کی آمدنیاں تھیں۔ لیکن اب نقش ونگار طاق نسیاں ہوگئے۔ آج غربت ہے افلاس ہے تنگدستی ہے احتیاج ہے اور سخت مصیبت کا سامنا ہے مال۔ سے بڑھ کر دیہاتی آبادی پریشان اور تنگدست ہے اور اس کے فقر وفاقہ کا وہ عالم ہے کہ تحریر کرتے ہوئے بھی دل کو تکلیف ہو رہی ہے غرضیکہ اقتصادی حالت بیحد پریشان کن اور تکلیف دہ ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ سننے میں آیا ہے کہ حجاج کی آمدنی کا اکثر حصہ حکومت خود لے لیتی ہے اور بہت ہی کم اہل حجاز کو ملتا ہے۔ جو یقیناً ان کے لئے ناکافی ہے پھر حکومت کے کثیر نہ بیشتر ملازمین دوسرے دار [illegible] نجدی ہیں اور کمتر حجازی ہیں۔ اس سے بھی اقتصادی حالت کی تباہی میں روز بروز ترقی ہوتی جارہی ہے اور رعایا میں بددلی کے صحیح جذبات نمایاں ہوتے چلے جارہے ہیں حکومت کو چاہئے کہ اپنی سالانہ آمدنی کی فہرست آمد وخرچ شائع کرے اگر ایک طرف رعایا کو شکایت کا موقع نہ مل سکے گا۔ دوسری طرف حکومت کو اپنے انتظامات میں آسانی رہے گی۔ آج کل یہ دستور ہے کہ بعض بعض مدوں کا بجٹ شائع ہوتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ ناکافی ہے۔ حکومت اپنے اخراجات پورا کرنے کے لئے انگریزوں سے قرض بھی لیتی رہتی ہے یہ چیز خود حکومت کے لئے مضر ہے انگریزوں کی وسیع حکومت کا زیادہ تر یہی راز ہے کہ وہ قرض دیکر مقروض پر ہر طرح کے دباؤ ڈالتے ہیں۔ اور تجارت کے بہانہ سے ہر قسم کے مراعات مانگتے ہیں۔ لہذا ان سے یوں بھی احتراز لازم ہے۔ حکومت کو چاہئے کہ حتی الامکان اپنے اخراجات کو کم کرے آمدنی کے وسیع سے وسیع ذرائع سوچے اور ان پر عمل کرے اپنے ہاں کے ذہین طلباء کی ایک کثیر جماعت کو ترقی یافتہ ممالک میں اقتصادیات کی تعلیم کے لئے بھیجے اور بتائے ہوئے راستوں پر عمل کرے۔ رعایا کے لئے بڑے بڑے کارخانے اور دوسرے کام نکالے اور ان کو کام پر لگا کر اپنے ہاتھ سے روزی پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کرے۔ اس سے ایک طرف ان کی زندگی کا دارومدار حجاج کی کثرت وقلت سے آزاد ہوگا تو دوسرے خود اپنی روزی اپنے ہاتھوں پیدا کرنے کی قوت پیدا ہوجائے گی۔ کارخانوں اور دوسرے بڑے کاموں کیلئے ظاہر ہے روپیہ کی ضرورت ہوگی اسکو مسلمانوں سے قرض لیکر پورا کیا جاسکتا ہے اگر سود کا خطرہ ہے تو بڑے بڑے حصص کے ذریعہ سے اس کو منافع میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک صورت اور بھی آمدنی کے اضافہ کی ہے۔ وہ یہ کہ حجاج پر آج کل کثیر ٹیکس کا جو بار ہے اسکو کم کرنا چاہئے اس سے لازماً حجاج کی تعداد بڑھ جائے گی اور آمدنی میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔

تجارت وصنعت

اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد بھی عربوں کا زیادہ ذریعۂ معاش تجارت تھا اور اس سے وہ اسقدر خوشحال اور مطمئن تھے کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا تو کجا اوروں کو کھلا کر کھلاتے تھے۔ وہی عرب آج بھی ہے اور عرب کی وہی چیزیں آج کل بھی ہیں بلکہ تجارت کے آج جو ذرائع حاصل ہیں وہ پہلے نہ تھے اگر عرب ملکی پیداوار ہی کی تجارت کی جائے اور دیسی مصنوعات کو فروغ دے کر ان کو بازار میں لایا جائے تو بہت جلد یہ بدحالی خوشحالی اور یہ تنگ حالی خوش حالی سے تبدیل ہوسکتی ہے فی الحال ہو یہ رہا ہے کہ اولاً تجارت کم ہے اور جو ہے بھی وہ غیر ملکی سامان کی جانمازیں، تسبیحیں، کپڑے اور دیگر ضروریات زندگی کی چیزیں یہ سب کثیر غیر ممالک سے آتی ہیں اور مکہ ومدینہ وجدہ کے بازاروں میں بکثرت فروخت ہوتی ہیں۔ ڈاکٹری دواؤں کا یہ حال ہے کہ گھر گھر چرچا مگر یونانی اور دیسی ادویہ کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ یہ ہزاروں قسم کی چیزیں کروڑہا روپیہ کی جاپان، اٹلی، برطانیہ، جرمنی، فرانس اور دوسرے ممالک سے آتی ہیں اور فروخت ہوکر اس سے کئی گنا زیادہ روپیہ ان ممالک کو چلا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ تمام چیزیں خود مکہ ومدینہ اور جدہ میں بن سکتی ہیں اور یہ کروڑوں روپیہ جو غیر ممالک میں چلا جاتا ہے۔ حجاز ہی میں رہ سکتا ہے۔ اور اس سے اقتصادیات کی اصلاح میں مؤثر مدد لی جاسکتی ہے

قدرتاً حجاز میں دنبوں، بکروں اور بھیڑوں کی کثرت کی وجہ سے اُون بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ ان کی اونی جانمازیں، اونی کمبل، اونی قالین اونی کپڑے بن کر بکثرت فروخت کی جاسکتی ہیں اور بکثرت نفع حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ چیزیں عمدہ تیار ہونے لگیں تو مسلمان تو ہاتھوں ہاتھ اسے تبرک سمجھ کر خریدیں گے اور زیادہ دام دیکر بھی خریدیں گے غیر ممالک کے لوگ بھی کوئی وجہ نہیں کہ خواہ مخواہ ان کے لینے سے احتراز کریں۔ اسی طرح مکہ اور مدینہ کی پہاڑیوں میں بکثرت خوبصورت پتھر پیدا ہوتا ہے۔ اس کی نہایت خوشنما تسبیحیں تیار کی جاسکتی ہیں مدینہ پاک کی کھجوروں کی تجارت کو اس سے بھی زیادہ فروغ دیا جاسکتا ہے یعنی ڈبوں میں بند کرکے دیگر ممالک کے بازاروں میں ان کو بھیجا جائے جیسا کہ عراق والے کر رہے ہیں۔ قربانی میں کس قدر کھال دستیاب ہوتی ہے اس سے ہینڈ بیگ، سوٹ کیس، جوتے اور چمڑی چیزیں تیار کرکے خاصہ نفع کمایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ابرق بھی بکثرت پیدا ہوتی ہے اس کی تجارت بھی باآسانی ہوسکتی ہے۔ [illegible]

کی قدرتی پیداوار ہے جو نہایت مفید اور زخموں کے لئے اکسیر ہے۔ اسکی کوئی باقاعدہ تجارت نہیں اگر اس کو ذرا ترقی یافتہ شکل میں بازاروں میں بھیجا جائے تو ایک کثیر منافع کی امید ہے۔ پھر زیتون کا تیل بھی بڑا ہی مفید اور تجارتی چیز ہے۔ جدہ، رابغ، کامران وغیرہ ساحلوں پر بکثرت سیپ اور گھونگھے اور خوبصورت دریائی چیزیں ملتی ہیں۔ اور بدو ان کو بڑی خوشدلی سے فروخت کرتے ہیں اور کوڑیوں کے دام پھینکتے ہیں۔ اگر ان کو ذرا تراش خراش کر کے دیگر ممالک میں بھیجا جائے تو جو یہ ایک ایک آنہ دو دو آنہ کو فروخت کرتے ہیں۔ علاوہ ان کے بھی باہر نہایت ارزاں سمجھا جائے اور بے مقدار کے ساتھ بکے۔ اسی طرح سرزمین حجاز میں بہت سی مفید گھاسیں اور بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں جو بے حد مفید ہیں اور امراض میں اس قدر زود اثر جو اپنی مثال نہیں رکھتیں۔ دستوں کے لئے ایک بوٹی پائی جاتی ہے۔ وہ اسقدر مفید اور زود اثر ہے۔ کہ کیسا ہی اسہال کیوں نہ ہو فوراً بند ہو جائے گا۔ اور مریض کو نقصان بھی نہ پہنچے گا۔ سانپ کاٹے کی بھی ایک جڑی ہے جس کو کھلانے کے بعد فوراً صحت ہو جاتی ہے دبیرہ وغیرہ اگر ان بدوؤں کے ذریعہ سے باقاعدہ تجارت کی جائے تو بڑا نفع ہو۔

اسی طرح کھجور کی مصنوعات کو بھی ترقی دے کر نفع پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مدینہ کے اطراف میں بکثرت زمین بیکار پڑی ہے۔ حالانکہ اگر اس کو آباد کیا جائے تو بہت کافی پیداوار ہو سکتی ہے۔ اور اہل مدینہ کی اکثر ضروریات کی کفیل ہو سکتی ہے۔ قربانی کے جانوروں کی ہڈیوں کی تجارت بھی مفید اور نفع بخش ہے۔ پھر اس سے کھجور کے ریشے سے فکر سازی کی صنعت میں کافی مدد لی جاسکتی ہے اور اونٹ کی ہڈی کے بہت سے مفید آلات اور خوبصورت اشیاء بنائی جاسکتی ہیں۔ سیپوں سے بٹن سازی کی صنعت کس قدر مقبول ہو سکتی ہے۔ اسی طرح مکہ میں بھی زراعت ہو سکتی ہے۔ خود سلطان اور ان کے وزیر مالیات کے باغات اس کو ثابت کر چکے ہیں۔ مکہ مکرمہ اور اس کے گرد کی زمین قابل کاشت ہے۔

مگر ضرورت ہے کہ حکومت جلد از جلد ان امور کی طرف متوجہ ہو قدم اٹھائے اور صنعت و تجارت اور دیگر چیزوں کے بننے کا کارخانے کھولے اور اس کی تجارت کا انتظام خود حکومت کرے جس میں عوام کا ایک بڑا حصہ بھی شریک ہو اور متحدہ تنظیم کے ساتھ اس کام کو چلایا جائے پھر ان دو سال میں دیکھئے حالت کیا سے کیا ہوتی جاتی ہے؟ ان صنعتوں پر عمل کر کے اس کام کو آسانی چلایا جاسکتا ہے اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ بکثرت بھوکے انسان کام پر لگ جائیں گے۔ اور حکومت کو دعائیں دیں گے جب آمدنی ہونے لگے گی۔ تو زیادہ ٹیکس کی بھی ضرورت نہ رہے گی اس سے غریب مسلمان بھی حج کر سکیں گے اور قدرتاً حجاج کی تعداد بڑھے گی جو آمدنی کے اضافہ کا باعث ہونے کے ساتھ ہی عام مسلمانوں سے یکجہتی اور تعلقات کی استواری میں بڑی ممد ہوگی

امن و امان

موجودہ حکومت کا یہ ایسا کارنامہ ہے جس پر وہ جس قدر فخر کرے کم ہے اور ایسا قیمتی کہ اس کی کوئی قیمت ادا نہیں کی جاسکتی۔ آج سے ۳۰ برس قبل کیا ہوتا تھا۔ سب کو معلوم ہے کہ گیارہ گیارہ ہزار کے قافلوں کو بدوؤں نے نہایت منظم طریقہ پر حملہ کر کے لوٹا اور پردیسیوں کو قتل و غارت کر کے خاک و خون میں لتھڑا ہوا چھوڑ دیا کسی کی یہ طاقت نہیں تھی کہ دن رات کے کسی حصہ میں تنہا آبادی سے ذرا ہٹ سکتا اور قتل نہ کر دیا جاتا۔ پھر لوٹ مار کی تو کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ مگر آج بالکل امن و امان ہے۔ اور ہر طرف چین و سکون ہے۔ چوری، ڈاکہ، قتل وغیرہ کا مطلقاً نام نہیں۔ ایسے جرائم کی سزائیں نہایت عبرتناک طریقہ سے دی جاتی ہیں جن کے نتیجہ میں اب یہ حالت ہے کہ اگر سونا بھی راستہ میں پڑا ہو۔ تو اس کو کوئی ہاتھ لگانے والا نہیں ہے اسے لوگوں نے بارہا آزمایا اور بالکل سچ پایا۔ بالکل یہی حال مسکرات اور دیگر جرائم کا بھی ہے کہ جرم کرتے ہوئے بلکہ اس کے تصور ہی سے لوگ کانپ جاتے ہیں مدینہ منورہ میں مجھ سے ایک بزرگ نے فرمایا کہ یہاں اگر کسی کا مال اتفاق سے کہیں لوٹ لیا گیا تو وہ اطلاع دے حکومت کا ضمان ہو جاتا ہے۔ اب اس کو صرف ایکبار اس قدر زحمت اٹھانا پڑے گی کہ پولیس کے ساتھ موٹر پر بیٹھ کر جائے وقوعہ کا پتہ دے آئے اور بس۔ بعد حسب حیثیت سواری خوراک اور کچھ جیب خرچ ملیگا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا۔ جب تک اس کی چیز نہ مل جائے یا حکومت اس کا معاوضہ خود نہ دلائے چنانچہ ۱۳۵۵ھ میں اس قسم کا ایک واقعہ ہو چکا ہے۔

تفتیش جرائم کا طریقہ

عام طور پر خفیہ پولیس جرائم کا پتہ لگاتی ہے اور یہ انتظام ایام حج میں قوی سے قوی تر کر دیا جاتا ہے۔ اگر موقعہ واردات پر مجرم گرفتار ہو جاتا ہے تو شرعی گواہ لے کر اور تحقیقات کر کے اس کو سزا دی جاتی ہے ورنہ

اس سے عام طور پر مجرم بآسانی مل جاتا ہے۔ ورنہ ہر وہ سزا شیخ کو بھگتنا پڑتی ہے۔ لیکن یہ کافی تحقیقات کے بعد اور بالکل مجبوری کی حالت میں دی جاتی ہے اس سخت گیری کا یہ اثر ہے کہ عموماً شیوخ قافلہ کے گزرتے وقت اس کی بڑی خاطر کرتے ہیں

چند اہم معلومات

مجھ سے میرے ندوۃ العلماء کے ساتھی مولانا محمد مظہر ندوی مکی جو آج کل وزارت خارجیہ میں ایک ممتاز جگہ پر ہیں بیان کیا کہ کل مملکت سعودیہ کی آبادی ایک کروڑ ہے۔ آپ کی مملکت تین بڑے صوبوں پر منقسم ہے حجاز، نجد اور حسا جس میں نجد آپ کا موروثی صوبہ ہے۔ حجاز پر ۱۹۲۴ء کے اواخر میں سلطان نے شریف حسین سے لے لیا اور اس کے چند برسوں بعد حسا بھی مملکت سعودیہ میں داخل ہو گیا۔ اسوقت حجاز کی سالانہ آمدنی . . . . . ۴۰ لاکھ ہے اور نجد و حسا کی مجموعی آمدنی . . . . ۷۰ لاکھ ہے۔ منظم فوج . . . ۵ ہزار ہے جس کی باقاعدہ ٹریننگ اور پریڈ قابل افسروں کے ماتحت ہوتی ہے یہ فوج انتہائی جفاکش مضبوط اور جدید آلات سے مسلح ہے جنگی ہوائی جہازوں، کلدار توپوں مشین گنوں اور زہریلی گیسوں سے حفاظت کے آلات اور دوسری ضروری جنگی ضرورتوں کے اسباب سعودی حکومت کے پاس بہت کافی ہیں یہ صرف منظم فوج کا تذکرہ ہے ورنہ غیر منظم . . . ۸۰ ہزار ہے جس کو سال میں دو مرتبہ پریڈ کرائی جاتی ہے اور بوقت ضرورت اسکو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ منظم پولیس . . . ۳۰ ہزار ہے جو نہایت مستعدی اور ہوشیاری سے اپنے فرائض منصبی انجام دیتی ہے۔ صوبہ حجاز میں ۲۵ بڑے ڈاکخانے اور تار گھر ہیں جہاں ڈاک اور تار کا عمدہ انتظام ہے۔ عموماً کارڈ اور لفافوں کا یہی نرخ وہاں بھی ہے جو یہاں ہے اور یہی حالت تار برقی کی بھی ہے۔ حجاز میں متعدد وائرلیس کے ستون نصب ہیں جہاں سے لاسلکی کے ذریعہ سے اپنے پیامات ملک کے اس طرف سے اس طرف تک جلد سے جلد روانہ کئے جاسکتے ہیں۔ مکہ مکرمہ سے طائف اور طائف سے [illegible] تک تار اور ٹیلیفون کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ اسی طرح جدہ سے مکہ مکرمہ تک ٹیلیفون اور تار کا سلسلہ ہے۔ ڈاک موٹر لاریوں سے تقسیم ہوتی ہے اور [illegible] ہوتی ہے حجاز میں متعدد بڑے شفاخانے ہیں۔ اور ایام حج میں تقریباً ہر منزل پر کچھ نہ کچھ دوا دارو کا انتظام رہتا ہے۔ حجاز میں ذرائع نقل و حمل، اونٹ، خچر اور موٹر لاریاں ہیں مگر سڑکیں نہایت بہت خراب ہیں خصوصاً مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ والی سڑک تو بے حد۔

صرف طلب ہے

محکمہ قضا و عدل

اس کے ماتحت کئی قسم کی عدالتیں قائم ہیں عدالت اعلیٰ جس کو مشورہ دینے کے لئے پبلک نمائندہ بھی لئے جاتے ہیں۔ عدالت ماتحت۔ عدالت مستعجلہ جس میں مقدمات کا جلد فیصلہ ہوتا ہے اور مقامی پنچایت گاہیں جس میں ہر قبیلہ کا شیخ اپنی مرضی سے چن لیتا ہے اور معمولی جھگڑوں کا فیصلہ خود وہی کرتا ہے۔ شیخ کا انتخاب عوام کی خوشی سے ہوتا ہے۔ لوگ خود سے چن کر حکومت کو اس کی اطلاع دیتے ہیں۔ جن کے نام مع قبیلہ اور افراد قبیلہ وغیرہ کے درج رجسٹر ہو جاتے ہیں۔

محکمہ قضا کا نظام قابل اطمینان ہے۔ شہروں میں عدالتیں قائم ہیں جس میں علماء دین اس خدمت کے لئے مقرر ہیں اور قدیم اسلامی طریقہ پر مقدمات فیصل ہوتے ہیں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ ہندوستان کی طرح یہاں انصاف فروخت نہیں ہوتا اور نہ انصاف کے حصول کیلئے کسی قسم کے محصول اور ٹیکس ہیں قاضی القضاۃ کا فیصلہ سب پر مقدم ہوتا ہے اپیل کا بھی طریقہ رائج ہے گواہوں کے لئے شرعی خصوصیات ضروری ہیں۔ چوری پر ہاتھ ڈاکہ پر ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کا قطع۔ قتل کے لئے قتل۔ زنا کے لئے سنگساری شراب کے لئے اسی درے۔ افترا و الزام کے لئے بھی اسی درے ڈاڑھی منڈانے پر ہفتہ بھر کی سزائے باشقت وغیرہ وغیرہ۔ شرعی حدود و تعزیرات جاری ہیں۔ بڑے بڑے اور اہم معاملات کا فیصلہ سلطان ابن سعود خود کرتے ہیں جن کا عدل و انصاف مشہور ہے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے ان کے کسی بیٹے نے کسی کو قتل کر دیا تھا۔ آپ نے فوراً قصاص کا حکم جاری کر دیا۔ اور ان کو مقتول کے ورثہ کے سپرد کر دیا۔ مگر جب ورثہ نے زر فدیہ لے کر معاف کر دیا۔ تو ان کی رہائی ہوئی۔ شرعی معاملات پر بادشاہ کی رائے کی کوئی وقعت نہیں ابھی چند دن ہوئے۔ شریف حسین مرحوم کے بعض اعزہ نے مدینے کے راستے میں زبردستی حجاج سے کچھ ٹیکس وصول کیا تھا سلطان ابن سعود کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے ان سب کو گرفتار کرا کے اپنے سامنے حاضر کرنے کا حکم دیا اور کارروائی سن کر انتہائی غضب میں ان سب کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔ اتفاق سے اسوقت قاضی القضاۃ موجود تھے۔ انہوں نے بادشاہ کی رائے سے اختلاف کیا اور قرآن حکیم کی رو سے ڈاکہ زنی کی فرد جرم عائد کی۔ اس پر سلطان نے فوراً اپنے حکم کو منسوخ کر دیا۔ اور معاملہ کو قاضی صاحب کے حوالہ کر کے قرآنی فیصلہ پر سزا دینے کا حکم صادر فرمایا (اخبار ام القریٰ مکہ مکرمہ ۲۴ ربیع الاول ۱۳۵۹ھ)

محکمہ قضا کے لئے مکہ مکرمہ میں ایک بڑا مدرسہ قائم ہے جس میں قانون اسلام کی اعلیٰ تعلیم ہوتی ہے جس میں وکلا تیار ہوتے ہیں۔ اور انہی میں سے قاضیوں اور مفتیوں کا انتخاب عمل میں آتا ہے۔

سزا کا طریقہ

سعودی عرب میں سزا کے چار طریقے رائج ہیں۔ قطع اعضا، ضرب بید جرمانہ اور جیل۔ ان میں قطع اعضا کی زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس سزا کا یہ طریقہ ہے کہ ایک وقت مقررہ پر مجرم کو شرعی سزا دیجاتی ہے اور اس جگہ دی جاتی ہے جہاں عام طور پر لوگوں کا مجمع ہوتا ہے۔ اس سے دو ایک دن پہلے سارے شہر میں بذریعہ منادی اعلان کرا دیا جاتا ہے۔ سزا سے پہلے مجرم کے کھانے پینے اور دوسری ضروریات کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے اور سزا کے بعد اس کو فوراً سرکاری ہسپتال بغرض علاج روانہ کیا جاتا ہے جب تک وہ اچھا نہیں ہوتا اس کے جملہ مصارف حکومت کے ذمہ ہوتے ہیں اچھے ہونے پر یا مقررہ میعاد سزا پوری ہوجانے پر وہ ایک با رسوخ قاضی کے سامنے لایا جاتا ہے اسوقت وہ اس کے سامنے قرآن اور حدیث کی روشنی میں نہایت مؤثر پند و نصائح کرتا ہے جس میں جرم سے باز رہنے اور آئندہ زندگی خدا اور رسولؐ کے حکم کے موجب بنانے کی تلقین ہوتی ہے

چوری کی سزا ہوئی تو ہاتھ، اور اگر قتل کی سزا ہوئی تو سر کاٹ کر کسی بلند مقام اور عام گذرگاہ پر عام عبرت کیلئے لٹکا دیا جاتا ہے۔ سزا دیتے کسوقت مناسب حال آیۃ کریمہ قاری بلند آواز سے تلاوت کرتا ہے اور پھر وہ سزا عمل میں آتی ہے یہ وقت بھی عجب عبرت خیز ہوتا ہے۔ بہتوں کی آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں اور خود مجرم بھی حکم ربانی کے سامنے سرنگوں ہوتا ہے۔ اور مطمئن بھی کہ اپنے جرم کا کفارہ ادا کر رہا ہے قتل کی سزا کی خاص اہمیت ہے اسوقت علاوہ محکمہ عدل کے بعض دیگر محکمہ کے بھی اعلیٰ حکام موجود ہوتے ہیں سب پہلے قاری تلاوت قرآن کرتا ہے۔ پھر ایک دوسرا شخص کچھ نصیحت عامہ مسلمین کو مخاطب کر کے کرتا ہے۔ پھر جلاد تلوار سے گردن اڑا دیتا ہے

یہ تمام سزائیں پوری تحقیقات اور پورے ثبوت کے بعد دیجاتی ہیں اور کہیں اگر شبہ ہوا تو اس کا پورا فائدہ دیا جاتا ہے اور اکثر احوال میں بری کر دیا جاتا ہے یا سزا میں تخفیف ہو جاتی ہے

جیل خانے

مجرموں کیلئے مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، جدہ، طائف، تابغ، مستورہ

میں متعدد جیلخانے قائم ہیں جن میں شرعی احکام کے بموجب انتظام ہوتا ہے ان میں نماز وغیرہ کا بندوبست حکومت ہی کی طرف سے ہے چونکہ یہاں شرعی قانون کا نفاذ ہے اس لئے جرائم کم ہوتے ہیں لہذا جیل خانے بھی ہندوستان یا دیگر ممالک کی طرح آباد نہیں ہیں۔ ان جیلخانوں میں احکام شریعت کا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے نماز روزہ وغیرہ کا باقاعدہ انتظام ہے مطالعہ کے لئے متعدد کتب مذہبیہ رہتی ہیں تلاوت کیلئے مصاحف کی ایک کافی تعداد رکھی رہتی ہے حج کے موسم میں قیدیوں کو حکومت کی نگرانی میں حج کرا دیا جاتا ہے ایک شعبہ حوالات ہے یہ بھی غیر آباد ہے مجرم بہت کم ٹھہرنے پاتے ہیں کیونکہ مقدمات کے فیصلے بہت جلد ہو جایا کرتے ہیں عموماً ایک ہفتہ سے زیادہ وقت نہیں صرف ہوتا ان میں اپنے کپڑے پہننے کا اختیار حاصل ہے نیز جیلخانے میں مجرم کو اپنے کپڑے پہننے اور اپنے کھانے کا پورا حق ہے جیلخانوں میں علمائے کرام بغرض وعظ روزانہ بعد فجر و عصر جاتے ہیں جن کے ساتھ خوش لحن قاری ہوتا ہے جو آیات قرآنی کی تلاوت کرتا ہے اور یہ اس کی تفسیر بیان کرتے ہیں بعدہ مرقعہ وعظ کے لحاظ سے عمدہ اور دلنشین پند و موعظت اس طریقہ سے بے حد نفع ہوتا ہے جیل میں رہکر مجرم نہ صرف اپنے گناہ سے تائب ہو جاتا ہے بلکہ بہت سے مسائل شرعیہ کا واقف بھی ہو جاتا ہے جس سے اس کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم نظر آتا ہے عورتوں اور مردوں کے جیلخانے الگ الگ ہیں اور ان کا انتظام بھی انہی کی صنف سے متعلق ہے تفتیش جرم کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ مجرم کے قبیلہ کے شیخ کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیتے ہیں اس سے مجرم خود حاضر ہو جاتا ہے قبیلہ کے دیگر افراد اسے جبراً حاضر کرا دیتے ہیں۔ یہاں کے جیلوں میں سختیاں کم ہیں اور نرمیاں بھی جو اپنے محل کے اقتضا سے بجا ہیں عموماً جمعہ کو جیلخانوں میں تعطیل رہتی ہے اور رمضان شریف کا پورا مہینہ ان کی تعطیل کا ہوتا ہے اور یہی حال دوسری اسلامی تعطیلات ہے

دولت حاصل کرو۔ محبّت کی فتح

قسمت کا موتی رات کو سوتے وقت اپنے سرہانے رکھنے سے خواب میں بشارت ہو جاتی ہے کہ اس کام میں کامیابی ہو گی یا نہیں' اور یہ کہ اس کا طریقہ کیا ہے اور کیونکر کامیابی ہوگی' بالکل سچا جواب مل جاتا ہے۔ اس کا عامل جس نے سونے کے ... میں رہ کر اس عمل کو یاد کیا ہے۔ ہدیہ ایک روپیہ دس آنہ' محصولڈاک الگ

دولت کی کنجی یہ ایک تعویذ ہے جس کو روپیہ پیسہ میں رکھ دینے سے اس قدر ترقی ہوتی ہے کہ خدا کی شان دکھائی دیتی ہے۔ غیب سے مفلسی دور ہونے کے سامان ہو جاتے ہیں اور تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر اتنی جلدی دولت مل گئی۔ نوکری کی صورت میں اس کو افسر کے سامنے جیب میں رکھ کر جائیے تو وہ اس قدر مہربان ہو جاتا ہے کہ قدرت کا کرشمہ دکھائی دیتا ہے اور اس کے دل میں خود بخود اپنے ماتحت کی ترقی کا خیال ... ہدیہ سوا روپیہ (رقم)

محبت کی ڈوری فقیروں نے بڑی بڑی محنتیں کر کے ایسی چیزیں حاصل کی ہیں۔ یہ بھی عامل صاحب کا عطیہ ہے جس کی محبت ہو یا کسی کو اپنے دام میں پھنسانا اور بے دام غلام بنانا ہو' اس سے شادی کی تمنا ہو تو محبت کی ڈوری کو اپنے گلے میں ڈال لیجئے اور جس جگہ آپ کا مطلوب ہو وہاں سے گذر جائیے اور وہاں تک رسائی نہ ہو سکے تو اس ڈوری کو اپنے مطلوب کے دروازہ یا اس کے ہاتھوں تک پہنچا دیجئے' بس گھر بیٹھے اس کی تڑپ کا تماشا دیکھئے وہ ماہی بے آب کی طرح بے چین ہو کر آپ تک پہنچے گا۔ ہدیہ ڈھائی روپے (رقم)

مندرجہ بالا سچے عملیات میں اُن کی ناکامی کی صورت میں ہم قیمت واپس دیں گے محصولڈاک ہر ایک بذمہ خریدار ہوگا

ملنے کا اصلی پتہ:- **شری مہاتما آشرم پوسٹ بکس ۱۲/۱۲ (A.G.L.) امرت سر** (پنجاب)

سو فیصدی سَت درجفر جوتش اور رمل کو سچا ثابت کرنے کیلئے بطور آزمائش ہر شخص کے دو سوالوں کے جواب بالکل مفت بلا فیس دیئے جائینگے صرف جوابی لفافہ بھیج کر کارخانہ "جوہر زندگانی" بمقام بٹالہ سے منگوائیے!

گریہ و تبسم

خلیل جبران کے شاہپارے

مترجمہ جناب غلام حسن علوی مولوی فاضل منشی فاضل

اردو میں ترقی پسند ادب آج کل بہت پسند کیا جاتا ہے۔ خلیل جبران عربی کا ایک ترقی پسند ادیب ہے۔ اس نے قدیم ترکیبوں، فرسودہ کنایوں اور استعاروں کو ترک کیا ہے اور ایک نئی طرز تحریر کی بنیاد ڈالی ہے یہ طرز تحریر بے جان نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ایک انوکھا پن پایا جاتا ہے اور انوکھا پن بھی ایسا جو ہر دل میں کھب جانے والا ہے۔ خلیل جبران نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان سب میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی گئی ہے۔ "دمعۃ وابتسامۃ" اس کی پہلی تصنیف ہے یوں سمجھئے کہ ایک نوعمر ادیب نے اپنے افکار و خیالات کو یکجا کر دیا ہے بظاہر یہ کتاب نقش اول کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ کوئی نوآموز شاعر مشق سخن کر رہا ہے۔ بلکہ اس میں پختہ کاری کی سب خوبیاں موجود ہیں۔ ذیل میں اس کتاب سے چند اقتباسات اردو میں ہدیہ ناظرین کئے جاتے ہیں۔ مقصد اس سے اس امر کا اظہار ہے کہ دنیا کی دوسری بلند پایہ زبانوں کے مقابلے میں عربی زبان ادبی جواہر ریزوں سے کچھ کم مالا مال نہیں ہے۔

گریہ و تبسم

سورج سرسبز اور شاداب باغوں سے اپنا دامن سمیٹ چکا تھا۔

دور ——— افق سے چاند نکل کر اپنی صاف شفاف روپہلی کرنوں سے فضا کو منور کر رہا تھا۔ میں درختوں کے نیچے بیٹھا فضا کے تغیر و تبدل کو گہری نظر سے دیکھ رہا تھا۔ آسمان پر ستارے نیلگوں سطح پر بکھری ہوئی اشرفیوں کی طرح معلوم ہوتے تھے۔

بہت دور...... وادی میں ... آبشار کے گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ پرندوں نے گھنے درختوں کی ٹہنیوں پر اپنے آشیانوں میں پناہ لی۔ فضائے عالم پہ کامل سکوت چھا گیا۔ شگوفوں نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں نرم و تر و تازہ مخملیں گھاس پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دیکھتا ہوں کہ ایک نوجوان جوڑا ہے۔ دونوں ایک گھنے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ انکی آنکھوں سے اوجھل میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ نوجوان نے چاروں طرف نگاہ ڈالی اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ کوئی قریب نہیں ہے تو وہ یوں گویا ہوا

"میری جان نواز! میرے قریب ہو جا اور میری داستان کو غور سے سن ——— خوب غور سے ذرا مسکرا دے۔ تیری مسکراہٹ میں میری زندگی کا راز پنہاں ہے۔ دنیا کی خوشیاں ہماری خوشی پر منحصر ہیں۔ اے میری محبوبہ! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرے دل میں کچھ وسوسہ ہے لیکن میری جان! محبت میں . . . وسوسہ گناہ ہے ——— گناہ عظیم!!

وہ وقت قریب ہے کہ یہ وسیع سرزمین اور یہ خوبصورت عظیم الشان شاہی محلات جنہیں چاند کی کرنیں سنہلی بنائے ہوئے ہیں ——— تیرے قبضے میں ہوں گے۔ میرے سبک رفتار گھوڑے تجھے ان خوبصورت سیرگاہوں اور اعلیٰ تماشاگاہوں کی سیر کرائیں گے۔

اے میری جان! میرے خزانے کے سونے کی طرح خندہ ریز ہو اور میرے والد کے جواہرات کی طرح مجھ پر نظر الفت ڈال۔ سن میری جان نواز! میں نے اپنے "کائنات دل" کو تیرے حوالے کر دینے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ شباب عمدہ اور خوشگوار موسم قریب ہے۔ ہم بہت سا مال و دولت لے کر سوئیزر کے جزیروں، اطالیہ کی تفریح گاہوں، ساحل نیل کے قریبی عالی شان محلوں اور لبنان کے باغوں کی سیر کریں گے۔

امیر عورتیں اور قوم کے سردار تیرے لباس اور تیری زیب و زینت پر رشک کریں گے۔ کیا یہ تجھے پسند ہے؟

آہ۔ تیرا تبسم کتنا شیریں و جاں نواز ہے!! تیری مسکراہٹ میری خوش نصیبی کی دلیل ہے!

اب وہ دونوں نرم و نازک گھاس اور شگوفوں کو اپنے پاؤں سے روندتے اور کچلتے چلے جا رہے ہیں ——— جس طرح دولتمند امیر ایک مزدور کے دل کو کچلتا ہے۔

وہ دونوں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے میں دنیائے عشق میں مال و دولت کے عظیم الشان کارناموں پر غور کر رہا تھا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ مال و

دولت تمام انسانی برائیوں کی جڑ ہے اور محبت انسانی سعادت اور خوش قسمتی کا سرچشمہ ہے میں ان پریشان کن افکار سے گھبرا اٹھا۔

بہت دور ــــ سرسبز کھیتوں میں جہاں غریب کسانوں کے جھونپڑے تھے ــــ ایک حسین جوان جوڑا نمودار ہوا۔ وہ انسانی صورتیں سامنے گھاس پر بیٹھی ہوئی دکھائی دیں۔ ایک منظر تھا۔ ہیبت ناک خاموشی اور سکون کے بعد چند کلمات درد ناک لہجہ کے ساتھ ملے جلے سنائی دئے نوجوان کہہ رہا تھا "اے میری جان آنسوؤں کو ضبط کر بے کس اور مجبور کر دینے والی محبت صبر و تحمل کی تلقین کرتی ہے۔ ہاں اے پیاری محبوبہ! اندھا چھوڑ دے مذہب عشق صبر کی تعلیم دیتا ہے۔ ہمارا مذہب ہی محبت ہی ہے غربت کا عذاب حرمان و یاس کی مشقت جدائی کے صدمے پیاری محبت کی بدولت برداشت کئے جا سکتے ہیں۔ کارزار حیات میں ایک عمدہ اور قابل قبول چیز کے حاصل ہونے تک جو منازل حیات میں مددگار ہو۔ تنگ دستی کی جا سکتی ہے پیاری محبوبہ محبت ــــ خدا (خدا محبت ہی ہے) ــــ ان خوشبودار معطر آنسوؤں اور ان دردناک آہوں کو قبول کر کے لقد ما تحقاق صلہ عطا کرتا ہے۔"

"الوداع پیاری محبوبہ۔ چاند کے غروب سے پہلے مجھے چلا جانا چاہئے۔"

شعلۂ عشق سے جلتے ہوئے دو دلوں کے رونے کی آواز سنائی دی ــــ ایک دوشیزہ کی دردناک آواز ــــ صبر کی شیرینی، جدائی کی تلخی، سوز عشق کی آواز ــــ "الوداع اے میرے محبوب الوداع۔"

میں درخت کے نیچے بیٹھا۔ ان دو محبت کرنے والے دلوں کے الوداعی منظر کا گہری نظر سے جائزہ لے رہا تھا۔ میں دریائے حیرت میں غوطہ کھانے لگا۔

بہت دیر کے بعد میں نے چونک کر ساکن و خاموش فطرت کی طرف دیکھا ــــ لامحدود دبے کراں فطرت اب بھی ساکت و صامت تھی فطرت کی لا انتہا خاموشی ازلی تھی۔

فطرت کے سکوت کو بہار کی شگفتگی اور خزاں کی مشقت محو نہیں کر سکتی سوئیٹزرلینڈ کے جھیلیں، اٹلی کی تفریح گاہیں فطرت کے سکوت کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

میں نے محبت کو ــــ زبردست اور قوی محبت کو ــــ بہار و خزاں دونوں میں سرسبز و شاداب پایا۔

محبت ہمیشہ ــــ ابد تک ــــ سرسبز و شاداب رہیگی۔

مُجرم

سڑک کے کنارے ایک بھوکا نوجوان بیٹھا ہے۔ اس کی جسمانی ساخت بہت مضبوط ہے۔ بھوک ـــ مہلک فاقہ ـــ کی شدت نے اُسے لاغر و نحیف کر دیا ہے۔ راستہ کی نکڑ پر دست سوال دراز کئے بیٹھا ہے آنے جانے والوں سے اپنی شکستہ حالی اور فاقہ کشی کی پُر آلام داستان کو بیان کرتے ہوئے بھیک مانگ رہا ہے۔

لیلائے شب نے اپنے سیاہ خیمے نصب کر دئے ہیں۔

اس کے ہونٹ خشک ہو گئے ہیں۔ پیاس کی شدت سے زبان سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔

اس کے دونوں ہاتھ مال خیرات سے اسکے پیٹ کیطرح خالی ہیں وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور سیدھا شہر کے باہر چلد یا بہت دور ـــ درختوں کے جھنڈ کے نیچے ـــ بیٹھ کر ابر نیساں کی طرح زار و قطار رونے لگا۔

اپنی پُرنم آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے بھوک اور فاقہ کشی کی مصیبت سے تنگ آ کر دردناک لہجہ میں کہتا ہے

"اے خدا میں دولتمند کے دروازے پر کام کی تلاش میں گیا۔ لیکن اپنی زبوں حالی کی بنا پر۔ وہاں سے دھکے دیکر نکالا گیا۔ مدرسہ کا دروازہ کھٹکھٹایا ـــ تہی دست اور غربت کی وجہ سے وہاں سے بھی سوائے محرومی کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ غلامی اور چاکری جیسا منحوس پیشہ بھی اختیار کرنے کا ارادہ کیا ـــ بدقسمتی اور بدحالی یہاں بھی آڑے آئی۔

اے خدا آخر کار چاروں طرف سے مایوس ہو کر بھیک مانگنے کا ارادہ کیا۔

میرے پروردگار تیرے بندوں نے مجھے دیکھ کر کہا ـــ یہ تو ہٹا کٹا اور طاقتور جوان احسان و خیرات سست اور کاہل انسانوں کے لئے ہرگز نہیں۔

اے میرے خدا۔ تو جانتا ہے کہ میں تیرے ارادہ اور منشا ہی سے پیدا ہوا ـــ اور تیرے منشا اور مرضی ہی سے اب تک زندہ ہوں۔

خدا جانے پھر کس بنا پر تیرے بندے مجھے روٹی عطا نہیں کرتے ـــ میں تو تیرے ہی نام پر بھیک مانگتا ہوں۔

یہ کہتے کہتے اس نا امید انسان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا ـــ اس کی آنکھوں سے خوفناک شعلے نکل رہے تھے ـــ انگاروں کے مانند ـــ وحشت کے مارے ٹہنی ٹہنی کر کاٹ کر شہر کی

[illegible] — جہاں سے وہ ناامید ہو کر آیا تھا — مشاہدہ کرنے اور زندہ [illegible] ہو سکتا ہے
"زندگی بھر [illegible] کو محنت اور مشقت سے تلاش کیا — مردم [illegible] محبت اور صلح کے نام پر دنیا میں بدعلی کی تلاش کی — [illegible] رہا — نفس [illegible] انسان نے میری باتوں کو سنا اور مجھے حقارت سے دیکھا — فتنہ و فساد کے نام پر روٹی طلب کروں گا اور جی کھول کر فتنے برپا کروں گا۔" سال گزرتے گئے جوان روپیہ اور دولت کے جمع کرنے کے لئے بے دریغ لوگوں کو قتل کے گھاٹ اتارتا رہا — اور اپنے راستہ میں مزاحم ہونے والی طاقتوں کو معدوم کرتا رہا۔
تھوڑے ہی عرصہ میں وہ بہت بھاری دولتمند بن گیا
اسکی قوت اور بہادری کا سکہ تمام لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گیا
اب وہ ڈاکو سے سردار بن گیا — عقلمند اور دنیادار اس سے ڈرنے لگے
عالم نے اس شہر میں — جس میں کہ اس نے فاقہ کشی کی زندگی بسر کی تھی — اسے امیر بنا دیا — فاقہ کشی اور غربت اسی طرح ایک مسکین انسان کو ظالم، اور صلح جو اور شریف النفس کو دنیا بھر کا مکار بنا دیتی ہے۔

داستانِ غم

از:- جناب احمد شجاع پاشا

نگاہِ یاس میری ترجماں ہے — میرا غم میرے چہرے سے عیاں ہے
نہ منزل ہے نہ منزل کا نشاں ہے — مجھے اے راہبر جانا کہاں ہے
سراپا درد میری داستاں ہے — جسے دیکھو وہی محوِ فغاں ہے
مسرت دو گھڑی کی میہماں ہے — فقط اک غم کی ہستی جاوداں ہے
موحد ہوں بتوں سے واسطہ کیا — مجھے بتخانے میں حکمِ اذاں ہے
جوانی کس طرح گذری تھی زاہد — بڑھاپے میں جو اب تسبیح خواں ہے
تصور ہے قفس کی تیلیاں ہیں — مری نظروں میں میرا آشیاں ہے
مرا دل بھی تو اک پردہ ترا ہے — کہ اس ظلمت کدے میں تو نہاں ہے
تمہیں سننا نہ ہوشاید گوارا!! — سراپا درد میری داستاں ہے
دمِ آخر نہیں دیتے تسلّی — ہمارے پھر سے جینے کا گماں ہے
سرور و کیف اس کے پاسباں ہیں — محبت اک نشاطِ جاوداں ہے

نہیں کچھ بھی ہماری داستاں میں
[illegible]

پیشاب کے بعد سفید قطرہ

اگر پیشاب کرنے کے بعد یا پیشاب سے پہلے سفید رنگ کا پانی خارج ہوتا ہو تو یہ بہت خطرناک بات ہے۔ اسے جریان کی بیماری کہتے ہیں رفتہ رفتہ یہ مرض بڑھ جاتا ہے۔ تو پھر آدمی شادی کے مطلب کا نہیں رہتا۔ اس کی قوت مردمی ختم ہو جاتی ہے۔ اس واسطے جن مردوں کو یہ شکایت ہو یعنی پیشاب کرنے سے پہلے یا پیشاب کے بعد یا بیوی کے قریب جانے سے پیشتر ہی سفید رنگ کی رطوبت خارج ہو جائے یا رات کو سوتے میں احتلام ہو جائے (یعنی خواب ہو جائے) تو اس خطرناک مرض سے غفلت نہ کرنی چاہئے۔ ورنہ ایک دن زندگی کا خاتمہ کر دے گا۔

جریان کا مرض صرف ایک ہفتہ میں ختم کیا جا سکتا ہے

اور صرف ساڑھے تین روپے خرچ ہوں گے دہلی کے مشہور زنانہ دواخانہ کی تیار کردہ دوا جوہر اعظم اس مرض کیلئے اکسیر کا کام کرتی ہے صرف ایک شیشی جوہر اعظم سے بڑے بڑے پرانے مریضوں کو تندرستی ہو گئی ۱۹۲۶ء کے نمائشی مقابلہ میں بھی یہ دوا سرتاج رہی اور یقین کیا گیا کہ جوہر اعظم جریان کے مرض کا بہترین علاج ہے چنانچہ اس وقت سے آج تک اس دوا پر محصول ڈاک معاف ہے۔ جن لوگوں کو ضرورت ہو وہ

جنرل مینجر زنانہ دواخانہ اے۔بی ۳۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھ کر جوہر اعظم کی ایک شیشی بذریعہ وی پی منگائیں۔ ایک شیشی کی قیمت تین روپے آٹھ آنے ہے (ساڑھے تین روپے) پارسل کا محصول کسی ہندوستانی خریدار سے نہیں لیا جاتا۔

سوزاک کے مریض ختم

اندازہ کیا جا رہا ہے کہ اگر دوا "گلوزول" اسی طرح سوزاک کے مریضوں کو تندرست کرتی رہی۔ تو بہت جلد وہ وقت آ رہا ہے کہ جب ہندوستان بھر میں سوزاک کا مریض نہ مل سکے گا۔ سوزاک نیا ہو یا پرانا ہر حالت میں صرف ایک شیشی دوا "گلوزول" سوزاک کے مرض کا پوری طرح خاتمہ کر کے مریض کو بالکل تندرست اور جوان بنا دیتی ہے کبھی آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی سوزاک کے مریض نے دوا "گلوزول" استعمال کی ہو اور اسے فائدہ نہ پہنچا ہو۔ کیونکہ یہ دوا ہندوستانی آب و ہوا کے لحاظ سے بہت عجیب ثابت ہوئی ہے۔ لوگ اسے جادو کی دوا کہنے لگے ہیں پس جو لوگ سوزاک کے مریض ہوں انہیں چاہئے کہ وہ

جنرل مینجر زنانہ دواخانہ اے بی ۳۴ دہلی

کو خط لکھ کر ایک شیشی دوا گلوزول بذریعہ وی پی پارسل طلب کریں۔ استعمال شروع کرنے کی تمام ہدایات دوا کے ساتھ ہوتی ہیں ایک شیشی دوا گلوزول کی

عورت کو حمل سے بچاؤ

مصیبت ہے بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ بچوں کی کثرت سے مرد پریشان ہو جاتا ہے یا عورت کی تندرستی زیادہ بچے پیدا کرنے سے خراب ہو جاتی ہے۔ تو ایسی حالت میں عورت کو چاہئے کہ کچھ عرصہ کے لئے اولاد کا پیدا پیدا کرنا بند کر دے۔ تاکہ اس کی تندرستی پھر ٹھیک ہو جائے اس کی ترکیب یہ ہے کہ ایک شیشی دوا "روہیل" منگا کر عورت اپنے پاس رکھ لے۔ اور خاص وقت سے پہلے اس دوا کی ایک خوراک کھا لے حمل نہ ٹھہر سکے گا۔ چنانچہ جب تک یہ عمل رہیگا عورت کو حمل نہ ٹھہر سکے گا اور جب اس دوا کا استعمال ترک کر دیگی حمل ٹھہر جانا ممکن ہے۔ اس دوا سے عورت کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔ ایک شیشی میں سے اسی مرتبہ استعمال کے لئے دوا ہوتی ہے اس کی قیمت چار روپے آٹھ آنے ہے اور محصول ڈاک گیارہ آنے لگتا ہے۔ اگر کسی کو ضرورت ہو ——— تو وہ

مینجر زنانہ دواخانہ اے بی ۳۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھ کر بذریعہ وی پی پارسل منگا کر اپنے پاس رکھیں

رفتارِ زمانہ

برطانیہ و جرمنی

جنگ کے دوسرے سال کا آغاز رودبارِ انگلستان کے سواحل پر آتش فشاں توپوں اور تہلکہ انگیز بموں کے دھماکوں سے ہوا جرمن طیاروں نے قطار اندر قطار آ کر لندن اور اُس کے نواحی پر آگ برسائی۔ اور پوری کوشش کی کہ کسی طرح انگریز [illegible] ہو کر صوبۂ شرقی ساحل کو [illegible] والے نازی وہاں اتر کر برطانیہ عظمٰی کے طول و عرض پر اپنے اقتدار و آمریت کا جھنڈا لہرا سکیں لیکن خوش قسمتی سے برطانیہ کے دفاعی انتظامات اس قدر مضبوط اور مستحکم تھے کہ ہٹلر کی تمناؤں کو رودبارِ انگلستان کی متلاطم موجوں میں غرق ہونا پڑا اور اب وہ اپنی استعماری تجاویز کے نقشہ کو از سر نو تیار کر رہا ہے۔ مسٹر چرچل نے ایک نشریہ میں یہ انکشاف کیا تھا۔ کہ جرمن جہاز ناروے کی کھاڑیوں سے لیکر خلیج بسکا تک کیل کانٹے سے لیس ہو رہے ہیں۔ اور وہ دن دور نہیں جب ہٹلر ان بحری فوجوں کو انگلستان پر حملہ کرنے کیلئے روانہ کرے گا۔ اس لئے سیاسی حلقے اب یہ قیاس آرائیاں کرنے میں مشغول ہیں کہ کیا ہٹلر اس خوفناک ارادے میں کامیاب ہو سکیگا! یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ برطانیہ ملکۂ بحر ہے اور مشرق و مغرب کے سمندروں میں صرف برطانوی جہازوں کا طوطی بول رہا ہے۔ اس لئے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔ کہ اگر ہٹلر نے برطانیہ کی بحری فوجوں سے ٹکر لینے کا ارادہ کیا تو وہ اس میں کبھی بھی کامیاب نہ ہو سکے گا اور فرانسیسی ساحل سے انگلستان تک کا یہ نازی سفر "ہٹلر کی موت کا سفر" ثابت ہوگا۔ پھر یہ امر بھی حد درجہ اطمینان بخش ہے کہ اب برطانیہ نے بھی "دفاع" کی بجائے "حملہ" کو اپنے پروگرام کا جزو بنانا شروع کر دیا ہے۔ اور اب رائل ایر فورس کا صرف یہی کام نہیں رہ گیا۔ کہ وہ نازی طیاروں کا اپنی وطنی فضا میں مقابلہ کریں۔ بلکہ وہ سینکڑوں میل کا پُر ہول فاصلہ طے کر کے برلن اور جرمنی کے دوسرے اہم فوجی مراکز پر بھی بم گراتے ہیں۔ اور اس طرح دشمن کو کافی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس لئے دنیائے سیاست میں اب یہ عام توقع پیدا ہو گئی ہے۔ کہ جرمنی و برطانیہ کا یہ مقابلہ موخر الذکر کی شاندار فتح اور اوّل الذکر کی ذلت آمیز شکست پر منتج ہوگا۔

عالمگیر واقعات پر ماہانہ تبصرہ

از شبلی بی کام

ڈاکر کی مہم

جب نازی فوجیں پیرس کے دروازے پر دستک دینے لگیں۔ تو فرانس کے بعض جرنیلوں نے ملک سے غداری کرتے ہوئے ہٹلر کے قشونِ قاہرہ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اور وشی کے مقام پر ایک وطن دشمن حکومت قائم کر کے جرمنی و اطالیہ سے بعض ذلت آمیز شرائط پر صلح کر لی۔ لیکن فرانس کے ایک معتمد جرنیل دیگال نے وشی گورنمنٹ کے اس طرز عمل کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور انگلستان میں بیٹھ کر مسلسل کوشش کی کہ فرانس کے غیر ملکی مقبوضات اِس نام نہاد حکومت کے فریب میں نہ آئیں۔ چنانچہ وہ اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب ہوا اور بحر الکاہل، بحرِ ہند اور بحر اوقیانوس کے کناروں پر بسنے والے فرانسیسیوں نے وشی گورنمنٹ کی اطاعت کا جوا اپنی گردن میں پہننے سے انکار کر دیا۔ اس کے باوجود ہٹلر اور مسولینی نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں اور پوری کوشش کی کہ کسی طرح فرانسیسی نو آبادیات بھی اُن کے جھانسہ میں آ جائیں۔ چنانچہ جنرل دیگال کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ ہٹلر استوائی افریقہ میں فرانسیسی نو آبادیات کو نازی شیشہ میں اُتارنے کی کوشش کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ ڈاکر کو اپنا ہوائی اڈہ بنائے تاکہ ایک طرف کا مرون تک اُس کیلئے پہنچنا آسان ہو اور دوسری طرف اُسے مغربی کرۂ ارضی میں اپنے ہتھکنڈے پھیلانے کا موقع مل سکے۔ چنانچہ جنرل دیگال نے حکومت برطانیہ سے امداد کی درخواست کی اور چند فرانسیسی و برطانی جہاز ڈاکر روانہ کر دیئے لیکن افسوس کہ مقامی فرانسیسی افسروں نے مزاحمت کی اور اس بیڑے کو مجبوراً واپس آنا پڑا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں براعظم افریقہ کو کن خطرات کا سامنا ہوگا اور یورپ کے ڈکٹیٹر کس طرح اِس ملک کو اپنی استعماری خواہشات کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔

اٹلی اور مصر

گزشتہ پرچے میں ہم نے احتمال ظاہر کیا تھا۔ کہ مصر پر اطالوی فوجیں حملہ کر دیں گی۔ چنانچہ یہ قیاس درست ثابت ہوا اور مسولینی کی فوجوں نے

وادیٔ نیل کا تین طرف سے محاصرہ کر لیا۔ اور سولم کے مقام سے پچاس ساٹھ میل تک مصری حدود کے اندر داخل ہو گئیں۔ برطانیہ نے اینگلو مصری معاہدہ کے مطابق اطالوی فوجوں کا جوانمردی سے مقابلہ کیا۔ اور بیدی برانی اور سولم کے مقامات پر بمباری کر کے حملہ آوروں کو کافی نقصان پہنچایا۔ جس سے اُن کی مزید پیش قدمی کم سے کم عارضی طور پر ضرور رُک گئی ہے۔

جیسا کہ ہم نے گزشتہ اشاعت میں لکھا تھا بعض عملی مشکلات کے پیش نظر اطالوی اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لیکن چونکہ برطانیہ اپنے ملکی مصائب میں گرفتار ہے۔ اس لئے خطرہ کو نظر انداز کرنا بھی ممکن نہیں۔ سولینی جب قبرص، ورصقلیہ کے جزائر سے شمالی مغربیہ کے ساحل پر نگاہ ڈالتا ہے تو اُسے مراکش۔ لیبیا۔ تونس اور الجزائر میں اپنی استعماری بھوک کو مٹانے کے لئے ایک وسیع اور زرخیز چراگاہ نظر آتی ہے۔ اس لئے وہ عرصہ دراز سے یہ چاہتا ہے کہ افریقہ کے ان سرسبز نخلستانوں پر روما الکبریٰ کا جھنڈا لہرائے۔ چنانچہ اس نے سومالی لینڈ کو فتح کر لیا ہے اور اب جرمنی و برطانیہ کو مصروف دیکھ کر مصر اور اُس کے ہمسایہ ممالک پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ حکومت مصر نے ابھی تک اعلان جنگ نہیں کیا اور بعض مصری وزرا کو ابھی تک یہ احساس نہیں ہو سکا۔ کہ جنگ کا دیوتا ابو الہول کی اوٹ میں منہ پھاڑے کھڑا ہے۔ سعادت پارٹی تو مقابلہ و دفاع کے حق میں تھی۔ لیکن وزارت کے باقی بارہ ارکان اس خیال سے متفق نہ تھے۔ اس لئے چار وزیروں کو اپنے استعفے داخل کرنا پڑے۔ کاش وفد پارٹی کے لیڈر نحاس پاشا اپنے ذاتی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اسوقت میدان عمل میں کود سکتے مملکت مصر کو اُن کی رہنمائی کی فی الواقع ضرورت ہے۔

ہسپانیہ پر ڈورے

ہسپانیہ کی ہٹلر اور مسولینی دونوں کو ضرورت ہے۔ جب تک جبل الطارق برطانیہ کے قبضہ میں ہے نہ تو مسولینی شمالی افریقہ کو اپنے استعماری پنجہ میں جکڑ سکتا ہے۔ اور نہ جرمنی کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ برطانیہ کو پامال کر سکے۔ اس لئے جرمنی و اطالیہ دونوں کی خواہش ہے کہ جبل الطارق اُن کے قبضہ میں آجائے۔ لیکن یہ کام اسوقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہسپانیہ اس باب میں اُن کی امداد نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مسولینی اور ہٹلر پچھلے مہینہ جنرل فرانکو اور اُس کے وزیر داخلہ سینور سونر پر ڈورے ڈالنے میں مصروف رہے۔ میڈرڈ کی ایک اطلاع مظہر ہے کہ ہرفان رین ٹراپ نے سینور سونر کو برلن بلایا اور افریقہ کا نقشہ دکھا کر اُسے کہا کہ اگر تم جبل الطارق پر نازی و فاشی جھنڈا لہرانے میں ہماری مدد کرو تو مغربی افریقہ میں ہمیں ہسپانوی مراکش کی حدود کو ڈاکر تک وسیع تسلیم کر لینے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ ابھی تک ہسپانیہ کے طرز عمل کا صحیح طور سے اندازہ نہیں ہو سکا۔ لیکن اگر اُس نے ہٹلر اور مسولینی کی خواہش کے مطابق جبل الطارق پر قبضہ کر لیا تو ظاہر ہے کہ ایک طرف برطانیہ کے مشرقی مقبوضات خطرے میں پڑ جائیں گے تو دوسری طرف افریقہ میں اسلامی حکومتیں بھی سب کی سب ختم ہو جائیں گی۔ اس کے علاوہ ممالک عربیہ اور بحر ہند کو جو جو خطرات درپیش ہوں گے۔ اُن کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس کا ذکر پہلے بھی کئی مرتبہ اِن صفحات میں آچکا ہے۔

ممالکِ اسلامیہ

ممالک اسلامی کا مستقبل روز بروز اضطراب و تشویش کی تاریکیوں میں گم ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عظمت و شوکت کے یہ آخری چراغ اُس بادِ حوادث کے جھونکوں سے محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ جو ماسکو۔ برلین اور روم کی شرارت گاہوں سے طوفان کی صورت اُٹھی ہے۔ اور اب اکناف عالم پر جنگ و قتال کی آندھی بنکر چھا چکی ہے۔ فاشی دیو اگر ایک طرف محافظِ اسلام کا بہروپ بھر کر شمالی افریقہ کی اسلامی حکومتوں کے اردگرد ناچ رہا ہے تو دوسری طرف جزیرۃ العرب۔ عراق اور شام کے دروازوں پر بھی منہ پھاڑے کھڑا ہے۔ اور اِن ممالک کی حریت و آزادی کو تہلکہ انگیزیوں کی گونج میں ہمیشہ کے لئے دفنا دینا چاہتا ہے چنانچہ اٹلی کے بمبار طیارے عدن اور حیفا کی خوبصورت آبادیوں پر بم برسا چکے ہیں اور مسولینی کے ایجنٹ امن و مصالحت کا لباس اوڑھ کر شامی مسلمانوں کو اپنے شیشہ میں اُتار رہے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں آخری خبر یہ ہے کہ مسولینی نے شام سے چار مطالبات کئے ہیں (۱) شام کی فرانسی فوجوں کو توڑ دیا جائے (۲) ہوائی اڈے اور بندرگاہیں وغیرہ اٹلی کے حوالہ کر دیئے جائیں (۳) نظمِ دمشق اٹلی کے سپرد کر دیا جائے (۴) اسلحہ و بارود بھی اٹلی کو دے دیا جائے۔

ظاہر ہے کہ ترکی اس استعماری لوٹ کھسوٹ سے مضطرب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور اگر مسولینی نے شام پر دستِ تطاول دراز کیا تو انقرہ میں اس کی بازگشت ضرور پیدا ہوگی۔ اور وہ اپنے اسلامی بھائی کی حفاظت کے لئے ضرور میدانِ عمل میں نکلنے پر مجبور ہوگا۔ عدن اگرچہ برطانی نوآبادی ہے۔ لیکن اگر مسولینی نے اُس پر اپنا تسلط جما لیا تو جزیرۃ العرب میں اثر انداز ہونا اس کے لئے چنداں مشکل نہ ہوگا۔ لیکن خوش قسمتی سے

جلالۃ الملک سلطان عبدالعزیز بھی آنے والے خطرہ سے بے خبر نہیں ہیں اور وہ اس کے مقابلہ کیلئے ہر طرح سے تیار ہو رہے ہیں۔

روم - ٹوکیو - برلین

جس طرح یورپ اور افریقہ میں ہٹلر اور مسولینی ایک نئے نظام کے قیام کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی طرح جاپان بھی براعظم ایشیا میں ایک "نیا نظام" قائم کرنے کا متمنی ہے۔ چنانچہ چین کے ساحلی علاقوں کا بیشتر حصہ ہڑپ کر لیا ہے اور اب فرانسیسی ہند چینی کی فتح کے بعد سیام پر بھی دانت تیز کر رہا ہے۔ لیکن بحر الکاہل کی موجوں میں اس کی یہ نقل و حرکت "وائٹ ہاؤس" کو مضطرب کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ فلپائن کے علاوہ مشرق بعید کے بعض دوسرے علاقوں میں امریکہ کو بھی دلچسپی ہے۔ چنانچہ احتجاج کے طور پر امریکہ نے جاپان کو تیل اور لوہا بھیجنا بند کر دیا ہے۔ یہ تجارتی انقطاع جاپان کی تجارت و معیشت پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اس "بندش" کا اثر زائل کرنے کے لئے اس نے اٹلی اور جرمنی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا شروع کر دیا ہے۔ اور اس ماہ روم - ٹوکیو اور برلن کے درمیان ایک فوجی معاہدہ قرار پایا۔ جس کی رو سے جاپان نے یورپ میں اٹلی اور جرمنی کی سیادت تسلیم کر لی ہے اور اٹلی اور جرمنی نے مشرق بعید میں جاپان کو قائد مان لیا ہے۔ اس معاہدہ میں یہ بھی قرار پایا ہے۔ کہ اگر کسی ملک نے جو اس وقت جنگ میں شریک نہیں ان تینوں میں سے کسی کے خلاف اعلان جنگ کیا تو وہ ایک دوسرے کی سیاسی، اقتصادی و فوجی مدد کریں گے۔ آخری دفعہ سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا اشارہ امریکہ کی طرف ہے۔ لیکن وہ امریکہ کی مدد کے بغیر ایک دوسرے کی اقتصادی و تجارتی مدد کیسے کریں گے؟ یہ وہ سوال ہے جس کے جواب کے لئے سیاسی دنیا ہنوز منتظر ہے۔

سیاسیات ہند

ہندوستان کی سیاست "مطالبہ پیشکش اور بیانات" کی حدود سے باہر نہیں نکلی۔ کانگرس کا طرز عمل پراسرار سے پراسرار ہوتا جا رہا ہے۔ کبھی وہ حکومت برطانیہ کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہے۔ کبھی عدم تشدد کا اصول اختیار کرتی ہے۔ اور کبھی گاندھی جی سے قطع تعلق کر کے اپنے لئے ایک نئی راہ تجویز کرنے کا ارادہ کرتی ہے۔ اب پھر سے گاندھی پر اعتماد کا اظہار کر کے انہیں کانگرس کا ڈکٹیٹر بنا دیا گیا ہے۔ مسلم لیگ کو اصرار ہے کہ وائسرائے کی انتظامیہ میں اسے تیس فیصدی حصہ دیا جائے۔ لیکن وائسرائے نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ دوسری طرف سکھوں اور ہندو مہاسبھا نے بھی پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑانے سے دریغ نہیں کیا۔ ہندو سبھا نے پرانے تعصب اور فرقہ وارانہ ذہنیت کو بروئے کار لاتے ہوئے زور دینا شروع کیا ہے کہ ہندوؤں کو آبادی کے تناسب سے وائسرائے کی انتظامیہ میں جگہ دی جائے۔ حالانکہ یہ وہی ہندو سبھا ہے۔ جو بنگال۔ پنجاب۔ سندھ اور فرنٹیئر میں تناسب آبادی کے اصول کو سب سے بڑی وطن دشمنی قرار دے چکی ہے۔ مسلم لیگ کے مطالبہ "تقسیم ہند" نے گوردواروں میں بھی زلزلہ برپا کر دیا ہے۔ اور سکھ علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ اگر مسلم لیگ کے مطالبہ پر صاد کیا گیا تو وہ بھی سکھ راج قائم کئے بغیر نہ رہیں گے۔ حالانکہ مسلم لیگ کی تجویز کے ماتحت سکھوں کے حقوق کی حفاظت بھی کی جائیگی۔ ورنہ انہیں اس سلسلہ میں کسی نقصان کا سامنا نہ ہوگا۔ گاندھی جی مسٹر جناح اور وائسرائے کی باہمی خط و کتابت شائع ہو چکی ہے جس کو پڑھ کر ایک غیر جانبدار انسان صرف یہی کہہ سکتا ہے کہ تعبیرات کی کثرت کے باعث ہندوستانی سیاست کا خواب پریشان ہوئے بغیر نہ رہے گا۔

تمنا

(مترجمہ جناب بدر ہاشمی)

یہ چیخ پکار بیکار ہے۔
یہ پُرجوش تمنائیں بے فائدہ ہیں۔
جب سورج غروب ہو جاتا ہے۔
جنگلوں میں تاریکی چھا جاتی ہے
ہلکا سا اجالا آسمان کی وسعت پر پھیل جاتا ہو
شعلہ سا ستارہ دن کی رخصت کا ماتم
کرتے ہوئے نمودار ہوتا ہے
تو میں تمہارے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں
میں لے لیتا ہوں۔
اور تمہاری مدبھری آنکھوں کو اپنی پیاسی
آنکھوں میں غرق کر دینا چاہتا ہوں۔
جستجو — تمنا — کہاں ہے تو!
کہاں ہے وہ غیر فانی شعلہ جو تیری گہرائیوں
میں نہاں ہے!
جب آسمان پر ایک تنہا ستارہ مسکرا رہا ہو
اور شام کا دھندلکا اسرار تنہائی سے لبریز ہو
تمہاری آنکھوں میں ایک تھرتھراتی ہوئی روح
ارمانوں سے لبریز کانپتی رہتی ہے۔
میں خاموش اسے دیکھتا رہتا ہوں
ایک گہری تمنا — میرے دل میں کروٹ
لیتی ہے۔ میں ان میں ڈوب جاتا ہوں
اور خود کو — کھو دیتا ہوں۔ (ٹیگور)

بھائی کی خاطر

نفسیاتی افسانہ

از جناب آسی رامنگری

طرفین کی باہمی محبت ازدواجی زندگی کی جان ہے۔ اور محبت کی روح اعتبار ہے اس میں بدگمانی کا شائبہ آتے ہی ازدواجی زندگی کی راحتوں اور مسرتوں کا اسی طرح خاتمہ ہو جاتا ہے جس طرح چاند تاروں کے جگمگاتے ہوئے سندر آکاش کی شوبھا کالے بادلوں سے مٹ جاتی ہے۔

شام کا وقت تھا بابو مرلی منوہر دفتر سے واپس آ رہے تھے۔ راستے میں وہ سارے مناظر موجود تھے جو راہ گیروں کی تفریح کا سامان ہوتے ہیں۔ لیکن مرلی منوہر ان سے مطلق بے نیاز تھے۔ ان کے لئے ان کا تصور ہی کیا کم تھا آنکھوں میں گھر کی تصویر تھی۔ دل میں کسی کی دید کا اشتیاق۔ وہ سوچ رہے تھے۔ گھر پر پہنچکر کواڑ کھٹکھٹاؤنگا۔ تارہ دروازہ کھولے گی اور محبت سے مسکراتی ہوئی خیر مقدم کرے گی۔ آج چاندنی ہے پارک میں بڑی بہار ہوگی کیسا نظر فریب سماں ہوگا تالاب کے نیلے پانی میں چمکتے اور جگمگاتے تاروں کا عکس کیسا حسین منظر ہوگا۔

انھیں خوش آیند خیالات و تصورات کے جھولے میں جھولتے ہوئے مرلی منوہر گھر پہونچے۔ لیکن اور دنوں کی طرح دروازہ بند نہ ملا۔ انہوں نے سوچا کوئی ہمسائی آئی ہوگی۔ انہوں نے اندر قدم رکھا ہی تھا۔ کہ کسی کے ہنسنے کی آواز کانوں میں آئی۔ پھر کسی نے کہا —— "لالہ یہ پریم کیا چیز ہے؟"

کسی نے جواب دیا —— "بھابی یہ اپنے دل سے پوچھو"

مرلی منوہر کا ماتھا ٹھنکا۔ ایں یہ کیا گل کھل رہا ہے؟ میری عدم موجودگی میں یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے، میں تو دفتر میں قلم گھستا گھستا آدھا ہوا جاتا ہوں اور یہاں پریم لیلا ہو رہی ہے۔ ان کے دل میں بدگمانی کی آگ بھڑک اٹھی وہ آگے بڑھے اور برآمدے میں ان کا چھوٹا بھائی شیام پلنگ پر لیٹا تارا کے منہ کی طرف مسکراتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اور تارا نیچے پر تکلف چٹائی پر بیٹھی پان بنا رہی تھی۔ اب بدگمانی کو روشن ثبوت بھی ملا۔ آگ پر تیل پڑ گیا۔ مرلی منوہر کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکے۔ سیدھے کمرے میں کپڑے اتارنے چلے گئے۔

شیام بھائی کو دیکھ کر شرم و ندامت سے عرق عرق ہوتا باہر چلا گیا۔ مرلی منوہر کمرے سے نکلے اور باہر جانے لگے۔ تارا نے اُن کی طرف سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟ کیا جل پان نہ کروگے؟"

"نہیں کوئی ضرورت نہیں" مرلی منوہر نے اتنا کہا۔ اور باہر چلے گئے۔

شوہر کے جاتے ہی تارا کو طرح طرح کے خیالات نے آگھیرا۔ وہ سوچنے لگی۔ آج وہ اتنے ناراض کیوں تھے؟ سیدھے منہ بات تک نہ کی۔ بغیر کچھ کھائے پیئے باہر چلے گئے۔ کسی سے جھگڑا تو نہیں ہوا؟ دفتر میں صاحب نے کچھ کہا سنا تو نہیں۔ نارائن جانے کیا بات ہے؟ جب کوئی اپنے دل کی بات نہ بتلائے تو کوئی کیا سمجھے،

مرلی منوہر پارک میں تالاب کے کنارے جا کر بیٹھ گئے۔ چاندنی ٹھنڈی روشنی ایسی معلوم ہو رہی تھی، جیسے کوئی باکمال مغنی کوئی دلکش راگ الاپ رہا ہو قدرت کے یہ دلکش مناظر اس فردوس گوش نغمہ کی تان میں رقص کرتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ ہر طرف سکون کا تسلط تھا۔ لیکن پانی کے چھینٹے دل کی آگ کو ٹھنڈی نہیں کر سکتے۔ مرلی منوہر کا غصہ اضطراب میں تبدیل میں تبدیل ہو گیا۔ انھیں باغ کی دلکش فضا سکون و طمانیت نہ بخش سکی۔ کبھی کبھی حسن صرف آنکھوں کو لبھاتا ہے۔ دل کو نہیں ان کے لئے باغ کا پر سکون سکوت مرگھٹ کی خوفناک خاموشی سے کم نہ تھا۔ تنہائی مسرور انسان کے لئے راحت بخش ہوتی ہے لیکن متردد و متفکر آدمی کے لئے تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔

مرلی منوہر کے سامنے تو گھر کی تصویر رقص کر رہی تھی۔ ان کے کانوں میں گونج رہا تھا "لالہ پریم کیا چیز ہے —؟ بھابی یہ اپنے دل سے پوچھو!" مرلی منوہر سوچ رہے تھے یہ باتیں بے وجہ نہیں ہو سکتیں۔ ان کی تہ میں کوئی راز ضرور ہے۔ تارا میری محبت کا دم ضرور بھرتی ہے لیکن عورت کے دل کا سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اس اتھاہ ساگر کا وارا پار نہیں۔ بھلا زبان سے کہی ہوئی باتوں سے دل کا بھید کیسے جانا جا سکتا ہے؟ مانا کہ ان دونوں میں ہنسی مذاق کا رشتہ ہے۔ لیکن میں نے شیام کو تارا کی طرف گھورتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کی آنکھیں اس کے دل کا راز صاف بتا رہی تھیں۔ تارا اُس کی طرف کن انکھیوں سے

دیکھتی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ یہ ساری باتیں اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔ کہ تارا اب اعتبار کے قابل نہیں رہی۔ کیا کروں ڈانٹ ڈپٹ سے تو آگ اور بھی بھڑکے گی، اور بدنامی ہی ہاتھ رہے گی۔ اس لئے نہایت خاموشی سے ان دونو کو علیحدہ کر دینا ہی اچھا ہوگا۔ اگر میرا شک حقیقت پر مبنی ہوگا تو ایسا کرنے سے راز فاش ہو کر رہیگا۔ ورنہ کوئی بات نہیں۔ دونوں اپنی اپنی راہ رہیں گے۔

اس خیال کے آتے ہی مرلی منوہر کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اور وہ گھر کی طرف چل دیئے۔

شیام اپنے کمرے میں لیمپ کے سامنے بیٹھا تھا۔ سامنے شیکسپیر کا ایک ڈرامہ کھلا پڑا تھا۔ لیکن اس میں اس کا جی نہ لگتا تھا۔ اس کے دل کی کشتی غم اور ندامت کے ساگر میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ وہ فطرتاً جذباتی واقع ہوا تھا۔ ذرا ذرا سی باتوں سے اس کے دل میں [illegible]۔ اس کے دل میں بار بار یہی خیال اُٹھ رہا تھا۔ کہ بھائی صاحب نے کیا سوچا ہوگا؟ ان کے بشرے سے خفگی عیاں تھی مجھے اس طرح من مانی نہ کرنی چاہئے تھی

اتنے میں مرلی منوہر کمرے میں داخل ہوئے۔ اور پوچھا ـــ

"شیام! تمہارا امتحان کب ہوگا؟"

"مارچ کے آخری ہفتے سے شروع ہوگا"

"وقت تو اب بہت کم رہ گیا ہے"

"جی ہاں"

"میرا خیال ہے کہ اب تم ہوسٹل میں جا کر رہو تو اچھا ہوگا۔ یہاں تمہاری پڑھائی کا حرج ہوگا"

"اچھی بات ہے"

دوسرے دن شیام اپنا سامان لیکر بورڈنگ ہاؤس میں چلا گیا۔

تارا اور شیام میں یہ وہ فطری محبت تھی جو ایک ساتھ رہتے سہتے مذاق اور طبائع کی یگانگت کے باعث پاک اور بے لوث دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ شیام کا کالج چار بجے بند ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد اس کے وقت کا بیشتر حصہ تارا کے ساتھ گزرتا تھا۔ کبھی ارباب فکر کے مقالات پڑھے جاتے کبھی شیام کی لکھی ہوئی نظمیں پڑھی جاتیں کبھی کوئی سماجی مسئلہ زیر بحث رہتا۔ غرض ان کی بے لوث محبت اور بے غرض رفاقت دونو کی زندگی کو قابل رشک طور پر سنوار رہی تھی۔

شیام کے جاتے ہی تارا افسردہ خاطر اور اداس رہنے لگی۔ شوہر کے برتاؤ میں بھی پہلی جیسی محبت نہ رہی۔

مرلی منوہر کی بدگمانی روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ وہ تارا کی اس بدحالی کا سبب صرف شیام کی علیحدگی سمجھتے تھے۔ انھیں تارا کے آنسوؤں میں اس کے مہجور دل کی آہیں گھلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اب وہ خود کو زیادہ نہ روک سکے۔ انہوں نے ایک روز نفرت آمیز غصہ کے انداز میں کہا ـــ

"تارا! میں تمہارا یہ روز روز کا رونا نہیں دیکھ سکتا۔ میں بہت دنوں سے تمہارا رنگ دیکھ رہا ہوں"

تارا نے ان کی طرف غم آلود نگاہوں سے دیکھا۔ وہ ان کی باتیں نہ سمجھ سکی۔ اس کی یہ نگاہ مجرم جیسے پاک اور رنج اسرار سے پُر نہ تھی۔ بلکہ ایک ناکردہ گناہ کی معصوم حیرت تھی۔ مرلی منوہر نے سمجھا تارا حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے۔ انہوں نے طنز آمیز لہجے میں کہا ـــ

"دیکھتی کیا ہو۔ تم سمجھتی ہو میں دودھ پیتا بچہ ہوں۔ جس طرح ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ اسی طرح ایک دل میں دو آدمیوں کی محبت نہیں جگہ پا سکتی"

تارا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اف یہ خوفناک الزام! معمولی ہنسی مذاق کا یہ انجام؟ اف اتنی بدگمانی! اس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ مرلی منوہر اُٹھ کر باہر چلے گئے۔

اس واقعہ کے تیسرے روز تارا اپنے میکے چلی گئی۔ جاتے وقت اس کی حالت اس طائر اسیر کی سی تھی جو ایک طویل مدت تک قفس میں بند رہنے کے بعد ایک روز آزاد کر دیا گیا ہو۔ جس کے بازوؤں میں طاقت پرواز ہوتی ہے نہ دل میں اُمنگ۔ جو محض قیدی کو برسوں رہنے سہنے کے بعد اسی کال کوٹھڑی کو چھوڑتے ہوئے دلی رنج ہوتا ہے۔

تارا کو میکے گئے ہوئے چھ مہینے ہو گئے۔ لیکن اس طویل عرصہ میں اسے مرلی منوہر کا ایک خط بھی نہ ملا۔ بلانے کو کون کہے سسرال سے اسے کوئی دیکھنے بھی نہ آیا۔ تارا کی حالت اس نرم و نازک بیل کی سی تھی جو چمن سے علیحدہ کر دی گئی ہو۔ اسے باغ کی جاں بخش فضا میسر تھی نہ کنج کی ٹھنڈی چھاؤں اور نہ درخت کی راحت آگیں آغوش محبت ہی نصیب تھی۔ اگرچہ تارا کی اس اندوہناک حالت کی ساری ذمہ داری مرلی منوہر پر تھی پھر بھی اسے ان سے کوئی شکایت نہ تھی۔ اگر اسے رونا تھا تو اپنے نصیب کا۔ اس برے وقت میں اگر اسے ڈھارس ہوتی تھی تو صرف اپنی بیگناہی کے احساس سے، یا رامائن پڑھنے سے۔

تارا عورت ہی تھی۔ وہ انسانی کمزوریوں سے پاک نہ تھی۔ بسا اوقات اس کا دل باغی ہو جاتا اور وہ سوچتی مجھ پر یہ کیسا ظلم ہو رہا ہے۔ کیا

محبت کا صلہ یہی ہے؟ اتنے دن ہو گئے خبر تک نہ لی کبھی بھول کر بھی آتے انہوں نے اگر آنکھیں پھیر لیں تو مجھی کو کیا پڑی ہے کہ ان کے پیچھے ماری ماری پھروں۔ لیکن اس اضطراب و ہیجان کے طوفان میں بھی اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی پریم رس میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہہ رہا ہے ــــ "پتی کے کٹھور برتاؤ پر بھی اس سے بغاوت و سرتابی کرنا ہندوستانی عورت کے شایانِ شان نہیں"

تارا شرم و ندامت سے گڑ جاتی۔ اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی۔ اور اسے اپنا ہی قصور نظر آنے لگتا وہ سوچتی اگر میں عاقبت اندیشی سے کام لیتی تو یہ روز بد کیوں دیکھنا پڑتا؟ جوانی اور وہ بھی عورت کی جوانی ہمیشہ مشتبہ نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ وہ مرد ہیں۔ مجھے شیام کے ساتھ یوں ہنستے بولتے دیکھ کر اگر انہیں بدگمانی ہوئی تو اس میں ان کا کیا قصور ہے؟ ایسے موقع پر شک کرنا تو انسان کی فطرت ہے۔ اصل میں یہ زہر تو میرا ہی بکھیرا ہوا ہے۔

کاتک کا مہینہ تھا۔ باد جنوب مستانہ ادا سے چل رہی تھی۔ تارا آنگن میں ٹہل رہی تھی صحن میں پھیلی ہوئی چاند کی روشنی ایسی معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے اس کے سہاگ کے دنوں کا مسرت انگیز خواب ہو۔ تارا نے چاند کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اور ٹھنڈی سی سانس کھینچ کر بولی ـــ "مجھکو ان بہ امتحان کی گھڑیاں اب کب ختم ہوں گی؟"

اسی وقت یکایک شیام اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ تارا نے حیرت اور مسرت آمیز انداز میں پوچھا ـــ "لالہ! تم یہاں کیسے ....؟"

"یوں ہی چلا آیا لیکن بھابی کیا تمہارے ہاں مہمانوں کا یوں ہی سواگت ہوتا ہے؟"

تارا نے شرمندہ ہو کر کہا ـــ "معاف کرنا لالہ! آؤ بیٹھو"

"نہیں بھابی بیٹھوں گا نہیں مجھے اسی دس بجے کی گاڑی سے واپس جانا ہے صرف تم سے دو باتیں کرنی ہیں"

شیام نے تارا کی طرف غور سے دیکھا۔ لیکن وہ جو نظارہ دیکھنے کا مشتاق تھا نظر نہ آیا۔ حسن و جمال کا وہ دلنواز پیکر جسے دیکھتے ہی اس کے شاعرانہ دل میں جذبات کا دریا موجزن ہو جاتا تھا۔ ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ گیا تھا۔ تارا کی حالت آخر شب کے چاند کی سی ہو گئی تھی۔ صورت پر حسرت و یاس کی افسردگی اور آنکھوں میں رنج و غم کے آنسو تھے۔ جبین پر جہاں سیندور کا ٹیکہ ہنسا کرتا تھا۔ فکر و تردد کے بل تھے۔ شیام کے منہ سے ایک دبی آہ نکل گئی۔

"تمہاری یہ کیسی حالت ہو رہی ہے تم کتنی بدل گئی ہو؟"

"کچھ ایسی بدلی تو نہیں ہوں۔ ہاں ادھر کچھ دنوں سے طبیعت اچھی نہیں رہتی لالہ!"

"مجھ سے بھید کیوں چھپاتی ہو بھابی؟"

"سچ کہتی ہوں کوئی اور بات نہیں لالہ!"

"اچھا یہی سہی۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ اگر تمہیں کوئی مرض ہے تو اس کا تعلق دل سے ہے"

"لالہ تم نے یہ فلسفہ کہاں سے سیکھا؟"

"تمہیں سے بھابی۔ تم اپنے دل کی بات لاکھ چھپاؤ۔ لیکن مجھ سے نہیں چھپ سکتی۔ بھائی صاحب کی خفگی کا راز بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ بھائی صاحب اور تمہارے درمیان جو کشیدگی ہے اس کا باعث بھی میں ہی ہوں۔ لیکن آج میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے نہیں اپنے جرم کا اقبال کرنے کے لئے آیا ہوں۔ میں اپنے دل کی پہنائیوں میں تمہاری محبت کو جاگزیں پاتا ہوں۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ یہ محبت ناروا ہے۔ اور اس کا انجام بھی غم انگیز ہوگا۔ لیکن میں معذور ہوں محبت کا نخل جڑ پکڑ چکا ہے۔ اب اسے اکھاڑ پھینکنا ناممکن ہے"

تارا کو شیام کے یہ الفاظ بے حد پیارے معلوم ہو رہے تھے۔ اس کا دل لذت احساس سے لبریز ہو گیا۔ بے سمجھ بچہ جلتے ہوئے چراغ کو دیکھتے ہی خوشی سے ہمک کر اس کی طرف لپکتا ہے اور چاہتا ہے کہ اسے اپنے منہ میں رکھ لے۔ لیکن ماں اسے دوڑ کر پکڑ لیتی ہے۔ ہٹیلے بچے سے ممتا کی ماری ماں کو جو تعلق ہوتا ہے۔ وہی تعلق دل سے ضمیر کا ہے وہ بسا اوقات دل کی راحت کے راستے کا روڑا بن جاتا ہے۔ تارا کا ضمیر اس کے دل کی امنگوں سے بیچ بن کر کہہ رہا ہے پرائے مرد کے منہ سے لفظ محبت بھی سننا شوہر پرست عورت کیلئے شرم کی بات ہے۔ تارا بڑے شش و پنج میں پڑ گئی۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ کیا کرے۔ وہ ایسے راستے سے بچنا چاہتی تھی۔ جس پر گامزن ہونے سے اس کی عصمت و عفت پر دھبہ آئے۔ اور ایک مجبور محبت پر غم و غصہ کرنا بھی اس کی افتاد طبع کے منافی تھا یکایک اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے کہا ـــ "لالہ! تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ یہ میرے لئے انتہائی خوش نصیبی کی بات ہے۔ لیکن اس کا انجام کیا ہوگا؟"

"تم میرا امتحان لے سکتی ہو"

"اچھا لالہ میں امتحان لیتی ہوں۔ دیکھو یار اپنے ضبط کو کھو بیٹھنا"

شیام کا دل کانپ گیا۔ وہ سوچنے لگا اُف میں امتحان کے لئے کیوں آمادہ ہوا۔ لیکن زبان دیکر تغلیں جھانکنا ایک غیور مرد کی شان کے

شایاں نہ تھا۔ اس نے کہا ”اچھا بھابی میں عہد کرتا ہوں کہ تمہیں بھول جاؤنگا۔ آج سے ایک ہفتہ کے بعد تم سے ایک بار پھر ملوں گا۔ اس کے بعد تمھاری راہ کا یہ کانٹا ہمیشہ کیلئے دُور ہو جائیگا“

شیام اتنا کہتا ہوا جلدی سے باہر چلا گیا۔ تارا وہیں کھڑی رہ گئی۔ اسے شیام سے مخالفت کا خوف تھا۔ لیکن اس کی ان خلاف توقع باتوں نے اسے حیرت میں ڈال دیا۔ اس کا ضمیر ضرور مطمئن ہو گیا تھا۔ لیکن دل میں بیٹھا بیٹھا درد ہو رہا تھا اس وقت اس کی حالت اس رہ نورد کی تھی جو ڈاکوؤں کو روپوں کی تھیلی دے کر جان بچاتا ہے۔ اسے جان بچ جانے کی خوشی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن روپوں کے ہاتھ سے نکل جانے کا رنج اس کا دل مسوستا رہتا ہے۔

شیام کی حالت اس وقت اس نادان بچے کی سی تھی جو آگ کو کھلونا سمجھ کر اس کے ساتھ کھیلتا ہے۔ لیکن جل جانے پر رونے لگتا ہے۔ اسے اب معلوم ہوا کہ محبت کی راہ باغ کے صحن کی طرح صاف ستھری اور ہموار نہیں ہے۔ بلکہ کانٹوں سے بھرا ہوا پُر پیچ صحرائی راستہ ہے۔ جس میں ہر ہر گام پر ہمت شکن صعوبتیں اور صبر طلب کلفتیں ہیں۔ جدائی کے جانگسل صدمات اور امتحان کا حوصلہ آزما خوف و ہراس ہے۔ جہاں حقیقت بے نقاب ہو کر رقص کرتی ہے۔ صرف خیال کے راحت آگیں خواب نظر نواز نہیں ہوتے۔

شیام کو ان دنوں شب و روز یہی فکر کھائے جاتی تھی۔ کہ تارا کو کیسے بھلا دوں؟ لیکن اس کے دل میں جتنی تدبیریں آئیں سب بیکار ثابت ہوئیں۔

دن کا تیسرا پہر تھا۔ اُس نے پڑھنے میں دل لگانے کی کوشش کی۔ لیکن گھنٹوں کتاب کھلی رہنے پر بھی بمشکل تمام ایک یا دو سطر سے زیادہ نہ پڑھ سکا۔ آخر کتاب بند کر دی اور میچ کھیلنے چلا گیا۔ شیام بڑی دلچسپی سے کھیل دیکھ رہا تھا۔ فیلڈ کے ہر ہر واقعہ پر نظر تھی۔ میچ ختم ہو گیا۔ لیکن اس سے کوئی پوچھتا کہ کون ہارا؟ تو شاید ہی بتا سکتا۔

میچ کے بعد شیام پارک میں گھومنے چلا گیا۔ باغ کی پُرسکون فضا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کی خوش خرامی۔ اور رنگا رنگ پھولوں سے لدے ہوئے پودوں کا جھومنا۔ یہ سارے مناظر ایک درد کے مارے کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو بلا نوش کے ساتھ خالی پیمانہ و ساغر کیا کرتے ہیں۔ شیام کو تارا کا خیال ستانے لگا۔ وہ سوچنے لگا ”میں کیا سے کیا ہوا جاتا ہوں۔ کیا یہ ناقابل برداشت اذیت میری جان ہی لیکر دامن چھوڑیگی! لیکن کسی پرائی عورت سے محبت کرنا کیسی شرم کی بات ہے۔ اور پھر وہ بھی کس سے! خاص بڑے بھائی کی بیوی سے! اُف کیسا شرمناک فریب اعتبار ہے۔ کیا گھر بار چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں! لیکن یہ تو بزدلی ہوگی۔ اور پھر یقین بھی نہیں ہوتا کہ یہ خیال وہاں بھی دُور ہو سکے گا۔ آہ بتی پتنی کیسے سکھ سے رہتے تھے۔ میں نے ان کی امرت جیسی زندگی میں زہر ملا دیا۔ میں جس کی محبت کا دم بھرتا ہوں۔ اسی کو گھر سے نکلوا دیا! کیا میرے لئے ڈوب مرنے کی بات نہیں! آہ بے گناہ تارا کی حالت کیسی قابل رحم تھی! کیا ان دو بچھڑے ہوؤں میں ملاپ کرا دینے کی کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی! کم سے کم مجھے کوشش تو ضرور کر دیکھنی چاہئے“

شیام اسی ادھیڑ بن میں ہوسٹل واپس آیا۔ اور بھائی کو ایک خط لکھا۔

تارا کے چلے جانے کے بعد مرلی منوہر کو گھر کاٹے کھاتا تھا۔ گھر کی حالت اس سونے قفس کی سی ہو گئی تھی۔ جسے ایک طائر خوش نوا چھوڑ کر اڑ گیا ہو۔ کسی چیز کی قیمت اس کے کھو دینے کے بعد معلوم ہوتی ہے مرلی منوہر کو تارا کی قدر و قیمت کا اندازہ اب ہوا جب اُن کی قدم قدم پر ضرورت پڑنے لگی۔ اب گھر میں پہلی سی صفائی تھی نہ ستھرا پن۔ ضرورت عیوب پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اب انہیں تارا کی خوبیاں ہی خوبیاں یاد آنے لگیں۔ اس باہمی شکر رنجی کے بارے میں بھی اب ان کا خیال بدل چکا تھا۔ ان کا ضمیر اب انہیں کو مجرم سمجھنے لگا تھا۔ ان کا دل بار بار کہتا میں نے تارا کے ساتھ زیادتی کی۔ معمولی ہنسی مذاق پر بدگمان ہو جانا اور اسے اتنی اہمیت دینا ہرگز مناسب نہ تھا۔ اگر یوں ہی ذرا ذرا سی باتوں پر شک کیا جائے تو دنیا کا کام چلنا مشکل ہو جائے۔

اس درمیان میں تارا کے کئی خطوط آ چکے تھے۔ جن کا ہر ہر حرف مہر و محبت کے جذبات سے لبریز ہوتا تھا۔ ان میں وہی اشتیاق و اضطراب اور محبت کی وہی چاشنی تھی جو پہلے خطوط میں رہا کرتی تھی۔ مرلی منوہر خطوط کا جواب لکھنے بیٹھتے تو انہیں عجب ندامت سی محسوس ہوتی۔ وہ گھنٹوں سوچتے کیا لکھوں؟ اور اگر کچھ لکھتے بھی تو لکھتے لکھتے چاک کر کے پھینک دیتے۔ اگر وہ تارا کو خود خط لکھنے سے قاصر تھے لیکن اس کے خطوط سے انھیں ناقابل بیان مسرت و طمانیت حاصل ہوتی تھی۔ مرلی منوہر کی حالت اب اس مچلے ہوئے بچے کی سی ہو گئی تھی جو رو دھو کر اس اُمید میں بیٹھا ہو کہ کوئی منائے تو من جاؤں۔

ادھر عرصہ سے تارا کا کوئی خط نہ آیا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ ملی منوہر قدم بڑھاتے ہوئے دفتر سے مکان کی طرف جا رہے تھے۔ گھر پہونچکر

اُنہوں نے دروازہ کھولا تو سامنے پڑا ہوا خط ملا۔ اُنکا دل خوشی سے ناچ اُٹھا۔ آنکھوں میں اُمید کی روشنی چمک اُٹھی۔ اُنہوں نے بڑھکر خط اُٹھایا لیکن ہاتھ میں لیتے ہی چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اُن کی اُمید پر اوس پڑ گئی۔ خط لیتے ہوئے اندر گئے۔ کپڑے اُتارے۔ منہ ہاتھ دھویا۔ پھر خط پڑھنے بیٹھے ۔۔۔ لکھا تھا:-

بھائی صاحب پرنام!

بہت دن ہو گئے۔ گھر کی خیر و عافیت نہیں معلوم ہوئی۔ میں کئی بار مکان پر آیا۔ لیکن اپنی بدقسمتی کو کیا کہوں کہ آپ کے درشن نہ ہوئے۔ میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ پرسوں حاضر ہوں گا۔ اُمید ہے کہ آپ اس روز گھر پر ملیں گے۔

ملاقات کا تمنائی:-

شیام منوہر

مرلی منوہر سوچنے لگے۔ وہ ضروری باتیں کیا ہو سکتی ہیں؟ کہیں تارا کے پاس چلنے کو نہ کہے۔ میں بھلا وہاں کیسے جا سکتا ہوں؟ تارا کیا کہے گی؟ میں کیا جواب دُوں گا! نہیں یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو گا۔ اس سے بہتر تو یہی ہو گا کہ میں گھر پر نہ رہوں۔ نہ اس سے ملاقات ہو۔ شیام آپ ہی واپس چلا جائے گا۔ لیکن اگر اسے کسی اور بارے میں صلاح لینی ہو تو؟ نہیں اس روز مجھے ضرور گھر رہنا چاہیئے۔ اگر میرا خیال صحیح ہو جب بھی وہ مجھے زبردستی تو وہاں نہ لے جائیگا۔

آج شیام کے آنے کا دن تھا۔ مرلی منوہر شام ہی سے مکان پر موجود تھے۔ چھ بج گئے۔ شیام ابھی تک نہیں آیا۔ مرلی منوہر انتظار کرتے کرتے اُکتا گئے۔ اُنہوں نے دروازہ کھولا سڑک پر جاکر دیکھا۔ لیکن کوئی آتا نظر نہ آیا۔ تو اندر واپس چلے گئے۔ جاکر ابھی بیٹھے ہی تھے کہ کسی نے کواڑ کھٹکھٹایا۔ اُنہوں نے اُٹھکر دروازہ کھولا لیکن شیام کے پیچھے ایک عورت بھی کھڑی دیکھکر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ یہ عورت کوئی اور نہیں تارا تھی۔ شیام اور تارا مکان میں داخل ہوئے۔ شیام نے جھک کر تارا کے کان میں کہا ۔۔۔ "دیکھو بھابی! اب اپنی چیز سنبھال کر رکھنا۔ میں اپنی بات پوری کر چکا۔"

شیام اندر صحن میں چلا گیا۔ تارا اور مرلی آمنے سامنے کھڑے تھے۔ لیکن دونوں کی آنکھیں نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ تارا کی آنکھوں سے محبت کے آنسو نکل رہے تھے۔ دونوں بہت کچھ کہنے کے لئے بیتاب تھے۔ لیکن کسی کا منہ نہ کھلتا تھا۔

یکایک اندر سے ریوالور کی آواز آئی۔ مرلی منوہر اور تارا چونک پڑے اور دونوں ساتھ ہی اندر کی طرف لپکے۔ سامنے رونگٹے کھڑا کر دینے والا جانگداز منظر تھا۔ شیام صحن میں چت پڑا ہوا تھا۔ سینے سے خون کا فوّارہ چھوٹ رہا تھا۔ کپڑے لہو سے تر تھے۔ بشرے پر عجیب طمانیت اور ہونٹوں پر سکون آمیز تبسّم تھا۔ بغل میں ایک ریوالور پڑا ہوا تھا۔ مرلی منوہر باہر کی طرف لپکے۔ شیام نے اشارے سے منع کیا۔ اور نحیف آواز میں کہا۔ "بھیّا کہاں جاتے ہو! ڈاکٹر کو بلانے؟ بیکار تکلیف نہ کرو۔ میرے مرض کا مداوا ہو گیا۔"

دیکھتے ہی دیکھتے شیام کی آنکھیں پتھرا گئیں اور جسم سرد ہو گیا لیکن ہونٹوں پر اب بھی ایک عجیب تبسم رقص کر رہا تھا۔

تارا اور مرلی منوہر لاش پر جھک کر چیخ چیخ کر رونے لگے۔

اس غم انگیز حادثہ کو کم و بیش ایک سال ہو گیا۔ صحن کے مختصر سے باغ کے وسط میں ایک چبوترہ بنا ہوا ہے۔ یہی وہ مقام ہے۔ جہاں ایک پریم کے پاگل نے محبت کی قربان گاہ پر اپنی جان کی قربانی پیش کی تھی۔ آج کاتک کی پورنماشی تھی۔ بام و در اور شجر و حجر پر پھیلی ہوئی چاندنی کو دیکھکر ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کسی فردوسی رُوح کی تجلی ضیا فگن ہو۔

تارا نے پھولوں کا ایک ہار چبوترے پر چڑھایا۔ پریم سے آرتی اُتاری اور پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور کسی خیال میں مستغرق ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دو بوندیں گر پڑیں۔ ان آنسوؤں میں عقیدت و محبت کی خیرہ کن تجلی تھی۔ دُور کھڑے ہوئے مرلی منوہر اس دیوی سروپ پریم پجارن کے درشن کر رہے تھے۔

عورت کے سفید پانی

جو عورتیں سفید پانی کی بیماری میں مبتلا ہیں یعنی وقت بے وقت زردی مائل یا سفید رطوبت ان کے خفیہ جسم سے نکلتی رہتی ہے۔ وہ اپنی بھری بھری جوانی کو چند روز میں خاک کر دیتی ہے۔ کیونکہ سفید پانی کی بیماری سے غفلت برتنا اور اس کا علاج نہ کرنا بے حد خطرناک ہوتا ہے۔ یہی سفید رطوبت دراصل جوانی اور شباب کا جوہر ہوتا ہے۔ جو رفتہ رفتہ بدن سے خارج ہو جاتا ہے۔ اور عورت کو بے کار کر دیتا ہے۔ اس بیماری کے شروع میں عورت کے تمام بدن میں بکلی۔ اور پنڈلیوں۔ کمر ناف کے نیچے میٹھا میٹھا درد ہوتا ہے۔ پھر سر چکرانے لگ جاتا ہے۔ کام کی زیادتی چلنے پھرنے سے بعد تکان اور کمزوری محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس کے بعد ماہواری ایام میں کچھ ایسی گڑبڑ پڑ جاتی ہے۔ جو بعض اوقات عورت کی صحت کا بالکل ہی خاتمہ کر دیتی ہے۔ پس ایسی حالت میں اس سفید بیماری (یعنی سیلان الرحم) سے عورت کو غفلت ہرگز نہ کرنا چاہئے۔

سفید پانی کو روکنے کی ترکیب

اگر کوئی عورت سیلان الرحم کی مریض ہے اور اس کے خفیہ جسم سے سفید پانی یا رطوبت نکلتی رہتی ہے۔ تو اس کو روکنے اور اس کا علاج کرنے کی سب سے آسان اور سب سے سستی ترکیب یہ ہے۔ کہ وہ ایک شیشی دوا "روک" استعمال کرے۔ یہ دوا تقریباً بارہ سال سے تجربہ میں آ رہی ہے اور سیلان رحم کی بیماری کو تیسرے دن ختم کر دیتی ہے ہزارہا عورتوں نے اس دوا کے ذریعہ اس بیماری سے نجات حاصل کی ہے۔ دوا شروع کرنے کے تیسرے دن ہی مریضہ بول اٹھتی ہے کہ دوا **روک** نے کتنی جلدی اُسے صحت کا یقین دلا دیا۔ کیونکہ استعمال شروع کرنے کے تیسرے روز سفید رطوبت کا خارج ہونا بند ہو جاتا ہے اور پھر پوری شیشی ختم ہونے تک ... کی بنیاد ختم ہو جاتی ہے۔ لیس ... ہو۔ تو اس کو سفید پانی کی بیماری ہرانیس چاہئے کہ اپنی جوانی کی حفاظت کریں ... اور

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے۔ بی نمبر ۳۴ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر دوا روک کی ایک شیشی بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا کر استعمال کریں۔ سفید رطوبت سے نجات مل جائے گی

ایک شیشی دوا روک کی قیمت صرف تین روپے ہے (تھے) سات آنے محصول لگتا ہے۔)

عورت کو ماہواری ایام میں درد ہوتا ہے

ہر عورت کو ماہواری ایام کا باقاعدہ اور بغیر درد کے آنا ضروری ہے اگر کسی باعث ایام کم آتے ہوں یا درد اور سخت تکلیف دے کر آتے ہوں۔ یا بند ہو گئے ہوں یا مہینہ میں دو بار رک رک کر آتے ہوں یا ایام ماہواری کی اور کوئی خرابی ہو۔ دورے وغیرہ پڑتے ہوں۔ تو یقین کیجئے کہ ماہواری ایام کو درست اور باقاعدہ اور ہر ماہ وقت مقررہ پر لانے کے لئے سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ مریضہ کو ایک شیشی دوا **کورس** استعمال کرا دی جائے دوا کورس کا حیرت انگیز اثر دیکھ کر ہر شخص خوش ہو جاتا ہے اس دوا کا سب سے بڑا کمال یہ ہے۔ کہ ماہواری ایام کو باقاعدہ کر دیتی ہے۔ اور پھر بغیر تکلیف کے ہر ماہ ایام ماہواری آتے ہیں اور پھر ایام کے دنوں میں درد وغیرہ کی کوئی تکلیف نہیں ہوتی بڑی محرک کی دوا ہے۔ اور سالہا سال سے ہندوستان میں شہرت حاصل کر رہی ہے۔

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے۔ بی ۳۴ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر دوا کورس کی ایک شیشی بذریعہ وی پی پارسل منگا لیجئے۔ ایک شیشی دوا کورس کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے رجسٹری اور سات آنے اس پر محصول ڈاک کے علیحدہ خرچ ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ دوا ماہواری ایام کی ہر خرابی اور درد اور ہر تکلیف میں اپنا پورا اثر دکھاتی ہے۔

ملاحظات

از — ادارہ

"عالمگیر کا ہنگامہ آرا خاص نمبر" زیر ترتیب ہے۔ دیدہ زیب تصاویر فراہم کی جا چکی ہیں۔ بہت سے مضامین نظم و نثر موصول ہو چکے ہیں۔ اور ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ خاص نمبر عالمگیر کی ترتیب و تدوین میں ہندوستان کے بلند پایہ ادباء و شعراء حصہ لیں گے۔ علمی و ادبی لحاظ سے اس اشاعت خصوصی کا معیار کتنا بلند ہوگا! اس کا اندازہ کچھ اس فہرست مضامین ہی سے ہو سکے گا جو آئندہ شمارہ میں ہدیۂ قارئین کی جائیگی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ کاغذ اور سامان طباعت کی گرانی کے باوجود عالمگیر کی روایتی خصوصیات میں رتی بھر بھی فرق نہ آئیگا۔ اس نمبر کو بحفاظت اور مفت حاصل کرنے کے لئے قارئین کو چاہئیے کہ عالمگیر کی مستقل خریداری قبول فرمائیں اور اگر پہلے ہی خریدار ہوں تو اپنے حلقۂ اثر میں اس کی توسیع اشاعت کی کوشش فرمائیں۔

جن قلمی معاونین نے ابھی تک اپنے رشحات گرامی ارسال نہیں فرمائے وہ از راہ کرم یہ اعلان دیکھتے ہی توجہ فرمائیں۔ ورنہ بہت ممکن ہے کہ ان کا مضمون درج ہونے سے رہ جائے۔

اگر آپ

ماہ دسمبر ۱۹۴۱ء میں شائع ہونے والا خاص نمبر مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی چار روپے چار آنے کا ویلیو پی منگا کر عالمگیر کے مستقل خریدار بن جائیے اس صورت میں آپ کو جنوری ۴۲ء میں شائع ہونے والا سالنامہ عالمگیر مفت ملیگا

زیر نظر شمارہ میں پہلا افسانہ جناب "مہر فیصل" کا ہے۔ جو اپنے دلچسپ تراجم، معرکہ آرا مضامین اور مزاحی افسانوں کی وجہ سے ہندوستان بھر میں نیک نامی حاصل کر چکے ہیں۔ اس افسانہ میں مہاجنوں کی ذہنی کیفیت کا نہایت خوبی سے تجزیہ کیا گیا ہے۔

جناب رشید احمد صاحب رشد عربی و فارسی کے فاضل اجل ہیں۔ آپ نے عہد فاروقی کے نظام تعلیم پر قابل قدر روشنی ڈالی ہے جس سے معلوم ہو سکیگا

گناہوں کی تاریک وادی میں جا گری۔ زبان اور فن کے لحاظ سے یہ ڈراما بہت کامیاب ہے۔

جناب میرزا محمد شبیر ایم اے بی ٹی نے تنقید اور اردو شاعری پر ایک معلومات افزا مضمون لکھا ہے۔ جو اختصار کے باوجود جامعیت کا آئینہ دار ہے۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ اردو رسائل میں ایسے مضامین بکثرت شائع ہوتے رہتے ہیں جنکو "تنقید" کی بجائے "تنقیص" کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ عالمگیر حتی الوسع ایسے مضامین کی اشاعت سے گریز کرتا ہے اور اس کی ہمیشہ سے یہی پالیسی ہے کہ خادمین ادب کے خلاف مضامین بالکل نہ لکھے جائیں۔ کیونکہ نقطۂ نگاہ کے اختلاف سے تلخی پیدا ہونا یقینی ہے اگر جب ہر شخص اپنے اپنے رنگ میں اردو ادب کی خدمت کر رہا ہے تو پھر اس کے رستہ میں روڑہ اٹکانے سے فائدہ؟ البتہ کسی کے زاویہ نگاہ سے اختلاف ہو تو بجائے اخبارات میں شائع کرانے کے اسے پرائیویٹ طور پر اطلاع دے دینا بہتر ہوتا ہے۔

اس سے قبل سید اخلاق حسین صاحب رضوی کے دو تین افسانے ہم قارئین عالمگیر کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ اس اشاعت میں آپ کا ایک پر لطف افسانہ شائع ہو رہا ہے جو نفسیاتی تجزیہ کے لحاظ سے بہت خوب ہے۔

مولانا عبد القیوم ندوی گزشتہ سال حرمین الشریفین کی زیارت سے فیض یاب ہو کر آئے ہیں۔ آپ نے حجاز کے دور جدید کو نہایت عمدگی سے نمایاں کیا ہے۔ اس موضوع پر آپ کی ایک کتاب بھی شائع ہو رہی ہے۔

اخبار و افکار

دیسی زبانوں میں ذریعۂ تعلیم

از ——— ادارہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) نے ہماری زبان میں دیسی زبانوں میں ذریعۂ تعلیم کے موضوع پر ایک قابل توجہ شذرہ سپرد قلم کیا ہے جس میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے اس فیصلہ پر تنقید نظر کی ہے جو اس نے حال ہی میں فارسی عربی اور سنسکرت کی تعلیم دیسی زبانوں میں دینے کے متعلق کیا ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے یہ شذرہ درج ذیل کیا جاتا ہے:

"پنجاب یونیورسٹی نے آخر یہ فیصلہ کر ہی دیا کہ فارسی عربی اور سنسکرت کی تعلیم دیسی زبانوں میں ہو۔ ہم اس سے پہلے بھی ایک دفعہ اس تجویز کے غیر مفید ہونے کے متعلق عرض کر چکے ہیں۔ اور آج پھر اس سلسلے میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا تھا ہمیں سنسکرت کے متعلق کچھ کہنے کا نہ تو حق پہنچتا ہے اور نہ ہی ہم ایسا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک فارسی اور عربی کا ذریعۂ تعلیم اُردو مقرر کرنے کا فیصلہ ہوا ہے وہ ہم کسی حالت میں مستحسن نہیں سمجھتے۔ پنجاب یونیورسٹی کے چند ایک فیلوز سے اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی۔ تو اُن کا زاویۂ نگاہ معلوم کر کے اور بھی حیرت ہوئی۔ ان کا یہ خیال ہے کہ فارسی اور عربی کا ذریعۂ تعلیم "اُردو" مقرر کرنے سے اُردو پنجاب میں زیادہ مقبول ہو گی۔ اس مسئلے پر علمی طور پر غور کرنے سے ہم بھی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جہاں تک جذبات کا تعلق ہے۔ ہم کارکنان جامعہ کے حسن نیت کی داد دیتے ہیں۔ لیکن فارسی اور عربی کا ذریعۂ تعلیم اُردو مقرر ہونے سے دیسی زبانوں کی ترویج کو تقویت ہرگز نہیں پہنچے گی۔ یہ صحیح ہے کہ اس تجربے کے نتائج کا فیصلہ مستقبل کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن واقعات اور حقائق کو نظر انداز کر دینا یقیناً دور بینی اور عاقبت اندیشی کی دلیل نہیں جذباتی لحاظ سے فارسی اور عربی کو اُردو میں پڑھانے کا انتظام درست ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ اساتذہ اور طلبا کے لئے اس طرح کرنے سے کئی قسم کی سہولتیں بہم پہنچیں گی لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کرنے سے اُردو مقبول ہو گی یا فارسی اور عربی دونوں نامقبول ہو جائیں گی؟ ظاہر ہے کہ جب فرنگی کے دیئے ہوئے نظام تعلیم میں ایک گریجویٹ ایک مضمون کی تعلیم دیسی زبان میں پا کر فارغ ہوگا تو وہ فرنگی کی منڈی (یعنی دفتروں) میں اس گریجویٹ کے مقابلے میں کم قیمت پر بکے گا جو تمام مضمونوں کی تعلیم فرنگی کی اپنی زبان میں پا کر فارغ ہوا ہے۔ اور اس کا حشر دیکھتے ہوئے بعد میں آنے والا طالب علم ہرگز ہرگز عربی اور فارسی کے نزدیک بھی نہ آئے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اُردو کو مقبول کرنے کی بجائے عربی اور فارسی خود بھی نامقبول ہو جائے گی۔ یہ ایک عیاں حقیقت ہے کہ آزاد ممالک کے علی الرغم فرنگی نے علاوہ آبادی ہند کو جو نظام تعلیم دیا ہے وہ عوام الناس کو تربیت یافتہ بنانے کے لئے نہیں دیا۔ اور تمام دنیا کے برعکس جس قدر غیر تعلیمی اور غیر مفید کام ہندوستان کے ہندوستانی سکول اور کالج کر رہے ہیں۔ اتنا مضر کام کوئی ملک اپنی درسگاہوں سے نہیں لے رہا۔ کوئی ملک اتنا بیوقوف نہیں جو ہندوستان کی طرح بچوں اور جوانوں کی عمر کا بہترین حصہ اور اپنے قلیل سرمایہ کا کثیر جزو صرف کر کے صرف اس بات پر قانع رہے کہ اس گراں قدر ایثار سے اس کے نونہال (ماسوا چند ایک کے) دینی اور دنیوی طور پر ناکارہ ہو کر ملک کے تمدنی سماجی اور قومی افلاس میں اضافہ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اور نہ اپنی ذات کے لئے مفید ہوتے ہیں اور نہ دوسروں کے کام کے رہتے ہیں۔ اب سوا ڈیڑھ سو سال کی غلامی کے بعد جب چند ماہرین تعلیم کو یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ فرنگی تعلیم کے مفید نہ ہونے کا ایک یہ بھی باعث ہے کہ ذریعۂ تعلیم غیر ملکی زبان ہے۔ تو ان کے جہل کی یہ حالت ہے کہ وہ اس مسئلہ کا حل براہ راست سوچنے کی بجائے آڑے ترچھے طریقوں سے اپنے گنہگار ضمیر کی آواز کو خاموش کرنے کی سعی میں مصروف ہیں۔ ہم کارکنانِ جامعہ پنجاب سے پوچھتے ہیں کہ جب آپ تسلیم کرتے ہیں کہ فارسی عربی اور سنسکرت کی تدریس دیسی زبانوں میں ہونی چاہیئے۔ اور آپ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ دیسی زبانوں کو مقبول بنانے کی راہ میں یہ پہلا قدم آپ اٹھا رہے ہیں۔ تو آپ راست روی اور جرأت سے کام لیتے ہوئے تمام مضامین کی تدریس کا آغاز دیسی زبانوں میں کیوں نہیں کرتے؟ آج سے چھ سال قبل پنجاب یونیورسٹی نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ کہ میٹرک کے تمام مضامین کی تدریس ورنیکلر میں ہو گی۔ لیکن یہ فیصلہ کرنے کے بعد اور اپنی تجویز حکومت پنجاب کے پاس بھیج دینے کے بعد یونیورسٹی ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ اس وقت اور بعد کی حکومت پنجاب کو ملکی مفاد کا جس قدر خیال ہے وہ اس امر سے ظاہر ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے اس فیصلے پر حکومت نے چھ سال تک غور ہی نہ کیا۔ بلکہ

ارباب حکومت کے دل میں غور کرنے کا خیال آج تک پیدا نہیں ہوا۔ کوئی کہے ان حالات میں سکولوں اور کالجوں میں عمر ضائع کرنے والے بچوں کے لئے مستقبل میں کیا لکھا ہے! فرنگی نے اپنی مطلب براری کے لئے جو کلرک ساز نظام تعلیم ہندوستانیوں کو دیا تھا۔ اس کو بہتر بنانے کا خیال بھی اگر با اقتدار لوگوں کو آیا ہے تو وہ اتنا اخلاص اور دیانتداری اپنے اندر نہیں رکھتے کہ کھلے بندوں یہ کہہ سکیں کہ "ہندوستان میں دیسی زبانوں میں تدریس و تعلیم ہونی چاہئے" اگر حکومت پنجاب سے یہ استفسار کیا جائے کہ آپ نے جامعہ پنجاب کے فیصلہ کرنے کے بعد دیسی زبانوں کو پنجاب میں ذریعہ تعلیم مقرر کرنے کی اب تک کیوں اجازت نہیں دی۔ تو سب سے پہلا جواب آپ کو ملے گا کہ پنجاب کی دیسی زبانوں کو معین کرنا بہت دشوار ہے اور اُردو ہندی کے جھگڑے میں کون پڑے۔ ہمارے خیال میں کاروباری سستی کا بہتر مظاہرہ اس جواب کے سوا اور کسی طرح نہیں کیا جا سکتا۔ ہم کہتے ہیں اگر فی الواقع پنجاب کے مختلف فرقے ہندی اور اُردو دیسی زبانوں کو پنجاب کی درسگاہوں میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ تو حکومت اس پر کیوں معترض ہے۔ اگر ہر ایک درسگاہ میں دونوں زبانوں کی تدریس ہونی ناممکن ہے۔ تو حسب ضرورت ایک ہی زبان رہنے دیجئے لیکن کم از کم فرنگی کی زبان سے تو نجات دیجئے۔ جس کو برسوں پڑھنے کے بعد ہمارا طالب علم نہ اس زبان میں گفتگو کر سکتا ہے، نہ لکھ سکتا ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ وہ دیسی زبانوں سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔ حکومت ہندی اور اُردو کے تنازعے سے گھبرا رہی ہے۔ ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ پنجابی کو بھی پنجاب کی تدریسی زبان کی حیثیت ملنی چاہئے۔ اور تدریسی زبان کے انتخاب کا پورا حق ہر ایک درسگاہ کو ملنا چاہئے۔ تاکہ ہر ایک درسگاہ اپنے طلبا کو کم از کم ایک زبان میں لکھنا پڑھنا اور بولنا تو سکھا سکے۔ ورنہ اس وقت تو یہ حالت ہے کہ میٹرک تو ایک طرف گریجویٹ بھی کسی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کامیابی سے نہیں کر سکتے۔ یہ سچ ہے کہ پنجاب میں تینوں دیسی زبانوں کو ذریعہ تعلیم مقرر کرنے سے حکومت کو بہت سے اخراجات کا متحمل ہونا پڑے گا۔ لیکن کیا قلیل قومی سرمایہ کو محض ضائع کرنے کی بجائے یہ بہتر نہیں کہ کثیر سرمایہ صرف کر کے صحیح معنوں میں قوم کے نوجوانوں اور بچوں کی تربیت کی جائے۔ آخر جب دوسری باتوں کے لئے لاکھوں روپے چند دنوں میں جمع ہو سکتے ہیں۔ تو کیا ملک کو صحیح طریقہ پر تعلیم دینے کیلئے حکومت حریص امراء کو سری۔ خان بہادری اور رائے بہادری کا لالچ دے کر روپیہ جمع نہیں کر سکتی۔ وما علینا الا البلاغ۔"

اس مقالہ پر "ہماری زبان" کے ایڈیٹر صاحب نے جو تبصرہ کیا ہے چونکہ ہمیں اُس کے حرف حرف سے اتفاق ہے۔ اس لئے وہ بھی ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :-

"پروفیسر محمد باقر صاحب نے اس مضمون میں دیسی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے پر زور دیا ہے۔ پنجاب کی حد تک دیسی زبانوں میں اُردو، ہندی اور پنجابی زبانیں زیر بحث لائی گئی ہیں۔ جہاں تک اُردو اور ہندی کے ذریعۂ تعلیم ہونے کا تعلق ہے۔ ہم کو پورا اطمینان ہے کہ پنجاب میں وہ ہندی جسے اب ایک الگ زبان بنانے کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ کسی صورت سے ذریعۂ تعلیم نہیں بن سکتی۔ کیونکہ پنجاب کے طالب علموں کے لئے ایسی ہندی انگریزی زبان کی سی اجنبی ہوگی۔ رہی وہ ہندی جو اُردو کا جزو مشترک ہے اگر ذریعۂ تعلیم بنائی جائے تو وہ فاصلہ بہت ہی کم ہو جائیگا جو اس زمانہ میں اُردو اور ہندی کے درمیان پیدا کر دیا گیا ہے۔ اور تھوڑے ہی دن بعد ایک مشترک ذریعۂ تعلیم پیدا ہو جائے گا جسے اُردو کی ترقی یافتہ یا زیادہ عام فہم شکل کہا جائیگا۔ لیکن پنجابی کو ذریعہ تعلیم بنانے کی کوشش کیا خواہش بھی اس قابل ہے کہ فوراً اس کا ازالہ کیا جائے۔ پنجابی زبان ایک مقامی زبان ہے اور محض صوبہ پنجاب تک محدود۔ جو زبان ذریعۂ تعلیم ہو اس کا صرف اس خاص علاقے کے لئے عام فہم ہونا کافی نہیں بلکہ اس میں علم کے اظہار کی صلاحیت ہونی بھی ضروری ہے۔ ورنہ یہ صلاحیت پیدا کرنے میں اتنا عرصہ صرف ہوگا کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔ اور ابھی یہاں اصلاح زبان کی تجویزیں اور ترمیمیں ہی ہوتے رہیں گے۔ اُردو زبان میں ہندوستان کی تمام مقامی بولیوں کی بہ نسبت ذریعۂ تعلیم بننے کی صلاحیت زیادہ پیدا ہو چکی ہے۔ اور دوسری طرف اُردو زبان (اگر اس کو صرف عربی اور فارسی زبانوں کا مجموعہ نہ سمجھ لیا جائے) اس وقت ہندوستان کی عام مشترکہ زبان ہے جس کے ذریعہ شمالی ہند کے لوگ آپس میں اور جنوبی ہند والے شمالی ہند والوں سے برابر بات چیت کر سکتے ہیں۔ یہ کوئی فراست نہ ہوگی کہ ایسی عام زبان کو محض جذباتی تقاضوں کی بھینٹ چڑھا دیا جائے "۔

مولینا اظہر امرتسری

گزشتہ پرچہ میں ہم نے لکھا تھا۔ کہ مولینا اظہر امرتسری آنکھوں کی تکلیف کے باعث صاحب فراش ہیں۔ قارئین کو یہ سن کر رنج ہوگا کہ مولینا کی یہ تکلیف

بڑھ گئی اور پتلی پر ایک ورم ہوگیا۔ جو بعد کو جاکر پھٹ گیا۔ جس سے بائیں آنکھ کی بصارت بالکل جاتی رہی۔ مولینا کو میو ہسپتال میں لیجایا گیا۔ لیکن وہاں کے ڈاکٹروں نے مایوسی کا اظہار کیا۔ اسی روز خوش قسمتی سے ڈاکٹر این آر شرما موجد پرل کلورہ آئی ڈراپ سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے اپنے وسیع تجربہ کی بنا پر بہت حد تک اطمینان دلایا۔ کہ اگر ان کا باقاعدہ علاج کیا جائے تو دو چار ماہ تک بصارت عود کر آئے گی۔ چنانچہ اب ڈاکٹر صاحب موصوف مولینا کی آنکھوں کا علاج کر رہے ہیں اور یہ امر موجب مسرت ہے کہ آنکھیں روز بروز روبصحت ہیں۔ قارئین کرام مولینا کیلئے درد دل سے دعا فرمائیں ۵

حقائق و معارف

ترک اور خلافت

از مولانا اظہر امرتسری

جدید ترکیہ کی سیاست و حکومت زمانہ جدید کی اصلاح و ترقی کے مطابق ہے اور جب تک پرانے نظام کو مکمل اختیار نہ کیا جائے جدید تعمیر کے لئے گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اسلئے جو پرانی "خلافت" کی تمام روایات و رسوم ایک ایک کر کے مٹا دیں موجودہ زمانہ کا ترک اگرچہ مذہب و مشرقیت سے دور نہیں لیکن اس کی سیاسی راہ مذہب کی وادی سے نہیں گزرتی وہ ہر چیز کو قومیت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ آزادی کے اصول پر پرکھتا ہے اور سیاسی مفاد کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ یہ طرز عمل چونکہ قدیم رسم و رواج کے خلاف ہے۔ اس لئے بعض حلقے تجدید و اصلاح کو ایسی تاریکی میں دیکھتے ہیں جہاں مذہب و شریعت کی روشنی نہیں آسکتی لیکن کوتاہ نظری کے باعث اگر جلوہ پر پردہ کا گمان ہو تو یہ حسن کا قصور نہیں۔ بلکہ آنکھ کا قصور ہے

ترکیہ جدید اور تنسیخ خلافت ایک خاص سلسلہ ہے جس کے مخالف و موافق پہلوؤں پر تفصیلی بحثیں ہوتی رہی ہیں حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی مرکزیت برقرار رکھنے کے لئے ایک بین الاقوامی قوت حاکمہ کی ضرورت ہے اسی قوت کو فقیہانہ اصطلاحات میں "خلافت، امامت اور امارت کہا جاتا ہے" لیکن خلافت اگر اپنے فرائض و مقاصد کو چھوڑ کر کوئی نئی راہ اختیار کرے تو اس کا وجود مقصد خدمت کے لئے خوشگوار نہیں ہو سکتا۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ترکوں نے جس خلافت کی کشتی کو سمندر میں ڈبو دی تھی وہ واقعی خلافت تھی۔ یا ایک بدترین ملوکیت تھی جس کی موجودگی میں اسلام کے جمہوری اصول برقرار نہیں رہ سکتے تھے۔

حقیقی خلافت کی تاریخ حضرت صدیق اکبرؓ سے شروع ہوتی ہے اور حضرت امام حسنؓ کی دست برداری پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد خلافت کے تمام دور ملوکیت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ خلافت راشدہ کے بعد امویوں کی خلافت آئی لیکن اس کا سلسلہ صرف ایک "خاندان" تک ہی محدود رہا۔ امیہ کا آفتاب غروب ہوتے ہی عباسی آئے لیکن انہوں نے بھی خلافت کو ملوکانہ وراثت بنا کر چھوڑا۔ عباسیہ کے دور انحطاط میں مصر میں عبیدی یا فاطمی خلافت قائم ہوئی۔ اس کے خلفاء کا انتخاب بھی جمہوری طریق پر نہیں ہوتا رہا۔ خلافت کے سب سے آخری وارث عثمانی ترک تھے لیکن عثمان اول سے لے کر سلطان عبدالمجید تک خلافت صرف ایک ہی خاندان میں رہی۔ حالانکہ خلفائے راشدین نے خلافت کو ملوکیت کی طرح ایک ہی قبیلہ کی ملکیت نہیں بنایا۔ بلکہ خلیفہ کا انتخاب ہمیشہ نمائندگان عوام کے ذریعہ سے ہوتا رہا اموی، عباسی اور عثمانی طریق انتخاب صحیح ہوتا۔ تو حضرت صدیق اکبرؓ کی وفات کے بعد حضرت عبدالرحمٰن کو خلیفہ منتخب کیا جاتا اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ کے بعد حضرت عبداللہؓ کے سر پر دستار خلافت باندھی جاتی لیکن اس ملوکانہ رسم کی پرواہ نہیں کی گئی۔ بلکہ ایسے جمہوری طریقہ سے خلیفہ کا انتخاب عمل میں لایا گیا جو عصبیت خاندانی اور قبیلوی اثر و رعایت سے پاک تھا لیکن ترکی خلافت تو عثمانیوں ہی کیلئے مخصوص ہو چکی تھی۔ یہ تخصیص ترقی پسند ترکوں کے لئے ہمیشہ باعث تشویش رہی۔ چنانچہ انجمن اتحاد و ترقی کے سلسلے میں غازی انور پاشا اور غازی مصطفےٰ کمال پاشا کے درمیان جو اختلافات رونما ہوئے تھے۔ ان میں سے "عثمانی خلافت" کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا تھا۔ غازی انور پاشا چاہتے تھے کہ انجمن کے مقاصد میں عثمانی خلافت کا تحفظ بھی شامل ہو۔ لیکن کمال مرحوم امارت و حکومت ایک خاندان کی ملکیت نہیں بنانا چاہتے تھے ان حقائق کے پیش نظر یہی کہنا پڑتا ہے کہ کمال مرحوم نے خلافت کا خاتمہ نہیں کیا۔ بلکہ ایک جابرانہ ملوکیت کو موت کے گھاٹ اتارا جو اپنی قوت سے خلافت کی قائم مقام بن گئی تھی۔ اس کے بعد جمہوریت انگورہ نے جو فرائض انجام دئے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ صدر جمہوریہ اگرچہ خلیفہ بننے کا مدعی نہیں لیکن اس کے طریق عمل سے فرائض خلافت کی تکمیل وابستہ ہے چنانچہ سلطان عثمان اول سے لے کر سلطان عبدالمجید تک کسی خلیفہ نے اسلامیان عالم کو اتحاد و اخوت کی طرف لانے کے لئے کوئی کامیاب کوشش نہیں کی۔ حالانکہ جو خلیفہ ملت اسلامیہ کو ایک مرکز پر نہیں لا سکتا۔ اس کی خلافت صحیح معنی میں نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ خلافت کا مقصد ہی مرکزی نظام کی تکمیل ہے لیکن جمہوریت نے میثاق سعد آباد کے ذریعہ سے جلال آباد (افغانستان) کو انگورہ سے ملا دیا یہ تھا خلافت کا کام جسے جمہوریت نے پورا کر دیا۔

خلافت کی مذہبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن بدقسمتی سے یہی اہمیت ترکوں کو مبتلائے مصیبت کرنے کا باعث ہوئی اتفاق

کی عیسائی ریاستیں اس لئے ترکوں کے خلاف بغاوت کرتی رہیں کہ وہ خلافت کے باعث عیسائیت کو اسلام کا غلام بنانا چاہتے ہیں۔ یہی مذہبی عناد سیاسی اغراض سے مل کر بغاوت بن جاتا تھا۔ حکومت روس اور دوسری عیسائی حکومتوں کے سر پر جب مذہبی جنون سوار ہوتا تھا۔ تو وہ ترکی پر چڑھ دوڑتی تھیں لیکن تنسیخ خلافت کے بعد وہی روس جو تحفظ عیسائیت کے نام پر ترکی کو یورپ سے نکال دینا چاہتا تھا۔ آج عصمت انونو کی دوستی پر فخر کرتا ہے۔ وہی بلقانی ریاستیں جو ترکوں کے سر سے دستار حکومت اتارنا چاہتی تھیں مصطفےٰ کمال کو اور اس کے بعد عصمت انونو کو اپنا قائد اعظم تسلیم کرنے لگیں۔ ان حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ملوکیت جس کے چہرے پر خلافت کا غازہ تھا۔ ترکی کی سیاسی، جغرافیائی تباہی کا موجب تھی۔ علاوہ ازیں یہ اصطلاحی خلافت اتحاد اسلامی کی راہ میں بھی رکاوٹ تھی۔ شیعہ چونکہ اعتقادی طور پر خلافت کی بجائے امامت کے قائل ہیں اسلئے وہ ایسی قوت حاکمہ کی اطاعت نہیں چاہتے تھے جس کی قوت سے عقیدہ امامت کی اہمیت کم ہوتی ہو لیکن خلافت کی تنسیخ ہوتے ہی ایران کے رضا خاں نے ترکی کے مصطفےٰ کمال کی قیادت قبول کر لی۔ اس اعتبار سے عثمانی خلافت کا وجود حقیقی خلافت کے مقصد اولیں (یعنی تجدید اخوت اسلامی) کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ اور جب تک مسلمان فروعی اختلافات سے آگے نکل کر متحد نہ ہوں حقیقی خلافت کا تخیل پیدا ہی نہیں ہو سکتا

تنسیخ خلافت کے جواز پر غازی اتاترک مرحوم نے جو دلائل دیئے تھے ان میں سے یہ دلیل حد درجہ اہم ہے کہ خلافت ساری اسلامی دنیا کو آزاد کرانے کی ذمہ دار ہے لیکن کیا ترکی خلافت ہندوستان، چین، روس اور مصر کے مسلمانوں کو آزاد کرا سکتی ہے؟ اگر نہیں تو ترک وہ بوجھ کیوں قبول کریں جس کے اٹھانے کی قوت نہیں رکھتے۔ فرض کیا جائے کہ ترکوں میں ساری اسلامی دنیا کو آزاد کرانے کی قوت پیدا ہو جائے۔ اور وہ مثال کے طور پر مصر کو غیر قومی پنجہ سے چھڑا لیں لیکن کیا آزادی کے بعد مصری یہ کہنے میں حق بجانب نہیں ہوں گے کہ مصر مصریوں کے لئے ہے ترکوں کو اس پر مسلط ہونے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اس کے بعد ترکوں کی محنت و کاوش کی کیا قیمت ہو گی؟

غازی مرحوم کی یہ دلیل صرف سیاسی عذر خواہی کی مرہون منت نہیں بلکہ حقائق و واقعات پر مبنی ہے۔ خلافت کا سرچشمہ ریگستان عرب سے ابلا تھا۔ اسلئے عربوں کو سب سے بڑھ کر خلافت کا محافظ و معاون ہونا چاہیئے تھا لیکن جنگ عظیم میں جس قوم نے قصر خلافت کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی۔ وہ "ملت عربیہ" ہی تو تھی اس حرکت سے ثابت ہوتا ہے کہ ممالک اسلامی بھی عملی طور پر عثمانی خلافت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس میں نوجوان ترکوں کا قصور کیا ہے؟

سلطان عبدالعزیز سے لیکر سلطان عبدالمجید تک کسی خلیفہ نے بھی فرائض خلافت کی طرف توجہ نہیں کی۔ چنانچہ سلطان عبدالعزیز کا عزل ہی اس حقیقت کا مظہر تھا کہ خلافت اپنے فرائض سے دور جا چکی ہے اس کے بعد سلطان عبدالحمید دستوریت کے ہنگاموں میں تخت خلافت پر جلوہ گر ہوئے لیکن انہوں نے رائے عامہ کو کچلنے کے لئے جو ہتھیار استعمال کئے ان کا تصور بھی اسلام کا جمہوری عقیدہ برداشت نہیں کر سکتا عبدالحمید کے بعد وحیدالدین محمد خامس نے نہ صرف ترکان احرار کی مخالفت کی۔ بلکہ اپنے مٹھی بھر سپاہیوں کو ان کے خلاف بھڑکا دیا۔ ان متواتر و مسلسل مصیبتوں کے بعد اگر ترکان احرار خلافت سے بدظن ہو گئے۔ تو ان کا قصور ہے؟

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں

(غالب)

ان حقائق سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ نوجوان ترکوں نے خلافت منسوخ نہیں کی۔ بلکہ خلافت نے انہیں اپنی مخالفت پر آمادہ کیا اگر عثمانی ملوک اپنے طرز حکمرانی کو اسلامی جمہوریت کی روح سے محروم نہ کرتے۔ تو انہیں ۴ نومبر ۱۹۲۲ء کو وہ دلگداز ساعت دیکھنا نہ پڑتی جب خلیفہ اور خاندان خلیفہ کو جلاوطنی کی مصیبتیں جھیلنا پڑیں۔ بہرحال یہ چند سطور اُن حضرات کی غلط فہمیوں کو کم کر سکیں گی۔ جو مسئلہ خلافت کے بارے میں ترکوں کو کوستے رہتے ہیں۔

وجدانیات

کس نے شرابِ لُطف کا جام مجھے پلا دیا

از مولینا اظہر امرتسری

رابطۂ نیاز و ناز نے جھگڑا ہی سب چکا دیا
عشق نے کھینچی آہ جب حُسن نے مُسکرا دیا

عشق کے معجزات پر دنگ ہیں عقل و فلسفہ
جو نہ سمجھ میں آسکا اُس کو خدا بنا دیا

بات تھی کیا کہ جب ہمیں صحنِ چمن میں وہ ملے
پھُول کھِلا، کلی ہنسی، غنچے نے مُسکرا دیا

اُسکو خدا کے گھر میں بھی مل نہ سکی کبھی پناہ
اپنے حریمِ لُطف سے تم نے جسے اُٹھا دیا

دل کی لگی نہ بجھ سکی، دل کی تپش نہ کم ہوئی
تُو نے اگرچہ بادِ غم، دل کا دیا بُجھا دیا

حالِ دلِ ملول میں گوش گزار کر تو دُوں
اِس کا علاج کیا اگر آپ نے مُسکرا دیا

عہدِ نشاط آئیگا واقعی لیکن اے ندیم
تُو نے یہ ذکر چھیڑ کر اب تو مجھے رُلا دیا

میرے جلو میں میکدے دوڑ رہے ہیں آجکل
کِس نے شرابِ لُطف کا جام مجھے پلا دیا

ظُلم نہیں تو کیا ہے یہ اُسکو ہی خارِ غم ملے
جس نے تمھارے واسطے سارا چمن لُٹا دیا

میری ہنسی سہی وہ بھی ہیں جبیں جبیں خدائی شان
جن کی نگاہِ شوخ نے قلب کو گُدگُدا دیا

حُسنِ تغافل آشنا کچھ تو ہو لُطفِ جور بھی
تُو نے سمجھ لیا ہے کیا میں نے اِسے مٹا دیا؟

بات تھی کیا کہ کہہ اُٹھے ہم سے وہ اور اُن سے ہم
تم نے ہمیں ہنسا دیا، تم نے ہمیں رُلا دیا

اظہرِ خوش مذاق کا اسقدر احترام کیوں؟
ایک شراب نوش کو تم نے ولی بنا دیا

رانچی ..... ستمبر ۱۹۴۷ء

پالی کے مہاجن

افسانہ

از میر فیصل

"غریبوں کے مائی باپ کیا یہی آپ کا انصاف ہے؟ ذرا میری پیٹھ کو تو دیکھئے کس بے رحمی سے لاٹھیاں ماری گئی ہیں۔ ہائے عدالتوں میں انصاف نہیں سرکار! میں بہت غریب آدمی ہوں۔"

ہم دو بھائی تھے۔ دونوں ایک ہی وقت میں پیدا ہوئے تھے لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اپنے بھائی رامداس سے پورے تین سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ ہم دونوں کی شکلیں آپس میں بالکل ملتی جلتی تھیں۔ اور میں ادھیر اولیں اور جتنی بھائی اس قدر ہم شکل تھے کہ کوئی شخص بھی ہم کو اکٹھا دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ درگاداس ہے اور یہ رامداس ہے میں ایک مارواڑی مہاجن ہوں اور ایماندار آدمی ہوں جو کچھ کہہ رہا ہوں بالکل صحیح ہے جب ہم جوان ہوئے تو ہم مارواڑ سے اپنے آبائی گھر کو چھوڑ کر پنجاب چلے آئے۔ میں نے اور میرے چھوٹے بھائی رامداس نے مل کر ایشر جنگ میں دوکان کھولی لیکن رامداس چونکہ دغاباز اور جھوٹا آدمی تھا اس لئے ہمارا آپس میں نباہ نہ ہوا۔ اور ہم علیحدہ ہو گئے۔

اس کے بعد رامداس نے منٹگمری والی بڑی سڑک پر ایک دکان کھول لی اور سودخوار بنیا بن گیا۔

پھر مصیبت کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ہم نے اس جھگڑے کے بعد ایشر جنگ کے گاؤں کو آپس میں بانٹ لیا تھا۔ ایک حصہ میں میرا بھائی سود کا لین دین کرتا تھا اور ایک حصہ میں میں تھوڑا بہت کام کرتا تھا منٹگمری والی سڑک کے دہانے سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ایک زمیندار محمد شاہ نامی رہتا تھا۔ وہ نواب کا لڑکا تھا۔ اور بہت ہی بدقماش تھا ہمیشہ شراب کے نشے میں مست رہتا جب تک اس کے گھر میں عورتیں اور دعوتوں کے لئے شراب اور روپیہ موجود رہا۔ وہ بہت خرم و شاداں رہا۔

رامداس (میرے بھائی) نے بھی اس کو کچھ روپیہ سود پر دیا تھا شاید لاکھ تھا۔ یا نصف لاکھ۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں ایشر جنگ کے باشندے میرے حصہ میں تھے لیکن چونکہ یہ زیادہ خوشحال نہ تھے۔ اس لئے میں کہیں پائی کہیں دمڑی دے دے کر گذارہ چلاتا تھا۔ اس کے برخلاف رامداس کو صرف زمیندار سے پائیں باغ کے دروازے پر ایک معمولی وقفے کیلئے کھڑا رہنا پڑتا اور پھر وہ زمیندار کو روپیہ قرض دے کر اس کے کارندے سے اس کا تمسک حاصل کر لیا کرتا تھا۔

اسی سال کے موسم بہار میں رامداس نے زمیندار سے کہا کہ اب مجھے میرا روپیہ ادا کر دیا جائے لیکن زمیندار نے اسے روپیہ کی بجائے گالیاں دیں۔ رامداس تمسکات اور کاغذوں کو لے کر عدالت میں پہنچا زمیندار کے خلاف ڈگریاں ہوئیں رامداس نے کھیت کے بعد کھیت اور کنوئیں کے بعد کنواں قرق کرنا شروع کر دیا اور زمین کی کاشت کے لئے اپنے کارندوں کو مقرر کر دیا۔ اسی طرح وہ زمیندار کی زمینوں کو سمیٹتا چلا گیا حتیٰ کہ رامداس کے آدمیوں نے زمیندار کے مکان کے ارد گرد والی زمینوں پر بھی کاشت شروع کر دی۔ یہ حال دیکھ کر زمیندار بہت سٹ پٹایا اور غضبناک ہو کر رامداس کو کوسنا شروع کر دیا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

پھاگن کا مہینہ تھا۔ میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ایک چوڑیاں بنانے والے سے سود وصول کرنے جا رہا تھا۔ میرے آگے آگے میرا بھائی رامداس بھی ایک گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں جا رہا تھا لیکن جب اس نے مجھے مڑ کر دیکھا تو پھر باگیں موڑ کر ایک اونچی فصل والے کھیت میں گھس گیا۔ میری رامداس سے چونکہ بڑی دشمنی تھی۔ اس لئے میں نے کوئی پرواہ نہ کی اور آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ جب میں سنگترے کے درختوں کے قریب پہنچا۔ تو مجھے چار نقاب پوش مسلمان ملے جنہوں نے میرے گھوڑے کی باگیں روک کر کہا۔ "یہی ہے رامداس! مارو اسے" اور پھر مجھے بے تحاشہ لاٹھیوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ لاٹھیوں پر شامیں بھی چڑھی ہوئی تھیں۔ میں مارے درد کے چلا اُٹھا۔ رحم کی درخواستیں کرتا رہا مگر بے سود ثابت ہوئیں اور میں بدحواس ہو کر زمین پر آ رہا لیکن ان بے رحموں نے پھر بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ بلکہ مجھے لاٹھیاں مار مار کر کہتے "رامداس! یہ ہے تیرا سود۔ ذرا اچھی طرح سے گن گن کر وصول کرنا" میں نے زور سے چلا کر کہا۔

"ارے میں رامداس نہیں ہیں اس کا بھائی درگاداس ہوں"
لیکن اس پر انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ زور سے پیٹنا شروع کردیا۔ اور جب میں مارے ضربوں کے ادھموا سا ہوگیا۔ تو مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ ان کے چہروں کو دیکھ چکا تھا۔ ان میں الہی بخش بھی تھا۔ جو زمیندار کے سفید گھوڑے کے ہمراہ رہا کرتا تھا۔ نور علی دربان بھی تھا۔ ہٹہ کٹہ باورچی واجب علی اور عبداللطیف ہرکارہ بھی تھا ۔۔۔ اور یہ سب زمیندار کے ذاتی لوگ تھے۔ جب یہ چاروں آدمی نہتے ہوکر جائے وقوعہ سے فرار ہوگئے تو قریبی کھیت سے میرا بھائی رامداس بھی نکلا اور مجھے مردہ سمجھ کر ماتم کرنا شروع کردیا۔ میں نے اپنی آنکھیں کھولیں اور پانی لانے کا اشارہ کیا۔ پانی پلانے کے بعد میرا بھائی رامداس مجھے اپنی پشت پر اٹھا کر "الیشر جنگ" میں لے آیا۔ اسکی ہمدردی کو دیکھ کر میرا دل پسیج گیا اور میں رامداس کی ساری دشمنی بھول گیا۔ لیکن سانپ سانپ ہی ہوتا ہے اور دغاباز موت تک دغاباز ہی رہتا ہے چنانچہ میں نے بھی جو گمان اپنے بھائی پر کیا تھا وہ غلط نکلا۔ جب میں اس کے گھر میں آیا۔ تو میری حالت بہت درست ہوچکی تھی۔ میں نے اسے سارا قصہ سنا دیا اور اس نے بھی کہا کہ بے شک ان ظالموں نے اپنی سمجھ میں مجھے ہی مارا ہے لیکن عدالت کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے تم ذرا تندرست ہوجاؤ تو پھر کوئی چارہ جوئی کریں گے۔

جب ہم اپنے وطن کو چھوڑ کر پنجاب آئے تھے تو ہمارے ساتھ ہماری ایک پھوپھی بھی تھی پہلے تو وہ ہم دونوں کے ساتھ رہتی تھی لیکن بعد میں ہم دونوں بھائیوں کی علیحدگی کے بعد رامداس کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ پھوپھی چونکہ کچھ علاج معالجہ بھی جانتی تھی۔ اسلئے رامداس نے مجھے اس کے سپرد کردیا۔ دوسرے دن مجھے بخار کی شکایت بھی ہوگئی۔ لیکن میں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اور اپنے مقدمے کی تیاری میں سوچنا شروع کردیا۔ "الیشر جنگ" کے تمام باشندے اگرچہ بظاہر گھگھے معلوم ہوتے تھے لیکن شہادت دینے کے حق میں نہایت چست و چالاک تھے اور بڑے بڑے وکیلوں کے بھی کان کتر کر رکھ دیا کرتے تھے۔ میں نے سوچا کہ میں جھوٹے گواہوں کی ایک بڑی جماعت روپے کے زور سے بنالوں گا۔ اور ان میں سے ہر ایک آدمی میری جانب سے یہ گواہی دے گا۔ کہ زمیندار نے ہمارے سامنے اپنے ان چار نوکروں کو حکم دیا تھا۔ کہ درگاداس کو مارو اور انہوں نے درگاداس کو مارنا شروع کردیا۔ پھر مارنے کے بعد ان بدمعاشوں نے درگاداس کی جیب سے دو سو روپے نکال لئے۔ اس روپے کے ثبوت کے لئے میرا خیال تھا کہ میں جوڑیاں بنانے والے کو اپنے سو دو روپے میں سے کچھ روپیہ چھوڑ دوں گا۔ اور وہ یہ کہے گا کہ میں نے اسے اپنے قرض کا ۲۰۰ روپیہ دیا تھا۔ اور جب یہ روپیہ لے کر میرے گھر سے گیا تھا تو زمیندار نے راستے میں اسے مار کر یہ روپے چھین لئے تھے۔

میں نے یہ تمام تجویز اپنے بھائی رامداس کو بتائی۔ اس نے بھی اگرچہ بہت پسند کی لیکن کہا کہ بیماری کے بعد دیکھا جائے گا فی الحال تم مجھے گواہوں کے نام لکھوا دو۔ چنانچہ میں نے تمام نام جو میرے ذہن میں تھے۔ لکھوا دیے۔

بخار تو مجھے پہلے ہی سے تھا لیکن ایک دن میرے جوڑ جوڑ میں درد ہونا شروع ہوگیا اور میری حالت نہایت تشویشناک ہوگئی اور میں سمجھا کہ اب میرا آخری وقت آپہنچا ہے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب شرارت میری پھوپھی کی تھی کیونکہ وہ مجھے ایسی دوا کھلاتی تھی جس سے میری حالت سدھرنے کے بجائے اور بھی خراب تر ہوتی چلی جارہی تھی ایک دن رامداس نے مجھے کہا کہ تمہارا گھر سونا پڑا ہوا ہے۔ اسلئے مجھے ڈر ہے کہ کہیں چوری نہ ہوجائے اس لئے بہتر یہ ہے کہ تم مجھے چابیاں دو تاکہ میں تمہارا تمام سامان یہاں لے آؤں۔ میں نے چابیاں دے دیں۔ اور رامداس نے میری تمام حساب کی کتابیں اور روپیہ جو میں نے زمین میں دفنایا ہوا تھا لے آیا اور مجھے دے دیا۔

معلوم نہیں اس واقعہ پر کتنے دن گزر چکے تھے۔ کیونکہ میری حالت روز بروز خراب ہوتی چلی جارہی تھی۔ میں نے ایک رات کو اپنے مقدمے کی مفصل کارروائی رامداس کو سمجھا دی اور اپنی تمام تجویزیں اسکے سامنے رکھ دیں۔ اس نے میری باتوں کو سن کر بے پروائی سے کہا کہ میں نے گواہوں کے ساتھ سودا طے کرلیا ہے۔ میری حالت چونکہ اچھی نہ تھی۔ اس لئے مجھے کئی دنوں تک ہوش نہ رہا۔ ایک دن جب طبیعت قدرے ٹھیک ہوئی تو میں نے رامداس کو گھر میں نہ پاکر اپنی پھوپھی سے اس کے بارے میں دریافت کیا اس نے جواب دیا کہ کسی مقدمہ کی پیروی کے لئے منٹگمری گیا ہوا ہے۔ اور پھر اس نے مجھے ایک دوائی پلا کر آرام کرنے کے لئے کہا۔ اس دوائی سے مجھ پر غنودگی سی طاری ہوگئی اور نہ معلوم میں کتنا عرصہ اس بیہوشی میں اپنی چارپائی پر پڑا رہا۔ البتہ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے تمام گھر میں خاموشی مسلط پائی۔ میں بہت گھبرایا اور پھوپھی کو آوازیں دیں مگر پھوپھی کا جواب نہ ملا۔ میں یہ حال دیکھ کر سمجھ گیا کہ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ اس لئے ایک لاٹھی کے سہارے آہستہ آہستہ گھبراہٹ کے عالم میں باہر آیا۔ کنوئیں کے قریب والے چورستے پر انیس

اور جوہر سنگھ بڑھئی کو بلایا۔ اس بڑھئی کا نام میں نے اپنے مقدمے کے گواہوں میں سب سے پہلے لکھا ہوا تھا چنانچہ جب جوہر سنگھ آیا تو میں نے اسے کہا

"سب کچھ اچھی طرح سے سمجھ بوجھ لیا ہے نہ؟ معلوم ہے تمہیں عدالت میں کیسی گواہی دینی پڑے گی؟"

جوہر سنگھ نے جواب دیا۔

"ارے۔ درگا داس یہ کیا بات ہے؟ تم کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے کہا

"بستر پر سے اٹھ کر آیا ہوں بھائی۔ زمیندار کے آدمیوں کی مار پیٹ کی وجہ سے کئی دن چارپائی سے اٹھنے کی ہمت نہیں پڑی۔ ہاں اگر رامداس کہاں ہے؟ اسے تو چاہئے تھا کہ گواہوں کا انتظام کرتا۔ کیا تمہیں بھی ان باتوں کا علم ہے؟"

جوہر سنگھ نے حیران و ششدر ہو کر کہا۔

"جھوٹے! مکار کہیں کے! تجھے بھلا اس مقدمے سے کیا غرض ہے میں تو گواہی دے بھی چکا ہوں۔ عدالت نے رامداس کے حق میں فیصلہ بھی کر دیا ہے اور رامداس کو زمیندار سے ایک ہزار روپیہ بھی مل چکا ہے پانسو تو زدوکوب کرنے کے عوض میں اور پانسو روپیہ وہ جو زمیندار کے حکم سے اُس کے آدمیوں نے رامداس سے چھین لیا تھا۔"

یہ خبر سن کر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور میں درد و کرب کی حالت میں غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے شہتوت کے درخت کے قریب آہستہ آہستہ پہنچا اور میں نے جوہر سنگھ سے کہا۔

"یہ سب بچوں کی باتیں ہیں۔ جوہر سنگھ کسی اور کو جا کر سمجھاؤ۔ زمیندار نے پیٹا تو مجھے تھا۔ رامداس اس سے کیسے روپیہ وصول کر سکتا ہے مجھے تو ابھی مقدمہ کے لئے گواہوں کو تیار کرنا ہے۔ اور اسی غرض کے لئے یہاں آیا ہوں اچھا یہ تو بتاؤ کہ میرا بھائی رامداس کہاں ہے؟"

یہ سُن کر جوہر سنگھ نے سر ہلایا۔ اور قریب سے ایک عورت بولی

"ارے بیٹے یہ کیا جھوٹ بول رہا ہے۔ کہ زمیندار نے تجھے پیٹا تھا۔ آخر اسے تجھ سے کیا بیر تھا۔"

میں نے دوبارہ آنسو بسورتے ہوئے کہا۔

"مجھے قسم ہے گنو ماتا کی مجھے قسم ہے مہا دیو کی صرف مجھے ہی زمیندار نے پیٹا تھا اور میں ہی اس کی مار سے اس حالت کو پہنچا ہوں اے جنگ کے رہنے والو تم خدا لگتی بات کہو میں گواہوں کو روپیہ بھی دوں گا۔"

یہ کہہ کر میں وہیں کا وہیں مارے درد کے لاٹھی کے سہارے ڈگمگا تا رہا لیکن رام نرائن نے جو شہتوت کے درخت تلے بیٹھا گاؤں والوں کی چٹھیاں لکھا کرتا تھا۔ میرے قریب آ کر کہا

"اس واقعہ کو آج پورے چودہ دن ہو چکے ہیں اور گذشتہ چھ دنوں کے اندر اندر اس کا فیصلہ بھی ہو چکا ہے عدالت نے تمہارے بھائی کے حق میں فیصلہ کیا ہے اور ایک ہزار روپیہ اسے زمیندار سے دلوایا ہے۔ میں بھی اس مقدمے میں بطور گواہ حاضر ہوا تھا عدالت کے کمرے میں دو مرتبہ رامداس مارے زخموں کی تکلیف کے بے ہوش ہوا تھا درگا داس! اب تم یہ بے معنی شور کیوں مچا رہے ہو کیا تمہارے خیال میں یہ صحیح نہیں کہ رامداس زمیندار کے آدمیوں سے پٹیا تھا؟"

اور پھر جوہر سنگھ نے بھی رام نرائن کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا

"بالکل ٹھیک کہتے ہو تم رام نرائن! میں بھی تو وہیں تھا!"

رام نرائن نے پھر اپنے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا

"اس فیصلہ کی وجہ سے زمیندار کو بہت شرمندگی اٹھانی پڑی ہے اور زمیندار کے غصہ اور انتقام کے ڈر سے رامداس اور اس کے گھر والے فرار ہو کر اپنے وطن چلے گئے ہیں رامداس نے تمہیں کہا تھا کہ تم اس سے پہلے ہی فرار ہو چکے ہو اور اب تمہاری آپس کی ناچاقی نہیں رہی۔ اور تمہارا بھی یہی خیال ہے کہ اپنے وطن میں جا کر دکان کھول لیں گے۔ ہاں اور سنو بھلا دا کہا اب تمہارے لئے بھی یہی بہتر ہے کہ تم بھی فرار ہو جاؤ۔ کیونکہ زمیندار قسم کھا چکا ہے اگر اس نے تمہارے تمام کنبے کے کسی ایک فرد کو بھی دیکھ لیا۔ تو اس کے پاؤں رسے سے باندھ کر چھت سے الٹا لٹکا دے گا اور اتنا مار یگا کہ کانوں سے بھی خون بہہ نکلے میں نے جو کچھ کہا ہے اسے یقین جانو! اور یہاں سے رفو چکر ہو جاؤ۔ ورنہ پھر تمہاری بھی خیریت نہیں اگر میری باتوں پر یقین نہ آئے تو دوسرے آدمیوں سے پوچھ لو۔"

میں نے یاس انگیز لہجے میں کہا

"کیا روپیہ پانسو ہی تھا؟"

یہ سن کر کرپا رام جاٹ بولا

"ہاں! ہاں!! پانسو ہی تو تھا۔ میں نے بھی تو اس مقدمہ میں گواہی دی تھی۔"

میں نے یہ الفاظ سن کر بے اختیار ہو کر رونا شروع کر دیا اور اپنے بھائی کی چالاکی پر بڑا حیران ہوا۔ لیکن دفعتاً میرے دل میں ایک نیا خدشہ پیدا ہوا۔ اور میں تیزی سے دوڑتا ہوا رامداس کے مکان پر پہنچا وہاں جا کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ میری تمام کتابیں جو لکڑی کے صندوق میں رکھی ہوئی تھیں غائب ہیں۔ پھر میں جب وہاں سے اپنے گھر پریشان و بدحال ہو کر گیا۔ تو آناج سے بھری ہوئی ٹوکروں میں اب سوائے چوہوں کے

اور کچھ نہ تھا اور رام داس سب کچھ لے کر چلتا بنا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔ اور میں اسی غم میں اپنے کپڑوں کو پھاڑتا ہوا پھر کنوئیں کی جانب چل پڑا اور انتہائی غم و ملال کی حالت میں اپنی کتابوں روپے اور اناج کی گمشدگی اور چوری کا اعلان کرتے ہوئے چلا چلا کر کہا۔

"دہائی ہے سرکار کی دہائی ہے بڑے لاٹ صاحب کی۔ میں دن دہاڑے ہی لٹ گیا ہوں۔ میرے بھائی رام داس نے میرا کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ خدا غارت کرے اس دغا باز اور ڈاکو کو۔"

یہ کہتے ہوئے میں کنوئیں کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ لوگوں نے جب دیکھا کہ اب میں کنوئیں میں بالکل کودنے ہی والا ہوں تو پھر انہیں میری باتوں کا یقین آیا۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ میرے تمام بدن پر ابھی تک ضربوں کے نشان بھی تھے۔

جیہر سنگھ بڑھئی اس وقت میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے اپنے مضبوط ہاتھ سے میرے جسم کو چھیر کر ضربوں کو دیکھا۔ اور پھر کنوئیں کی مینڈ پر جھک کر ایک ایسا قہقہہ لگایا جس نے زمین کے ساتوں طبق ہلا دئے۔ اور پھر ہنستے ہوئے کہا۔

"لوگو! گیدڑوں کی آپس میں لڑائی ہوئی ہے اور ایک گیدڑ بھاگ گیا ہے۔ پٹیا تو بے چارا درگا داس تھا لیکن مقدمہ کا روپیہ رام داس لے کر فرار ہو گیا۔ درگا داس کی تمام کتابیں اور کھاتے اب گم ہو چکے ہیں لہذا اب درگا داس کے مقروضو! تمہیں اچھی طرح سے معلوم ہو جانا چاہئے کہ درگا داس کے کھاتے جل چکے ہیں۔"

یہ خبر بجلی کی طرح تمام الیشر جنگ میں پھیل گئی اور افسوس بہی کھاتے ضائع ہونے کا انکشاف خود میں نے ہی کیا تھا۔ اور میرے سودی روپیہ کے واپس ملنے کی اب کوئی بھی امید نہ تھی۔ لوگ اب مجھے لاٹھیوں سے دھکا دیتے مجھ پر گوبر پھینکتے اور گالیاں دیتے تھے۔ الغرض میری عجیب حالت تھی۔ ایک شہر مجھے اپنا تماشہ بنائے ہوئے تھا۔ اور میں تھا کہ بار بار رحم کی درخواستوں پہ درخواستیں کئے جا رہا تھا

بالآخر رام نرائن خط نویس نے لوگوں کو ان حرکتوں سے منع کیا اور کہا کہ مجھے یہ ڈر ہے کہ اس واقعہ کی خبر کہیں منٹگمری نہ پہنچ جائے اور پھر پولیس تفتیش کے لئے یہاں نہ چلی آئے۔

پھر اس نے باتوں ہی باتوں میں مجھے بھی بہت کوسا اور جی کھول کر واہیات باتیں سنائیں اور اخیر میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا

"درگا داس اگرچہ بھوری بھینس کے معاملے میں تم نے میرے بھانجے کے ساتھ بہت بے رحمی کی تھی لیکن خیر میں اب تم پر ایک مہربانی کئے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے آدمیوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"ارے! کیا کسی آدمی کے پاس کوئی ناکارہ ٹٹو ہے۔ تاکہ یہ بنیا اپنی جان بچا کر فرار ہو سکے۔ کیونکہ اگر زمیندار کو اس کا پتہ مل گیا تو پھر اسے قتل کر کے ہی دم لے گا۔ اور پولیس کی آمد کی وجہ سے سارے گاؤں کو الگ مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

کرپا رام جاٹ بولا ۔۔

"ہاں! ہاں!! میرے پاس ایک مریل سا ٹٹو ہے۔ لیکن اگر اس کی پیٹھ پر متواتر لاٹھیاں برسائی جائیں تو وہ زیادہ سے زیادہ دو میل تک چل سکتا ہے۔ لیکن ڈر یہ ہے کہ جب وہ راستے میں مرے گا تو اس کی کھال کون اتارے گا۔"

چھمو چمار بولا ۔۔

"ارے بھائی! میں اس کی کھال کے تین آنے دے سکتا ہوں اور میں ٹٹو کے مرنے تک درگا داس کے ساتھ ساتھ جاؤں گا۔ لیکن ایک شرط یہ ہے کہ اگر یہ ٹٹو دو میل کے اندر اندر نہ مرا۔ تو پھر میں اس کی کھال کے صرف دو آنے ہی دوں گا۔"

کرپا رام نے کہا۔

"اچھا بابا یوں ہی سہی۔"

آدمی ٹٹو کو لے آئے اور ادھر میں نے کنوئیں سے پانی نکال کر پینے کی اجازت چاہی۔ کیونکہ میرا حلق مارے خوف و پریشانی کے خشک ہو چکا تھا۔ جب میں پانی پی کر فارغ ہوا تو رام نرائن نے پھر مجھے مخاطب کر کے کہا

"درگا داس یہ لو چار آنے۔ چونکہ بھگوان نے تمہیں بہت ہی غریب کر دیا ہے۔ لہذا میں تمہیں بغیر سفر خرچ کے باہر نہ جانے دوں گا اور اگرچہ تم نے میرے بھانجے کے ساتھ بھوری بھینس کے معاملے میں جو سلوک کیا ہے۔ وہ میرے دل سے ابھی تک نہیں بھولا لیکن خیر میں تم سے ایسا سلوک نہیں کرتا۔ . . . . . اور ہاں ذرا خیال رکھنا کہ ٹٹو کی لگام بھی ساتھ ہی لے کر چمپت نہ ہو جانا یہ لگام میری ہے۔

چنانچہ میں اس بے آبروئی کے ساتھ لوگوں کے قہقہوں کے درمیان الیشر جنگ سے رخصت ہوا۔ ٹٹو نے حسب توقع راستے میں ہی دم توڑ دیا۔ اور میں وہاں سے سر پہ پاؤں رکھ کر زمیندار کے ڈر

سے بھاگا۔ اور پھر بھاگتے بھاگتے اس جگہ پہنچا ہوں

میں گنگا کی اور تمام ان چیزوں کی جو ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے نزدیک مقدس ہیں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ زمیندار کے آدمیوں سے میرا بھائی۔ اماس نہیں بلکہ میں ہی پٹا تھا۔

سرکار! عدالت کے دروازے اب میرے لئے بند ہو چکے ہیں اور خدا معلوم "سٹنٹ صاحب" اب کہاں چلا گیا ہے۔ ہائے افسوس میرا کوئی گواہ نہیں۔ اور میرے زخم بھی اب ٹھیک ہونے والے ہیں

صاحب بہادر! آپ صاف صاف ڈپٹی صاحب کو لکھ دیں کہ وہ میرے زخم دیکھ سکتے ہیں۔ زمیندار کے آدمیوں سے میں ہی پٹا تھا۔ میرا بھائی نہیں۔

اور ہاں! ان سب باتوں کے علاوہ یہ بھی کھول کر لکھ دیں کہ "پاپی گاؤں کے راجن پورن داس کا بیٹا اور میرا بھائی رام داس سور، چور، جھوٹ، چھپا کرنے اور گوشت کھانے والا بے ایمان انسان ہے۔"

آزاد ترجمہ

غمِ وفا

از حضرت عاصم

جز ماجرائے شوق ہمارا بیاں نہیں
اک آہ نا تمام ہے منہ میں زباں نہیں

کنجِ قفس میں بارشِ گُل رائگاں نہیں
لیکن وہ عیشِ خار و خسِ آشیاں نہیں

اللہ دل ہی دل میں امنگوں کو کیا ہوا
بانگِ جرس تو ہے اثرِ کارواں نہیں

کیا دیکھتے ہو اپنی طرف مجھ کو دیکھ کر
گرتی ہیں جو ادھر وہ اُدھر بجلیاں نہیں

کیونکر چھپاؤں دل میں نگاہوں کا اضطراب
آخر نظر کی چوٹ ہے وہم و گماں نہیں

افشائے رازِ عشق کا دھڑکا ہے دل تمام
کیا پوچھتے ہو درد کہاں ہے کہاں نہیں

آخر بھرم ہے جُرأتِ ذوقِ نگاہ کا
وہ اس طرح نہاں رہے گویا نہاں نہیں

ناکام آرزو ہوں میری بے کسی نہ پوچھ
اب دل کی دھڑکنوں میں بھی سوزیاں نہیں

عاصم غمِ وفا کی امانت ہے زندگی
وہ سانس رائگاں ہے جو صرفِ فغاں نہیں

عہدِ فاروقی کا نظام تعلیم

تحقیقی مقالہ

از جناب حافظ سید رشید احمد ارشد فاضل السنہ شرقیہ

یہ امر تعجب خیز ہے کہ حضرت عمر فاروق نے اپنے زمانہ میں ذرائع آمد و رفت کی دشواریوں، قوموں کی بیحد جہالت، طباعت اور کتابت کا انتظام نہ ہونے کے باوجود ایک ایسا وسیع نظام قائم کر لیا تھا جو موجودہ زمانہ میں بھی مذکورہ بالا سہولتوں کے باوجود مشکل نظر آتا ہے۔ آپ نے نہ صرف بچوں کے لیے مکاتب قائم کئے تھے۔ بلکہ بالغوں کی تعلیم کا بھی مناسب بندوبست کر رکھا تھا۔

لازمی تعلیم کا انتظام

اس تعلیم میں قرآن کریم کی تعلیم کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم دینی اور دنیاوی ترقیوں کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی اور اس کی تعلیم کے بعد وہ دیگر علوم سے بے نیاز ہو جاتے تھے۔ اس بنا پر اسلامی تعلیم ہر مسلمان کیلئے لازمی تھی اور اسی تعلیم میں انہیں نوشت و خواند جسمانی اور فوجی تعلیم بھی حاصل ہو جاتی تھی خانہ بدوش بدو بھی تعلیم حاصل کرنے سے مستثنیٰ نہ تھے۔ مگر چونکہ اس قسم کے لوگوں کو جن کی مستقل بود و باش نہ ہو تعلیم دینا اور ان کی تعلیمی قابلیت کو جانچنا بڑا مشکل کام تھا۔ اس بنا پر فاروق اعظم نے مناسب انتظام سے ان مشکلات کو رفع کیا۔ انہوں نے بدوؤں اور اعرابیوں کی تعلیم کو جانچنے اور ان کا امتحان لینے کے لئے چند تعلیمی انسپکٹر مقرر کر رکھے تھے جو ابوسفیان نامی ایک شخص کی زیر سرکردگی ان خانہ بدوش قبائل میں گشت لگا کر ان لوگوں کا امتحان لیتے تھے اور انہیں خلافت فاروقی کی طرف سے یہ اختیارات بھی حاصل تھے کہ جس شخص کو قرآن کریم کا کوئی حصہ یاد نہ ہو یا وہ تعلیم حاصل کرنے سے پہلو تہی کرتے ہوں تو انہیں مناسب سزا دیں۔

نصاب تعلیم

بچوں کے مکاتب میں قرآن کریم کی تعلیم کے ساتھ نوشت و خواند کی تعلیم بھی دی جاتی تھی یعنی لکھنا اور عربی ادب و زبان کی تعلیم بھی لازمی

لیکن ان مکاتب میں صرف قرآن کریم کی عبارت پڑھانی تعلیم کا مقصد نہ تھا۔ بلکہ قرآن مجید کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی قوانین و احکام کی تعلیم بھی دی جاتی تھی بعض دفعہ فقہ اور اسلامی مسائل کی تعلیم کے لیے الگ الگ معلم مقرر ہوتے تھے اور قرآن کریم کی تعلیم القراءت کے لئے جداگانہ معلمین ہوتے تھے لیکن وہ جلیل القدر صحابہ جو قرآن کریم حدیث اور فقہ تینوں کے ماہر ہوتے تھے۔ ہر قسم کی اسلامی تعلیم دے سکتے تھے حضرت ابوالدرداء مشہور صحابی اسی قسم کے معلم تھے۔ اور ان کا حلقۂ درس جامع مسجد دمشق میں بہت وسیع تھا۔

معلم کے اوصاف

چھوٹے چھوٹے بچوں کے معلمین کے انتخاب میں کافی جدوجہد کی جاتی تھی اور وہ خوش الحان قاری اور حافظ ہونے کے علاوہ لغت اور زبان عربی کے جید عالم ہوتے تھے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ نے یہ حکم صادر فرما رکھا تھا۔ کہ جو کوئی زبان عربی کا عالم نہ ہو۔ قرآن کریم کی تعلیم دینے کا اہل نہیں بن سکتا۔

چھوٹے بچوں کے مکاتب میں تعلیم دینے والے اساتذہ کی تنخواہیں پندرہ پندرہ درہم ہوتی تھیں۔ اس سے پیشتر مسلمان معلم تعلیم کی اجرت نہیں لیتے تھے۔ اور مفت پڑھایا کرتے تھے لیکن حضرت عمر فاروق کو چونکہ باقاعدہ وسیع نظام تعلیم ہر قریہ و قصبہ اور شہر میں قائم کرنا مقصود تھا۔ اس لئے جب تک کثیر تعداد معلموں کو محض اس کام کے لئے اجرت نہ دی جاتی اس وقت تک یہ سلسلہ قائم نہیں ہو سکتا تھا۔

فوجیوں کی تعلیم

حضرت عمر تعلیم میں اس قدر اہتمام فرماتے تھے کہ وہ اپنے گورنروں اور عمال کے نام جو احکام نافذ فرماتے تھے ان میں تعلیم قرآن کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا۔ چونکہ فوجیوں کے لئے بھی تعلیم قرآن [illegible] مقام

ہر ایک باقاعدہ رجسٹر ہوتا تھا جس میں ان کی تعلیمی ترقی کی کیفیت مندرج ہوتی تھی۔ ان میں تعلیم کا مزید شوق پیدا کرنے کیلئے تعلیمی ترقی پر انہیں وظائف بھی دئے جاتے تھے۔ اس قسم کے رجسٹروں کو خلیفۂ اعظم وقتاً فوقتاً دربار خلافت میں طلب فرماتے تھے تاکہ ان کی تعلیمی ترقی کا اندازہ ہو سکے۔ اس نگرانی سے اہل فوج میں قرآن کی تعلیم اس قدر عام ہو گئی کہ نہ صرف ناظرہ خوانوں کی تعداد بڑھ گئی کہ اس کا کوئی شمار نہ تھا بلکہ حافظوں کی تعداد میں بھی اس قدر اضافہ ہوا کہ عراق کے سپہ سالار حضرت سعد بن وقاص کے لشکر میں جبکہ حضرت عمرؓ کی خلافت کا ابھی آغاز تھا تین سو حافظ ہو گئے تھے۔

ان حافظوں کو حضرت عمرؓ طلب فرما کر مختلف دیہاتی اور قصباتی علاقوں میں تعلیم قرآن کے واسطے بھیجا کرتے تھے، اور جس قدر تعلیم عام ہوتی گئی اسی قدر قابل معلم اور استاد دور دراز علاقوں میں نومسلموں کو تعلیم دینے کے لئے بھیجے جانے لگے۔

قابل معلمین اسلام

تعلیمی کاموں میں لائق اور فاضل اساتذہ کا انتخاب فاروق اعظم کی اہم خصوصیت تھی۔ تعلیم دینے کا پیشہ محض پیشہ ور معلموں کیلئے مخصوص نہ تھا۔ بلکہ اسلام کے فوجی جرنیل سپہ سالار اور گورنر بھی معلم کے فرائض انجام دیتے تھے بلکہ یوں کہئے کہ اسلام کا ہر آدمی سپاہی بھی تھا اور معلم و مبلغ بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عہد فاروقی کے قابل معلمین کی فہرست میں ان لوگوں کے اسماء گرامی بھی نظر آتے ہیں جنہوں نے ساری عمر جنگوں میں گزاری اور بقول اقبال مرحوم تیغوں کے سایہ میں پل کر جواں ہوئے ہیں

شام کے تعلیمی افسر

فاروق اعظم کے حکم سے مندرجہ ذیل جلیل القدر بزرگ ہستیوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ اور انہیں حکم دیا گیا کہ وہ شام کے مختلف علاقوں میں اپنے تعلیمی مرکز قائم کریں وہ اصحاب یہ تھے۔ حضرت معاذ بن جبل حضرت عبادہ بن صامت اور حضرت ابوالدرداء یہ تینوں حضرات سب سے پہلے حمص پہنچے اور وہاں اسلامی تعلیمات کی بیخ و بن کو مستحکم کیا جب یہ تعلیمی مرکز مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گیا تو اس مرکز کے نگران عبادہ بن صامت مقرر ہوئے اور حضرت معاذ بن جبل جو ایک دفعہ شام کے لشکر اسلامی کے کمانڈر انچیف اور حاکم اعلیٰ بھی مقرر ہوئے تھے فلسطین کی سرزمین کے تعلیمی مرکز کے نگران ہو گئے۔ عہد رسالت کے مشہور قاری اور زبردست محدث حضرت ابوالدرداءؓ شام کے پایۂ تخت دمشق میں تعلیمات کے معلم اعلیٰ منتخب ہوئے اور آپ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخر زمانے تک نوجوانان اسلام کو اپنے حلقۂ درس سے مستفید فرماتے رہے۔

طریقۂ تعلیم

حضرت ابوالدرداءؓ کا طریقۂ تعلیم یہ تھا کہ آپ نماز فجر کے بعد ہی درس قرآن کا سلسلہ شروع کر دیتے تھے۔ چونکہ طلبا کی تعداد بہت زیادہ تھی اسلئے آپ نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ دس دس مبتدی طالب علموں کی ایک جماعت کے لئے منتہی اور فارغ التحصیل طالبعلموں میں سے ایک مانیٹر مقرر کر رکھا تھا اور بذات خود سب جماعتوں کی اس طرح نگرانی فرماتے تھے کہ ٹہلتے جاتے تھے اور پڑھنے والوں پر کان لگائے رکھتے تھے تاکہ درس و تدریس کا سلسلہ باقاعدہ اور صحیح طریقہ سے انجام پذیر ہوتا رہے جب کوئی طالب علم پورا قرآن شریف یاد کر لیتا تھا تو وہ خاص حضرت ابوالدرداءؓ کی شاگردی میں آ جاتا تھا اور اسے باقیماندہ مزید تعلیم دی جاتی تھی آپ کا حلقۂ درس اس قدر وسیع تھا کہ جب ایک دن آپ نے طالب علموں کا شمار کرایا تو معلوم ہوا کہ صرف آپ کے حلقۂ درس میں سولہ سو طالب علم تعلیم پا رہے تھے

دوسرا طریقۂ تعلیم

یہ طریقۂ تعلیم قرآن کے لئے تھا مگر اسلامی تعلیمات اور قوانین فقہیہ کی تعلیم کا طریقہ جدا تھا۔ ان فقہائے اسلام کے حلقۂ درس میں لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ بعض تین صحابیوں کو بیک وقت تعلیمی خدمت سرانجام دینی پڑتی تھی۔ تعلیم فقہ کا تعلق صرف نوعمر طلبہ اور دیگر شائقین علم کے ساتھ نہ تھا۔ بلکہ عوام الناس بھی ان مجالس میں شریک ہوتے تھے اسلئے یہاں کتابی طریقۂ تعلیم اختیار نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ایسی مجالس میں فقہائے اسلام کے گرد شائقین علم دائرہ میں مجتمع ہو کر بیٹھ جاتے تھے اور ہر شخص کو اپنے حالات کے مطابق سوالات کرنے کا موقع دیا جاتا تھا چنانچہ ہر ایک باری باری اسلامی مسائل دریافت کرتا تھا اور فقہائے اسلام دلنشین پیرائے میں نہایت شافی اور تسلی بخش جوابات دیتے تھے اسطرح ہر شخص کو اپنی معلومات بڑھانے مختلف سوالات کے جوابات سے فائدہ اٹھانے اور اپنے شکوک رفع کرنے کا موقع ملتا تھا۔ یہی وہ طریقہ ہے جسے آج کل کے ماہرین تعلیم بھی بہت پسند کرتے ہیں اسطرح سے طالبان علم میں علمی تحقیق و تجسس کا مادہ پیدا ہوتا ہے جو آگے چل کر کائنات عالم کے سربستہ راز منکشف کر دیتا ہے اور اسی تحقیقی جذبہ سے بعد کے زمانے میں مسلمانوں میں فلسفہ اور سائنس کا شوق پیدا ہوا اور وہ دنیا کے موجودہ علوم و فنون کے بانی ہوئے۔

اقدامِ محبت

زعیم

از حضرت فطرت واسطی بی۔ اے

عارضِ پُر نُور سے، پردا اُٹھا کر دیکھ لو!
منہ چھپائیں گے ستارے، منہ دکھا کر دیکھ لو!
چاند بھی پھیکا پڑیگا جگمگا کر دیکھ لو!

دیکھنے والے تمہارے کھو نہ جائیں تو سہی
دونوں عالم غرقِ حیرت ہو نہ جائیں تو سہی

نرگسوں میں بادۂ جذبات بھر کے دیکھ لو!
شانۂ رومان زلفوں میں بھی کر کے دیکھ لو!
جیسے میں کہتا ہوں ویسے بھی سنور کے دیکھ لو!

حسن سے زیادہ حسیں تم ہو نہ جاؤ تو سہی
بے محابا عشق سے آنکھیں ملاؤ تو سہی

مسکرا کر، کفر کا رُخ سوئے ایماں موڑ دو!
آج زنجیرِ حیا دستِ وفا سے توڑ دو!
کیا کہیں گے لوگ تم کو یہ انہیں پر چھوڑ دو!

میں کہ قدموں پر تمہارے سر جھکاؤں تو سہی
عشق میں اپنا خدا تم کو بناؤں تو سہی

"مکتی"

مترجمہ:- جناب بدر ہاشمی

سنسان گھر کا دیا بجھ چکا تھا
مسافر اپنے لمبے سفر سے لوٹ آیا
اس نے دروازہ کھولا —— اور
اندھیرے میں اپنا بوجھ اس کے سینے پر
پھینک دیا
وہ سو رہی تھی —— بے خبر
اس نے خواب دیکھا۔ رات کے خاموش
لمحوں میں
"یہ اس کی قسمت کا خواب تھا — بھیانک
اور پُر درد
اس کی قسمت کا سورج ڈوب چکا تھا
زندگی کی مسرتیں چھن چکی تھیں"
صبح ہوئی۔
اس کی نیم کی ماتی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی
کیونکہ اس نے فضا میں اڑتی ہوئی ڈاکوؤں
کی آواز سُنی تھی
"رحم کر! رحم کر! اے مسافر
تُو نے بیداری کے نزع میں میری مدد کی
مجھے زندگی کی بندشوں سے آزاد کر دے
میرے رفیق! مجھے بھی اپنے ساتھ
اسی دیس میں لے چل"

(ٹیگور)

"آزادی"

آزادی —— غلاموں کیلئے سکون
کا ایک مبہم لفظ
ایک موہوم تمنّا
جانبازوں کے لئے مشعلِ راہ
پیامِ عمل
وطن پرستوں کے لئے ——
صدائے جرس
"آگے بڑھو۔ بڑھے چلو"
بزدلوں کے لئے ——
دیو عفریت
قوم فروشوں کے لئے ——
پیٹ کا ذریعہ
سفید پوشی کا ڈھونگ
ذہنیت کی پستی

(ہندی)

فریادِ محبت

از حضرت شعلہ وارثی لکھنوی

ہم نے ہر دردکو اپنا ہی بنا رکھا ہے
یعنی ہر تیر کو سینے سے لگا رکھا ہے

خلشِ درد نے دیوانہ بنا رکھا ہے
تم نہیں پاس تو اس زیست میں کیا رکھا ہے

التفاتِ آپ کا اندازِ جفا سے نہیں کم
اِن ہی باتوں نے تو دیوانہ بنا رکھا ہے

اُن کے ہر ظلم پہ شکوہ کے عوض شکر کریں
نام دُنیا نے اسی کا تو وفا رکھا ہے

رنج و غم بھول گئے عیش و مسرت ہوتے
ہم تو وہ ہیں کہ زمانے کو بھلا رکھا ہے

مجکو جز داغِ اَلم کچھ نہ ملا دُنیا میں
طُرفہ قسمت نے محبّت کا صلا رکھا ہے

آپ سے کوئی شکایت نہیں شکوہ ہی نہیں
ہم کو خود اپنی مصیبت نے رُلا رکھا ہے

سجدے کرتے ہیں وہیں دیر و حرم والے سب
جس جگہ آپ نے اپنا کفِ پا رکھا ہے

جُرم ہے جُرم ہے اظہارِ تمنّا کرنا
دل کے ارمانوں نے کیوں شور مچا رکھا ہے

داغ جو اُس نے دیا ہجر میں ہم کو شعلہ
ہم نے اس کو بھی کلیجے سے لگا رکھا ہے

دھرتی ماتا

امریکہ کی سحر طراز مصنفہ پرل بک کی کتاب گڈ ارتھ کا ترجمہ

یہ کتاب داستان ہے: حقیقت وانگ لنگ کی، غریب کسان، بیوی، بچے، ایک مختصر سا گھرانہ جسے زمین سے رزق ملتا ہے اور خون پسینہ ایک کرکے ملتا ہے۔ تھوڑی سی زمین ان کی کل کائنات ہے۔ خوشحال ہوں تو اسے جوتتے ہیں۔ غریب ہوں تو اسے بیچتے ہیں۔ مگر زمین سے تعلق نہیں جاتا۔ یہاں تک کہ جب قحط سالی کی وجہ سے پالتو مویشی تک کھا جانے کے بعد وانگ لنگ باول ناخواستہ زمین کو خیرباد کہہ کر شہروں میں پہنچتا ہے تو سوتے جاگتے اس کے دل میں یہی خلش رہتی ہے۔ کہ اپنی زمین واپس حاصل کرے اور پھر تقدیر اس غریب کسان کو شہروں میں مالامال کر دیتی ہے۔ وہ پھر واپس آتا ہے لیکن امیر ہونے کے بعد اس کی مشکلات میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ پہلے قحط سالی کا بھوت اس کے سر پر مسلط تھا۔ اب دولت کا جن سر پر سوار رہتا ہے۔ اس کسان کی زندگی کی یہ دونوں تصویریں دیکھنے کے قابل ہیں۔

غریب کی بپتا اور امارت کے چونچلے دونوں دیکھئے — قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ)

مصر کی رقاصہ ۱/-/-

موت کا راگ۔ میرزا ادیب ۱/۸/-

قلوپطرہ۔ سلمیٰ تصدق ۲/۸/-

موپساں کے افسانے ۱/-/-

داستان۔ دنیا کی رنگین ترین کتاب .. ۲/-/-

پھول اور کلیاں۔ ٹیگور کے افسانے ۱/۸/-

لالہ رخ۔ ایک ایرانی شہزادہ اور ہندوستانی شہزادی کی محبت کی داستان ۲/۸/-

دوشیزہ صحرا۔ سرزمین عرب کا زبردست ناول .. ۱/۴/-

مسولینی۔ اٹلی کے جابر حکمران کے حالات .. ۱/۸/-

یاد اقبال۔ ڈاکٹر اقبال کے متعلق جتنی نظمیں لکھی گئی ہیں ان کا مجموعہ ۱/۴/-

سیاہ کار اور دیگر افسانے .. ۱/-/-

ملنے کا پتہ

ہاشمی بک ڈپو۔ انارکلی لاہور

عالمگیر ہندوستان بھر کے معیاری علمی و ادبی باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۲۳ — فہرست مضامین ماہ نومبر ۱۹۴۷ء — نمبر ۶

ملاحظات

زیر نظر شمارہ سے عالمگیر کی ظاہری و باطنی خوبیوں میں بعض خوشگوار تبدیلیاں کی گئی ہیں امید ہے قارئین پسند فرمائیں گے۔ عالمگیر کو ہمیشہ سے اپنے ہم عصروں کی رہنمائی کا فخر حاصل رہا ہے۔ باقاعدگی۔ تصاویر اور خاص نمبروں کی اشاعت و ترتیب وغیرہ کے لحاظ سے ہندوستان کا کوئی علمی و ادبی ماہنامہ عالمگیر کا مقابلہ نہیں کر سکتا تاہم ادارہ کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ عالمگیر کو مشرقی صحافت کا قابل رشک و قابل قدر نمونہ بنایا جائے چنانچہ زیر ترتیب "خاص نمبر ۱۹۴۱ء" سے اس امر کا کسی قدر اندازہ ہو سکے گا کہ ہمارے عزائم و ارادے کتنی تیزی کے ساتھ عمل و حقیقت کی طرف آرہے ہیں۔

جناب ظفر واسطی شاہ آبادی کا افسانہ "عورت کی کمزوری" پلاٹ اور کردار نگاری کے لحاظ سے خاص طور پر جاذب توجہ ہے اس میں دکھایا گیا ہے کہ نوجوان عورت اپنے دل کو خواہ کتنا ہی ضمیر اور عقل کے تابع رکھے جذبات اس پر غالب آجاتے ہیں۔ افسانہ کی ہیروئن کو اپنے شوہر کے ایک "فلاسفر دوست" سے محبت ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی یاد میں جان دے دیگی۔ لیکن افسانہ کے "سیلان" میں یکلخت تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور ایک حیرت انگیز انکشاف قاری کے ذہن پر خوشگوار اثر ڈالتا ہے اور وہ اطمینان و سکون کی سانس لے کر افسانہ کو ختم کر دیتا ہے اس افسانہ میں فلاسفر دوست شوہر اور بیوی تینوں کے کردار قابل مطالعہ ہیں۔

جناب ہندی گورکھپوری نے یونان اور روم کے فلسفہ سیاست پر ایک چھپلتی ہوئی نظر ڈالی ہے اور اب جبکہ جمہوریت و آمریت میں خوفناک جنگ برپا ہے اور اطالیہ نے یونان پر فوج کشی کر دی ہے اس بہایا جارہا ہے،

زیر نظر شمارہ پر ایک نظر

از:- ادارہ

یہی افسانہ کو کامیاب بنا رہے ہیں۔

"ترکی شجاعت کا ایک منظر" جناب جلال شاہجہانپوری کا ایک تاریخی مقالہ ہے آپ بہت عرصہ کے بعد محفل عالمگیر میں آئے ہیں یہ مقالہ رگوں میں آزادی و حریت کا خون دوڑائے بغیر نہیں رہے گا۔

جناب سید اخلاق حسین رضوی کا افسانہ "سوکن" اگرچہ انگریزی سے ماخوذ ہے لیکن آپ نے اس خوبی کے ساتھ اسے مشرقیت کا لباس پہنایا ہے کہ بالکل ہندوستانی معاشرت کا آئینہ دار معلوم ہوتا ہے۔

جناب مدن مراری لال نے اپنے وسیع مطالعہ کی بنا پر "عاشق کا جسم ناتواں" کے عنوان سے ایک مزاحی مضمون لکھ کر فارسی ادب پر ایک دلچسپ طنز کی ہے۔

"ماروی" سندھی زبان کا ایک دلآویز و دلگداز تاریخی افسانہ ہے ہم جناب رفعت ہاشمی کے ممنون احسان ہیں کہ آپ عالمگیر کے قارئین کو سندھی ادب سے روشناس کرتے رہتے ہیں۔ امید ہے ان کی یہ کرمفرمائی جاری رہے گی۔

جناب جاوید قصری نے ایک گمنام پارسی نژاد شاعر کے حالات سے پردہ اٹھایا ہے۔ "امیروں کا کھیل" جناب پروانہ بریلوی کا ایک بہت کامیاب ڈراما ہے آپ کو ڈرامے لکھنے میں خاص کمال حاصل ہے جناب مودودی نے "لسانیات" کے تحت ایک معلومات افزا تبصرہ کیا ہے "رسوائی" ایک دلکش افسانہ کا ترجمہ ہے۔

منظومات کا پایہ بھی حسب معمول بہت بلند ہے۔

ضروری تصحیح

اکتوبر ۱۹۴۰ء کے پرچہ میں بعض غلطیاں رہ گئی

عالمگیر خاص نمبر ۱۹۴۱ء

معاونین کرام کی خدمت میں نہایت ضروری گزارش

دسمبر کے پہلے ہفتہ میں حسب معمول رسالہ عالمگیر لاہور کا معرکہ آرا خاص نمبر شایع ہوگا۔ ہرچند کہ موجودہ گرانی کے زمانہ میں کسی معیاری پرچے کا شایع کرنا ناممکن نہیں تو محال ترین ضرور ہے تاہم عالمگیر کا خاص نمبر بے انتہا محنت و مشقت سے بالکل جدید اصول کے ماتحت مرتب کیا جا رہا ہے اور اس کو ہر جہت سے بے حد کامیاب بنانے کے لئے زیادہ سے زیادہ مالی قربانی کی گئی ہے۔ یہ خاص نمبر موجودہ سائز کے **تین سو صفحات** پر پھیلا ہوا ہوگا اور اس میں صرف ترقی یافتہ اور زندہ رہنے والا بہترین ادب پیش کیا جائے گا۔

علاوہ ازیں بیحد جاذب نظر سہ رنگی و یکرنگی تصاویر بھی ہونگی

خاص نمبر کی ہنگامہ خیزیوں کا پوری طرح سے اندازہ لگانے کے لئے اسی پرچہ میں شایع ہونے والی فہرست مضامین کا ضرور مطالعہ کیجئے!

جن معاونین کرام کی میعاد خریداری اس پرچہ کے ساتھ ختم ہو رہی ہے خاص نمبر اُن کی خدمت میں بذریعہ وی۔پی بھیجا جائے گا۔ امید ہے کہ وہ نہ صرف آئندہ سال کے لئے اس کی سرپرستی قبول فرماکر اس گرانی کے زمانہ میں ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں گے بلکہ اپنے اپنے حلقہ اثر میں بھی عالمگیر کی توسیع اشاعت کے لئے کوشش فرمائیں گے۔

احباب کرام کی یہ معاونت

کارپردازان عالمگیر کی ناچیز کوششوں اور مالی قربانیوں کا صحیح اعتراف ہے اور یقین ہے کہ آپ اس جائز اعانت سے عالمگیر کو محروم نہ رکھیں گے

"عالمگیر" کی امداد فی الحقیقت اردو ادب کی امداد ہے

اخبار و افکار

گزشتہ اشاعت میں ہم نے ڈاکٹر محمد باقر صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی کا ایک مقالہ درج کیا تھا جس میں آپ نے فرمایا کہ پنجاب کے مختلف فرقے اگر فی الواقع ہندی اور اردو کو پنجاب کی درسگاہوں میں رائج کرنا چاہتے ہیں تو حکومت کو اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہیئے اور آپ نے تجویز پیش کی تھی کہ پنجاب میں پنجابی زبان کو بھی تدریسی زبان کی حیثیت ملنی چاہیئے۔ اس پر ہم نے معاصر "ہماری زبان" سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا تھا کہ پنجاب میں ہندی یا پنجابی کو ذریعہ تعلیم بنانا سخت غلطی ہے اس سے اردو زبان کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ذیل میں ہم ایک مضمون درج کرتے ہیں جس میں اسی نظریہ کی مدلل تائید کی گئی ہے۔۔

پنجاب کا ذریعہ تعلیم

از:- ادا ساکا

"پروفیسر صاحب اگر پنجاب میں ان ہر سہ زبانوں کی حیثیت پر گہری نظر ڈالتے تو وہ کبھی یہ فقرے زبان قلم پر نہ لاتے۔ اصلیت یہ ہے کہ پنجاب میں دو زبانیں رائج ہیں پنجابی اور اردو۔ پنجابی اکثر دیہات میں بولی جاتی ہے اردو پنجاب کی عدالتی، علمی اور درسی زبان ہے سب سے زیادہ اخبارات و رسائل اور کتب اسی عالمگیر زبان میں شایع ہوتے ہیں اس میں نمایاں خوبی یہ ہے کہ مشکل سے مشکل خیالات بھی عام فہم پیرایہ میں ظاہر کیئے جاسکتے ہیں اور ہر اردو پڑھا لکھا خواہ وہ ہندو ہو، سکھ ہو یا مسلمان، اردو عبارت کا مفہوم آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جو اردو مروج ہے وہ وہی ہے جو ملک کے ہر حصہ میں مستعمل ہے اور جس کو مقامی اثرات متاثر نہیں کر سکتے۔ برعکس اس کے اردو کو جو یکسانی اور ہمہ رنگی ہندوستان کے مختلف حصوں میں حاصل ہے وہ پنجابی کو پنجاب کے اندر بھی نصیب نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ زبان صوبہ کے ہر حصہ میں مختلف ہے اور اس کو ہر جگہ مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے مثلاً پوٹھوہاری۔ ملتانی۔ دوآبہ۔ کنڈی۔ لاہوری ماجھا۔ لمیا۔ لہندا۔ اداں کاری پہاڑی وغیرہ وغیرہ

یہ ایک امر واقع ہے کہ پنجابی بولی ہر بارہ میل پر بدلتی جاتی ہے اور اگر اتفاق سے دریا بیچ میں حائل ہو تو اس سے بھی کم فاصلے پر اختلاف رونما ہو جاتا ہے اس کی چند مثالیں ناظرین کی تفنن طبع اور اضافہ معلومات کے لیئے پیش کی جاتی ہیں۔ اردو کا ایک عام اور معمولی فقرہ ہے "کدھر جاتے ہو" جو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اسی صورت میں بولا جاتا ہے اور اس کو ہر صوبے کے افراد برابر بولتے اور سمجھتے ہیں۔ لیکن ذرا غور فرمائیے کہ پنجاب کے مختلف حصوں میں یہ چھوٹا سا فقرہ کیا کیا صورتیں اختیار کرتا ہے۔

پنجاب کے ایک ضلع میں۔ "کتھے چلیا ایں؟"
" دوسرے " "کدھر جانا ایں؟"
" تیسرے " "آپاں کتھے چلے او؟"
" چوتھے " "کدھر چلیا ایں؟" —
" پانچویں " "کتھے چلیں؟"
" چھٹے " "کدھے جاسیں؟"
" ساتویں " "کدھے وہنا ایں؟"
" آٹھویں " "کدھر دبھناں ایں؟"
" نویں " "کدھے ویسیں؟"
" دسویں " "کدائیں چلیا ایں؟"

ایک اور چھوٹا سا جملہ لیجیئے۔ "اسے پکڑ لو"۔ پنجاب میں اس دو لفظی جملہ کی یوں گت بنے گی۔

"اینہوں پھڑ لو"
"ایسنوں پھڑ لو"
"ایس نوں پھڑ لو"
"اینھوں نپ گھن"
"ایس نوں پھڑ گھن"
"اینھوں پکڑ لو"
"اینھوں تھم لو"

بعض اوقات یہ ناموں کا اختلاف سر پھٹول کا باعث بھی ہوتا ہے پنجاب کے ایک ضلع میں لڑکی کو کڑی کہتے ہیں لیکن ایک دوسرے ضلع میں کڑی بیوی کو کہتے ہیں۔ اب آپ ہی فرمایئے کہ لڑکی کو کڑی سمجھنے والا کسی ایسی جگہ جا نکلے جہاں کڑی بیوی کو کہا جاتا ہے اور وہ وہاں وہ کسی کی لڑکی کو کڑی کہہ دے تو اس کا کیا حشر ہوگا؟

پنجابی زبان کا ایک اور دلچسپ پہلو قابل ذکر ہے جو پنجابی عام طور پر بولی جاتی ہے وہ گورمکھی حروف کی پنجابی سے بالکل مختلف ہے۔ ہر

پنجابی آسمان کو آسمان ہی کہتا ہے لیکن لکھنے میں اس کو خواہ مخواہ آکاش بنا دیا جاتا ہے۔ عرفت۔ قابل۔ ذریعہ کے الفاظ پنجابی میں عام طور پر مروّج ہیں لیکن جب ان کو تحریر میں لایا جائے گا تو یہ علی الترتیب۔ کیول۔ یوگ اور دوآرہ بن جائیں گے۔ "کاروبار کا وقت" کے لیے پنجابی میں "کم کاج دا ویلا" بولا جاتا ہے لیکن لکھتے وقت وہ "ویارک سماں" لکھا جائے گا۔ یہ سب ہندی کے الفاظ ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی کے ذریعہ پنجاب میں ہندی پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے کہ پنجابی میں ہندی کے الفاظ آ رہے ہیں بلکہ حالات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سب کچھ عمداً اور کسی خاص تحریک کے ماتحت ہو رہا ہے اس کا ایک بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ عربی اور فارسی کے الفاظ کو پنجابی سے چن چن کر نکالا جا رہا ہے اور کوئی شیدائے پنجابی حتی الامکان کسی عربی یا فارسی لفظ کا استعمال جائز نہیں سمجھتا۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ مشہور ہے کہ ایک سکھ صاحب سے کہا گیا کہ عربی اور فارسی کے الفاظ نکال دینے سے پنجابی ادھوری رہ جائے گی اور آپ کو اس میں ہندی کے الفاظ ٹھونسنے اور ان کو عام پنجابیوں میں قابل فہم بنانے میں دقت پیش آئے گی تو وہ فرمانے لگے کہ ہم کو تکلیف گوارا اور دقت منظور لیکن ہم عربی اور فارسی کے الفاظ سے اپنی زبان کو ناپاک نہیں کرنا چاہتے۔ عرض کیا گیا کہ سردار کا لفظ ہر سکھ اپنے نام کے ساتھ فخر یہ لکھتا ہے۔ گرنتھ صاحب میں عربی اور فارسی کے الفاظ بھرے پڑے ہیں اور گورو گوبند سنگھ کے فارسی اشعار اب تک زبان زد عام ہیں ان کے پاک یا ناپاک ہونے کے متعلق جناب کا کیا ارشاد ہے۔ سردار صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

یہ تو پنجابی اور اس کے ذریعہ ہندی کی ترقی کی کوششوں کا حال ہے اس کے مقابلے میں اردو کی کیا کیفیت ہے؟ وہ نہ صرف برطانوی پنجاب میں بلکہ تمام پنجابی ریاستوں میں بھی عام اس سے کہ وہ ہندو ہوں یا سکھ یا اسلامی عدالتی زبان ہے اس کے علاوہ اس کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ پنجابی صرف پنجاب کے اندر محدود ہے اور وہ بھی اختلافات عظیم کے ساتھ لیکن اردو ہندوستان کے ہر گوشے میں سمجھی جاتی ہے اور اب تو اس کے سمجھنے والے دیگر ممالک عالم میں بھی پیدا ہوتے جاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جب پنجابی بولی میں صوبے کے مختلف حصوں میں اس قدر اختلاف ہے کہ ایک علاقہ کی پنجابی دوسرے علاقہ کا باشندہ نہیں سمجھ سکتا۔ جب اس کو ہندی الفاظ ملا کر اور بھی مشکل بنایا جا رہا ہے اور جب لکھی اور بولی جانے والی پنجابی میں بھی زمین و آسمان کا فرق موجود ہے تو آخر وہ کون سی پنجابی ہے جس کو پنجاب میں ذریعہ تعلیم یا عدالتی زبان بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور جس کی "تدریسی حیثیت" کے ہمارے فاضل پروفیسر صاحب "قائل" ہیں۔

اب رہا ہندی کا مسئلہ۔ درحقیقت پنجاب میں یہ مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر اردو کو ہندی کی ایک ترقی یافتہ صورت تسلیم کر لیا جائے جیسی کہ وہ حقیقت میں ہے تو پھر پنجاب میں ہندی کی ترویج کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور اگر اس صوبہ میں اس ہندی کو رائج کرنا مقصود ہے جو کانگرس یا ہندو سبھا کے متعصبین کی منظور نظر ہے اور جس کے ذریعہ وہ قدیم سنسکرت کو ازسرنو زندہ کرنا چاہتے ہیں تو باوجود ان کوششوں کے جو اردو سے عربی یا فارسی الفاظ نکال کر یا پنجابی میں ہندی الفاظ ملا کر اور کئی دوسرے طریقوں سے کی جا رہی ہیں اس کا یہاں رائج ہونا غیر ممکن ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ جب ایک ایسی زبان موجود اور مروّج ہے جو اس قسم کے اختلافات سے پاک ہے اور صوبہ میں اپنے قدم مضبوطی سے جما چکی ہے عدالتوں۔ درسگاہوں۔ اخباروں۔ اور کتابوں پر جس کا پورا پورا تسلط ہے جو آسان اور عام فہم ہے جو ہندوستان کے دیگر صوبوں کے ساتھ مبادلہ خیالات کا ایک بڑا ذریعہ ہے ——— جو ہندو مسلم اتحاد کا نشان عظیم ہے ——— جو مختلف قوموں کو آپس میں ملانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے اور جس کے ذریعہ قومیت متحدہ کا آفتاب طلوع ہو سکتا ہے ——— کیوں نہ اسی کو مستقل طور پر ذریعہ تعلیم بنایا اور سمجھا جائے۔ لیکن بنانے اور ——— سمجھنے کا سوال نہیں اردو طبعی طور پر پنجاب میں جڑ پکڑ رہی ہے وہ لوگ جو اس سے ضرورتاً یا طبعاً متنفر ہیں عملاً اس کے آگے گردن اطاعت خم کر رہے ہیں۔

پنجاب کے متعدد کثیر الاشاعت۔ ہندو۔ آریہ سماجی اور سکھ اخبارات جو اردو کے درپئے آزار ہیں خود اسی زبان میں شایع ہوتے اسی کے ذریعہ اپنے سیاسی و مذہبی عقائد کی تبلیغ کرتے اور اسی سے اپنے خزانے پُر کر رہے ہیں۔ یہ احسان ناشناسی کی حد ہے بلکہ محسن کشی ہے کہ جو زبان ان کی زندگی و بقا کا وسیلہ ہے وہ اسی کی جان کے لاگو ہو رہے ہیں۔"

(ہماری زبان)

حقائق و معارف

مختلف مذاہب اور اقوام کے حالات مطالعہ کرنے والوں کو معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں کہاں کہاں ایک مذہب کے پیرو، عموماً دوسرے مذاہب کے افراد سے برسرپیکار رہتے ہیں لیکن ایک سے زائد ایسے مقامات اور معابد بھی موجود ہیں جہاں ایک دوسرے سے رقابت رکھنے والی اقوام کے اشخاص متفقہ اور متحدہ طور پر عبادت کرتے ہیں اور ان مقامات کی تقدیس و حرمت قائم رکھنے میں ایک دوسرے سے پیش پیش ہیں۔ بیت المقدس میں (جسے یروشلم بھی کہا جاتا ہے) دیوارِ گریہ کو یہ عظمت و شرف حاصل ہے کہ دنیا کی تمام بڑی قومیں نصرانی، یہودی اور مسلمان اسے مساوی طور پر متبرک اور قابل احترام مانتی ہیں اور وہاں پہنچ کر آپس کے اختلاف اور مذہبی رقابتوں کے احساس سے بالاتر اور مستغنی ہو کر انتہا درجہ کی عقیدت و نیازمندی سے گردن جھکاتے ہیں۔ ہندوستان کے عام باشندوں کو شاید یہ نہیں معلوم کہ ہندوستان کے جنوبی گوشہ میں بھی ایک ایسی جگہ موجود ہے جسے مذکورہ بالا قسم کی خصوصیات کے لحاظ سے جنوبی ہند کا مکہ کہا جاتا ہے اور جہاں ہندو اور مسلمان (جو ملک کے طول و عرض میں آپس کی رقابتوں اور عداوتوں میں نام روشن کر چکے ہیں) برادرانہ محبت و خلوص کے ساتھ اپنے اپنے سر نیاز جھکاتے ہیں۔

یہ متبرک مقام میسور کی ریاست میں بیس میل لمبے ایک سلسلۂ کوہ میں واقع ہے اور بابا بدان کا پہاڑ کہلاتا ہے۔ پہاڑ کی بلندی سے نصف راستہ پر ایک غار ہے جسے مسلمان دادا حیات میر قلندر کا مقبرہ کہتے ہیں اور ہندو دیوتا دتاتریہ کا تخت قرار دیتے ہیں اور دیوتا کے متعلق ہندوؤں کا کہنا ہے کہ جب دنیا فتنہ و فساد اور خون خرابہ کا گہوارہ بن جائیگی اور قیامت برپا ہونے لگے گی تو دتاتریہ دیوتا پردۂ غیب سے ظہور میں آکر بگڑتی ہوئی دنیا کو سنواریں گے گویا مسلمانوں کی عام روایات پر نظر کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ دیوتا دتاتریہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمات انجام دینگے۔

بابا بدان کے نام سے جو سلسلۂ کوہ منسوب ہے وہ اپنے دلکش و نظر فریب مناظر کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے جتنا اس مقام کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترک مقامِ عبادت ہونے کا شرف حاصل ہے اتنا کسی دوسرے مقام کو حاصل نہیں۔ اس کوہستان میں شکار بھی ہر قسم کا موجود ہے۔ قہوہ اور کافی پیدا ہوتا

میر قلندر کا مقبرہ

ترجمہ

اور جگہ جگہ قہوہ کے فارم اور باغات نظر آتے ہیں ان میں سے بہت سے باغات یورپین افراد کے قبضہ میں ہیں۔ اس علاقہ میں جو قہوہ پیدا ہوتا ہے اسے "چکبری قہوہ" کہا جاتا ہے۔ جس پہاڑ کو آج کل بابا بدان کہا جاتا ہے "پرانوں" کے زمانے میں اسے "چند دروناپربت" کہا جاتا تھا۔ ایک خدا رسیدہ مسلمان بزرگ بابا بدان عرب سے آکر یہاں مقیم ہوئے تو انہیں کے نام سے یہ پہاڑ بھی منسوب ہو گیا۔ یہ وہی بابا بدان ہیں جن کی بابت مشہور ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے قہوہ انہیں کے ذریعہ سے آیا۔ کوہ بدان کی وادیوں میں اور ڈھلوان چٹانوں پر آپ نے قہوہ کی کاشت کی اور ایک سال میں وہ تمام کوہستان قہوہ کے باغات سے سبزہ زار بن گیا۔

اندر سے غار مذکور کی بلندی صرف پانچ فٹ ہے اس میں دادا حیات میر قلندر ہی کا مزار نہیں بلکہ کچھ اور بھی مزارات ہیں۔ آخر میں ایک گوشے میں ایک چشمہ بھی ہے مشہور ہے کہ اس میں غسل کرنے سے امراض دور ہو جاتے ہیں۔ غار کے ایک کونہ میں چبوترہ پر چاندی کی کھڑاویں بھی رکھی ہوئی ہیں مسلمانوں میں مشہور ہے کہ یہ کھڑاویں بابا صاحب کی ہیں ہندو کہتے ہیں کہ دیوتا دتاتریہ جب نازل ہونگے تو اس کھڑاویں کو پہنینگے اس غار کے جنوب میں ہی چھوٹا سا ایک غار اور بھی ہے اس میں ایک سرنگ ہے کہا جاتا ہے کہ یہ سرنگ سیدھی مکہ معظمہ تک گئی ہے۔

موسم سرما میں جب اس ۔ فہ میں بارش نہیں ہوتی اور سڑکیں صاف ہوتی ہیں ہندو اور مسلمان اس مقدس مقام کی زیارت کے لئے لاکھوں کی تعداد میں پہنچتے ہیں۔ اس خانقاہ یا مقبرہ کا سجادہ نشین یا مہنت ایک مسلمان فقیر ہوتا ہے ہندو مسلمان دونوں مذاہب کے زائرین اسی کے عقیدتمند ہیں۔ لوبان کی دھونی دی جاتی ہے اور مٹھائی چکھ کے لگے اور اخروٹ نذر کے طور پر چڑھائے جاتے ہیں ہندو اسے پتا کی خانقاہ بھی کہتے ہیں۔ مسلمان سجادہ نشین کو سوامی کہتے ہیں سادات میں سے اس سجادہ نشین کا انتخاب ہوتا ہے۔ سجادہ نشین کے پورے القاب بھی بہت کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اسے "سری دتاتریہ سوامی بابا بدان سوامی جگت گورو" کہا جاتا ہے۔ اس خانقاہ کے سجادہ نشین [illegible] کے پاس ہمایوں۔ اکبر

حیدر علی۔ ٹیپو سلطان اور اکبری دیسور کے، اجگان کی بخشی ہوئی سندات بھی موجود ہیں۔

اس سلسلہ کوہستان میں جو غار۔ جنگل اور چشمے وغیرہ ہیں ان سے مختلف قسم کی متعدد روایتیں منسوب ہیں۔ ایک چشمہ کے بارے میں جسے گدتیرتھ کہا جاتا ہے یہ روایت مشہور ہے کہ جب ایک مرتبہ بھیم کی ماں کنتی کو بہت زیادہ پیاس محسوس ہوئی تو اس نے بھیم سے کہا کہ کہیں سے پانی مہیا کرے بھیم نے اپنے گدا کو زمین پر دے مارا جس سے فوراً ہی چشمہ جاری ہو گیا وہی چشمہ گدتیرتھ کہلاتا ہے۔

ایک مسلمان شہزادی کا قصہ بھی بڑی دلچسپی سے بیان کیا جاتا ہے کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں اس علاقہ کے ایک ہندو راجہ نے پڑوسی مسلمان بادشاہ کی خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا چاہی اور جب بظاہر صورت کامیابی نہ دیکھی تو اس نے اپنے سپاہیوں کو بھیج کر کسی نہ کسی طرح اس شہزادی کو اغوا کرا لیا۔ سپاہی سوتی ہوئی شہزادی کا چپرکھٹ لے اڑے جب سپاہی اس غار کے قریب پہنچے تو سلسلہ کوہسار کی نسیم سحر کے سرد جھونکوں نے شہزادی کو جگا دیا۔ یہ دیکھ کر کہ وہ دشمنوں کے نرغہ میں گرفتار ہے اور اس کی آبرو بچنا دشوار ہے اس نے گڑگڑا کر دعا کی کہ وہ بوڑھی ہو جائے۔ اللہ تعالےٰ نے اس کی دعا قبول کی اور ایک ہی منٹ میں جہرکھٹ پر خوبصورت نوجوان شہزادی کی جگہ بدشکل بوڑھی عورت نظر آنے لگی سپاہیوں نے جو دیکھا تو اسے وہیں جنگل میں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔

حضرت بابا صاحب نے بوڑھی عورت پر جو حقیقت میں جوان شہزادی تھی ترس کھایا ان کی دعا سے وہ پھر حسین شہزادی بن گئی اور اس کا باپ بادشاہ بحفاظت تمام اسے آ کر لے گیا۔

(ترجمہ)

نظم

ہلالِ عید

از حضرت عاصم جے پوری

اے ہلالِ عید اے ماہِ تمامِ آرزو　　اے شعاعِ انبساط، اے شمعِ شامِ آرزو
تو ہمیں دینے تو آیا ہے پیامِ آرزو　　یہ تو کہہ خالی ہے کیوں خود تیرا جامِ آرزو
کیا نشاطِ زندگی بے آرزو رہنے میں ہے
یا ترے مانند محوِ جستجو رہنے میں ہے

کیا تمنا ہے کہ ہے پھیلی ہوئی جھولی تری　　یا تمنّاؤں سے تو نے کر لیا دامن تہی
مضمحل ایسا ہے تو مُنہ فق سراپا بیکسی　　مطمئن ایسا کہ ابرو بے شکن لب پر ہنسی
حسرت واندوہ کا پہلو میں زخم تازہ ہے
یا تری جمعیت خاطر کا یہ شیرازہ ہے

سوز باطن ہے تو کیوں ہے آج مجبور ظہور　　آ گیا کیا پردۂ اسرار میں کوئی فتور
ہے گرفتار نظر کیوں اے شعاعِ برقِ طور　　توڑ ڈالا کیا کسی نے لن ترانی کا غرور
تو نے دیکھا کیا بلا چشمِ تماشا کوش ہے
ایک انبوہِ نظر ہے اور تو بیہوش ہے

تو ہے وہ تحریر جو وقتِ قبولِ مُدّعا　　ہو لبِ محبوب پر پیدا باندازِ حیا
ہے ترا ضبطِ تبسم عین پیمانِ وفا　　جب کیا پورا ہوا ہے وعدۂ فردا ترا
تیری چتون سے برستی ہے مسرت اس قدر
ہو محبت کا یقیں جیسے کسی کو دیکھ کر

جب تمنا کی کرن ہے تو تو اے نورِ فلک　　یا نہ ہو دور اس قدر یا تیز کر اپنی جھلک
دل کی بیتابی بڑھا چشمِ تمنا کی چمک　　یا نہ ہو دلکش یہاں تک یا نظر آ دیر تک
کیوں مٹا جاتا ہے نقشِ حسنِ صورت کی طرح
چاند بن کر جگمگا داغِ محبت کی طرح

عالمگیر خاص نمبر ۱۹۴۱ء کے مندرجات کی ایک جھلک

ضخامت
تین سو (۳۰۰) صفحات

قیمت
خاص نمبر
صرف ایک روپیہ

اگلے صفحات پر عالمگیر خاص نمبر ۱۹۴۱ء
میں شائع ہونے والے گرانقدر مضامین معرکہ آرا
افسانوں اور کیف آور نظموں کی ایک فہرست شائع کی جا رہی ہے،
اس سے آپ یہ اندازہ کیجیے کہ عالمگیر کی یہ اشاعت
خاص کتنی ہنگامہ پرور خصوصیات کی حامل ہے
اور آپ کے واسطے اس کا مطالعہ
کتنا ضروری ہے

متعدد
سہ رنگی
یکرنگی
تصاویر

دلچسپ
نفسیاتی
افسانے

بلند پایہ
مقالات

کیف آفریں
نظمیں

افسانے اور ڈرامے

صحرا نورد کا دسواں خط ——— میرزا ادیب بی۔ اے آنرز

صحرائی رومان ——— ظلم و مظلومیت کا لرزہ خیز تصادم۔ نازک تشبیہات۔ آرٹ کا بہترین نمونہ۔ میرزا ادیب کا ایک باکمال کارنامہ جس کو پڑھ کر آپ قعرِ حیرت میں گم ہو جائیں گے۔

مقدس پیالہ ——— رحمٰن مذنب

یونانی مؤرخ پلوٹارک کے ایک قصّہ کا بدترین ناٹک جو ولایت کی اسٹیج پر متواتر ایک سو تیس رات کھیلا گیا۔ لارڈ ٹینسن کا زندہ جاوید کارنامہ جس کے اس ترجمہ کو بھی اردو ادب میں ممتاز حیثیت حاصل ہو گی۔

پاگل پریمی ——— علی احمد بی اے

ایف۔ ڈبلیو بین کے ایک بہترین افسانہ کا ترجمہ سنسکرت ادب کی رومانی داستان شروع سے لیکر اخیر تک سنجیدہ دلچسپ رنگین رومان فرہاد لکڈ ار۔

ڈرائنگ ماسٹر ——— احمد ندیم قاسمی بی اے

نفسیاتی تجربہ اور کردار نگاری کے لحاظ سے بہترین افسانہ ہے جو لائق افسانہ نویس نے اپنے مخصوص طرزِ نگارش میں تحریر فرمایا ہے۔

پھیکے خواب ——— شفیق الرحمٰن

"اگر وہ میری ہو گئی تو ——؟" یہ سوال اسکے دماغ میں گھڑی گھڑی آتا۔ وہ سوچنے بیٹھ جاتا اگر واقعی وہ اس کی ہو گئی تو وہ کیا کریگا؟

بے جوڑ شادی ——— آسی رام نگری

بے جوڑ شادی سے کتنے روح فرسا نتائج برآمد ہوتے ہیں! اسکی تشریح جناب آسی رام نگری نے اس معرکہ آرا افسانے میں کی ہے۔ زبان پلاٹ اور نفسیات کے لحاظ سے آسی صاحب کا یہ افسانہ حسب معمول خاص طور پر لائق مطالعہ ہے۔

گلنار ——— ظفر واسطی شاہ آبادی

چار دن کی مدت میں حامد کو پہلی مرتبہ زندگی دلکش معلوم ہوئی۔ "بھائی حامد یہ تو بس "رکھائیے" بھائی حامد ایک پیالی اور لیجئے بھائی حامد لکھنؤ میں رہ کر بالکل لکھنوی بن گئے آپ تو" گلنار کی باتوں میں ایسا رس تھا کہ آخر کار۔

زرتشت کا رومان ——— احسان علی شاہ بی اے

زرتشت اعظم کی حیاتِ معاشقہ کا ایک رنگین باب جس کا ہر ہر فقرہ شعریت میں ڈوبا ہوا ہے۔

اندھا ——— ایم اے خاں یوسفی

ایک اندھے کی دلچسپ نفسیات جس کی آنکھوں میں بصارت اچانک عود کر آئی۔ نوشتہ ایڈملن لیف۔

عورت ——— عزیز احمد

کیا عورت بیوی رہ کر بھی محبت کر سکتی ہے؟ انگریزی افسانہ نویس ایچ۔ جی۔ ویلز کا نفسیاتی شاہکار۔

گوالن کی لڑکی ——— سالک لکھنوی

دلآویز و دلکش داستانِ محبت معرکہ آرا انگریزی افسانہ کا ترجمہ۔

بارش کا چھینٹا ——— ممتاز حسین بسمل

بعض اوقات معمولی سا واقعہ انسانی زندگی کو کس طرح تبدیل کر دیتا ہے۔ بارش کے ایک چھینٹے نے پروین اور ہمدم کی زندگی پر کیا اثر ڈالا؟

شانتا کی ڈائری ——— امجد علی خاں یوسف زئی

مرہٹی زبان کا شاہکار۔ مہاراشٹر کے مایہ ناز ادیب پروفیسر پھڑکے کے قلم سے۔

دُلّا بھٹی ——— پاشا جالندھری

ایک طرف محبت تھی دوسری طرف فرض! اس کش مکش میں دُلّا بھٹی نے کیا فیصلہ کیا؟ پنجاب کے رابن ہڈ دُلّا بھٹی کا دلچسپ تاریخی افسانہ۔

رانک دیوی ——— نعمت ہاشمی

کاٹھیاواڑ کی ایک تاریخی داستان حسن و عشق کی معرکہ آرائی سندھی سے براہِ راست ترجمہ۔

ایک بوڑھے گداگر کا تحفہ ——— محمد اسحٰق مہر

وہ حسین تھا، خوبصورت تھا لیکن محبت نے اُسے بیکار بنا دیا! زندگی کے تلخ تجربات۔ اسکر وائلڈ کا دلگداز افسانہ۔

وغیرہ وغیرہ !!

علمی و ادبی مضامین

خیام کا فلسفۂ معصیت ——— اظہر امرتسری

حکیم عمر خیام کے پیغامِ معصیت کا ناصحانہ پہلو۔

مثالیہ شاعری ——— مولوی بشیر احمد برہانپوری

سنسکرت، ہندی، عربی، فارسی اور اُردو شاعری کی دلکش تشبیہیں، حسین استعارات اور پُر لطف محاورے۔ فاضلانہ ادبی مقالہ۔

بابل اور نینوا ——— خانصاحب حکیم محمود علیخاں ماہر اکبرآبادی

نوح علیہ السلام کے طوفان کے بعد جو مہذب حکومتیں قائم ہوئیں اُن میں بابل اور نینوا امتیازی درجہ رکھتی ہیں۔ اس مقالہ میں بابل اور نینوا کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔

بالشوزم کے جدید رجحانات ——— شبلی بی کام

بالشوزم کی پرورش کن حالات میں ہوئی؟ اُس کا ابتدائی نقشہ کیا تھا؟ اور سٹالین نے اپنی آمریت کے زور سے اُسے کیا سے کیا بنا دیا؟۔ ایک معلومات افزا بلند پایہ سیاسی مقالہ۔

ابو قطیفہ ——— طالوت

پہلی صدی ہجری سے ایک غیر معروف محبِ وطن عرب شاعر کی دلاویز شاعری پر دلچسپ تبصرہ۔

تاجدارانِ سخن مفلسی کی آغوش میں ——— ماہر القادری

دُنیا اہلِ کمال اور اہلِ کمال سے ہمیشہ بے خبر رہا ہے۔ چنانچہ حافظ شیرازی، میر، غنی کاشمیری وغیرہ سے دنیا نے کیا سلوک کیا۔

اُردو شاعری اور جنابِ شیخ ——— صدیقہ بیگم سیوہاروی

شیخ، واعظ اور محتسب وغیرہ اُردو شاعری کا ہمیشہ ایک دلچسپ موضوع رہا ہے۔ اس ادبی تبصرہ میں اسی شخصیت کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

قصرِ جعفری ——— عبدالقیوم ندوی

وہ رشکِ جنت اور فردوس مثال محل جس کے متعلق گبن کہتا ہے کہ یورپ میں آج جس قدر شاندار عمارتیں ہیں وہ اسی محل کے نمونہ پر بنائی گئی ہیں۔ تاریخی مضمون۔

اُردو کی رباعیاں ——— میرزا محمد بشیر ایم۔اے

اُردو شاعری میں رباعی کی تاریخ اور اُردو کے چند مشہور رباعی گو۔

رگلی کتب خانہ ——— محمد ولی الحسن

تاریخِ عالم کے سب سے قدیمی کتب خانہ کے دلچسپ حالات

منظومات

ارشاداتِ عالیہ ——— فصاحت جنگ حضرت جلیل

طوفانِ نوح ——— ناخدائے سخن نوح ناروی

کب تک ——— حضرت علامہ محوی صدیقی

قاضی نذر الاسلام کی نظم کا منظوم ترجمہ —— حضرت مولانا اختر شیرانی
تجلیات —— حضرت اثر صہبائی ایم۔ اے
اعتبارات —— حضرت دل شاہجہانپوری
اک پیکر جمیل سے —— حضرت جلال ملیح آبادی
نکات —— حضرت فراق گورکھپوری
واردات —— حضرت ثاقب لودھیانوی
پھول والی —— جناب مقبول حسین احمد پوری
سورج کی پہلی کرن —— حضرت عاصم جے پوری
غیر مطبوعہ کلام —— حضرت احسن مارہروی
التجائے تغافل —— حضرت احمد ندیم قاسمی
نغمہ و فریاد —— حضرت ماہر القادری
ناز و نیاز —— جناب عزیز احمد
ستم —— حضرت کوکب شاہجہانپوری
دور عمل —— حضرت طالب باغپتی
نوائے راز —— حضرت راز چاندپوری

علاوہ ازیں!

امین حزیں، یاس بسوانی، محمود اسرائیلی، نفیس ، نوح ، ، لوی، شفق جالندھری اور روش سہارنپوری وغیرہ
وغیرہ حضرات کا بلند پایہ کلام بھی خاص نمبر کی زینت درج ہوگا

مقالات مدیری

اخبار و افکار —— حقائق و ... —— رفتار زمانہ

خاص نمبر مفت حاصل کرنے کیلئے آج ہی مستقل خریداروں کی فہرست میں نام لکھائیے سالانہ چندہ صرف للعہ (علاوہ محصول ڈاک)
جس میں خاص نمبر کے علاوہ جون میں شائع ہونے والا سالانہ نمبر بھی مفت پیش کیا جاتا ہے

خاص نمبر تمام شہروں کے نیوز ایجنٹوں کے علاوہ وہیلر کے ریلوے بک سٹالوں پر بھی فروخت ہوتا ہے

قیمت خاص نمبر ... علاوہ محصول ڈاک

منیجر رسالہ عالمگیر سید مٹھا بازار لاہور

سالانہ چندہ للعہ علاوہ محصول

عورت کی کمزوری

افسانہ

از جناب ظفر واسطی شاہ آبادی

مجھے چندرکانتا نے بتایا کہ آج شام کی گاڑی سے وہ یہاں سے گزرینگے اور انھوں نے میرے بھائی کو لکھا ہے کہ مجھے لیکر اسٹیشن پر آجائے۔ کئی دن سے دلیو اور اس کے دوست جینتی کے درمیان میرے رشتہ کے متعلق خط و کتابت ہو رہی تھی۔ جب جینتی کا خط آتا تو دیو ماتاجی کو پڑھ کر سناتا اور پھر دونوں خیالات کا تبادلہ کرتے۔ میں دوسرے کمرے سے اُن کی باتیں سُن کرتی۔ جینتی دلیو کا ہم جماعت اور ایک سیٹھ کا لڑکا تھا۔

جب لڑکی کی منگنی کا سوال درپیش ہوتا ہے تو اس غریب پر عجیب وقت آتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں ڈرتی ہے کہ پرماتما جانے ماتا پتا کس کے پلّے باندھ دیں اور اس کا یہ خوف اکثر ہوتا بھی ہے درست۔ مجھے بھی اسی قسم کا فکر دامنگیر ہوگیا۔

چندرکانتا نے بتایا کہ تمھاری ماتا اس لڑکے کی بڑی تعریف کر رہی تھیں کہتی تھیں بڑے امیر کا لڑکا ہے۔ بی۔ اے پاس ہے اور ہاکی اور کرکٹ کا بڑا اچھا کھلاڑی ہے۔ اس کی زبان سے تعریف سنی تو دل کو کچھ تسلی ہوئی لیکن پھر خیال آیا کہ خبر نہیں شکل وصورت کا کیسا ہے یہ بات ماتا پتا دیکھتے ہی نہیں حالانکہ اسے سب سے پہلے دیکھنا چاہئے۔

لڑکیوں کے معاملہ میں تو لڑکوں کے ماں باپ اس بات کا خیال رکھتے ہیں لیکن لڑکوں کے متعلق لڑکیوں کے والدین اس کا ذرا بھی خیال نہیں کرتے۔

شام ہوئی تو ماتاجی نے مجھے نہا کر کپڑے تبدیل کرنے کو کہا۔ مجھے چندرکانتا پہلے ہی بتا چکی تھی۔ ماتاجی نے بڑی محنت سے میرے بال بنائے، میں نے اپنی بہترین ساڑی اور جمپر پہنا اور گاڑی آنے سے کافی دیر پہلے تیار ہوگئی۔ دلیو نے بھی سوٹ پہنا اور ہم بہن بھائی سٹیشن پر پہنچ گئے۔ مجھے ماتاجی نے یا دلیو نے یہ نہ بتایا تھا کہ کوئی مجھے اس نظر سے دیکھنے آرہا ہے دلیو نے کہا تھا کہ اس کا ایک دوست لاہور جارہا ہے اور وہ اسے ملنے اسٹیشن جائے گا اور پھر مجھ سے بھی کہا تھا کہ کملا تم بھی چلنا۔ شاید اس کی بہن بھی اس کے ساتھ ہو وہ بڑی خوش خلق اور ملنسار لڑکی ہے۔ تم اسے یقیناً پسند کروگی۔

میں اور دلیو پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے اور دلیو اپنے دوست کی تعریفیں کرتا رہا کہ وہ ہاکی کا بین الاقوامی شہرت کا کھلاڑی ہے اور کرکٹ میں بھی ساری دنیا میں نام حاصل کرچکا ہے۔ کالج میں اس کے کھلاڑی ہونے کی وجہ سے پرنسپل تک اس کی عزت کیا کرتا تھا۔ بڑا قوی ہیکل نوجوان ہے میں اس کی زبانی جینتی کی تعریفیں سنتی رہی اور دل ہی دل میں اس کی تصویر بناتی رہی۔

گاڑی آئی تو ایک کمرے میں سے دو نوجوان اُتر کر ہماری طرف لپک کر بڑھے۔

"ہیلو دلیو!" اگلے نوجوان نے کہا۔

"ہیلو جینتی!" دلیو نے جواب میں کہا۔

"مزاج شریف؟" اگلے نوجوان نے پھر کہا۔

"مزاج شریف؟" دلیو نے جواب میں پھر اسی سے سوال کر دیا۔

جینتی واقعی بڑا تندرو نوجوان تھا۔ شکل وصورت کا بھی بُرا نہ تھا، دلیو نے تعارف کرایا۔

"کملا! یہ میرا دوست جینتی ہے اور جینتی یہ کملا ہے میری بہن"۔

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے نمستے کیا اور اس نے بھی اسی طرح جواب دیا اور کہنے لگا۔

"مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی"۔

"شکریہ!" میں نے دبی زبان سے کہا۔

پھر اس نے اپنے دوست کا تعارف ان الفاظ میں کرایا۔

"یہ میرا نوجوان فلاسفر دوست ہے گیان سنگھ اور فلاسفر دوست! یہ دلیو ہے میرا ہم جماعت اور یہ ان کی بہن ہے کملا"۔

فلاسفر دوست نے ہم دونوں بہن بھائی کو پرنام کیا اور خاموش کھڑا رہا۔ نہ اس نے یہ کہا کہ مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور نہ اس نے کوئی اور ہی بات کہی۔ وہ جینتی کے پیچھے ہی کھڑا رہا صحت کے لحاظ سے وہ جینتی سے بہت کم درجہ پر تھا لیکن حسن کے اعتبار سے ۔۔۔۔ نہیں یہ بات مجھے نہیں کہنی چاہئے۔

جینتی اور دیسو ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے اور میں اور فلاسفر چپ چاپ کھڑے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ جینتی نے دو ایک دفعہ مجھے بھی اپنی گفتگو میں شامل کرنا چاہا لیکن مجھ پر چپ ہی طاری رہا اور میں خاموش ہی کھڑی رہی۔ اتنے میں گارڈ نے سیٹی دی اور سبز لالٹین دکھائی۔ ان دونوں نے جلدی سے ہم سے ہاتھ ملا کر ریل میں سوار ہو گئے۔ دیسو نے پوچھا "اور جینتی تو نے اس بات کے متعلق بتایا ہی نہیں"۔

"... اس نے چلتی ہوئی ریل میں سے کہا۔

میں ... دیکھ رہی تھی۔ زرد زرد لیکن سرخی مائل رنگ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، پتلا دبلا بدن کہ جینتی کے الفاظ میرے کانوں میں پہنچے اور میں نے پرماتما کا شکر ادا کیا کہ میں امتحان میں کامیاب ہو گئی۔ یہ ایک امتحان ہی تھا اور اگر میں اس امتحان میں پاس نہ ہوتی تو ماتا جی کئی دن تک ذرا ذرا سی بات میں میخیں نکال نکال کر مجھ پر خفا ہوتی رہتیں۔

اس واقعہ کے کوئی ایک مہینہ بعد میری شادی جینتی سے ہو گئی۔ شادی سے پہلے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ جاتے ہی گھر سنبھالنا پڑے گا کیونکہ ان کے گھر میں عورت کوئی نہیں۔ جینتی کی ماں تو اسے بچپن ہی میں چھوڑ کر دوسری دنیا میں چلی گئی تھی اور باپ جینتی کے بی۔ اے کرنے تک تو اس کی دیکھ بھال کیلئے ٹھہرے اور پھر وہ بھی اس کی ماں کے پاس چلے گئے۔ خیر سسرال جاتے ہی دو چار دن تو میں شرم میں بیٹھی رہی اور دیکھتی رہی کہ نوکرانیاں اور ہمسائیاں گھر کو لٹا رہی ہیں پھر شرم کو بالائے طاق رکھ کر خود سارے کام کاج اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ جینتی نہایت خوش مزاج مرد تھا مجھے ہر وقت ہنساتا رہتا تھا لیکن میں اس کے سامنے خود کو کچھ بے حقیقت سی سمجھتی۔ جب سے ہماری شادی کی بات چیت پکی ہوئی تھی میں اپنے دل سے اس کے فلاسفر دوست کو بھلانے کی کوشش کر رہی تھی اور بہت بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئی تھی اور امید تھی کہ کچھ دنوں میں اسے بالکل بھول جاؤں گی لیکن ابھی شادی ہوئے سات ہی دن گزرے تھے کہ جینتی کے پاس ہمارا جہ صاحب ——— کا تار آ گیا جس میں اسے ایک میچ میں کھیلنے کے لئے بلایا تھا۔ جینتی تار لیکر میرے پاس آیا اور کہنے لگا "مجھے افسوس ہے کہ میں تمھیں اتنی جلدی اکیلا چھوڑ کر جا رہا ہوں لیکن میں بہت جلد واپس آ جاؤں گا۔ تم کہو تو تمھیں تمھارے گھر بھیج دوں اور یہاں رہنا ہو تو یہاں رہو۔ آج میرا فلاسفر دوست اپنے وطن سے آ جائے گا۔ تم اسے بھول تو نہیں گئیں۔ وہ جو اس رات میرے ساتھ تھا جب ہم نے پہلے پہل ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ تم اس کے ساتھ بیڈ منٹن کھیلا کرنا ——— اور گاڑی میں سیر کے لئے بھی چلی جایا کرنا"۔

خبر نہیں وہ کیا کیا کہتا رہا۔ میں اس کے فلاسفر دوست کا ذکر سن کر بدحواس سی ہو گئی تھی جس شخص کو میں بڑی مشکل سے بھلانے میں کامیاب ہوئی تھی اس کے متعلق جینتی کہہ رہا تھا کہ اس کے ساتھ بیڈ منٹن کھیلا کرنا اور اس کے ساتھ سیر کو چلی جایا کرنا اس نے بتایا کہ اس کا باپ بیمار تھا اس لئے وہ ہماری شادی میں شریک نہ ہو سکا تھا۔

میں نے کہا: "آپ شوق سے میچ کھیلنے جائیے اور میرا فکر نہ کیجئے اول تو مجھے گھر کے کام کاج ہی سے فرصت نہ ملے گی اور اگر ملی بھی تو میں کتابیں پڑھ کر وقت گزار لیا کروں گی لیکن اپنے فلاسفر دوست کو اپنی غیر حاضری میں یہاں آنے کے لئے نہ کہیئے"۔

"پگلی کہیں کی" انھوں نے کہا۔ "وہ بالکل میرے بھائی کے برابر ہے اور تم بھی اسے اپنا بھائی ہی سمجھو"۔

شام کو اس کا فلاسفر دوست آ گیا اس کا سامان دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ یہ سامان یہاں کیوں لایا ہے۔ کیا اس نے الگ کوئی مکان نہیں لے رکھا میرے دریافت کرنے پر جینتی نے بتایا کہ وہ اس کی درخواست پر اس کے ساتھ رہتا ہے ورنہ اسے تو اس شہر میں کوئی بھی کام نہیں۔

دوسرے دن جینتی میچ کھیلنے چلا گیا اور میں اور فلاسفر دوست اکیلے رہ گئے۔

اور جینتی کی غیر حاضری میں فلاسفر دوست نے میرے دل پر مکمل طور سے قبضہ کر لیا۔ جب میں نے اسے پہلی دفعہ دیکھا تھا تو اسی وقت اس کی موہنی صورت میرے دل میں کھب گئی تھی لیکن چونکہ میری نسبت جینتی سے ہو گئی تھی اس لئے میں اسے اپنا فرض سمجھتی تھی کہ جینتی کے سوا دوسرے مرد کو محبت کی نظر سے نہ دیکھوں اور اسی لئے میں نے اس فلاسفر کو بھلانے کی کوشش کی اور قریب قریب کامیاب بھی ہو گئی۔ لیکن یہ میرا خیال ہی خیال معلوم ہوتا ہے ورنہ محبت کی آگ لگ کر پھر کبھی نہیں بجھتی بعض دفعہ ناموافق واقعات کی وجہ سے اس میں وہ شعلے اور تیزی نہیں رہتی لیکن یہ اندر ہی اندر نیچے ہی نیچے سلگتی رہتی ہے اور موقعہ پا کر پھر بھڑک اٹھتی ہے۔ میں نے جب فلاسفر کو دوبارہ دیکھا اور اس کے ساتھ تنہائی میں اٹھنے بیٹھنے اور سیر کو جانے کے مواقع ہاتھ آئے تو میں اور زیادہ اس کی گرویدہ ہو گئی لیکن وہ میرے لئے صرف ایک فلاسفر ہی بنا رہنا چاہتا تھا ہر وقت اپنے خیالوں میں گم۔ ہر وقت اپنے آپ میں محو اور اس کی یہ گمشدگی اور محویت مجھے اور زیادہ پیاری معلوم ہوتی۔ اس کی آنکھیں جو اس کی خوبصورتی میں خاص درجہ رکھتی تھیں اس سے کہیں زیادہ فلسفہ کی حامل تھیں۔ وہ مجھے سمندر سے بھی زیادہ گہری معلوم ہوتی تھیں اور ان میں مجھے زندگی کا فلسفہ

لکھا ہوا دکھائی دیتا۔

سات دن گزر گئے اور جینتی نہ آیا۔ دو ایک دن میں نے اس کی جدائی بہت زیادہ محسوس کی لیکن پھر اس کی جگہ فلاسفر نے لے لی اور مجھے کم از کم دن میں وہ بہت کم یاد آتا۔ جینتی ایک ایسا مرد تھا جس میں تقریباً ساری خوبیاں تھیں۔ خوبصورت، طاقتور، تعلیمیافتہ، امیر اور حق شناس، لیکن ہم عورتیں چونکہ خود کمزور ہوتی ہیں اس لئے ہم بعض دفعہ مرد کی کمزوریوں سے محبت کرنے لگ جاتی ہیں اور جینتی میں بظاہر کوئی کمزوری تھی نہیں۔ فلاسفر مجھے میری طرح کمزوریوں کا مجموعہ نظر آتا تھا۔ اس لئے بھی مجھے اس سے زیادہ محبت ہوگئی۔ وہ بیڈمنٹن کھیلتا تو کبھی میں اسے ہرا دیتی۔ کبھی وہ ہرا دیتا، اس کے ساتھ کھیلنے میں مجھے اتنا لطف آتا کہ جینتی کے ساتھ کھیلنے میں کبھی نہیں آیا۔ جینتی کو میں کبھی نہ ہرا سکی۔

میں اُس کے ساتھ سیر کو جاتی تو ندی کے کنارے جا کر وہ چپ چاپ پانی کی سطح پر نظریں جما کر بیٹھ جاتا اور سوچا کرتا۔ میں خاموش بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہتی اور مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ میری آتما آکاش کی بلندیوں پر اُڑ رہی ہے۔ برخلاف اس کے جب میں جینتی کے ساتھ سیر کرنے جایا کرتی تھی تو نہ وہ خود نچلا بیٹھتا اور نہ مجھے بیٹھنے دیتا۔ کبھی خود چھلانگیں لگاتا کبھی مجھے کہتا اس ٹیلے پر سے کودو۔ اُس ٹیلے پر ایک ٹانگ کے بل چڑھو۔ یہاں سے وہاں تک بھاگی ہوئی جاؤ اور راستے میں سانس نہ لو۔

آٹھویں دن جینتی آیا تو میرے لئے بڑے تحفے لایا اور اپنے فلاسفر دوست کے لئے کچھ بھی نہ لایا۔ میں نے شام کو موقع پا کر اس سے کہا۔ یہ آپ نے ٹھیک نہیں کیا کہ اپنے فلاسفر دوست کے لئے کچھ نہیں لائے اس نے میری طرف خاص انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہیں ناگوار نہ ہو تو اپنی ان چیزوں میں سے آدھی اس کی بیوی کے لئے اُسے دیدو۔ حال ہی میں اس کی شادی ہونے والی ہے۔

میں نے خوشی سے اس کی یہ بات منظور کر لی۔ اور آدھی کیا میں تو ساری چیزیں خوشی سے اس کو دے دیتی۔ فلاسفر نے شکریہ کے ساتھ وہ چیزیں لیں اور اپنی ہونے والی بیوی کی باتیں کرتا رہا۔ جنھیں نہ معلوم کیوں رنج پہنچا۔

رات کو جینتی نے مجھ سے پوچھا کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کے فلاسفر دوست نے مجھے کوئی شکایت کا موقع تو نہیں دیا۔ میں اس کا مطلب نہیں سمجھی اور تیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا وہ مسکرا پڑا اور بولا میرا مطلب صرف یہ ہے کہ اس نے تمہیں پریشان تو نہیں ہونے دیا۔ یعنی وہ تمہارا دل تو بہلاتا رہا۔ میں پھر بھی اس کا مطلب نہیں سمجھی اور اسی طرح اس کی طرف تکتی رہی۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ ہم تینوں ایک ساتھ سیر کو جاتے، ایک ساتھ بیڈمنٹن کھیلتے۔ ان دو وقتوں کے علاوہ فلاسفر صاحب اپنے کمرہ میں بند فلسفہ کی موٹی موٹی کتابیں پڑھتے رہتے۔ بیڈمنٹن کھیلتے وقت جینتی ایک طرف ہوتا اور میں اور فلاسفر دوسری طرف اور پھر بھی اکثر وہی جیتتا۔

میرے دل میں ایک انقلاب پیدا ہو رہا تھا۔ مجھے روز بروز فلاسفر سے زیادہ سے زیادہ محبت ہوتی جاتی تھی اور یہ بات مجھے بڑی ناگوار گزرتی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ جینتی کے علاوہ کسی اور مرد سے محبت کروں یہ میرے دھرم کے خلاف تھا۔ میری عقل کے خلاف تھا اور میری ضمیر کے خلاف تھا لیکن دل نہ دھرم کی پروا کرتا ہے نہ عقل کی اور نہ ضمیر کی۔ آخر ایک روز تنگ آ کر میں نے جینتی سے کہا۔

"یہ آپ کا فلاسفر دوست کب تک ہمارے ساتھ رہے گا؟"

"کیوں ـــ اس کے رہنے سے کیا تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے؟"

جینتی نے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔

"تکلیف تو کوئی نہیں پہنچتی ـــ لیکن آخر اُسے دنیا میں کوئی کام کرنا چاہیئے یوں آپ کے ٹکڑوں پر کب تک پڑا رہے گا ـــ آخر اسے شادی کرنی ہے۔"

جتنا مجھ سے ضبط ہو سکتا تھا میں کر چکی تھی۔ اب یہ بات مجھے اپنی طاقت سے باہر معلوم ہوتی تھی کہ فلاسفر ہمارے ساتھ رہتا رہے اور میں اس پر اپنی محبت ظاہر نہ کر دوں اور ایسا میں کرنا نہ چاہتی تھی لہٰذا یہی مناسب معلوم ہوا کہ جینتی سے کہہ کر اسے یہاں سے چلتا کرا دوں لیکن جینتی پرماتما جانے کس خیال میں تھا اس نے مجھے اور اُسے فرشتہ کیوں سمجھ لیا تھا آخر ہم انسان تھے اور نوجوان ـــ!

"دیکھو! کملا میں آئندہ تمہاری زبان سے اس کے متعلق ایسے الفاظ نہیں سننا چاہتا۔ تم چاہو تو میری توہین کر سکتی ہو لیکن میرے فلاسفر دوست کی نہیں کر سکتیں۔ وہ یہاں میرے ٹکڑوں پر نہیں پڑا ہے۔ پرمیشر کا دیا اس کے پاس بہت کچھ ہے۔ یہ اس کی مہربانی ہے کہ میرے ساتھ رہتا ہے۔"

"لیکن جینتی میں عورت ہوں اور عورت آخر انسان ہوتی ہے تم اس پر جتنا چاہو اعتماد کر لو ـــ"

نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا اور میں کیا کہنا چاہتی تھی اور پھر کہتے کہتے خود بخود چپ کیوں ہو گئی۔

جینتی کی پیشانی پر تیور آئے اور غائب ہو گئے اُس نے کہا۔

"اس پر مجھے جتنا اعتماد ہے سو ہے لیکن اس سے زیادہ میں تم پر اعتماد کرنا چاہتا ہوں۔ تم اپنے آپ کو اتنا کمزور نہ سمجھو۔ عورت کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کمزور سمجھتی ہے۔"

"لیکن جینتی ——"

"پاگل نہ بنو —— پیشتر اس کے کہ تم کچھ بولو۔ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو کچھ تم کہنا چاہتی ہو اسے اچھی طرح سوچ لو۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں تم کو پچھتانا پڑے۔"

میں خاموش ہو گئی۔ جینتی چپ چاپ کمرے سے چلا گیا۔ میں بیٹھی سوچتی رہی کہ یہ مجھے آگ سے کھیلنے پر مجبور کرتا ہے اور پھر یہ بھی چاہتا ہے کہ اس آگ سے میں اپنا دامن یا ہاتھ پاؤں نہ جلا لوں۔ میں اس سے کوئی دغا یا بیوفائی نہ کرنا چاہتی تھی۔ اور اسی لئے میں نے درخواست کی تھی کہ فلاسفر دوست کو کہیں الگ رہنے دے لیکن اسے اس سے ایسی محبت تھی کہ اس کے سامنے میری —— اپنی بیوی کی پروا نہ تھی۔ نفس نے ورغلانے کی کوشش کی کہ جینتی کو اس کی ضد کی سزا دینی چاہئے لیکن پھر ضمیر نے روشنی دکھا دی۔

میں نے اس معاملہ پر خوب غور کیا اور دوسرے دن جینتی سے پھر درخواست کی کہ وہ مجھے میکے میں ایک مہینہ رہنے کی اجازت دیدے۔ اس مرتبہ وہ بہت زیادہ نرمی سے پیش آیا اس نے کہا۔

"کملا پیاری تم جانتی ہو کہ گھر میں اور عورت کوئی نہیں۔ ورتمہارے آنے سے پہلے یہاں خاک اڑتی تھی لیکن اب یہ ایک چھوٹی سی بہشت ہے چیزیں اب بھی گو وہی ہیں لیکن تم نے ان میں ایک خاص جاذبیت ایک خاص کشش بھر دی ہے لیکن اگر ماتا پتا سے ملنے کو تمھارا جی بہت ہی زیادہ چاہتا ہے تو میں تمھیں نہیں روک سکتا۔ میں دیسو کو تار دیدیتا ہوں کہ آ کر تمھیں لے جائے —— مگر پرماتما کے لئے ایک ہفتہ سے زیادہ وہاں نہ ٹھہرنا۔"

ایک دن اور گزر گیا۔ جینتی اور اس کا دوست تقریباً تمام دن ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی سوچتی رہی —— تجویزیں سوچتی رہی وہاں سے جانے سے پہلے میں یہ فیصلہ کرنا چاہتی تھی کہ آیا ایک ہفتے میں واپس آ جاؤں جیسا کہ جینتی نے درخواست کی تھی یا وہاں ہی رہوں اور جینتی کو مجبور کروں کہ اگر وہ مجھے بلانا چاہتا ہے تو اپنے دوست کو چلتا کرے اور یہ کہ میں جاؤں یا نہ جاؤں۔

دوسرے دن دیسو دوپہر کی گاڑی سے آ گیا۔ ہم سب اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور سب نے مل کر بہت اچھا وقت گزارا۔ کبھی سیاست کی باتیں کرنے لگتے کبھی کھیلوں کی۔ شام کو ہم بیڈمنٹن کھیلنے لگے جینتی اور میں ایک طرف ہوئے اور دیسو اور فلاسفر دوسری طرف۔ ہم دو بازیاں کھیلے اور دونوں ہمیں نے جیتیں۔ جینتی کے تیز اور سخت کھیل سے مجھے پہلی مرتبہ خوشی حاصل ہوئی۔ پھر میں اور فلاسفر الگ ہو گئے۔ جینتی اور دیسو ایک اور بازی کھیلنے لگے۔

کچھ دیر تو ہم وہاں کھڑے رہے پھر میں فلاسفر کو اکیلا چھوڑ کر اپنے کمرے میں لباس تبدیل کرنے چلی گئی۔ لیکن ابھی میں لباس تبدیل کر ہی رہی تھی کہ دروازے سے کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور جا کر دروازہ کھول دیا اور گیان کو دیکھ کر حیران ہو گئی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے نہایت خشکی سے کہا۔ اسکی آنکھوں میں کوئی عزم —— کوئی خوفناک عزم جھلک رہا تھا۔

اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔ خاموش کھڑا رہا۔

میں نے پھر پوچھا۔ "کیا بات ہے —— تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"میں تمھارے کمرے میں آ سکتا ہوں؟" آخر وہ بولا۔

"تم اتنے رنجیدہ کیوں ہو؟ کیا کوئی خاص بات ہو گئی ہے؟"

وہ کمرے میں بغیر میری اجازت حاصل کئے داخل ہو گیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں جہاں تھی وہیں دروازے میں کھڑی رہی اور اس کے چہرے کی طرف تکتی رہی تاکہ چہرے سے دل کے حالات معلوم کر دں۔

ایک یا دو منٹ کے توقف کے بعد اس نے کہا۔

"میں تم سے ایک بات پوچھنے آیا ہوں —— !"

وہ خاموش ہو گیا۔

میں اس کی طرف اور زیادہ تیز نظروں سے گھورنے لگی۔

وہ پھر بولا ——

"میں تم سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ تم ہمیں اکیلا چھوڑ کر کیوں جا رہی ہو۔ میرا مطلب ہے جینتی کو اور مجھے۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ جینتی تم سے کتنی محبت کرتا ہے اسے تمھاری جدائی سے کتنا رنج پہنچے گا۔"

"اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں یہاں رہوں —— جینتی کے ساتھ رہوں تو تمھیں یہاں سے چلا جانا ہو گا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرے دل میں تمھاری بڑی عزت ہے لیکن پرماتما کے لئے اس گھر سے چلے جاؤ۔ میں ہمیشہ تمھاری اسی طرح عزت کرتی رہونگی۔ تمھاری موجودگی سے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

میں جو کچھ کہنا چاہتی تھی ایک دم کہہ دیا۔ یہ خیال تک نہ کیا کہ اس پر اس کا کیا اثر پڑے گا اور اس سے اس کے جذبات تو زخمی نہیں ہونگے۔

اور اُس نے کہا ۔۔۔۔

"کملا یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میں تمھاری محبت کی آگ میں جلا جا رہا ہوں جب سے میں نے تمھیں دیکھا ہے تمھاری صورت ایک لمحہ کے لئے میرے خیال سے جدا نہیں ہوئی۔ سوتے جاگتے مجھے ہر وقت تمھارا ہی خیال رہتا ہے لیکن چونکہ اب تم دوسرے کی ہو چکیں اس لئے میرا تم پر کوئی حق نہیں اور خاص طور پر جب کہ تم میرے عزیز ترین دوست کی بیوی ہو لیکن کملا پیاری ۔۔۔ پہلی اور آخری مرتبہ پیاری کہہ لینے دو۔ مجھے اپنے پاس سے ۔۔۔۔ میری زندگی سے دور جانے کے لئے نہ کہو۔"

میں اس کے اظہار محبت سے بےخودسی ہوگئی۔ جی میں آیا کہ خود بھی کچھ عرضِ حال کردوں لیکن ضمیر نے سیدھے راستے پر ڈال دیا اور میں نے کہا۔

"میں تمھاری زبان سے ایسی باتیں نہ سننا چاہتی تھی۔ تمھیں شرم نہیں آتی کہ تم اپنے دوست کی بیوی سے ایسی باتیں کہہ رہے ہو۔ مجھے دنیا میں صرف ایک مرد سے محبت ہے اور وہ مرد میرا شوہر ہے۔"

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر کچھ کہنے کے بجائے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں اور میری پیشانی چوم لی۔ میرے سارے ارادے اور مستقل مزاجی دھری رہ گئی میں نے بھی اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔ میں پاگل ہو گئی۔ میں مذہب کو بھول گئی۔ میں ضمیر کو بھول گئی۔ مجھے کچھ بھی یاد نہ رہا۔

ٹھیک اس وقت جب ہم ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے کھڑے تھے جینتی دوسرے کمرے میں سے اچانک آ گیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں پستول تھا۔ میں اور فلاسفر دونوں خوف سے کانپ اُٹھے جینتی کی آنکھیں غصہ سے لال ہو رہی تھیں۔ ایک منٹ تک اس نے غصہ سے کچھ نہیں کہا ہمیں غصہ سے گھورتا رہا۔ پھر میرا بازو پکڑا اور دوسرے کمرے میں کھینچ کر لے گیا اور وہاں ایک صوفہ پر گرا کر پھر اسی کمرے میں چلا گیا اور فلاسفر سے چیخ کر پوچھا۔

"تم دونوں یہاں کیا کر رہے تھے ؟"

"کچھ نہیں" فلاسفر نے نہایت مطمئن آواز میں کہا۔ اس کی آواز کے سکون پر مجھے تعجب ہوا۔

"جھوٹ مت بولو" جینتی نے غصہ بھری آواز میں کہا "اگر تم نے سچ سچ بات نہ بتائی تو میں تمھیں جان سے مار ڈالونگا۔"

"اور اگر میں نے سچ سچ بات بتا دی تو بھی کیا تم مجھے چھوڑ دو گے؟"

فلاسفر کے جواب سے میں ایک دفعہ اور کانپ اٹھی۔

"اچھا پہلے میں کملا سے پوچھتا ہوں۔" جینتی نے کچھ سوچ کر کہا۔

میں صوفے پر پڑی بدستور خوف سے کانپ رہی تھی۔ وہ میرے قریب آیا اس کی آنکھیں لال انگاروں کی طرح سُرخ ہو رہی تھیں۔

"کملا! تمھاری کمزوری آخر رنگ لائی۔"

"مجھ سے کچھ نہ پوچھو ۔۔۔ پستول کی نالی میرے سینے کے قریب لاؤ اور چلا دو ۔۔۔۔" میں نے بمشکل یہ الفاظ کہے وہ غصہ سے لال پیلا ہو رہا تھا۔

"پہلے مجھے ساری بات بتانی ہوگی۔"

"میں کچھ نہیں بتاؤنگی" میں نے کہا۔ میں اس وقت کیا کہتی جب کہ ایک دن پہلے کہہ چکی تھی کہ مجھ پر اعتماد نہ کرو۔"

"تم کچھ نہیں بتاؤ گی" اس نے غصہ میں دانت پیس کر کہا اور پستول کی نالی میری طرف کر دی۔

خوف سے میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

ابھی اس نے پستول نہ چلایا تھا کہ آواز آئی۔

"خبردار جو پستول چلایا۔"

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ فلاسفر بندوق لئے کھڑا تھا اور جینتی کی طرف شست باندھ رکھی تھی۔

پھر میرا بھائی آ گیا اس کی آنکھوں میں مجھے ایسی ملامت نظر آئی کہ میرے جی میں آیا کہ فوراً گلا گھونٹ کر مر جاؤں۔ جینتی اور گیان ایک دوسرے کو حقارت اور غصہ سے دیکھتے رہے۔ یہ میرے لئے بہت زیادہ تھا۔ میں بیہوش ہو گئی۔

رات کو آہستہ آہستہ مجھے ہوش آیا آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ ایک نہایت خوبصورت لڑکی قیمتی ساڑی پہنے میرے قریب بیٹھی ہے۔

"اے پرماتما" میں نے سوچا۔ "کیا میں خواب دیکھ رہی ہوں یا دوسری دنیا میں ہوں۔"

خوبصورت لڑکی نے مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر جینتی کو آواز دی۔ دلیپ اور جینتی دونوں ایک ساتھ آ گئے۔

جو کچھ شام کو ہو چکا تھا تیزی سے میرے سامنے آ گیا اور میں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ اس مرتبہ خوف کا اتنا غلبہ نہ تھا جتنا کہ شرم کا تھا دنیا کی کوئی نیک بیوی ایسی بےوفائی کرنے کے بعد جیسی کہ میں نے کی تھی اپنے پتی سے آنکھ نہیں ملا سکتی۔

"کملا پیاری اب کیسی طبیعت ہے؟" جینتی نے بڑی نرمی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کا گرم گرم اور نرم لمس محسوس کیا اور آنکھیں کھول دیں۔ وہ مجھ پر جھک رہا تھا اور ہمیشہ کی طرح مہربان

دکھائی دیتا تھا۔ اب اس کی آنکھوں میں نہ غصہ تھا نہ ملامت۔ اس اچانک تبدیلی سے مجھے سخت حیرت ہوئی۔ مجھے شام کا سارا واقعہ یاد تھا۔ مجھے اس کا ایک ایک لفظ یاد تھا۔ اب اسے کیا ہو گیا تھا۔ وہ اتنا زیادہ کیوں بدل گیا تھا۔ فلاسفر کا کیا ہوا۔ میں سوچتی رہی اور پھر دیسو کی طرف نظر کی شاید دیسو ہی اس بات پر کچھ روشنی ڈالے۔ وہ شرارت سے مسکرا رہا تھا۔ میں نے ایک دفعہ پھر آنکھیں بند کر لیں۔

اس مرتبہ دیسو بولا۔

"کملا آنکھیں کھولو اور اس خوبصورت لڑکی کو دیکھو — کیا تم اسے پہچان سکتی ہو؟"

میں نے ایک مرتبہ اور اس حسین لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی شکل و صورت بالکل فلاسفر سے ملتی تھی۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کہا۔ فلاسفر ساڑی پہن کر میرے پاس کیسے بیٹھ سکتا تھا۔ جبکہ صرف چند گھنٹہ پہلے ایسا ناخوشگوار واقعہ ہو چکا تھا۔

جینتی نے ایک راحت بخش تبسم کے ساتھ کہا۔

"یہ ہمارا فلاسفر دوست ہی ہے کملا پیاری — حقیقت میں یہ میری بہن ہے۔ میرے باپ نے ایک سخت غلطی کی تھی — پرماتما میری اس نکتہ چینی کو معاف کر دے۔ انھوں نے اس کی شادی بچپن ہی میں کر دی تھی اور ابھی یہ شادی کے معنی بھی نہ سمجھنے لگی تھی کہ بیوہ ہو گئی ہمارے دھرم میں تم جانتی ہو کہ لوگ ودھواؤں کے اچھے کپڑے پہننے اور زندگی کی دلچسپیوں میں حصہ لینے پر اعتراض کرتے ہیں۔ ہمارے رشتہ داروں نے بھی اعتراض کیا اس سے مجھے اور میری بہن کو بڑا صدمہ پہنچا میں نے اسے لوگوں کے طعنوں سے بچانے کے لئے مشہور کر دیا کہ میں اسے ودھوا آشرم میں بھیج رہا ہوں اور میں نے بھیج بھی دیا تھا لیکن پھر کچھ دنوں میں مردانہ لباس پہنا کر واپس لے آیا۔"

"یہ سب کچھ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ وہ بوجھ جو میرے دل کو نیچے ہی نیچے دبائے چلا جا رہا تھا جینتی نے ایکدم ہٹا دیا۔

جینتی نے آگے کہا۔

"اب کل اسے دیسو اپنے ساتھ گھر لے جا رہا ہے لہذا اب تمہیں ہمارے فلاسفر دوست کی وجہ سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

نغمۂ عید

از:- حضرت شعلہ وارثی لکھنوی

بہارِ عید چمن میں ہے گُل کھلائے ہوئے
روش روش کو صبا ہے دولھن بنائے ہوئے

جھکی ہی پڑتی ہے ہر شاخِ گُل گلے ملنے
بڑھے نہالِ چمن ڈالیاں لگائے ہوئے

یہ کہہ رہا ہے غرور آج ان حسینوں سے
حضور خاک سے دامن ذرا بچائے ہوئے

خوشی ہے آج قیامت کی روزہ داروں میں
فلک کو دیکھتے ہیں ٹکٹکی لگائے ہوئے

چمن میں جوشِ مسرّت کی دھوم ہے ہر سو
بلا کا لالۂ صحرا ہے رنگ لائے ہوئے

یہ بزم کس کی بنی آج غیرتِ فردوس
سوادِ ہند کی روحیں ہیں دل لبھائے ہوئے

یہ کس کی بزم ہے کس کے لئے یہ ساماں ہے
مری نگاہوں میں یہ کون ہیں سمائے ہوئے

فلک پہ آج سلامِ حضورؐ کو شعلہ
ہلالِ عید بھی نکلا ہے سر جھکائے ہوئے

اُن کی انگڑائی

ایک منظر

از حضرت عرش حیدری دہلوی

اُن کی انگڑائی کہکشاں نکلی　　عرش والوں کی ہمزباں نکلی
ماہِ نو بن کے رات کو اکثر　　بزمِ انجم کی پاسباں نکلی
کوئی قوسِ قزح سمجھ بیٹھا　　تیر ہوتے ہوئے کماں نکلی
چشمِ ساقی میں موجِ مے بن کر　　اہلِ تقویٰ سے بدگماں نکلی
کبھی محرابِ کعبۂ ایماں　　حسن والفت کے درمیاں نکلی
حلقۂ زلف، پرتوِ ابرو　　قاتلِ قلبِ عاشقاں نکلی
دامنِ چاک بن کے غنچوں کا　　ایک رنگین داستاں نکلی
طُور پر برق بن کے لہرائی　　دشتِ ایمن کی رازداں نکلی
عالمِ بیخودی کی پیغمبر　　ضبطِ موسیٰ کا امتحاں نکلی
ان کی انگڑائی ہائے کیا کہنا　　دوست بن کر رقیبِ جاں نکلی

حُسن و اُلفت کے درمیاں گویا
عرش دو قالب ایک جاں نکلی

یونان اور روم کا فلسفۂ سیاست

سیاسیات

از جناب ہندی گورکھپوری

یونان

سیاست کا فلسفہ پانچویں صدی قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے اس سے قبل مصر، بابل، ایشیائے کوچک اور جزیرۂ قبرص میں بھی اس کے آثار نظر آتے ہیں۔ ہمیں مشرق کی مقدس کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان اور چین میں بھی سیاسی معاملات پر کافی فکر و غور کیے جا چکے تھے مگر یہ ابتدائی ریاستیں الوہی حکومتیں Theocracies تھیں جن کے قوانین خدائی احکام متصور ہوتے تھے۔ مصر کے فراعنہ کو لوگ خدا مانتے تھے اور شاہ بابل دیوتاؤں کی نسل سے شمار کیا جاتا تھا۔ اس ابتدائی دور میں سیاست اور مذہب دونوں ایک ساتھ وابستہ تھے یونانیوں نے سب سے پہلے اپنے آپ کو "وہمی قصوں" کی زنجیروں سے آزاد کیا۔ انھوں نے اشیاء کو ان کی اصلی ماہیت میں دیکھنے کی کوشش کی اور "توہمات" سے پیچھا چھڑا کر حقیقت کو جاننے کی کوشش کی لیکن اس سے یہ مقصد نہیں کہ انھوں نے مذہب کو بالکل چھوڑ دیا تھا کیونکہ اس زمانہ کا ایک مقولہ ہے کہ یونان کے شہر ایتھنز میں دیوتاؤں کی تعداد انسانوں کی تعداد سے بہت زیادہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یونانیوں نے مذہب کو شدید اہمیت نہیں دی تھی اس قسم کے فلسفیوں میں سب سے پہلا نمبر فیثاغورث کا ہے جو محض ایک فطری فلسفی تھا سیاسی مدبر نہیں تھا۔

یہ "سوفسطائیوں" کا فلسفہ تھا جس نے مذہب اور "رسمی اخلاقیات" سے پورا چھٹکارا حاصل کر کے حب الوطنی، مدنیت اور انفرادی حقوق کی مکمل آزادی کی آواز بلند کی۔ سوفسطائیوں نے "یونانی مدنی ریاست" Greek City State کی پوری پوری مخالفت کی۔ "ریاست" کے وجود کو انھوں نے "دستوری" اور "اجارانہ" حیثیت دی۔ "قانون" کو "اعلیٰ طاقت" کا ترجمان بتایا اور حقوق کو طاقت پر ترجیح دی۔

سوفسطائیوں کے بعد سقراط میدان سیاست میں رونما ہوا اور اس نے ان کے فلسفہ کے عیوب اور بحثوں کی غلط فہمیوں کو بے نقاب کر کے لوگوں کو یہ تعلیم دی۔ کہ ریاست کا وجود فطری اور لابدی ہے۔ قانون مقدس اور ناقابل تغیر ہے۔ ماہ ت غلام ہے ابدی حق کی۔ اجتماعیت پہلی اور انفرادیت بعد کی چیز ہے اور حکومت ایک اعلیٰ فریضہ ہے جس کی ذمہ داری جماعت کے سب سے زیادہ دانشمند اور بہترین افراد پر ہے۔

افلاطون سقراط کے بعد افلاطون سقراط کے شاگرد رشید نے اس کے نظریہ کو قلمبند کیا۔ اس نظریہ کے تین بنیادی اصول ہیں۔

۱۔ یہ کہ "دیانتداری" اور "راستبازی" زندگی کا مقصد اعلیٰ ہے۔

۲۔ یہ کہ "دیانتداری" اور "علم" دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔

۳۔ یہ کہ "ذہن" جو علم کا آلہ متحرکہ ہے انسان میں سب سے ارفع طاقت ہے

مذکورہ بالا تینوں اصول افلاطون نے اپنی مشہور عالم تصانیف جمہوریت Republic مدبر Statesman اور "قانون" The Laws میں قلمبند کئے ہیں۔ جمہوریت میں اس نے سوفسطائیوں کے فلسفہ کی پوری پوری مخالفت کی ہے جس کا نمائندہ تھریسی ماکس Thrasymachus ہے۔ افلاطون نے اس کو مغرور، بالونی۔ فسادی اور نیٹ احمق کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سقراط اور تھرسی ماکس میں مکالمہ اور مباحثہ ہوتا ہے سقراط اس پر غالب آتا ہے اپنے حریف کو پچھاڑنے کے بعد سقراط "افراد" اور "ریاست" کے تعلقات کے صحیح فلسفہ کی طرف توجہ کرتا ہے جو ایک طویل مکالمہ کی صورت میں ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ریاست ہی افراد کی اچھی زندگی کا حامل ہے اس لئے افراد کے اعلیٰ فریضہ کا تعلق اسی سے ہے اور بحیثیت شہری ان کی یہ پابندی مقدم ہے۔ تمام دوسری وفادارانہ پابندیوں پر۔ وہی شخص منصف ہے جو مدنی زندگی میں اپنے لئے مناسب مقام حاصل کر لیتا ہے اپنے "مدنی امور" کو راستبازی کے ساتھ پورا کرتا ہے اور اپنے جملہ مخصوص مفاد کو "فلاح عامہ" کے تابع رکھتا ہے اس نے منظم ریاست کے تین درجے بتلائے ہیں۔ ۱ حاکم Councillors ۲۔ سپاہی warriors ۳۔ مزدور work men،

ہر وہ آدمی جو منصف کہلانے کا مستحق ہے ان میں سے کسی ایک درجہ میں اپنے لئے جگہ حاصل کر لیتا ہے۔ اور فرائض عامہ کی ادائگی میں چونکہ طاقت صرف کرنے کے لئے "حاکم" اور "سپاہی" کو ذاتی مفاد کے جھمیلوں سے بالکل آزاد ہونا چاہیئے اس لئے نہ تو وہ کسی جدا جائے رہائش کے مستحق ہیں اور نہ ذاتی

جائداد کے ان کو جماعت ہی میں رہنے کا حق ہے اور گاہے گاہے مجسٹریٹ کی ہدایت کے بموجب غیر مستقل شادی بھی کر سکتا ہے۔

افلاطون کی سیاسی اسکیم میں تعلیم Education خاص مرتبہ رکھتی ہے۔ جمہوریت کی سیاسی اشتراکیت چونکہ قابل عمل اور عام فہم نہیں تھی۔ اس لئے۔ "مدبر" اور "قانون" میں افلاطون نے اس کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ "قانون" میں وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ افلاطونی 'اشتراکی سرپرستوں اور فلسفی بادشاہوں کی عدم موجودگی کی حالت میں ایک "متحدہ دستور" طاقتوں کی تقسیم اور ——— علیحدگی کے ساتھ قابل عمل ہے۔

افلاطونی فلسفہ کا سیاست پر گہرا اثر پڑا خصوصاً نشاۃ ثانیہ۔ Renaissance کے دور سے نیکر ستسرو اور سینٹ اگسٹائن کے علاوہ۔ ٹامس مور۔ روشو۔ فختے۔ ہیگل اس کی تجدید کے علمبردار ہیں لیکن عہد وسطیٰ کے آخری زمانے میں ارسطو کا فلسفہ مقبول عام تھا۔ ارسطو افلاطون کا شاگرد تھا اور ۳۸۴ قبل مسیح اسٹگرائیٹ میں پیدا ہوا اس کا باپ امنتاس دوم Amyntas II شاہ میڈونیا کا شاہی حکیم تھا ۳۶۷ ق م سے لیکر ۳۴۷ء تک ارسطو، افلاطون کے شاگرد کی حیثیت سے ایتھنز میں مقیم رہا اور اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ ممتاز رہا اس میں انفرادیت بدرجہ اتم موجود تھی اور وہ افلاطون کے کسی بھی نظریہ کو بآسانی قبول نہیں کرتا تھا اس لئے افلاطون کے بعد اس کے علمی ادارہ کی سرکردگی اس کے ایک غیر معروف رشتہ دار کے ہاتھ میں آئی۔ ارسطو بیس سال تک ایتھنز سے باہر رہا کئی سال تک وہ سکندر اعظم کا اتالیق بھی رہا ۳۳۵ ق م میں وہ پھر ایتھنز آیا اور لیسیم Lyceum میں فلسفہ کا ایک نیا ادارہ قائم کیا جہاں وہ اخیر عمر تک تعلیم دیتا رہا۔

چوتھی صدی قبل مسیح تک یونانی دنیا میں جتنے بھی علوم رائج تھے مثلاً منطق، سائنس، فلسفہ، ادب، اخلاقیات، اقتصادیات، تاریخ اور سیاست وغیرہ ارسطو نے سب پر قلم اٹھائے ہیں۔ افلاطون کی طرح ارسطو مکالموں اور مباحثوں سے کام نہیں لیتا۔ وہ خیالی دنیا میں پرواز نہیں کرتا ہے بلکہ سرزمین ہی پر جادہ پیما نظر آتا ہے۔ ارسطو کی تصانیف منظم اور اصولی مضامین اور تقاریر کی صورت میں ہیں۔ ارسطو نے نہ صرف افلاطون کے اس فلسفہ کو رد کرتا ہے کہ "مثالیت" Idealism "حقیقت محض" ہے بلکہ فیثاغورث کی "الوہیت" اور "علم الاعداد" کو بھی رد کرتا ہے۔

"سیاست" ارسطو کی بہترین تصنیف ہے جس میں وہ افلاطونی کمیونزم کی مخالفت کرتے ہوئے اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ "ریاست" کی بنیاد "وہی خاندانی اور مخصوص ادارے ہیں" جن کو افلاطون نے اپنی جمہوریت سے علیحدہ کر دیا ہے اس کے بعد وہ ریاست کے ارتقا کی طرف رخ کرتا ہے جو خاندان اور دیہات سے شروع ہوتا ہے اور بعد کو شہر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہی اس کی آخری منزل ہے۔ ریاست کی تشریحات کے بعد ارسطو ریاست کو دو حصوں پر تقسیم کرتا ہے۔

۱۔ اخلاقی ریاستیں جن کا مقصد دیانتداری اور راستبازی ہے۔

۲۔ اعتدالی ریاستیں جن کے پیش نظر شہریوں کی فلاح و بہبود ہوتی ہے۔

قسم کی ریاستوں کی مخالف وہ ریاستیں ہیں جن کا مقصد گرا ہوا ہوتا ہے یعنی وہ محض طاقت اور دولت کے حصول کی کوشش کرتی ہیں دوسری قسم کی ریاستوں کی مخالف وہ ریاستیں ہیں جو کسی خاص جماعت کے مفاد کے لئے اپنی طاقتیں استعمال کرتی ہیں مگر اخیر میں وہ اس ریاست کے تین حصے کر کے اپنی بحث کو ختم کرتا ہے۔ یعنی۔

۱۔ شخصی حکومت ۲۔ امراء کی حکومت ۳۔ عوام کی حکومت!

روم

اگرچہ افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ میں شدید اور نمایاں فرق تھا مگر دونوں اس خیال میں متحد تھے کہ "یونانی مدنی ریاست" سیاست کی اعلیٰ اور ارفع صورت ہے دونوں مانتے تھے کہ اس کے داخلی و خارجی دشمن اس کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور دونوں کا یقین تھا کہ صرف "مدنی تعلیم" civic education کے ذریعہ ہی سے اس کی اصلاح اور حفاظت ہو سکتی ہے مگر یہ ان کی غلط فہمی تھی۔ ان کے عہد ہی میں اس ریاست کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اس کی تباہی کے اسباب ایتھنز، اسپارٹا اور مقدونیہ کے جنگوں کے علاوہ اور بھی بہت سے تھے۔ چنانچہ اس ریاست کے اندر ہی وہ زبردست خامیاں موجود تھیں جنھوں نے خود اس کا خاتمہ کر دیا۔ کیونکہ یہ یونانی مدنی ریاست نہ صرف محدود۔ مختصر اور خودغرض ہی تھی بلکہ یہ غیر مستحکم ظالم و جابر اور غلامی کا ایک زبردست سفاک ادارہ تھا جب فلپ شاہ مقدونیہ کے لڑکے سکندر اعظم نے یونانیوں کی شکست کے بعد ۱۳ سال کے اندر ایک زبردست حکومت قائم کی تو اس وقت یہ عظیم الشان ریاست محض میونسپلٹیوں میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔ مقدونیہ۔ شام اور مصر اس کے تین حصے تھے۔ شام اور مصر کے ممالک بعد کو روم کی ماتحتی میں شامل ہو گئے تھے۔ روم کی تہذیب یونانی تھی۔ اس کی زبان، اس کا ادب، قانون اور اس کے سیاسی خیالات سب کے سب ایتھنز کے کلچر کے زیر اثر تھے ——— جو سکندر اعظم کا لایا ہوا تھا ———،

لذتی اور رواقی

یہ یقین کرلینے کے بعد کہ یونانی مدنی ریاست کا دور ختم ہو گیا ایپکورس Epicurus اور زینو Zeno نے ایتھنز میں اپنی تعلیمات کی مہم شروع کی۔ ایپکورس جزیرہ ساماس کا باشندہ تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ افلاطونی ادارہ میں شامل ہو گیا۔ زینو، سپرس کا باشندہ تھا۔ ایپکورس انفرادیت کا علمبردار تھا، اس نے سوفسطائی فلسفہ کی پھر سے داغ بیل ڈالی اور "لذت" کی تعلیم دی اس کی تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ "انفرادیت ہی دنیا میں سب کچھ ہے۔ لذت اور خوشی زندگی کا مقصد ہے ریاست اس مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے انصاف کا کوئی انفعالی وجود نہیں۔ مذہب تشدد آمیز وہم ہے حکومت غیر اہم چیز ہے (بشرطیکہ وہ اتنی طاقتور اور مکمل ہو کہ اس کے ذریعہ سے بغیر کسی انتشار کے امن قائم کیا جاسکے اور افراد "لذت یاب" ہو سکیں) اس فلسفہ کے ماننے والوں نے پبلک کے کاموں سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور اپنی خودی میں گم ہو کر رہ گئے۔ عملی دنیا میں اگر آئے بھی تو عیوب کا شکار ہو گئے اور کسی بھی سوسائٹی کے فریضہ کے مستحق نہ رہے اس لئے ان کے فلسفہ کو عوام میں کوئی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ ہوریس Horace اور لیوکریشیس Lucretius کی نظموں کے علاوہ جو خالص لاطینی زبان میں ہیں ان کے فلسفہ کا اور کہیں بھی نشان پاتی نہیں۔

اس کے برعکس رواقیت Stoicism کو روم میں بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی یہ خصوصیت سے بہت کچھ مشابہت رکھتی ہے سینٹ پال کی تعلیمات زیادہ تر اسی کے زیر اثر تھیں۔ رواقیوں نے "لذت" کے بجائے فرض کو اپنا نصب العین بنایا۔ یہ نہ تو انفرادیت پسند تھے نہ تو قومیت یا بین الاقوامیت ہی کو کوئی خاص اہمیت دیتے تھے۔ وہ دنیا کے سارے انسانوں کو ایک واحد اور ناقابل تقسیم جماعت خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک انسان شہروں کا خالق نہیں ہے بلکہ وہ اسی واحد اور ناقابل تقسیم جماعت کا ایک ممبر ہے۔ تمام انسان آپس میں بنیادی مساوات کا درجہ رکھتے ہیں انھوں نے ریاست کو ایک فطری ادارہ قرار دیا بشرطیکہ یہ ادارہ عام اور محیط عالم ہو اگر محدود ہے تو وہ ادارہ مصنوعی ہے۔ قانون قدرت کو ابدی اور اعلیٰ مرتبہ دیکر انھوں نے اسے تمام دنیاوی طاقتوں سے بالاتر قرار دیا۔ عدل اور انصاف جس کا مقدس اور قابل تعظیم حکم ہے جو انفعالی، ابدی، ناقابل تغیر اور عام ہے ان کے نزدیک مذہب کے دو مقصد ہیں۔

۱۔ اس ہمہ گیر عقل کی فرمانبرداری ۔ جو فطرت اور اس کے قانون کے ساتھ وابستہ ہے۔

۲۔ تمام فرائض کی ایماندارانہ تعمیل۔

خدا کا وجود ہے یا نہیں ان کے لئے یہ ایک غیر ضروری سوال تھا۔ اگر ہے تو وہ ان تمام تکالیف اور مصائب برداشت کرنے کے لئے تیار تھے جو ان پر نازل ہو سکتی تھیں اور اگر نہیں ہے تو وہ بغیر خدا کے بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔

لاطینی رواقیوں میں سینیکا Seneca کو جو عظمت نصیب ہوئی وہ کسی کو نہیں ہوئی اس نے سیاسی مسئلہ پر بہت کچھ خیال آرائی کی ہے مگر اس سے پہلے ہم پالی بس Polybius اور سسرو Cicero کے سیاسی خیالات جانتا ہیں۔

پالی بس نے اپنی بیش بہا تصنیف میں ان اصولوں کی فلسفیانہ تشریح کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے رومن دستور Roman Constitution کو پائداری اور طاقت نصیب ہوئی۔ اس کے نزدیک ارسطو کی قائم کردہ ریاست کے تین درجوں میں جو کچھ فرق ہے وہ خارجی اور بنیادی ہے وہ اپنی اصل حالت میں قطعی غیر مستحکم ہیں۔ پالی بس ہی نے عظمت روم کی وجہ "توازن قوا" قرار دیا ہے اس نے سب سے پہلے "توازن" کا نظریہ پیش کیا ریاست کو وہ نامی نہیں بلکہ میکانی تصور کرتا ہے۔ پالی بس کے تقریباً سو سال بعد جبکہ جولیس سیزر اپنی فاتح افواج کے ساتھ روم میں شاہی ڈکٹیری قائم کر رہا تھا سسرو نے اپنی تصانیف شروع کیں۔ وہ جولیس سیزر سے متنفر اور متوحش رہتا تھا۔ وہ ایک کٹر قسم کا جمہوریت پرست تھا اور مجسٹریوں کی کھوئی ہوئی عظمت کے لئے بےچین رہتا تھا۔ وہ رومن جمہوریت کو رواقیوں کی "فطری ریاست" سے تعبیر کرتا تھا۔ رومن قانون اور رواقیوں کے قانونِ فطرت کو ایک ہی چیز سمجھتا تھا۔ یہی سسرو کا عظیم الشان کارنامہ ہے اس نے اس قانون کو آسمان سے اتار کر زمین پر لاکر کھڑا کر دیا اور انسانوں میں سب سے پہلے حریت، مساوات اور اخوت کا عمل ہونے لگا۔ سیزر کی طرف سے سسرو کی نفرت اور وحشت نے سسرو کا خاتمہ کر دیا۔ رومن جمہوریت شاہی دفاتر میں تبدیل ہو گئی۔ نیرو Nero اس سلطنت کا پہلا اور بدترین حکمران تھا سینیکا جو نیرو کا اتالیق تھا وزارت کے عہدہ پہ معمور تھا سینیکا اور اس کا یہ منصبِ وزارت دراصل ایک حیرت کی چیز ہے کیونکہ ایک طرف اس کا رواقی فلسفہ جہاں موروثی ریاست اور قانونِ فطرت کارفرما ہے انسانیت معصومیت اور سرور ہے۔ نہ ذاتی جائداد ہے نہ غلامی اور محکومی۔ ہر طرف آزادی۔ برابری اور بھائی چارہ کا دور دورہ ہے اور دوسری طرف رومن سلطنت جس میں انتہائی بدفعلیاں۔ گھناؤنے جرائم۔ لاتعداد مصائب بھیانک غلامی اور نفرت انگیز غیر مساویانہ عمل اور خانہ جنگی لیکن سینیکا کے لئے کوئی چارہ کار نہ تھا کیونکہ رواقی اس وقت ظلم و تعدی کو "انارکی" (لومنیت") پر ترجیح دیتے تھے مگر یہ ارتباط کچھ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا اس کے چند ہی دن بعد رواقی بالکل گوشہ نشین ہو گئے۔

سینیکا کے بعد قسطنطین Constantine کے عہد تک رواقی فلسفہ کا عمل رومن قانون کے ساتھ شدت کے ساتھ ہوتا رہا۔

جوانی کی راتیں!

از:-

جناب اظہار حسن خاں اظہار ملیح آبادی

ابھی یاد ہیں شادمانی کی راتیں
وہ برکھا کی رُت وہ جوانی کی راتیں

نہ جانے وہ مدت سے ہیں کس طرف گم
مری اور تری زندگانی کی راتیں

میں قرباں کروں ان سیہ گیسوؤں پر
کہاں ہیں مری عمرِ فانی کی راتیں

مرے دل کے ٹوٹے ہوئے میکدے میں
بسی ہیں مئے ارغوانی کی راتیں

ابھی تک مرے آنسوؤں میں ہیں غلطاں
وہ مہتاب کی زرفشانی کی راتیں

نہ آئیں گے مر کر بھی اظہار واپس
وہ بچپن کے دن وہ جوانی کی راتیں

کیونکر بھُلاؤں؟

از:-
جناب عزیز احمد صاحب

سمندر کا تلاطم حشر آسا   تھپیڑوں کی صدا محشر کا نقشا
تصوّر میں تمنّاؤں کی گردش   مرے جذباتِ خوابیدہ میں جنبش

اگر سُن لو کبھی تمُ دل لگا کر
لگا دو مُہرِ خاموشی لبوں پر

سُنہرے ابر کے ٹکڑے فلک پر   فضا رنگیں، صبا مدہوش پی کر
مرے سینے میں دریائے محبت   گہر اشکوں کے نذرِ چشمِ اُلفت

اگر تمُ دیکھ لو بھولے سے اکبار
نگاہیں پھیر لو بیتاب ہو کر

گلستاں میں کلی کا مُسکرانا   گُلِ تازہ کِھلا کر روٹھ جانا
حسیں چہرہ نگاہیں مسکراتی   تمھاری کج ادائی بے وفائی

بھُلاتا ہوں مگر کیونکر بھُلاؤں
محبّت کی لگی کیونکر بجھاؤں

گھر سے دُور

نفسیاتی افسانہ

از جناب سالک لکھنوی

ہر اتوار کو انھیں چھٹی ملا کرتی تھی اور چھٹی ملتے ہی وہ دونوں گھومنے نکل جاتے وہ چلتے رہتے یہاں تک کہ غریب مزدوروں کی جھونپڑیوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا پُل کے پار ہرے بھرے جنگل کے قریب پہنچ کر وہ اپنی رفتارِ معمول سے کم کر دیتے۔

دونوں دُبلے پتلے تھے۔ سروں پر میلی کچیلی ٹوپیاں۔ پاجامہ اور قمیص پر تیل کے سیاہ دھبے۔ پیروں میں پھٹے پرانے جوتے، خاموش و کم گفتار اپنے خیالوں میں گم، دونوں چلتے رہتے۔ رستہ میں بہت کم گفتگو ہوتی کیونکہ سون ندی کے کنارے پل سے اتر کر درختوں سے گھری ہوئی تنہائی میں ایک جگہ ایسی بھی تھی جو انھیں اپنے گھروں کی یاد دلاتی تھی ——— اور وہ وہیں پہنچکر خوش ہوتے تھے۔

اکثر سون ندی کے کنارے جب پانی کی روانی زیادہ ہوتی تو وہ کھڑے کھڑے خیالی دنیا میں چکر لگایا کرتے ان کی نگاہیں کسی ایک مرکز پر جم جاتیں اور اسی خیال میں وہ اپنے گھروں کا خواب دیکھنے لگتے۔ بوڑھے ماں باپ، چھوٹی بہن۔ گاؤں کے وہ نوجوان جن کے ساتھ بچپن کھیل کر گزارا تھا سبھی یاد آتے تھے۔ گاؤں چھوڑے انھیں دو برس ہو چکے تھے ——— وہ تنکر کی ایک مل کے مزدور تھے۔

انھوں نے اپنی مرضی سے گھر نہیں چھوڑا تھا بلکہ قسمت نے مجبور کر دیا تھا متواتر تین چار سال تک فصل خراب رہی بیچارہ بڈھا لگان دینے سے معذور تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن سرِعام اس کی زمین کا نیلام بول دیا گیا ——— دونوں بھائیوں کو غیرت آئی اور زمین واپس لینے کے لئے وہ قسمت کا نام لے کر چل نکلے کہ کچھ پونجی جمع ہو تو آرزو پوری ہو۔

تنکر مل میں پہلے تو معمولی مزدوری کرنا پڑی پھر کام دیکھ کر افسر نے سردار کر دیا تھا۔ آمدنی تو اب غنیمت تھی مگر فرصت کا نام نہ تھا کہ کبھی جائیں اور گھر ہو آئیں۔ ایک بار دونوں نے بڑی التجا کی، بڑی خوشامد کی مگر افسر ٹس سے مس نہ ہوا کہا کہ کام چھوڑا تو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑیگا۔

اس لئے ہر اتوار کو تھوڑی دیر کی خوشی کے لئے وہ جنگلوں کو نکل جاتے دن بھر یا دن کا بیشتر حصہ وہیں گزارتے اور اس طرح وہ چھٹی کا دن منا لیا کرتے تھے۔

رستے میں وہ کسی نانبائی کے یہاں سے کچھ روٹیاں۔ تھوڑی سی بھنی ہوئی ترکاری اور کبھی کبھی گوشت خرید لیتے اور سہ پہر کے قریب جب انھیں بھوک لگتی تو کھاتے۔ یہی ان کی شام کا ناشتہ ہوتا اور رات کا کھانا بھی۔ کسی دن جب ان کی مزدوری اچھی ہو جاتی تو وہ کچھ مٹھائی بھی خرید لیتے تاکہ کھانے کے بعد کھائیں۔ گوشت کے ساتھ نیبو اور ہری مرچیں بھی خریدتے تاکہ گوشت چٹپٹا اور مزیدار معلوم ہو۔ گھروں سے دور، باپ ماں کی محبت سے محروم ہر اتوار کو گھر کی یاد سے وہ اپنا دل خوش کر لیا کرتے تھے۔

دوپہر کے قریب ان کی نگاہیں اکثر سامنے والے گاؤں کی طرف اٹھ جاتیں کیونکہ یہی وقت ہوتا گوالن کی لڑکی کے آنے کا ——— ہر اتوار کو وہ ان دونوں کے سامنے سے گزرتی۔ اس گائے کو دوہنے کے لئے جو اسی جنگل میں چرنے کے لئے بھیجی جاتی تھی۔

پھر ان کی نگاہیں اسے آتا ہوا دیکھ لیتیں۔ وہ بہت مسرور ہوتے سورج کی شوخ کرنوں کو اس کے چہرے پر کھیلتا ہوا دیکھ کر۔ اس کی پیتل کی بالٹی اس کا سرخ دھاری دار لہنگا اور سبز انگیا۔ اس کا وہ دوپٹہ جسے دودھ دوہتے وقت وہ گائے کی پچھلی ٹانگوں سے باندھ دیتی۔ وہ ان سب چیزوں کو دور ہی سے پہچان لیتے۔ اسے دیکھ کر وہ دونوں خوش ہو جاتے لیکن وہ کیوں خوش ہوتے یہ انھیں بھی معلوم نہ تھا وہ تو بس اسے دیکھتے اور خوش ہوتے لیکن انھوں نے کبھی اس کے بارہ میں گفتگو نہیں کی۔

لڑکی جوان تھی۔ کشیدہ قامت۔ ابھرا ہوا گداز جسم۔ چہرے پر دھوپ کا اثر مگر رخسار دیہاتی آب و ہوا اور محنت کی وجہ سے گلابی ——— گویا خون پھوٹا پڑتا تھا۔

وہ روزانہ اپنی گائے دوہنے کیلئے اسی جنگل میں آتی کیونکہ وہیں اس کی گائے چرا کرتی تھی اور ہر اتوار کو وہ ان دونوں بھائیوں کو دیکھتی۔ اکثر ایک ہی طرح بیٹھے ہوئے۔ اکثر ایک ہی طرح کھڑے ہوئے پاتی ——— اسی طرح بہت سے اتوار گذر چکے تھے۔ اسے تعجب تھا کہ ہر ہفتہ اسے دیکھنے کے باوجود دونوں میں سے کسی نے بھی اسے مخاطب نہیں کیا ——— کیسے نوجوان تھے وہ دونوں؟

آخر ایک اتوار کو جبکہ وہ دونوں حسبِ معمول ایک بڑے پتھر پر بیٹھے ہوئے سوتن ندی کی روانی دیکھ رہے تھے وہ ان کے قریب سے گزرتے ہوئے بولی۔ "تم دونوں یہاں کیا کیا کرتے ہو؟"

اس اچانک تفتیش سے دونوں کسی قدر گھبرا گئے۔ سوچنے لگے کہ کیا جواب دیں۔ بڑا بھائی جو کچھ زیادہ دلیر تھا بولا۔ "چھٹی ملتی ہے تو ادھر ہی آ نکلتے ہیں ہم دونوں ــــ!"

اور بس ــــ بات چیت ختم۔ وہ اپنی گائے دوہنے چلی اور یہ پتھر پر بیٹھے رہ گئے۔ لیکن دوسرے اتوار کو جب وہ جنگل سے گزری تو انہیں دیکھ کر مسکرائی بالکل اس عورت کی مانند جس نے کسی مرد کے شرمیلے پن کو سمجھ لیا ہو ــــ بولی۔

"کیا کر رہے ہو تم دونوں؟ کیا گھانس کو بڑھتے دیکھ رہے ہو؟"

بڑا بھائی خوش ہو گیا بولا۔ "شاید ــــ!"

وہ پھر بولی۔ "تیزی سے بڑھتے نہیں معلوم ہوتی نا؟"

وہ ہنس پڑا ــــ "نہیں!"

وہ بھی ہنس دی۔

پھر وہ دودھ دوہنے چلی گئی اور یہ دونوں ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد روٹی اور ترکاری نکالی گئی اور دونوں کھانے لگے اور ابھی دونوں کھا ہی رہے تھے کہ وہ واپس ہوئی۔ بالٹی میں دودھ لئے ان کے قریب پہنچ کر بولی۔

"کیوں، دودھ پیوگے؟ یہ تمہیں گھر کی یاد دلائے گا۔"

اُس نے نادانستہ دونوں کی دکھتی ہوئی رگ کو چھو لیا تھا دونوں کے چہروں پر اچانک یاس کی ایک خفیف سی جھلک بیدار ہو گئی ــــ انہیں دراصل گھر یاد آ گیا تھا۔

پھر بغیر دوبارہ پوچھے ہوئے اس نے ان کے پیالے میں دودھ بھر دیا۔ بڑے بھائی نے پیالہ اٹھایا اور آہستہ آہستہ پینے لگا ڈرتے ہوئے کہ کہیں وہ اپنے بھائی کا حصہ بھی نہ پی لے۔ پھر اس نے پیالہ اپنے چھوٹے بھائی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ دونوں کے سامنے کھڑی رہی۔ ایک ہاتھ کولھے پر رکھے بالٹی پیروں پر اور مزا لیتی ہوئی اس مسرت سے جو وہ اس کی وجہ سے محسوس کر رہے تھے۔ وہ بولی۔ "تم نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

"میرا نام محمد دین ہے۔" بڑا بھائی اس طرح بول اٹھا گویا صرف اسی سے پوچھا گیا تھا۔

"اور تمہارا نام؟" اس نے دوسرے سے پوچھا۔

"احمد دین ــــ!"

"اچھا تو اب دوسرے اتوار کو۔" اس نے بالٹی اٹھائی اور چل دی۔

دونوں کی نگاہیں کچھ دور تک تعاقب کرتی رہیں۔

اتوار یونہی گزرتے رہے اور ہر اتوار کو وہ ان سے ملتی اور انہیں دودھ دیتی رہی۔ ایک اتوار کو جنگل کی جانب جاتے ہوئے چھوٹے بھائی نے تجویز پیش کی کہ اس کے لئے بھی کوئی تحفہ لیجانا چاہئے۔ بڑے بھائی نے بھی اس رائے کو پسند کیا اور دونوں غور کرنے لگے کہ کون سی شے مناسب ہوگی۔

بڑے کا خیال تھا کہ اگلی میلے سے لکڑی کا ایک سنگاردان خرید لیا جائے تو کیا برا ہو۔ مگر چھوٹے بھائی کو یہ رائے کچھ جچی نہیں اس کا خیال تھا کہ کوئی ایسی شے لڑکی کو نہیں دینی چاہئے جسے وہ گھر لیجا سکے کیونکہ گھر والوں میں اس سے شک پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ ممکن ہے کوئی پوچھ بیٹھے کہ کس نے دیا؟ کہاں سے لائی تو؟ بہتر یہ ہے کہ کوئی مزیدار کھانے کی چیز اسے دی جائے تاکہ جب وہ ہمیں دودھ دے تو ہم بھی وہ چیز اسے کھانے کو دیں اور آخر جھنگو حلوائی کی دوکان کے کیوڑے میں بسے ہوئے پیڑوں پر فیصلہ ہوگیا۔

چنانچہ انھوں نے چار آنے کے پیڑے خریدے اور اسی جنگل میں پہنچے دونوں بےچینی سے انتظار کرنے لگے۔ یکایک چھوٹا بھائی بولا۔

"دیکھو وہ آ رہی ہے۔"

بڑے بھائی نے بھی دیکھ لیا۔ بولا، "ہاں آ رہی ہے وہ۔"

وہ ان کے قریب پہنچ گئی اور بولی ——— "کیا ہو رہا ہے آج؟"

پھر باتیں شروع ہوگئیں۔ دیہاتی زندگی کی سیدھی سادی باتیں آب و ہوا اور موسم کی تبدیلی ——— فصل کی خوبی۔ گاؤں کا چوکیدار ——— غلہ کی گرانی مہاجن کا سود ——— معاشیات کے تمام اصول زیر بحث آ رہے تھے گفتگو ہوتی رہی۔ دونوں میں کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ پیڑے پیش کرتا۔ دونوں بےچین تھے بھلا کیونکر کہا جائے کہ اس کے لئے وہ پیڑے لائے تھے۔

آخر بڑے بھائی نے ہمت کی اور بولا ——— "ہم تمہارے لئے ایک چیز لائے ہیں۔"

"دیکھوں کیا لائے ہو؟" اس نے پوچھا۔

احمد دین کا چہرہ سرخ ہوگیا اسی کی جیب میں پیڑے تھے۔ کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے اپنی جیب سے پیڑے نکالے اور لڑکی کے سامنے رکھ دیئے۔ وہ پیڑے اس کے ہاتھ میں نہ دے سکا۔ وہ بہت شرمیلا تھا۔

وہ پیڑے کھانے لگی۔

دن یونہی گزرتے رہے۔

محمد دین نے اس مرتبہ اپنی تنخواہ سے دو قمیصیں اور دو نئے پاجامے بنائے۔ اس کے بال اکثر الجھے رہتے تھے مگر اب وہ انھیں سنوارنے لگا تھا کبھی کبھی تیل بھی لگا لیتا۔

احمد دین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

ایک دن دونوں اسی جنگل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آج بجائے روٹیوں کے دونوں تین تین بھٹے اپنے ساتھ لائے تھے۔ پھر انھوں نے سوکھی ہوئی پتیاں جمع کیں۔ آگ جلائی اور بھٹے بھون لئے ——— احمد دین دانے چباتے ہوئے بولا۔

"اگر زمین ہوتی تو اب کے فصل اچھی ہوتی بھیا۔"

"کل نتھو کمار گاؤں سے آیا ہے۔" محمد دین بولا۔ "وہ بھی یہی کہہ رہا تھا کہ اب کی پانی خوب ہوا ہے وہاں۔"

دونوں خاموش ہوگئے کیونکہ دونوں کو کچھ یاد آگیا تھا۔ اسی نتھو کمار نے تو کہا تھا کہ ان دونوں کی ماں بیمار ہے۔ دونوں سوچنے لگے۔ گھر کا آرام۔ باپ ماں کی شفقت۔ دوست یار ——— سب ایک ایک کرکے یاد آنے لگے۔

احمد دین نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ "اس بار جو ملے گا گھر بھیج دونگا۔"

محمد دین کے چہرہ پر ندامت جھلکنے لگی۔ "بھیجتا تو میں بھی مگر اب کے کچھ کپڑے بنوالئے ہیں۔"

"تو کیا ہوا میں ہی بھیجدونگا۔" احمد نے کہا۔

محمد سر جھکائے سوچتا رہا۔

ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ منگل کا دن تھا۔ محمد دین نے اپنے افسر سے شام کے بعد چند گھنٹوں کی چھٹی مانگی اور دس بجے رات تک غائب رہا۔

احمد تشویش و پریشانی میں سوچتا رہا کہ آخر اس کے بھائی کے چھٹی لینے کا سبب کیا تھا؟ پھر اسی جمعہ کو محمد دین نے اپنے ایک دوست سے دس روپیہ قرض لئے اور پہلے دن کی طرح پھر چھٹی لے کر رات گئے تک باہر رہا۔ اتوار کو جب وہ دونوں حسب معمول جنگل کی جانب جا رہے تھے محمد دین کچھ پریشان، کچھ عجیب، کچھ بدلا ہوا سا معلوم ہو رہا تھا۔ احمد دین کچھ نہ سمجھ سکا چند دھندلے شک، چند مبہم نقوش اس کے دماغ میں آئے لیکن وہ نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا تھے کیا نہیں۔

دونوں وہیں پہنچے جہاں ہمیشہ بیٹھا کرتے تھے۔ تھوڑی دیر میں

میں انھوں نے روٹیاں نکالیں اور کھانے لگے —— بھوک کسی کو بھی نہیں تھی کچھ دیر بعد لڑکی نمودار ہوئی۔ ایک ہاتھ میں پیتل کی بالٹی لئے ہوئے۔ محمد دین دیکھتے ہی کھڑا ہوگیا۔ وہ قریب آئی اور بولی۔

"میرا ایک کام کردوگے؟"

"ضرور کردونگا" محمد دین نے جواب دیا "کیا کام ہے بولو"

"تھوڑی سی سوکھی ہوئی لکڑیاں توڑ دو"

"بس یہی کام ہے۔ اچھا توڑ دونگا"

"تو پھر چلو توڑ دو ورنہ مجھے دیر ہوجائیگی آج گھر میں کام ہے"

وہ آگے بڑھی۔ محمد دین پیچھے پیچھے ہولیا۔ احمد دین کچھ سمجھا۔ کچھ نہ سمجھا۔ خاموش بیٹھا انھیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دیکھا کہ کچھ دور جاکر محمد دین نے لڑکی کا ہاتھ تھام لیا اور دونوں ساتھ چلنے لگے۔ ساتھ چلتے رہے جھاڑیوں کے قریب، درختوں کی اوٹ میں۔ محمد دین کا سر جھکا۔ لڑکی کسی انتظار میں کھڑی ہوگئی۔ محمد دین کا سر جھکتا رہا اور پھر لڑکی کے چہرے سے پیوست ہوگیا۔ وہ آگے بڑھے، بڑھتے رہے۔ درختوں میں چھپ گئے۔ جنگل میں غائب ہوگئے۔

احمد کو حیرت تھی۔ وہ حیرت سے دیکھتا رہا پھر یکایک وہ سب کچھ سمجھ گیا —— بھائی کے مزاج میں تبدیلی —— نئی قمیصیں اور پاجامے راتوں کی غیر حاضری سب اس کی سمجھ میں آگئیں۔ اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھیں۔ دل کی گہرائیوں میں دبے ہوئے جذبے جنھیں وہ اب تک پہچان نہ سکا تھا یکایک ابھر آئے اور اسے بیتاب کئے ڈالتے تھے —— اس کی بھی کوئی تمنا تھی جو مٹ گئی —— کوئی حسرت تھی جو پامال ہوگئی۔ سکون تھا جو فنا ہوگیا —— اور زندگی میں پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اسے بھی کسی سے محبت تھی! دانستہ و نامعلوم محبت،

پھر اسی بربادی تمنا میں۔ اسی ہجوم حسرت میں اسے اپنا گھر یاد آیا گھر کے ساتھ ہی اپنی ماں یاد آئی —— پیار کرتی ہوئی ماں۔ وہ تسلی ڈھونڈنے لگا اس کی کوئی چیز کھوگئی تھی اور وہ بیچین تھا اسے پانے کے لئے۔ اگر ماں کو معلوم ہوجاتا تو کیا وہ تسلی نہ دیتی۔ کیا وہ چیز نہ ڈھونڈ دیتی جس کے لئے اس کا بچہ بیتاب تھا۔ ماں کیا نہیں کرتی؟ وہ اپنے بچہ کی ہر عمر میں ماں ہوتی ہے وہ کھسیانہ ہوگیا۔ اس کا دل بھر آیا۔ بالکل اس بچہ کی طرح جو اپنی ماں کی آغوش سے دور غیروں کے گھر میں ذرا ذرا سی بات پر اپنی ماں اور اپنے گھر کو یاد کرتا ہے —— ماں! ماں! آہ، اس کی ماں اس سے دور تھی۔ وہ گھر سے دور دور تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ دونوں آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ محمد دین کے ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی لکڑیاں تھی۔ لڑکی بالٹی اٹھائے ہوئے تھی۔ احمد نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

وہ دونوں آئے اور بیٹھ گئے۔ لڑکی نے روز کی طرح دونوں کے پیالے میں تھوڑا سا دودھ ڈال دیا۔ آج احمد سے کسی نے زیادہ بات چیت نہیں کی وہ چپ بیٹھا رہا۔ سوچتا رہا۔

محمد دین لڑکی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ وہ ہنس ہنس کر جواب دے رہی تھی۔ دونوں کو خیال بھی نہ تھا کہ ان کی مسرت میں آج کسی کے ٹوٹے ہوئے دل کی حسرت بھی شامل ہے۔ تھوڑی دیر بعد لڑکی اٹھی اور دوسرے اتوار کا وعدہ کرکے اپنے گھر چلدی یہ دونوں بھی اٹھے —— اور آبادی کی طرف چلے گئے۔

پل پر پہنچکر احمد یکایک رک گیا۔ سورج ان کی پشت پر غروب ہونے کو تھا، وہ دیر تک سرخ بادلوں اور ان کے عکس سے سرخ بہتے ہوئے پانی کو دیکھتا رہا۔ یکایک وہ پل کی سلاخوں پر جھکا، جھکتا گیا۔ گویا پل کے نیچے کسی شے سے دلچسپی لے رہا ہو۔ محمد دین نے پوچھا "کیا دیکھ رہے ہو نیچے" ابھی اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ احمد سر کے بل پل کے نیچے جارہا۔ سون کی روانی میں ایک لمحہ کیلئے تلاطم برپا ہوا اس کی قمیص ایک بار پھر ابھری اور ہمیشہ کیلئے غائب ہوگئی۔ ندی بہتی ہی رہی ۴

۴ محمد دین بوکھلا گیا۔ سمجھ نہ سکا۔ وہ دوڑا بے تحاشا چیختا ہوا "ارے دوڑو احمد پانی میں گر پڑا ہے اسے جلدی بچاؤ وہ ڈوب جائے گا ——" کاش اسے معلوم ہوتا —— ؟" (طبعزاد)

سوزِ ناتمام!

دلِ ناکام سے لینا ہے مجھے کام ابھی

از جناب سید محمد عسکری طباطبائی بی-اے؛ سروش لکھنوی

جذب ہے خام ابھی، درد ہے ناکام ابھی
کامیابی کا محبت میں نہ لے نام ابھی

ہوئی اک عمر کہ وارفتۂ آغاز ہے شوق
ہات آیا نہیں سر رشتۂ انجام ابھی

دلِ پُرشوق تری چشمِ سخنگو کے نثار
جانِ بیتاب ہے حسرت کشِ پیغام ابھی

زندگی خوابِ فراموش ہوئی جاتی ہے
اور نہیں صبحِ تمنا کی مرے شام ابھی

عشق ہے منزلِ عرفاں سے بھی کوسوں آگے
عقل گمراہ ہے سرگشتۂ اوہام ابھی

یہ جو اک نغمۂ رنگیں ہے فضا میں محفوظ
جپ رہا تھا کوئی دیوانہ ترا نام ابھی

لوٹ لی جھوٹی تسلی سے کسی نے وہ بھی
تھی تڑپنے میں جو اک لذتِ بے نام ابھی

کامیابی کا نہ مفہوم بدل دوں تو سہی
دلِ ناکام سے لینا ہے مجھے کام ابھی

دل میں مے ریزیِ جلوہ ہے ازل سے اب تک
ظرف اتنا ہے کہ چھلکا نہیں یہ جام ابھی

نذرِ نومیدیِ جاوید ہوئی جاتی ہے
دل میں باقی ہے جو اک حسرتِ ناکام ابھی

خشک ہے سیلِ حوادث تنک آبی سے سروش
اور مرا ذوق ہے لب تشنۂ آلام ابھی

ترکی شجاعت کا ایک منظر

تاریخی مضمون

از جناب جلال شاہجہانپوری

جنگ عظیم ختم ہوگئی۔ التوائے جنگ پر دستخط ہوئے تو ترکی جنرل مصطفےٰ پاشا شام سے منتشر ترکی سپاہیوں کو سمیٹتا ہوا قدیم ترکی وطن اناطولیہ کی طرف چلا۔

نیبجہ کے جنکشن پر اناطولیہ اور بغداد ریلوے آکر ملتی ہیں۔ یہیں پر کوہ طورس کے ایک دامن کی درازی بھی ختم ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے گرد و نواح کے پہاڑی علاقوں کے رہنے والے اسی طرف سے گذرتے ہیں اس وقت ترکی فوجوں کی واپسی کا راستہ بھی یہیں سے تھا۔ بغداد سے پانچویں پلٹن اور دمشق سے ساتویں پلٹن کے منتشر سپاہیوں کے شکستہ دستے انہیں ریلوے لائنوں کے ذریعہ سے واپس ہوکر جنکشن پر جمع ہو رہے تھے جس کی وجہ سے یہاں سے ڈورک کی طرف تئیس میل تک کھلا میدان جنگ کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ جابجا سپاہیوں کا ضروری سامان، کمسریٹ کا اسباب اور شکستہ سامان حرب بکھرا نظر آتا تھا۔

اور ریلوے لائن کے برابر سپاہیوں کی موجودگی اس کی حفاظت کی ضامن نظر آتی تھی۔ جنوبی علاقہ شام کا تھا جہاں گو اب فرانس کی حکم برداری ہے، لیکن التوائے جنگ کے وقت یہ علاقہ انگریزی فوجوں کے قبضہ میں تھا۔ انگریزی فوجیں اقتضائے وقت سے تمام باقی ماندہ ترکی سامان جنگ پر قبضہ جمانے اور روکنے کی تگ و دو میں سرگرداں تھیں اس لئے اس وقت جو سامان بھی نیبجہ کے نواح میں نظر آتا تھا۔ وہ مصطفےٰ پاشا کی حکمت عملی اور چابکدستی کا شاہد تھا اور جس کی وجہ سے اب یہ سپاہی اپنے وطن عزیز کو واپس ہونے اور ایک آخری مگر کامیاب دفاعی جنگ لڑنے کے قابل ہونے والے تھے۔

نیبجے شام کے علاقہ میں جہاں عرب آزادی کی دیرینہ خوابوں کی تعبیر کے لئے راستہ صاف کرنے میں جان و مال کی بازی لگا چکے تھے۔ خلاف امید انگریزی اور فرانسیسی فوجوں کے تسلط اور بازگشت کو دیکھ رہے تھے۔ اسکندرونہ اور مرسینا کی بندرگاہیں مغربی فوجوں سے معمور ہیں اور گو یہاں سے چند میل کے فاصلہ پر ترکی وطن کی جنوبی حدود حائل تھیں۔ اور اس میں ولایت ادانہ کا دار الحکومت بھی تھا۔ جو التوائے جنگ کی شرائط کے مطابق مخالف فریق کے لئے ممنوعہ علاقہ تھا۔ لیکن فرانسیسی جرنیلوں نے فتح و کامرانی کے نشہ میں ایسی پابندیوں کو نظر انداز کرکے اس طرف بھی پیشقدمی شروع کردی۔ ان کے ساتھ ارمنی اور یونانی پناہ گزینوں کا ہجوم غفیر بھی تھا۔ جو اپنے ولی نعمت کے ساتھ نمک حرامی کی سزا میں خارج از وطن ہوکر غیروں کے دامن میں پناہ ڈھونڈتا اور ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا۔

اس کو حسن اتفاق کہیے یا مصطفےٰ پاشا کی موقع شناسی کہ جس وقت فرانسیسی فوجوں کا یہ طوفان بے تمیزی ادانہ کے نواح میں پہنچا۔ تو ترک سپاہی اندرون وطن کی طرف روانہ ہوکر نیبجہ پہنچ چکے تھے۔ ادانہ میں پہنچکر جب فرانسیسی دستوں کو کسی قسم کی مزاحمت نہ پیش آئی تو یہاں پڑاؤ ڈال کر خبر گیر رضاکاروں کو آگے بھیجا گیا اور اس کام کیلئے نواح سے واقف ارمنی رضاکار تجویز کئے گئے وہ کچھ دیر میں پہاڑی علاقوں سے نیبجہ میں ترکی سپاہ کے قیام کی خبر لائے ایک شکستہ سپاہ کی ایسی بے سر و سامانی کے ساتھ موجودگی فرانسیسی اور اٹالین سپاہ اور ان کے ساتھ بے شمار ارمنی اور یونانی اجتماع کے واسطے خوان یغما ہوسکتی تھی لیکن ترکی لشکر کا رعب اس حالت میں بھی اتنا غالب تھا۔ کہ فرانسیسی سپاہ نے اس وقت تک پیشقدمی کا ارادہ نہ کیا۔ جب تک ترک خود ہی ہفتہ عشرہ میں قونیہ کی طرف نہ چلدیئے قونیہ میں اس لشکر نے دشمن سے مقابلہ اور مدافعت کیضرورت سے ایک پہاڑی پر توپیں اور ایک دستہ چھوڑکر آگے کا رخ کیا۔ اور افیوم قرہ حصار عسکی شہر اور احمدیہ پر بھی اسی طرح

مدافعتی دستے چھوڑتے چلے گئے۔ اس تدبیر کی غرض یہ تھی کہ خبر رسانی اور احکام رسانی کا ذریعہ اس وقت تک قائم رہے جب تک اس کی ضرورت باقی ہے۔ اور جب ترکی سپاہ تازہ احکام کے ساتھ دفاع وطن کے لئے واپس ہو تو اُن دستوں کے ذریعہ گرد و نواح کے تازہ دم عدائی کمک میں شامل ہوتے رہیں۔ ترکوں کی واپسی میں عجلت کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ التوائے جنگ پر اُن کے نمائندہ نے بھی دستخط کئے تھے۔ اس لئے وہ شجاع قوم کے شایان شان اس کی تعمیل کرنا اپنے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ تاکہ مخالفین کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملے اسی خیال سے اُن کے نگران افسر ہر طرف باقی ماندہ سپاہ اور پس ماندہ سامانِ حرب میں سے زیادہ سے زیادہ جس قدر سمیٹ سکتے تھے۔ سمیٹنے میں مصروف تھے۔ اور شرائط کے وقت سے پہلے ہی پہل اس طرح اپنے فرائض سے فارغ ہو جانا چاہتے تھے۔

ان کے برعکس دشمن کی فوجیں اور اُن کے سپاہی ہر چیز کو ٹھکراتے ہوئے آگے بڑھنے کے کوشاں تھے۔ چنانچہ وہ قونیہ میں داخل ہو گئے اور یہاں کے پہلے ترکی دستہ کو آسانی سے قید کر کے یہیں لشکر کو قیام کا حکم دیا۔ یہ جگہ کوہ طور کی مذکورہ شاخ اور کوہ الداغ کے دامن میں ایک خوبصورت میدان ہے۔ جو وادیٔ شمرا کے نام سے مشہور ہے۔ اور قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ اسی نام سے نسبت رکھنے والے چند دیہات کیلئے کپاس کی کاشت زندگی کا سہارا بنی ہوئی ہے۔ جب قونیہ سے ادانہ تک فرانسیسی تسلط نظر آنے لگا تو دیرینہ دستور اور معاشرتی روایات فنا ہوتی دکھائی دینے لگیں، دیہات کے رہنے والے کئی ہزار ترک گرفتاروں یا محکموں میں شمار کر لئے گئے۔ جرنیل کے حکم سے ایک عارضی حکومت قائم کی گئی۔ اس کا انتظام ایک ارمنی مجلس مشاورت کے سپرد کیا گیا، اور اسکی حفاظت و استقلال کے لئے، توپ خانہ اور جملہ ضروری سامان حرب و ضرب ٹرینوں، لاریوں اور طیاروں کے ذریعہ لا کر انبار لگا دیا گیا۔ ہوائی جہازوں کے اسٹیشن، فوجی دفتر، چھاؤنی، توپ خانہ شفاخانہ غرضیکہ جو کچھ فوجی ضرورت کے لئے مناسب تھا بہم پہنچا کر شمرہ کو مستقل کیمپ میں بدلنے کے انتظام کر لیے گئے تاکہ باقی ماندہ ترکی سپاہ سے جو چند میل کے فاصلہ پر وطن کو آزاد کرانے جان توڑ کوشش کر رہی تھی۔ بزور شمشیر غلامی کی دستاویز پر دستخط کرا لئے جائیں۔

وادی کے ایک طرف بوزنتی درہ میں ترکی گیریسین کی بارکیں واقع تھیں جن میں اُس زمانہ میں فوجی چوکی کے طور پر چند سپاہیوں کا ایک حفاظتی دستہ پڑا ہوا تھا۔ فرانسیسی سپاہ نے ان سپاہیوں کو گرفتار کر لیا اور فاتحانہ انداز سے بارکوں میں اُن کے سپاہی داخل ہو گئے پھر گرفتار سپاہیوں کو پریڈ پر صف بندی کرا کے اور ہر ایک کو بگل حوالے کر کے حکم دیا کہ سلطنت ترکیہ پر ان بگلوں سے فاتحہ پڑھتے رہو۔

مجبور ترک سپاہیوں نے بادل ناخواستہ بگل تھامے اور آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں جھکائے ہوئے نئی لشکری بارکوں کی طرف چل دیئے۔ غرضیکہ اب ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ قدم قدم پر غلامی کی ذلت و خواری نصیب ہو رہی تھی۔ دشمنوں کی سخت نگرانی تھی، اجتماع وطنی کی طرف کسی ترک کو رخ کرنے کی اجازت نہ تھی۔

شمرا کے لشکر میں ایک رونق تھی۔ ہنگامہ تھا چہل پہل تھی۔ جس کی کرشمہ سازیاں اہل وطن میں معکوس اثر کر رہی تھیں یعنی یہاں کے قدیم ساکنوں کو غیروں اور دشمنوں سے گلو خلاصی کے لئے مجبور کر رہی تھیں۔ اناطولیا میں حکومت ملیہ بالاعلان قائم ہو چکی تھی۔ لہٰذا ردعمل کے طور پر اس لشکر میں نگرانی کے انتظامات دوگنے کر دیئے گئے تھے۔ اور بچ نکلنے کے تمام امکانات مسدود ہو گئے تھے۔ فرانسیسی نگرانی، ارمنی انتظام پر طرفہ یہ تھا۔ کہ مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لئے ایک مقامی صوفی شیخ ولی نامی کو برائے نام حاکم قونیہ مقرر کر دیا گیا تھا۔ اور قدیم دستور کے مطابق مسلمانوں کی سرکوبی و سرزنش کے لئے ایک مسلمان ہی کو آلۂ کار بنایا گیا تھا۔ اس صوفی منش والی نے اپنے آقائے نعمت کے زیر ہدایت تمام ترک آبادی سے بیعت لینا، کمالی ملی حکومت کے خلاف اکسانا اور بیعت سے منکرین کو طرح طرح سے ستانا شروع کر دیا تھا۔ جو ترک مساجد اور خانقاہوں کو مامون و محفوظ سمجھ کر ان میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ اُن کو وہاں سے گھسیٹ گھسیٹ کر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ یہیں پر حضرت مولانا رومی کا مزار واقع ہے جس کی وسیع و عریض خانقاہ میں سینکڑوں ضعیف عورتیں اور بچے پناہ گزین تھے۔ اُن کو بے دردی سے زدوکوب کر کے داخل زنداں کر دیا گیا

فرانسیسی جرنیل کے اشارہ پر شیخ کے مسلم کش احکام کی تلقین میں سرگرم اور دارو گیر میں مصروف تھے۔ اگر غیر ملکی غاصب مسلمانوں کی عزت اور ننگ و ناموس پر بے کھٹکے ڈاکہ زن تھے۔ تو شیخ کے کارندے مسلمان تاجروں اور بیوپاریوں سے حسب منشا ٹیکس وصول کرکے انہیں اس قدر تنگ کر رہے تھے۔ کہ وہ مکان بند کر کے خانہ نشین ہو جانے میں عافیت سمجھنے لگے تھے۔

شمرا کے شمال میں افیوم قرہ حصار کا ریلوے اسٹیشن اور اُس کے قریب کا علاقہ یونانیوں کے قبضہ میں تھا۔ مگر اُس کے متصل کمالی ملی حکومت قیصریہ کو خط جنگ بنانے اور اس کے مضبوط کرنے کی تیاریاں کر رہی تھی، باربرداری کے لئے سڑکیں بن رہی تھیں۔ پٹڑیاں اور گاڑیوں کی مرمت کی جا رہی تھی۔ جگہ جگہ سامان اور غلہ کے انبار نظر آتے تھے۔ صدر دفتر سے ہر چہار طرف رضاکاروں کا ترسیل پیامات و اطلاعات کے لئے سلسلہ بندھا ہوا تھا۔ ان کی جانبازیاں اور سرزدہ دنیاں اطراف کے مجبور و ترساں مسلمانوں کے لئے کی شکستہ سامانیوں اور پریشان حالیوں میں تازہ روح اور حرارت عمل پھونک رہی تھیں۔ انتیاب، عرفہ اور کھانہر جیسے دور افتادہ اضلاع میں بھی ایک جدید زندگی کے آثار نمایاں تھے۔ جس کی وجہ سے دشمنوں کی چوکیاں، تنہا دستے، کمزور جمعیتیں اور مسافر، روز افزوں خطرات میں مبتلا نظر آتے تھے۔ دیہاتی ترک اگر دن کو طاقتور دشمنوں کی اطاعت اور خدمت بجا لانے میں کاٹتے تو تاریک راتیں ملی مفاد اور قومی احکام کی تعمیل میں گذارتے اور اس طرح دن کی خدمات کو رات کے قومی احکام کی تعمیل سے برباد کر دیتے تھے۔ رات کے چھاپے، شبخوں اور چھوٹے موٹے معرکے ہر طرف عام تھے جس کی وجہ سے دشمن کے سپاہی ہر وقت ہر قسم کے خطرات میں پھنسے ہوئے تھے، اسلحہ اور بندوقیں نکل جانے کی وارداتیں عام تھیں جن کی شکایات فرانس کے ایوان حکومت میں روزانہ جا کر گونجتی تھیں، یہ روز کی وارداتیں فاتحین اور ارباب حکومت کے لئے ایک مسلسل اور ترقی پذیر عارضہ بن گیا تھا۔ فرانسیسی پارلیمنٹ میں ترکوں کو۔ ڈانہ گیدڑ بھبکیاں دی جانے لگی تھیں اور یہ مطالبہ شروع کر دیا گیا تھا۔ کہ ترکوں سے اتنا علاقہ خالی کرا لیا جائے جسمیں فرانسیسی فوج مقیم ہے۔

ایوان فرانس کی یہ چیخ پکار جب ترکی اخبارات میں چھپ کر دیہاتیوں تک پہنچتی تو سلگتی آگ میں ہوا کا کام دیتی تھی ان کے حوصلے بڑھتے تھے، ان کی ہمتیں بلند ہوتی تھیں، اگر ایک طرف دشمن کا خبر رسانی سلسلہ تار اور ٹیلی فون کاٹا جاتا تھا تو دوسری اُن کی پٹریاں اکھیڑی جاتی تھیں، لشکروں سے توپیں غائب ہو رہی تھیں، مال اور سواری گاڑیوں کے لٹنے کی وارداتیں عام تھیں دشمن کے فوجی افسران ان غارت گریوں کو سیاسی مصلحت کی بنا پر چھپانے کی بے انتہا کوشش کرتے تھے لیکن یہ چیز سعی لاحاصل سے زائد حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ کیونکہ ترکی رضاکار روزمرہ کی کارگذاریوں کی خبروں کو اس قدر مبالغہ آمیزی سے ہر شخص تک پہنچاتے تھے۔ کہ دشمن کے سپاہیوں کو اب دن میں بھی راستہ چلنا عذاب ہونے لگا تھا۔ اب ان کو اپنے دم خم ڈھیلے نظر آنے لگے تھے، وہ جدھر سے نکلتے ترک عورتیں بچے اور بوڑھے اُن کو چھیڑتے اور تنگ کیا کرتے تھے۔

اس تمام عرصہ میں کمالی ترکوں کی تیاریاں ہر چند کہ تیز رفتاری سے جاری تھیں اور اُن کے پروگرام میں سب سے پہلے شاید قونیہ سے دشمن کو نکالنا فرض قرار پایا تھا۔ کیونکہ التوائے جنگ کی شرائط کی رُو سے یہ علاقہ بہر صورت ترکی وطن کا حصہ تھا۔ پروگرام کے مطابق ترکوں کی پیش قدمی میں بظاہر ابھی دیر معلوم ہوتی تھی۔ لیکن ایک اتفاقی ظالمانہ واقعہ کی وجہ سے انتظار کی مزید ضرورت نہیں رہی۔ اور ایک ہی کامیاب حملہ کے بعد دشمن کو انتہائی شرم و ذلت کے ساتھ نکلنا پڑا۔

شمرا کی آبادیوں میں ایک دن صبح کے وقت اتحادیوں کا ایک دستہ جس میں فرانسیسی اطالوی اور ارمنی سپاہی شامل تھے۔ ترکی اجیر کی رہنمائی میں بازار اور گلی کوچوں میں گشت کر رہا تھا۔ ایک راستہ پر سامنے سے ایک ارمنی افسر انتہائی متکبرانہ انداز سے اپنے گھوڑے پر آ رہا تھا، راستہ کے دونوں طرف ترک آبادی تھی۔ اس میں سے ایک مکان کے سامنے جو بالکل لب سڑک تھا۔ اور جس کی اوپر کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں وہ افسر آ کر رکا۔ یہ مکان ایک ترکی افسر کا تھا۔ جنگ میں جام شہادت پی چکا تھا۔ اور اب اُس کے پس ماندوں میں سے اس کی بیوہ اور دو جوان بیٹیاں گھر میں رہا کرتی تھیں ابھی ان لڑکیوں کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ جب اس افسر نے جو گھوڑے پر سوار تھا

مکان کے دروازہ کی کنڈی کھٹکھٹائی تو اندر سے چھوٹی لڑکی نے دروازہ کھولا۔ اس عرصہ میں یہ فوجی دستے بھی قریب پہنچ گئے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی وہ ارمنی سوار گھر میں گھس گیا، اس کو دیکھ کر سامنے سے آنے والوں میں سے فرانسیسی، اطالوی، ارمنی افسر بھی یکے بعد دیگرے اسی گھر میں بے کھٹکے گھس گئے، غریب ترک اجیر یہ ظالمانہ منظر دیکھ کر غم و غصہ سے کانپنے لگا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ گھر میں سے عورتوں کی چیخنے اور چلانے کی دلدوز آوازیں اس کے جگر کو پاش پاش کئے دیتی تھیں۔ معاً ایک خیال کے آتے ہی وہ پڑوس کے دروازہ پر پہنچا اور اس کے مالک کو باہر بلا کر حقیقت حال سے آگاہ کیا اور اس کی اجازت سے اس کے گھر میں سے ہو کر کوٹھوں اور دیواروں پر چڑھتا ہوا مکان مذکور کے اندرونی زینہ پر جا پہنچا۔ یہاں پہنچکر اس نے دیکھا کہ پیچھے والے ارمنی افسر نے ایک لڑکی کو پوری طاقت سے پکڑ رکھا ہے اور وہ لڑکی کچھ خوف و غم سے چیخ رہی ہے اور کچھ غصہ کی حالت میں لڑنے کے لئے بھی آمادہ ہے۔

ترک اجیر نے اس منظر کو دیکھتے ہی فوراً گولی چلائی گولی چلتے ہی وہ ملعون ارمنی افسر زمین پر تھا۔ اطالوی اور فرانسیسی افسروں نے اپنے ساتھی کو جب اس حالت میں دیکھا تو وہ فوراً کنڈی کھولکر بھاگ گئے۔ گولی کی آواز سے اور اس کے بعد مکان سے ان تین افسروں کو نکلتا اور بھاگتا دیکھ کر ہمسایہ ترک اور ان کی عورتیں گھروں سے نکل آئیں اور راستہ پر جمع ہو گئیں چند لوگ جب اس مکان کے دروازہ میں داخل ہوئے۔ تو تین عورتوں ایک سپاہی اور ایک ارمنی کی لاش کو دیکھ کر آپس میں مختلف قسم کی چہ میگوئیاں اور سوالات کرنے لگے، ترک سپاہی نے مستورات کو دوسرے مکان میں چلے جانے کی ہدایت کی پھر مقتول ارمنی کا پستول اور کارتوس قبضہ میں کر کے مجمع کو نہایت استقلال سے ہدایت کی کہ وہ سامنے سے ہٹ کر مکانوں میں چلا جائے کیونکہ اسی وقت پکی سڑک پر گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ ابھی یہ مجمع منتشر نہیں ہوا تھا کہ بارہ سواروں کا ایک دستہ مکان کے دروازہ پر آ کر ٹھہرا اور مکان کے اندر داخل ہونے لگا۔ ترک سپاہی فوراً بالاخانہ کی طرف دوڑا اور وہاں ایک کمرے میں چھپ رہا، اس عرصہ میں نیچے سے برابر گولیوں کا تانتا لگا رہا۔ ساتھ ہی کچھ سپاہی تعاقب میں اوپر کو چڑھنے لگے، ترک سپاہی نے نشانہ بازی کا مناسب موقع دیکھ کر گولیوں کا جواب دینا شروع کیا۔ نشانہ کی پختہ کاری کے لئے یا حسن اتفاق کہ ایک نشانہ بھی خالی نہیں گیا اور جو سپاہی زینہ پر چڑھ چکے تھے۔ ان میں سات لڑھکتے ہوئے نیچے آ رہے یہ کیفیت دیکھ کر باقی سراسیمگی کی حالت میں نکلنا ہی چاہتے تھے۔ کہ اس نے کمرہ میں سے آگے بڑھ کر تین کو اور ٹھنڈا کر دیا۔ باقی دو سپاہی سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن کچھ دور جا کر جب کچھ ہوش درست ہوئے تو اپنی قدیم بزدلانہ روایت کے مطابق راہ گیر ترکوں پر انتقاماً گولیاں برساتے ہوئے اپنے لشکر میں پہنچے گولیوں کی جب آوازیں بند ہوئیں اور نگران دستے دور جا چکے تو پڑوس کے جوان، بچے اور بوڑھے دریافت حال کے لئے جمع ہو گئے، ان میں سے بعض لوگ امن پسند ہونے کی وجہ سے شیخ ولی کے ہاتھ پر جو اس وقت والئے علاقہ بنا ہوا تھا۔ بیعت کر چکے تھے پھر بھی اس وقت ہر شخص بغیر کسی استثنا کے شیخ ولی پر لعنت اور نفریں بھیج رہا تھا، صورت واقعہ کی نزاکت کو دیکھ کر ان لوگوں نے اس وقت اس ترک مجاہد کو کمالی کیمپ تک پہنچا دینے کا انتظام کیا، ترکی کمانداروں نے مجاہد کی داستان شجاعت سنکر اس کے کارنامہ پر ہزار تحسین کی اور اس کی حفاظت کا مناسب انتظام کر دیا۔ پانچ منٹ بعد ترکی افسر کمالی دفتر سے تحقیقات کے مطالبہ کا پیام لیکر اتحادی لشکر میں پہونچے، جب انہوں نے فرانسیسی افسر کے سامنے پیام پہونچا کر تحقیق حال کی تاکید کی تو وہ اتنا سہم گیا۔ کہ وہ ترک مجاہد کے بارے میں سوال کرنا بھول گیا حسب ضرورت تمام مقبوضہ علاقہ میں فرانسیسی افسر نے چوکی پہرے میں اضافہ کر دیا۔ ملزمین گرفتار کر لئے گئے، اس واقعہ کا نتیجہ ترکوں کے حق میں بہت مفید نکلا۔ واقعہ کے متعلق نئی اور مبالغہ آمیز خبریں تو پہلے ہی سے سب طرف پھیل چکی تھیں جس کی وجہ سے شیخ ولی کے مرید اور حامی اس سے متنفر اور بیزار ہونے لگے تھے اور اس کا اثر ٹوٹنے لگا تھا۔ اس خبر کے پہنچنے پر کمالی علاقہ سے پر جوش رضاکاروں کا ایک دستہ شیخ کو گرفتار کرنے اور سزا دینے کے لئے روانہ ہوا تو فرانسیسی طلایہ گرد دستے اپنے دفتر میں یہ خبر لائے کہ ترکوں کی ایک بڑی فوج حملہ کرنے آ رہی ہے۔ اس دستے کی آمد سے دیہاتی ترکوں کے دل بڑھ گئے اور انہوں نے دشمن کے لشکر کو رسد پہنچانے

سے صاف انکار کر دیا۔ ہوائی جہاز بھی کمالیوں کی وسیع پیمانہ کی تیاریوں کی خبریں فرانسیسی دفتر میں پہنچا رہے تھے۔ ان حالات کی موجودگی میں فرانسیسی کمانڈر نے اس وادی کو چھوڑنے بلکہ ولایت قونیہ سے نکل جانے کا مستقل فیصلہ کر لیا۔ اس ارادہ کے بعد ہر قسم کی تبدیلیاں ہونے لگیں اور تمام فوجی سامان جس کو وہ لیجا سکتے تھے۔ ایک جگہ جمع ہو کر مال گاڑیوں میں لادا جانے لگا۔ ترک اس تماشہ کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ اور دل ہی دل میں کہہ رہے تھے کہ دشمن کا مال ہمارے قبضہ میں آ کر نکل جانا ہماری شان کے خلاف ہوگا۔ مال گاڑیوں کی قطاریں بزانتی اسٹیشن پر روانگی کے لئے کھڑی تھیں فرانسیسی سپاہیوں کو بھی اطراف سے سمیٹ کر اسی جگہ جمع کر لیا گیا تھا۔

ترکی کے طلایہ گرد دستہ کا سالار رات کی تاریکی میں شہر میں پہنچا اور شیخ ولی کے چند خاص ہزار مریدوں کو مشورہ میں طلب کر کے کہا۔ "اب یہ مغربی مہمان یہاں سے جانا چاہتے ہیں ان سے یہاں کے قیام کا کرایہ اور خرچہ وصول ہونا چاہیئے۔ انہوں نے ہماری مہمان نوازی سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے اور اب یہ بھی اندیشہ ہے کہ اپنے اسباب کے ساتھ اگر ہمارا سامان بھی سمیٹ کر لے گئے تو ترک مجاہدین کو دفاع وطن کے لئے سامان مہیا کرنے میں بڑی دقتیں پیش آئینگی"۔ شیخ ولی کے چیف سیکرٹری جوہر آغا نے پریشان ہو کر جواب دیا "پاشا! اب قونیہ میں کیا رہا ہے فرانسیسی تو ہر طرف سے فوجی سامان صاف کر کے بزانتی اسٹیشن پر پہنچا چکے ہیں لے دے کے پرانی ساخت کی سو بندوقیں اور کچھ یونہی سا بیکار سامان پڑا ہوا ہے"۔ سالار داؤد بے نے پرجوش انداز میں کہا "تو پھر بزانتی اسٹیشن پر چھاپا مارنا چاہیئے۔ میرے خیال میں یہ موقع بہت اچھا ہے۔ مگر اب وقت ضائع کرنے کا موقع نہیں ہے جو کچھ ہو جلد ہونا چاہیئے، مجلس ملیہ کا حکم ہے کہ اپنی فوجیں خود بناؤ۔ اور اس کا سامان بھی خود ہی مہیا کرو، اور پھر آپ سمجھتے ہیں کہ مجلس ملیہ کے حکم کی تعمیل ضرور اور فوراً ہونی چاہیئے"۔ جوہر آغا نے مدبرانہ انداز میں جواب دیا۔ کہ "لڑائی کے تو میں خلاف ہوں، پاشا! آپ دیکھتے ہیں کہ دشمن کے پاس ہر قسم کا اعلیٰ درجہ کا سامان ہے اور ہمارے پاس چند توپیں بھی نہیں ہیں تو پھر ہم کیسے مقابلہ میں آ سکتے ہیں۔ اب تک تو ہم بندوقوں سے کام چلاتے رہے ہیں۔ لیکن کھلے میدان میں دشمن کی گولہ باری کے مقابلہ میں ہماری یہ سو بوسیدہ بندوقیں کیا کریں گی"۔ داؤد بے نے اسی بہادرانہ انداز سے جواب دیا کہ "عزیز من! یہ تو سچ ہے پھر بھی ہمیں فوراً کچھ کرنا چاہیئے۔ اعلیٰ درجہ کا فرانسیسی سامان کا انبار دیکھ کر مجھ کو بے انتہا مسرت محسوس ہو رہی ہے"۔ اور پھر مسکراتے ہوئے کہا کہ "یہاں کے قیام کے کرایہ اور خرچہ کے معاوضہ میں ہمیں اس تمام سامان جنگ کو روک لینے کا پورا پورا حق حاصل ہے"۔ جواہر آغا نے جواباً عرض کیا کہ "میں آپ کے ساتھ ہوں۔ صرف دو سو ایسے بہادر فداکاروں کی ضرورت ہے جو جان پر کھیل جائیں۔ اگر ناکام رہیں تو واپسی کا نام نہ لیں۔ اور اگر خوش قسمتی سے کامیاب ہو جائیں تو فرانسیسی سپاہ سے سامان جنگ کے علاوہ کچھ بخشش بھی وصول کریں"۔ اس وقت جوہر آغا کی آنکھیں جوش و جلال سے چمک رہی تھیں۔ بزانتی اسٹیشن سے منجملہ چار مال گاڑیوں کے دو روانہ ہوئیں مگر وزن کی زیادتی اور چڑھائی کے رخ کی وجہ سے رفتار تیز نہ تھی اور چونکہ ترکوں کی طرف سے کسی فوری حملہ کا اندیشہ بھی نہیں تھا۔ اس لئے فوجیں بھی اطمینان سے گاڑی کے ساتھ ساتھ پڑاؤ ڈالتی چلیں،

ترکی سالار نے اس گفتگو کے بعد کراتپارا اور ریلوے لائن کے نواح میں دیہاتوں کے اندر رضاکاروں کو ہدایت بھیج دیں۔ کہ ریل کی پٹڑی اڑا دی جائے۔

ایک ہفتہ کے اندر دیہاتوں سے تین سو سوار رضاکار ریل کی پٹڑی کے برابر برابر ڈائنامیٹ کے بم چھپاتے ہوئے کوہ طور کے دامن اور درے تک پھیل گئے۔ راستہ میں ایک بڑے پل کو بھی اڑانے کا بندوبست کیا گیا۔

پانچ سو آدمی اور انتخاب کئے گئے جو کوہ طور کے حالات اور راستوں سے خوب واقف تھے، رضاکاروں کا ایک دستہ اُن سو ترک سپاہیوں سے بھی جا ملا، جو بزانتی میں قید کی مجبوریوں میں مصیبت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ترکی سالار نے فرانسیسی سپاہ اور سامان کی نہایت مفصل خبریں حاصل کیں اور پروگرام بنا کر اُن سو بگلچی قیدیوں کو ہدایت کی کہ "وہ مجوزہ وقت پر اشارہ پاتے ہی بگل بجانا شروع کر دیں اور جب تک منع نہ کیا جائے۔ اس وقت تک برابر بجاتے رہیں"۔ قومی فداکار پیٹ کے بل بزانتی کے درہ اور پہاڑوں پر سے چلتے ہوئے ریل کی پٹڑی کے پاس نہایت خاموشی سے پہنچ گئے۔ اور لائن کو اڑانے

کے ضروری سامان پٹریوں کے نیچے چھپاتے رہے۔ ڈیڑھ بجے رات کو درہ کے پاس ایسا زبردست دھماکا ہوا جس سے سننے والوں کے کان بہرے ہو گئے، فرانسیسی سپاہی سوتے سے چونک پڑے، اسی سپاہ جو توپوں کی نگرانی پر متعین تھی مشینیں اور دیگر سامان جنگ چھوڑ کر چیختے چلاتے اسٹیشن کی طرف بھاگے۔ راستہ میں سینکڑوں ٹھوکریں کھا کر مر گئے اور بیسیوں نے آپس میں ٹکرا کر دم دے دیا۔ ایک منٹ کے بعد دوسری سمت ایک اور گولہ پھٹا، اس کے ساتھ ہی بگلچیوں نے بگل بجانے شروع کر دیے۔ گرد و نواح کے دیہاتیوں نے ٹین اور ڈھول پیٹنے اور نعرۂ تکبیر بلند کرنا شروع کر دئے غرضیکہ کسی بڑی فوج کے حملہ کیوقت جو کیفیت شور و غل اور داویلا کی ہوا کرتی ہے اسوقت بھی بعینہ وہی کیفیت رونما ہوگئی تھی۔ اسی ہنگامہ میں مستعد رضاکاروں نے بڑھ کر مشین گنوں پر قبضہ کر لیا، اور فوراً ہی ان کو درست کر کے ہوا میں گولہ باری شروع کر دی۔ دشمن کی سپاہی خوف اور پریشانی کے عالم میں ہر طرف پناہ کی تلاش میں بھاگتے پھرتے تھے۔ اور بعض وقت گھبرا کر اپنے ہی آدمیوں کو گولی کا نشانہ بناتے تھے، بگل کی آواز کے ساتھ تکبیر کے نعرے رہ رہ کر جب بلند ہوتے تھے تو دشمن سہمے پھٹتے تھے۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر ساری مشینیں اور توپیں قبضہ میں کر لی گئیں، تھوڑی دیر کے لئے سکوت ہوا تھا کہ اتنے میں ایک ترکی افسر دس ماتحت افسروں کے ساتھ ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں سفید جھنڈا لئے ہوئے اسٹیشن میں داخل ہوا۔ دو فرانسیسی افسروں نے کانپتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔

ترکی افسر نے کہا کہ تین ہزار ترکی فوج پہاڑی کے اس پار حملہ کی منتظر ہے، اب یہ پورا لشکر اور اس کا سامان سب ترکی حراست میں ہے مشین گنیں ہمارے قبضہ میں آچکی ہیں۔ ہمارے کمانڈر کا آپ کے کمانڈر کو یہ حکم ہے کہ آدھے گھنٹہ کے اندر سب ہتھیار رکھدئے جائیں ہم اس وقت یہیں انتظار کرتے ہیں، جب ترکی افسر یہ پیام پہنچا چکا تو بگلچیوں کا شور اور تکبیر کے نعرے بندوقوں کی باڑھ اور عام شور و غل نے ایسا ہنگامہ برپا کیا کہ فرانسیسی کمانڈر کو کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا اور گھبرا کے اس کے ساتھ ہو لیا، ایک گھنٹہ کے بعد جب صبح

کی چاندنی ٹمٹما رہی تھی تو آس پاس کے گڑھوں اور غاروں میں سے چار سو ترک سپاہیوں نے نکل کر تمام ریلوے لائن مال گاڑیوں اور اسٹیشن پر پہرے بٹھا دئے اور آفتاب نکلتے نکلتے دشمن کی تمام سپاہ سے ہتھیار رکھوا لئے۔ دن نکلنے پر جب فرانسیسی قیدیوں کو معلوم ہوا کہ نہ کہیں ترکی فوج تھی۔ اور نہ رسالہ، بلکہ یہ ایک جنگی چکمہ تھا۔ جو ترکی کے بہادر رضاکاروں نے کھیلا تھا تو اس حقیقت حال کے انکشاف پہ دشمن دانتوں سے اپنے جسم نوچتے تھے۔ فرانسیسی کمانڈر نے ترکی افسر سے نہایت منت و لجاجت سے التجا کی کہ جو کچھ ہوا سو ہوا، اس کا تذکرہ اب اخبارات میں نہ آنا چاہیئے۔ فرانسیسی قوم کے لئے یہ معرکہ جس میں سو بگل، سو بندوقیں، چھ دستی بم اور رسمی شور و غل نے پوری رجمنٹ سے گھنٹہ بھر میں ہتھیار رکھوا لئے گئے بڑا اذلت بخش اور رسوا کن تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد شکستہ پل اور پٹریوں کی مرمت ہوگئی اور فرانس سے ایک دوسرا معاہدہ لکھا گیا جس کے بموجب اناطولیہ کے چپہ چپہ کو اُسے چھوڑنا پڑا۔ اور دو برس بعد انقرہ کے جشن فتح میں جب یہاں کے کارناموں کا نمبر آیا تو نزانتی اسٹیشن کی ایک ٹرین جس میں سو بگلچی سوار تھے اور سو بندوقیں قرینہ سے رکھی ہوئی تھیں جشن آزادی میں ترکی شجاعت کی نمائش کے لئے لائی گئی۔ اس ٹرین کا آنا اس امر کی دلیل تھا۔ کہ نزانتی کے بگلچیوں نے ترکی سلیشیا کو کس طرح طاقتور دشمن کے مضبوط پنجوں سے آزاد کرایا۔

خاص نمبر کی تین خاص چیزیں

اسیر انورد کا دسواں خط — میرزا ادیب بی اے

۲ - مقدس بیلیا — لارڈ ڈنسنی کا بے نظیر کھیل۔ مترجمہ رحمٰن مذنب۔

۳ - پاگل پری — نوشتہ ایف۔ ڈبلیو بین۔ مترجمہ علی احمد بی۔ اے

سوکن

افسانہ

از جناب سید اخلاق حسین رضوی

"جانِ آرزو!" ذکیہ نے نجمی سے سرگوشی میں کہا۔ "چلو اب چلیں کوئی دیکھ لے گا!"

اس وقت جب یہ دونوں محبت بھرے قلوب جذبات سے لبریز ہو رہے تھے۔ سورج کی نورانی کرنیں فضا میں روشنی کی لہریں پھیلا رہی تھیں۔ نجمی کے بیتاب لب ذکیہ کے شوخ رخساروں پہ محبت کی مہریں لگانے میں مصروف تھے اور ذکیہ——؟ اسکا دل جذبات کی رنگینیوں میں کھیل رہا تھا۔ مگر فورِ اشتیاق پہ حیا پردے ڈال رہی تھی، وہ آغوشِ محبت میں پہنچ جانا چاہتی تھی۔ مگر حجاب مانع ہو رہا تھا—— ایک جنگ تھی خواہشِ وصل اور کاہشِ شرم میں! اور آخر شرم کو فتح ہوئی!—— ذکیہ ایک ہلکی سی سسکی لیکر نجمی کی گود سے نکل گئی۔

"جانِ تمنا! آج تمہیں کون سا خیال سوہانِ روح ہو رہا ہے؟" نجمی نے ذکیہ کو اپنی آغوش میں دوبارہ لیتے ہوئے کہا۔ "میں فرزانہ کو طلاق دیکر ہمیشہ کے لئے تم سے منسلک ہو جاؤں گا۔"

"نہیں پیارے نجمی! ایسا نہ کہو—— تمہیں اپنے خوشگوار ازدواجی تعلقات کو اس طرح نہ منقطع کرنا چاہیئے—— بہتر تو تھا کہ کاش!—— ہم تم کبھی کے لئے ایک ہو جاتے مگر اس نوعیت کا اشتراک کم از کم مجھے کبھی گوارا نہ ہوگا—— جاؤ—— پیارے! جاؤ خدا حافظ! اب بڑی دیر ہو گئی" یہ جملہ ختم کرتے وقت ذکیہ کی پلکوں پر دو چھوٹے چھوٹے ستارے رقص کرنے لگے اور اس کے ہونٹوں میں ہلکی سی لرزش نمایاں ہو گئی۔

"نہیں ذکو پیاری! یہ کبھی نہ ہوگا۔" نجمی نے ذکیہ کی ابرو پر اپنے تھرتھراتے ہوئے لب رکھ کر کہا۔ "جب ہم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ تو ہمیں اپنی نئی دنیا بسانے کے لئے جائز و ناجائز سب کچھ قربان کرنا ہوگا—— میں فرزانہ سے نپٹ لونگا۔"

ایک مرتبہ پھر چاہنے والے دل ماضی و مستقبل سے ناآشنا ہو کر ایک دوسرے سے اس طرح لپٹ گئے جیسے برسوں کے بچھڑے ملتے ہیں اور ایک مرتبہ پھر وہ اسی رومانی دنیا میں کھو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے جس میں جذبات محبت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

انہیں کیا خبر تھی کہ اس روحانی ماحول میں موت ایسی اور ہولناک شئے کا گذر ہو سکتا ہے۔ ہال کا ٹوٹا دروازہ کھلنے کی خفیف آواز آئی اور آنِ واحد میں پستول سے ایک سنسناتی ہوئی گولی نکلی جو نجمی کی کنپٹی سے گذرتی ہوئی ہال کی پختہ دیوار میں دھنس گئی۔ دوسرے لمحہ ایک دوسری گولی کی گرجدار آواز بلند ہوئی جس نے اس مرتبہ ذکیہ کو ہمیشہ کے لئے موت کی آغوش میں سلا دیا۔ نجمی چکراتا ہوا کروٹ کے بل فرش پر گرا اور ذکیہ ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ ایک ہاتھ سے زخم کی جگہ پکڑے ہوئے منہ کے بل فرش پر آ رہی۔ یہ دونوں فدائی ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو فرش پر پڑے ہوئے زندگی کی آخری منزل سے ہمکنار ہو رہے تھے۔ اور قاتل سایہ کی طرح الٹے پاؤں فرار ہونے میں منہمک تھا۔

مئی کی اس سہ پہر کو جبکہ یہ سانحہ گذرا تھوڑی دیر بعد پولیس کو اطلاع ملنے پر تمام حلقہ کے افسران معہ معاونین کے جائے وقوع پر پہونچ چکے تھے۔

پولیس افسران نے اس منظر کو حیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھا۔ نجمی کی کنپٹی سے سرخ لہو کی دھار نکل نکلکر پختہ فرش پر جم گئی تھی۔ قریب ہی بائیں جانب ایک پستول پڑا ہوا تھا۔ دوسری طرف ذکیہ—— حسن و جوانی کا مجسمہ! جو اس سے قبل صانع حقیقی کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھی! خون سے لتھڑے ہوئے فرش پر موت کی ابدی نیند سو رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اس کی زخمی چھاتی اور فرش کے درمیان تھا اور دوسرا نجمی کے مردہ ہاتھ کی طرف بڑھا ہوا—— کشتگانِ محبت اس سرائے فانی پر الوداعی نظریں ڈالتے ہوئے رخصت ہوتے وقت بھی ایک دوسرے کے لئے محبت رکھنے کا اعلیٰ ثبوت دے رہے تھے!

پولیس سپرنٹنڈنٹ رضا نجمی کو پہچانتے ہوئے فوراً اپنے نائب صدیقی سے مخاطب ہو کر بولا "یہ لاش یقیناً پروفیسر نجمی کی ہے! ——— شہر بھر کی آنکھوں کا تارا، ہر دلعزیز، ملنسار مردانہ حسن کا بہترین نمونہ ——— !"

"جی ہاں۔ مگر حیرت ہے کہ یہ یہاں کیسے آ گئے؟" صدیقی نے کہا

"مجھے یہاں کے ماحول سے خودکشی معلوم ہو رہی ہے" رضا نے نتیجہ اخذ کیا "نجمی کے دل میں نہ معلوم کب سے اس لڑکی کی طرف سے محبت کی آگ بھڑک رہی ہوگی۔ وہ یہاں کسی طرح پہونچ گیا۔ مگر ناکامی کی صورت میں اس نے لڑکی کو پہلے اپنے پستول کا نشانہ بنایا اس کے بعد خودکشی کر لی"

"مگر حضور! پروفیسر نجمی تو اہل دعیال والے شخص تھے" صدیقی نے کہا۔

"اس میں کیا شبہ! ان کے بیوی بچے ہیں اور نہایت خوشگوار ازدواجی زندگی تھی ———" رضا نے جواب دیا۔

"مگر باوجود اس کے اس نئی لڑکی سے معاشقہ حیرت انگیز واقعہ ہے ——— خصوصاً جب یہ چیز پروفیسر نجمی کی ذات سے منسوب کی جائے"

"اسمیں بھلا حیرت و استعجاب کون سا؟ ارے بھئی حضرتِ عشق تو بھوت ہیں بھوت ——— جنون ہے ایک خطرناک قسم کا ——— کیوپڈ کے تیر کا بھرپور وار نجمی کی زندگی کے خاتمہ کا باعث ہوا ساتھ ہی اسے بھی لیتا گیا جو اس حادثہ کا باعث تھی ——— ہاں! اس حادثہ کی اطلاع چوکی پر کس نے پہنچائی تھی۔" رضا نے دریافت کیا۔

صدیقی نے بوڑھے نگہبان کی طرف اشارہ کیا جو اپنی سفید وردی پہنے ہوئے ان لوگوں سے علیحدہ ہاتھ باندھے کھڑا ہوا تھا۔ رضا نے اسے چٹکی کے اشارہ سے اپنے قریب طلب کیا۔ اور سوالیہ نشان ہو کر اس کی طرف مخاطب ہو گیا۔ بڈھا بولا۔

"سرکار! میں چھوٹی بیگم ذکیہ کے بنگلہ کا پاسبان ہوں اس وقت بھی چھوٹی بیگم صاحبہ مجھے داخلہ کے دروازہ پر متعین فرما کر اندر تشریف رکھتی تھیں ——— ان کے ہمراہ پروفیسر صاحب بھی تھے۔ یہ لوگ گھنٹوں سے ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے ——— گرمی کا موسم حضور! میں اپنی جگہ بیٹھا بیٹھا غالباً سو گیا۔ مجھے نیند سے بیدار کرنے والی یکے بعد دیگرے دو گولیوں کی گرجدار آوازیں تھیں میں گھبرا کر اٹھا اور جائے وقوع پر پہنچا مگر یہاں پر سوائے ان دونوں لاشوں کے اور کچھ نہ تھا۔ پستول ان لوگوں کے درمیان پروفیسر صاحب کے قرب میں اسی طرح پڑا ہوا تھا جیسا کہ حضور نے ملاحظہ فرمایا میں فوراً بنگلہ کے مالی کو یہاں متعین کر کے چوکی میں اطلاع دینے حاضر ہوا اس کے بعد حضور خود ہی تمام باتوں سے واقف ہیں" بڈھے پاسبان نے تفصیل سے اپنا بیان دیا۔

"یہ تو قتل ہے خودکشی نہیں" رضا اپنا قیاس تبدیل کرتے ہوئے صدیقی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"جی ہاں بہت ممکن ہے!" صدیقی نے اپنے افسر اعلیٰ کی تائید کی "بہت ممکن ہے!" "بلکہ یقیناً یہی ہے کیوں کہ بائیں جانب کنپٹی کا گہرا زخم یہ ظاہر کرتا ہے کہ پروفیسر نجمی الٹے ہاتھ کے عادی نہ تھے ——— رضا نے اس واردات پر مزید روشنی ڈالی۔

"درست فرماتے ہیں آپ۔ اس کے علاوہ ہم پستول کے انگشت کے نشانات کا عکس لے کر بھی تو قاتل کا باسانی سراغ لگا سکتے ہیں ———!" صدیقی نے اپنی تجویز پیش کی۔

اسی اثناء میں سپرنٹنڈنٹ رضا کا طلب کردہ ڈاکٹر اندر داخل ہوا جس کے ہمراہ ماہر نشانات تھا۔ اور یہ دونوں اپنے کاموں میں منہمک ہو گئے۔ رضا نے صدیقی کے ذریعہ اس حادثہ کی اطلاع فرزانہ نجمی کو پہنچا دی اور خود ایک سگار جلا کر منہ میں لگاتے ہوئے پاسبان سے مخاطب ہو کر سوال کیا،

"تم پہلی گولی کے چھوٹنے کے وقت کا صحیح تخمینہ بتا سکتے ہو؟"

"جی ہاں حضور! تقریباً ساڑھے تین بجے، کیونکہ جس وقت میں نے یہاں کا انتظام کر کے چوکی پر اطلاع دی تھی۔ تو اس وقت چار بجے تھے ———"

۲

پروفیسر نجمی اور ذکیہ کے قتل کی ہیجان خیز خبر آن کی آن میں تمام شہر میں پھیل گئی ہر شخص اپنے خیال کے مطابق اس ضمن میں اظہار رائے کرنے لگا۔ شام کے اخبارات نے بڑی بڑی سرخیاں قائم کر کے گورنمنٹ اور پولیس سے پروفیسر نجمی کے قتل کے متعلق فوری تحقیق اور قاتل کا

سراغ لگانے کا مطالبہ کیا۔ کیونکہ پروفیسر نجمی سے عقیدت رکھنے والوں کا طبقہ اکثریت پر مشتمل تھا۔

سپرنٹنڈنٹ رضا نے محکمہ سراغرسانی سے معاونت حاصل کرتے ہوئے۔ اس مقدمہ کی مزید چھان بین اور قاتل کا سراغ لگانے کے لئے متعدد معاونین کی خدمات حاصل کرکے انہیں شہر کے ہر مشکوک گوشہ میں پھیل جانے کا حکم دیا اور دو چار خفیہ لوگوں کو اپنے نائب صدقی کی معیت میں جائے قتل کی سخت اور مکمل نگرانی پر متعین کر دیا اور خود بھی اس کی تفتیش میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ وہ لوگوں کو اپنے فرائض پر روانہ کرنے سے پہلے بولا:۔

"مقتول اور مقتولہ کے احباب اور اعزار کو تلاش کرو اور ان لوگوں کے متعلق جہاں تک بھی معلومات حاصل ہو سکیں قلمبند کرتے جاؤ۔ یہ ملحوظ رہے کہ اس مقدمہ میں وقت کی قدر کرنا سب سے اہم اور اشد ضروری چیز ہے"۔

پروفیسر نجمی کے قتل کے سلسلہ میں رضا کو بھی رنگ برنگی خبریں اور طرح طرح کے بیانات ملے مگر اسے کسی سے بھی اطمینان حاصل نہ ہوا۔ کیونکہ ان تمام باتوں میں سے ایک بھی اس کے لئے ممد و معاون ثابت نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد اسے ذکیہ کے محلہ کی ایک برقعہ پوش معمر خاتون سے معلوم ہوا کہ ذکیہ سلطانہ گرمی کے ایام مضافات میں گذارنے گئی تھی۔ وہ حال ہی میں کشمیر کی فرحت افزا وادیوں میں بقیہ گرمی کے ایام کاٹنے جانیوالی تھی۔ وہاں جانے سے پیشتر وہ دو چار یوم کے لئے مکان آئی تھی تاکہ یہاں سے کشمیر کے سفر کیلئے ضروری سامان مہیا کرنے کے بعد عازم سفر ہو ہمارے محلہ میں ہر چھوٹا بڑا اس کے متعلق بہترین رائے قائم کرتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ ذکیہ چال چلن کی ہمیشہ سے بڑی پاکباز لڑکی تھی۔ اس کے متعلق کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک شادی شدہ شخص سے معاشقہ کرتی ہے۔

اس کے علاوہ مقتول پروفیسر نجمی بھی عوام کے خیال کے مطابق چال چلن کا بہت پختہ آدمی تھا۔ اس کی زندگی بہت پرسکون، اس کا کیریکٹر نہایت اعلیٰ اور مزاج نہایت سادہ اور موہ لینے والا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے دوستوں میں سے بھی کسی کو ذکیہ اور نجمی کی اس رومانی زندگی کے متعلق علم نہ تھا۔

ان تمام باتوں کا موازنہ کرنے کے بعد سپرنٹنڈنٹ رضا کو اس مقدمہ کے متعلق مزید پیچیدگیاں پیدا ہوتی دکھائی دینے لگیں۔ وہ انہیں پریشانیوں اور الجھنوں میں گرفتار نہ معلوم کیا کیا سوچ رہا تھا۔ کہ ٹیلیفون کی گھنٹی نے اس کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ وہ اُدھر مخاطب ہوا۔ کوئی ٹیلیفون کے اس حصہ سے بول رہا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ رضا نے حیرت و استعجاب میں سننا شروع کیا :۔

...... مگر سپرنٹنڈنٹ .... ! میں پروفیسر نجمی کے متعلق اور کچھ نہیں جانتا سوائے اس کے کہ وہ اکثر ہمارے یہاں آیا کرتا تھا .... جی ہاں .... ہاں ہاں: ...... جی ...... ہاں میں اس وقت اپنے دوستوں کے ہمراہ اسلامی جیمخانہ میں تھا ...... شوق سے ...... ہاں آپ تحقیق کر سکتے ہیں ــــ"

صدقی بہت رات گئے واپس آیا۔ اسے اپنی کوششوں میں ناکامی ہوئی تھی۔ اس نے ذکیہ کے دوستوں اور عزیزوں سے مل کر اس کے متعلق بہت کچھ سراغ لگایا مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ اخذ کر سکا۔

"اے جناب! ذکیہ کے اعزا اور دوست تمام کے تمام ذکیہ کے متعلق بہترین خیالات کے حامل ہیں ــــ صدقی نے رضا سے آکر کہا۔

"تو تمہیں کوئی کارآمد بات نہ معلوم ہو سکی ــــ ؟"

"کچھ نہیں۔ ان کے بیانات سے صاف عیاں ہے کہ وہ پروفیسر نجمی اور ذکیہ کی محبت کے متعلق بالکل ناواقف ہیں"۔ صدقی نے جواب دیا۔

"بہت پیچیدہ معاملہ ہے صدقی ــــ"

"جی ہاں! قصہ دراصل یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہمیں اب تک کوئی کارآمد بات معلوم نہ ہو سکی جسے ہم اپنی مشعل راہ بنا سکتے ــــ" صدقی بولا۔

"اگرچہ نصف شب سے زیادہ ہو چکی ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ ہم لوگ اس تحت میں ایک مرتبہ بیگم فرزانہ نجمی سے ضرور ملکر مبادلہ خیال کریں ــــ ؟"

آدھی رات گذر چکی تھی۔ آسمان پر تارے چمکتے ہوئے تھے فضا ساکن و خاموش تھی، مالک کار "قصر انجم" کے نمبر سے

پھاٹک پر رُکی اور بنگلہ کی گیلری میں داخل ہو کر اس نے اپنا ہارن بجایا۔ ایک ادھیڑ عمر کا شخص قریب آیا۔ سپرنٹنڈنٹ رضا اور صدقی بغیر اس سے کچھ کہے ہوئے موٹر سے اُتر کر اس کے ساتھ ہو لئے۔ جب وہ لوگ بنگلہ کے اندر پہنچ گئے تو رضا نے اسے اپنا کارڈ دیکر اس کی مالکہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

تھوڑی دیر میں حریر و دیبا کے پردوں میں لرزش ہوئی اور ایک سڈول جسم کی متوسط العمر خاتون ملاقاتی کمرے میں رضا اور صدقی کی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کا کاہیدہ بدن ہلکے شب جوانی کے لباس سے ببیٹا ہوا تھا۔

اُس نے ملاقاتی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"اتنی رات گئے . . . . سپرنٹنڈنٹ رضا!"

"سب سے پہلے میں آپ کے آرام میں مخل ہونے کی معافی چاہتا ہوں اور ——"

"کوئی مضائقہ نہیں —— تشریف رکھیئے ——" فرزانہ نجمی نے مقیم ہوتے ہوئے کہا "فرمائیے! کیا میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتی ہوں ——؟" ان کی آواز نحیف تھی اور اس کے چہرے سے حزن و ملال ٹپک رہا تھا۔

"ہاں مجھے امید ہے کہ آپ ایک حد تک اس مقدمہ کے سلسلہ میں میری معاون ثابت ہونگی ——" رضا نے نیچی نگاہ کئے ہوئے جواب دیا۔

"مگر سپرنٹنڈنٹ! برخلاف اس کے مجھے اسکی کم توقع ہے۔ کیونکہ عوام کی طرح میں بھی مفصل حالات سے بے خبر ہوں پھر بھی مجھے خوشی ہوگی۔ اگر میں اپنے مقتول شوہر کا انتقام لینے کے لئے آپ کی کچھ معاونت کر سکوں،" فرزانہ کی غمزدہ نگاہیں فرش کی طرف جھکی ہوئی تھیں اور وہ اپنے ناخن کو اُچ کی لکڑی میں گڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں اسی امید و بیم کی جھلک لئے ہوئے حاضر خدمت ہوا تھا۔"

"مگر ملاحظہ تو فرمائیے سپرنٹنڈنٹ رضا! میں اپنے شوہر کے چال چلن کے متعلق بہت عمدہ رائے رکھتی تھی۔ اگر میں نے کبھی انہیں اس قسم طفلانہ حرکت کرتے ہوئے سنا یا دیکھا ہوتا۔ تو مجھے مشکوک ہونے کی گنجائش بھی ہوتی اور اس صورت میں مجھے قانوناً اُن سے علیحدگی کے اختیارات بآسانی حا...

سکتے تھے۔"

سپرنٹنڈنٹ رضا نے غیر ارادی طور پر اثبات میں سر کو جنبش دی پھر سوال کیا۔

"کیا آپ صحیح فرما سکتی ہیں کہ وہ دن کو مکان سے کس وقت رخصت ہوتے ——؟"

"ہاں ہاں۔ بہت آسانی سے" بیوہ نے اپنی نظریں اوپر اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ اس نے ایک لمحہ سوچنے کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں تاکہ وہ سپرنٹنڈنٹ کے سوال کے سلسلہ میں صحیح وقت بتا سکے۔ اس کے بعد بولی "محترمی! وہ دو بجے تک ہم لوگوں کے ہمراہ قصر انجم میں رہے۔ اس کے بعد ہی کپڑے پہن کر باہر چلے گئے۔ چونکہ مجھے بھی شام کے چار بجے ایک جلسہ میں شریک ہونا تھا۔ اس لئے میں بھی یہاں سے تقریباً ساڑھے تین بجے چلی گئی۔"

"اچھا اب میرے ایک سوال کا اور جواب دیں —— یہ بتا سکتی ہیں کہ پروفیسر کو ٹیلیفون پر یا کسی شخص کے ذریعہ کسی نے طلب تو نہیں کیا تھا ——؟"

"میری موجودگی تک تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی پھر بھی آپ خادمہ اور دوسرے نوکروں سے بھی استمزاج فرما کر اپنا اطمینان کر سکتے ہیں ——"

نوکروں سے استفسار پر رضا کو سب کے بیانات تقریباً یکساں نظر آئے۔ جن سے وہ اپنے مقدمہ کے سلسلہ میں کوئی کارآمد نکتہ نہ پا سکا۔

۲

گناہ کی شطرنج پر ایک چالاک مہرے کی طرح سپرنٹنڈنٹ رضا نے اپنی چال کے متعلق فیصلہ کیا کہ ذکیہ کے ہمسایہ لوگوں سے اس کے متعلق کچھ تحقیقات کرے چنانچہ اس خیال کے ماتحت اسے تحقیقات پر معلوم ہوا کہ ایک شخص اکثر ذکیہ سے ملنے آیا کرتا تھا۔ جو اس کا بھائی تھا۔ مگر مزید چھان بین پر رضا کو یقین ہو گیا۔ کہ ذکیہ اور یہی شخص مقتول پروفیسر نجمی تھا

معاملات اور بھی پیچیدہ اور اہم ہوتے ہی چلے گئے۔ ابھی اس راز کو پانے میں رضا کو بہت دشوار گذار مراحل نظر آتے تھے۔ اگرچہ اسے بہت سی کارآمد باتیں دستیاب ہو گئی تھیں، مگر دقت تھی تو یہ کہ وہ واقعات ایک دوسرے

سے ہم آہنگ نہیں ہو رہے تھے رضا نے دفتر میں بیٹھے بیٹھے ایک لمحہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ہاتھوں کو میز پر تکیہ دے کر اپنا سر رکھ لیا۔ اور واقعات کی لڑیوں کو یکجا کر کے ایک مسلسل زنجیر بنانے میں منہمک ہو گیا حتیٰ کہ ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آگئی۔ ایسی ترکیب کہ وہ مسرت و انبساط میں مسکراتا ہوا اٹھا اور بقیہ رات تفکرات کے دلدل سے نکل کر اطمینان و سکون کے سبزہ زار میں گذارنے کی غرض سے اس معاملہ کو صبح پر ملتوی کرتا ہوا مکان چلا آیا اور بستر پر دراز ہو کر چند لمحات کے لئے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا صبح کے وقت جبکہ شاہ خاور افقِ مشرق سے نمودار ہو کر پردۂ گیتی پر اپنی ہلکی ہلکی روشنی بکھیر رہا تھا سپرنٹنڈنٹ رضا نے اٹھ کر غسل کیا اور بہت احتیاط سے باورچی کا بھیس بدل کر اپنے شکار کی تلاش میں پیادہ پا چل دیا۔

رضا نے چند دنوں فرزانہ کے یہاں باورچی کی ملازمت میں رہ کر اس کی خادمہ مرجانہ سے یارانہ گانٹھ لیا۔ حتیٰ کہ وہ لوگ آپس میں اسقدر بے تکلف اور مانوس ہو گئے کہ آخر ایک دن رضا نے باتوں باتوں میں مرجانہ سے سب کچھ بھید لے لیا۔

"مگر عباد! تم کہیں اس راز کو افشا نہ کرنا ورنہ تمہاری مرجانہ کہیں کی نہ رہے گی ـــــ" مرجانہ نے ناز سے بل کھاتے ہوتے کہا۔

"ارے نہیں نہیں میری جان! تم میری طرف سے تو مطمئن ہی رہو" نقلی عباد نے مرجانہ کو اطمینان دلاتے ہوئے جواب دیا۔

"حادثہ کی دوپہر کو صاحب کے پاس ایک پیغام موصول ہوا تھا"

"تقریباً کتنے بجے ـــــ؟"

"یہی کوئی ایک بجے۔ پیغام بر ایک خوش پوش لڑکا تھا ـــــ میرا خیال ہے کہ وہ کسی شریف گھرانے کا چشم و چراغ ہوگا۔ اس کے ہاتھ میں ایک عنابی لفافہ تھا جسے اس نے صرف صاحب کے ہاتھ میں دینے کی خواہش ظاہر کی"

"اچھا تو تمہارے صاحب نے اس خط کو پڑھا ـــــ؟"

"ہاں اور نہیں تو! ...... اسی وقت پڑھا ـــــ"

"پھر ان کے چہرے پر کون سے تاثرات تھے؟"

"مسرت و انبساط کے"

"اور تمہاری بیگم پروفیسر نجمی کے جانے کے کتنی دیر بعد گئیں؟"

"یہی کوئی تقریباً ½ ۲ بجے سے کچھ پیشتر"

"نہیں ـــــ صرف یہ اظہار کیا کہ انہیں جلد جانا چاہیئے مبادا تاخیر ہو جائے اور یہ کہ وہ حتیٰ الامکان جلد واپس ہوں گی"

نقلی عباد بیگم فرزانہ نجمی کے یہاں اپنے فرائض سے سبکدوش ہو کر اول شام اپنے مکان لوٹ آتا تھا۔ اور وہ یہاں سپرنٹنڈنٹ رضا کی طرح تمام شب اپنے فرائض ادا کرتا تھا اس شام کو جب وہ قصر انجم سے واپس آیا۔ تو اس نے ضروری کاموں سے بہت جلد فراغت حاصل کر کے ذکیہ کی تمام سہیلیوں اور ملنے والیوں کو پولیس اسٹیشن پر طلب کیا۔ اور ان سے ان کے بھائیوں اور دیگر صغر سن رشتہ داروں کی بابت استفسار کیا آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ ذکیہ کی ایک سہیلی محسنہ نے دو گھنٹہ کی جد و جہد کے بعد اعتراف کیا کہ پروفیسر نجمی کے پاس وہ خط لیجانیوالا اس کا چھوٹا بھائی ایاز تھا۔ رضا نے اس کا بیان قلمبند کرتے ہوئے۔ اطمینان کا سانس لیا اور مزید سوال کیا:۔

"آنسہ محسنہ! جہاں آپ نے اتنا کرم فرمایا ہے۔ وہاں اس معاملہ میں میری کچھ اور امداد فرمایئے ـــــ یہ فرمایئے کہ آپ مرحومہ ذکیہ اور مقتول پروفیسر نجمی کے متعلق اور کیا جانتی ہیں ـــــ؟" محسنہ نے کہنا شروع کیا۔

"ذکیہ اور پروفیسر کی عرصہ ایک سال سے والہانہ محبت تھی۔ مگر رفتہ رفتہ فرزانہ کیوجہ سے حالات متضاد ہوتے چلے گئے۔ مگر ان کی محبت میں کوئی فرق نہ آیا ـــــ"

"جی ہاں ـــــ اور ـــــ؟"

"مگر ذکیہ نے نجمی کو سمجھا بجھا کر اس سے قطع تعلق کرنا چاہا اور اس کا سبب محض فرزانہ تھی ـــــ ذکیہ نے اپنے مفاد کی خاطر اپنی جنس کی حق تلفی ہرگز گوارا نہ کرنی چاہی ـــــ"

"ہاں ہاں کہے جایئے ـــــ"

"ـــــ اور چونکہ یہ ناؤ اب زیادہ دور تک چلنے والی نہ تھی۔ کیونکہ خطرہ تھا کہ کہیں حوادث کے تھپیڑوں میں پھنس کر منجدھار میں غرق نہ ہو جائے ـــــ آخر سماج میں رہ کر وہ سماج سے بغاوت تو کر نہ سکتی تھی اسی لئے

اس نے پروفیسر کو اس دن محض اس لئے طلب کیا تھا۔ کہ اس الوداعی طور پر رخصت ہو کر کشمیر کے لئے عازم سفر ہو۔ مگر اس کے بعد جو سانحہ وقوع پذیر ہوا اس سے آپ واقف ہیں محسنہ نے یہ جملہ ختم کیا۔ شدت غم سے اس کی پلکیں نمناک ہو گئی تھیں۔

—— ۴ ——

دوسرے دن ——

صبح سپرنٹنڈنٹ رضا پھر عباد کے بھیس میں اپنی نوکری پر وقت سے پہنچ گیا اور وہاں رہ کر اس نے فرزانہ کی نقل و حرکت کا بغور مطالعہ کیا۔ جس سے صاف عیاں ہو گیا کہ فرزانہ اپنے شوہر کی غیر موجودگی سے کوئی گلہ نہ محسوس کرتی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی اگر بچے تذکرۃً "پاپا" کی کوئی بات کہہ دیتے تھے۔ تو وہ انہیں ڈانٹ کر خاموش کر دیا کرتی۔

رضا نے تمام دن اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دیئے اس کے بعد وہ حسب معمول شب کو مکان واپس چلا آیا۔ اور اپنے نائب صدقی کو بلا کر اس سے رازدارانہ طریقہ پر گھنٹوں گفتگو اور مبادلۂ خیالات کرتا رہا۔ آخر کار کافی جد و جہد کے بعد وہ لوگ ایک نکتہ پر متفق ہوئے اور اس نکتہ کو عملی جامہ پہنانے کی تجاویز اور راستوں پر غور و خوض کر کے معاملات دوسری صبح پر ملتوی کر کے یہ لوگ آرام کرنے چلے گئے۔

دوسری صبح —— نائب صدقی نے اپنے افسر اعلیٰ کی ہدایات کے مطابق تمام دن نہایت تن دہی سے شب کی تجاویز کو عملی جامہ پہنایا اور شام کو بے صبری سے رضا کے آنے اور حالات کے انکشاف کا انتظار کرنے لگا۔

شام اپنی تمام دلفریبیوں اور رعنائیوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے آئی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ رات نے اپنا سیاہ جامہ پہنا۔ رات کے دو پہر گذر رہے۔ سڑکوں پر راہگیروں کی آمد و رفت بالکل خفیف رہ گئی چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ دن بھر تمازت آفتاب سے جھلسی ہوئی ہوا اب بھی گرم گرم تھپیڑوں سے اکا دکا چلنے والوں کا سڑکوں پر استقبال کرتے ہوئے بڑی بڑی حویلیوں اور فلک بوس عمارتوں سے ٹکراتی ہوئی ادھر ادھر گذر جاتی۔ کبھی کبھی ایک آدھ موٹر یا تانگہ گذرنے کی آواز سنائی دیتی ورنہ پھر وہی سناٹا چھا جاتا۔ تمام عالم محو خواب تھا۔ عمارتوں کی کھڑکیوں اور دریچوں سے نکلتی ہوئی برقی روشنی سڑکوں کے کھمبوں کے برقی قمقموں سے ہم آہنگ ہوتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ کہیں کہیں ایک آدھ پروانہ اپنی وفا اور محبت کا ثبوت دیتے ہوئے روشنی کے گرد محو رقص تھا تو کہیں دور آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آواز ساکن فضا میں ایک ارتعاش پیدا کر دیتی۔ پھر وہی سکوت کا عالم جاری و ساری رہتا۔

رضا اور صدقی اپنے فرائض کی انجام دہی میں منہمک اور معاملات کے انکشاف کے منتظر تھے۔ کبھی کبھی ان پر غنودگی کا تسلط ہو جاتا۔ مگر پھر وہ نیند کو جھٹک کر چوکنا ہو جاتے۔ سامنے کے گھنٹہ گھر نے پونے دو کا اعلان کرتے ہوئے اپنا مترنم نغمہ چھیڑا جو کچھ لمحہ بعد فضا بسیط میں پھیل کر معدوم ہو گیا۔ اس کے بعد ہی ان لوگوں کو زیادہ دیر تک منتظر نہ رہنا پڑا کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے ایک خوبصورت کار اپنی طرف آتی ہوئی دیکھی جو ان کے قریب ہی آ کر رک گئی۔ یہ دونوں پہلے سے زیادہ محتاط ہو گئے۔ اور محفوظ طریقہ سے پوشیدہ رہ کر آنیوالے کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے لگے۔ کار کا داہنی طرف والا پٹ کھلا اور اس میں سے ایک عورت سیاہ برقعہ میں ملبوس بجلی کی سرعت کے ساتھ نکل کر سامنے کی چھوٹی گلی میں داخل ہوئی اور دس گز کے فاصلہ والے مکان کے بھڑے ہوئے پٹ کو کھول کر مکان میں چلی گئی۔

رضا بھی صدقی کو موٹر کی نگہداشت پر متعین کرتے ہوئے اپنی سرعت سے مذکورہ مکان کی طرف لپکا اور دروازے کے باہر کھڑا رہ کر موقع کا متلاشی رہا۔ اور تھوڑی دیر بعد جب وہ سیاہ برقعہ پوش عورت اپنا کام ختم کر کے باہر نکلی تو ایک شخص کو دروازہ دیکھ کر وہ الٹے پاؤں بہت تیزی سے مکان میں داخل ہو گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لینا چاہا۔ مگر رضا نے اسے اس کا موقع نہ دیا۔ بلکہ خود بھی سرعت سے دروازہ کے پٹوں کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ نجمی اور ذکیہ کی قاتل فرزانہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اور کچھ فاصلہ پر ذکیہ کا سابق بڈھا پاسبان کھڑا ہوا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں نوٹوں کی ایک گڈی تھی۔ اور فرزانہ کا چہرہ خوف و ہراس سے باد خزاں کے خشک جھونکوں سے

مرجھائی ہوئی بیجان پتی کی طرح زرد نظر آرہا تھا۔ رضا کے دونوں ہاتھوں میں بھرے ہوئے ریوالور تھے جنہیں وہ فرزانہ اور بڈھے کی طرف بلند کئے ہوئے تھا۔ بڈھا بغیر کسی سوال کے رضا کے پیروں پہ گر پڑا۔ اور گڑگڑا کر بولا۔

"حضور! میں بالکل بے گناہ ہوں۔ میرا کوئی قصور نہیں ابتدا سے بیگم فرزانہ نے روپے کا لالچ دے کر مجھے اس مکروہ گناہ میں شریک کیا۔ مجھے میرے ضمیر کے خلاف انہوں نے نمک حرامی اور دغابازی پہ مجبور کیا۔ اور شروع ہی سے انہوں نے گورنمنٹ پہ حالات نہ منکشف کرنے کے عوض میں ان روپوں سے میرا منہ بند کر دیا ——— حضور! میں بالکل بے گناہ ہوں ———

بڈھا دو زانو ہو کر اُٹھتے ہوئے فرزانہ کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے ملتمس ہوا۔

بڈھے اور فرزانہ کی نگاہیں چار ہوئیں اول الذکر کی نظروں سے نفرت و حقارت ٹپک رہی تھی۔ اور آخر الذکر کی آنکھوں سے غیظ و غضب مگر اس وقت دونوں عالم بے بسی میں تھے۔ رضا کے ہونٹوں پہ تبسم رقصاں تھا۔ اس کی ذاتی ہمدردی ان دونوں کے ساتھ تھی۔ مگر سرکاری قانون اور اس کا فرض منصبی دوسری چیزیں تھیں۔

سپرنٹنڈنٹ رضا نے صدیقی کو بھی بڈھے پاسبان کے مکان میں بلا لیا اور یہاں ان دونوں کے بیانات قلمبند کئے بڈھا بولا۔

"سرکار! میں پہلی گولی کی آواز سے قبل ان کے وجود سے کلیتہً ناواقف تھا"

"یہ جھوٹ بولتا ہے" فرزانہ نے گرج کر بڈھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ غصے سے ان کا چہرہ ایک لمحہ کے لئے سرخ ہو گیا

"اب اس سے کیا حاصل بیگم فرزانہ! ———؟" اب رضا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا "جہاں تک ہو سکے اب معاملات کو زیادہ پیچیدہ نہ کیجئے اسی میں ہم سب کی بہتری ہے میں ابتدا سے آپ پہ مشکوک ہو رہا تھا۔ مگر چونکہ ثبوت قابل گرفت نہ تھے۔ اس لئے میں آپ کے خلاف کچھ نہ کر سکا۔ اور اب جب کہ میرے پاس اس ضمن میں کافی مواد موجود ہے تو آپ کے فرار و گریز سے نتیجہ کچھ نہ ہو سکے گا۔ یہ فقیر مجھی کو ایک لڑکے کے توسط سے اس دن دوپہر کو ایک خط ملا تھا۔ جسے آپ نے کسی طرح پڑھکر اس کے مقام سے واقفیت حاصل کر لی۔ اس کے بعد آپ نے موقع و محل مناسب دیکھ کر ان دونوں کو نشانہ اجل بنایا اور پستول کو مقتولین کے درمیان چھوڑ کر آپ جلسہ کی شرکت کیلئے چلی گئیں۔ کیا آپ کو ان تمام باتوں سے انکار ہے ——— ؟"

رضا نے فرزانہ کا جواب سُنے بغیر دوبارہ کہنا شروع کیا "اب اگر آپ اس کی بھی ضرورت سمجھتی ہیں کہ یہ تمام واقعات ہمیں کس طرح معلوم ہوئے تو میں آپ کو اس سے بھی آگاہ کرنے کے لئے تیار ہوں ——— تجزیہ سے مجھے یہ تمام حقیقت معلوم ہوئی ——— ہم نے آپ کو اپنی مضبوط قانونی گرفت میں لینے کے لئے چند ذرائع اختیار کئے تھے۔ جو اتفاق سے کامیاب ثابت ہوئے جس کے نتیجہ میں آپ میرے سامنے بحیثیت قاتل کے موجود ہیں ——— کیا آپ کو اب بھی ارتکاب جرم سے انکار ہو سکتا ہے ——— ؟" رضا کے لہجہ میں سختی اور سنجیدگی تھی

فرزانہ کے چہرہ پر ایک رنگ آتا اور دوسرا جاتا تھا۔ وہ عورت جو کچھ دیر قبل ایک ممتاز شخصیت کی مالک تھی اس وقت قانونی شکنجہ میں بُری طرح گرفتار تھی۔ اپنی لغزش کا لازمی انجام سزا کی شکل میں اس کے سامنے موجود تھا ——— !

وہ نڈھال ہو کر چارپائی پہ گر پڑی۔ اس کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب بہہ چلا تنفس کی رفتار کئی گنا تیز ہو گئی اور اس نے اسی کشمکش میں اعتراف گناہ کر لیا۔ وہ بولی۔

"ہاں! میں اپنے شوہر اور ذکیہ کی قاتل ہوں ——— میں اپنے شوہر سے ذکیہ کے تعلقات کو کبھی برداشت نہ کر کر سکتی تھی ——— سپرنٹنڈنٹ رضا! ان کے قتل میں جذبہ حسد ضرور کارفرما تھا۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ میں نے اخلاقی جرم ہرگز نہیں کیا" اس نے سسکیوں کے درمیان اس جملہ کو توڑا کیا پھر بولی "میں نے انہیں اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا جب کہ وہ .... وہ ایک .... دوسرے کے بازوؤں میں تھے ..... مجھے ذکیہ سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ رضا نے اس سے دریافت کیا۔

"اور خلاف معمول آج آپ بڈھے پاسبان کے مکان پہ کیوں تشریف لائیں ؟"

"اس لئے کہ صبح اور شام کے مقامی اخبارات نے

لکھا کہ پاسبان نے جو بیان دیا وہ صداقت پر مبنی نہ ہوتے ہوئے قتل کے سراغ میں ابتک ایک معمہ بنا ہوا ہے۔ اور بہت جلد وہ مزید حالات کو منکشف کریگا جس سے یہ گتھی سلجھ سکے ——— میں گھبرا گئی ——— میں نے خیال کیا کہ پاسبان سب کچھ کہہ دیگا ... اس لئے ...... اس لئے میں اسکا منہ بند کرنے ...... رضا نے درمیان میں اسے روک دیا۔

"ہاں ہاں میں سمجھ گیا" سپرنٹنڈنٹ رضا نے صدیقی کی طرف دیکھ کر متبسم ہوتے ہوئے کہا۔ ان کی شب والی اسکیم کامیاب ہو چکی تھی۔

——— ۵ ———

ایک ہفتہ بعد شام کو ———

نیر اعظم تمام دن کا تھکا ماندہ ایوانِ مغرب میں روپوش ہونے جا رہا تھا۔ اس کی زرد کرنیں اونچے اونچے درختوں کی چوٹیوں، فلک بوس عمارتوں، سبزہ زاروں اور کوہساروں پر اپنی الوداعی نگاہیں ڈالتی ہوئی پھیکی پڑتی جا رہی تھیں۔

شام وحشت ناک ہو چلی تھی۔ دریا کی طوفانی موجیں اٹھ اٹھ کر ایک عجیب آواز پیدا کر رہی تھیں۔ فرزانہ نے زنداں کے عقبی حصہ کی کھڑکی کی سلاخیں اپنے حنائی ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے اپنی افسردہ نظریں شام کے منظر کی طرف ڈالیں۔ اس کے گیسوئے خمدار شانوں پر بکھرے ہوئے عشق پیچاں کی طرح بل کھا رہے تھے۔ اس کے صندلی ہاتھوں میں خفیف سی لرزش تھی۔ اس کی سیاہ مخمور آنکھیں شدتِ غم سے ابل آئی تھیں ——— اور آہ! اس کی غریب روح!! ——— اپنے کئے پر پشیمان ہو رہی تھی ——— وہ فطرت کی نگاہوں میں بے گناہ تھی مگر ——— قانون کی نظروں میں قاتل۔

(پلاٹ مستعار)

قطعات

عمرِ جاودانی

میرے سازِ دل کے ہر اک تار کو
اک نوائے غیر فانی بخش دی
گویا جب بخشی محبت آپ نے
مجھ کو عمرِ جاودانی بخش دی

تشبیب

شبِ تاریک کی خموشی میں
میرا دل مجھ سے چھپ کے روتا ہے
آہ مظلومیت کا یہ منظر
کس قدر دل گداز ہوتا ہے

کوشش ناکام

دل مجھے شاد بنانے کیلئے
کوششِ خام کئے جاتا ہے
بیقراری کو مٹانے کے لئے
آپ کا نام لئے جاتا ہے

محبت کی بھیک

یہ تمنا ہے دلِ بیتاب کی
مجھ کو ہر دم آپ کی ہے جستجو
کاش مل جائے محبت آپ کی
بس یہی مسرور کی ہے آرزو

از جناب مسرور علیگ

عاشق کا جسم ناتواں

محبت میں یہ کوئی نئی بات نہیں کہ ہم جن کو چاہیں وہ ہم کو نہ چاہے یہ اکثر ہی ہوا کیا ہے اور ہوا کیا۔ اور یہ بھی کوئی عجیب بات نہیں۔ کہ محبت کی مایوسیوں سے کسی چاہنے والے کی صحت خراب ہو جائے۔ مگر یہ عجیب بات تو ضرور ہے۔ کہ عاشق اپنی اس خراب صحت پر نازاں ہی نہ ہو بلکہ اور زیادہ اس اُمید میں لاغر ہو جائے کہ اگر وہ دم نزع بستر مرگ کے پاس نہ آئے تو کم از کم مرنے کے بعد میت پہ تو ضرور آئیں گے اور افسوس کریں گے کہ آخر ہم نے اسے کیوں مار ڈالا؟ لیکن یہی عجیب بات ہے جو ہم کو اکثر فارسی کے شعرا کے کلام میں ملتی ہے۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ محبت کے اس فلسفہ کا موجد کون تھا۔ مگر علمبردار اس کے فارسی ہی کے شعرا تھے اور ان کے بعد بعض اُردو کے شعرا نے بھی یہی طرز اختیار کیا۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ فارسی کے شعرا زیادہ تر توانا و تندرست رہے ہوں گے، مگر چونکہ محبت میں اپنے جسم کو گھلا دینا معشوق کی نظر کرم حاصل کرنے کا ایک حقیر اور جائز طریقہ خیال کیا جاتا تھا۔ یہ ایک فیشن سا ہو گیا کہ ہر عاشق خواہ وہ کتنا ہی موٹا تازہ ہو جب اپنے معشوق کے سامنے وصل کی درخواست پیش کرے تو اس میں یہ ضرور لکھے کہ میں آپ کے عشق میں اسقدر دبلا ہوا جا رہا ہوں کہ ؎

جواب بھی تو جیہ نہ فرمائیے گا　　تو بس ہاتھ ملتے ہی رہ جائیے گا

افسوس تو یہ ہے کہ یہ فیشن عام شعرا تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اساتذہ تک اس کے شکار ہو گئے۔ اور فارسی شاعری میں ایک ایسی چیز کا اضافہ کر گئے۔ جس پر آنے والی نسلیں ہمیشہ ہنسیں گی۔

خسرو ایسے بلند پایہ شاعر کے منہ سے یہ شعر کس قدر عجیب معلوم ہوتا ہے:۔

زیں ضعف وجود از من در زلف تو آویزم
مشاطہ بجائے مو در شانہ کشد مارا

یعنی میں اس قدر کمزور ہوں کہ اگر تمہاری زلف میں لپٹ جاؤں تو مشاطہ بجائے بالوں کے مجھ کو کنگھی میں کھینچ لے۔

مطلب کہنے کا یہ ہے کہ میں اتنا ہی نحیف و لاغر ہوں جتنی تمہارے سر کی جوں۔ جسے تمہاری مشاطہ کنگھی میں کھینچ لیتی ہے۔ مگر کس قدر

مزاحی مضمون

از جناب مدن مراری لال بی اے (آنرز)، ایل ایل بی وکیل

لطیف خیال ہے۔

ایک اور شعر میں فرماتے ہیں:۔

دوم ز ضعف بہر جانبے کہ آہ رود
چو عنکبوت کہ بر تار خویش راہ رود

یعنی میں اسقدر کمزور ہوں کہ جس طرح مکڑی اپنے دہن سے نکلے ہوئے تار پر چلی جاتی ہے۔ اسی طرح میں بھی اپنی آہ کے ساتھ جدھر وہ جاتی ہے چلا جاتا ہوں۔

اس نازک خیالی کی داد دینا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ آہ کے ساتھ چلا جانا کیونکہ ہماری آہیں تو ہمیشہ آسمان کی طرف جاتی ہیں۔

ابو طالب اپنے نہ مر سکنے کی صفائی اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

در فرقت تو زندہ نہ از سخت جانیم
جاں از کمال ضعف نیاید بلب مرا

یعنی میں تمہاری جدائی میں اپنی سخت جانی کی وجہ سے زندہ نہیں ہوں بلکہ میری کمزوری اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ جان ہونٹوں تک نہیں آتی۔

غنی کی سمجھ میں بھی یہی بہانہ آیا۔ وہ فرماتے ہیں ؎

جاں بلب از ضعف نتواند رسید
تا بزور ناتوانی زندہ ایم

یعنی جب تک ہم ناتوانی کے زور سے زندہ ہیں جان کمزوری کی وجہ سے ہونٹوں تک نہیں آ سکتی۔

مطلب کہنے کا یہ ہے کہ ہماری جان جب ہی ہونٹوں تک آ سکے گی کہ ہماری ناتوانی جاتی رہے اور یہ جب ہی جائیگی جب آپکی ہمارے حال پر نظر عنایت ہوگی۔ لہذا بس ایک مرتبہ ہمارے مہربان ہو جایئے تاکہ ہمارے جسم میں مر جانے بھر کے لئے قوت آ جائے۔

(اس مضمون کو صاف کرتے وقت ایک نوجوان کی بڑی دردناک موت کی خبر ملی۔ وہ نیک ذات بظاہر تندرست تھا۔ مگر چھپا ہوا تپ دق کا مریض تھا۔ جوانی کی اُمنگوں نے اُسے اپنی محبوب منگیتر سے شادی کرنے پہ مجبور کر دیا۔ جس سے دبا ہوا مرض ایسا اُبھرا کہ چند ہی روز میں غریب دُنیا سے سدھار گیا۔ اب ہم جو غور کرتے ہیں تو غنی کے شعر کی جو ہم نے مزاحیہ رنگ

میں تشریح کی وہ اس افسوسناک واقعہ پر مطابق آتی ہے اور ہم یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ بعض بظاہر مہمل شعروں میں بھی اصلیت ہوتی ہے)

کمزوری کی وجہ سے نہ مرنا تو عجیب ہے ہی مگر ایک عاشق سادہ لوح تو اپنے نہ مرنے کی نہایت ہی مضحکہ خیز وجہ بتلاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

تنم از ضعف چناں شد کہ اجل جست و نیافت
نالہ ہر چند نشاں داد کہ در پیرہن است

یعنی میرا جسم کمزوری سے ایسا ہو گیا کہ موت اس کو ڈھونڈھ ہی نہ پائی باوجودیکہ میری پُر درد آواز برابر یہ بتاتی رہی کہ لباس میں ہے۔

ایک دوسرے عاشق ناچیز کے غریب خانہ پر تو موت کئی مرتبہ چکر لگا کر واپس چلی گئی۔ وہ فرماتے ہیں ؎

فراق یار چناں زار و ناتوانم ساخت
کہ چند بار اجل آمد و مرا نشناخت

یعنی یار کی جدائی نے مجھکو اسقدر کمزور اور لاغر کر دیا کہ موت کئی مرتبہ آئی اور مجھکو پہچان نہ سکی۔

ایک تیسرے عاشق زار نے شاید اسی غرض سے کہ موت ان کو پہچان نہ سکے، لاغری کی مشق شروع کر دی، وہ فرماتے ہیں ؎

ز بس بمکتب غم مشق لاغری کردم
تنم بکاغذ مسطر کشیدہ می ماند

یعنی مکتب غم میں میں نے اسقدر لاغری کی مشق کی کہ میرا جسم مسطر کئے ہوئے کاغذ کی طرح معلوم ہوتا ہے۔

عشق میں جسم کا اتنا گھل جانا کہ ہڈیوں کا صرف ایک ڈھانچہ رہ جائے سمجھ میں آسکتا ہے، مگر سالک تو ایک عجیب مرض میں مبتلا ہو گئے کہتے ہیں ؎

چناں فرسودہ گردید از غم عشقت سراپایم
کہ گر بادے وزد چوں گل ز ہم پاشند اعضایم

یعنی تمھارے عشق میں ہمارا تمام جسم اسقدر فرسودہ ہو گیا۔ کہ اگر ذرا سی ہوا چلے تو ہمارے اعضا پھول کی پنکھڑیوں کی طرح علیحدہ ہو کر گر جائیں۔

آجتک کسی طب کی کتاب میں اس مرض کا ذکر نہیں دیکھا۔ مگر شوکت کو بھی کچھ اسی قسم کی شکایت تھی۔ کیونکہ فرماتے ہیں ؎

بساں ریزہ کاغذ کہ افتد از مقراض
تن ضعیف بروں افتد از گریبانم

یعنی مرا کمزور جسم اس طرح ٹکڑے ہو کر گریبان سے گرتا ہے جیسے کاغذ کے پرزے قینچی سے گرتے ہیں۔

فاخر مکیں کی کمزوری سے سانس اُکھڑنے لگی۔ فرماتے ہیں ؎

ز ضعف رشتہ آہم گسستہ می آید
نفس ز سینہ بصد جا شکستہ می آید

یعنی کمزوری کی وجہ سے میری آہ ٹوٹتی ہوئی نکلتی ہے، اور سانس جو سینے سے آتی ہے تو سو جگہ دم لے لے کر۔

ایسے مرض میں شاید ملیٹھی و عناب کا شربت تجویز کیا جاتا ہے۔

محسن فانی اپنی نازک حالت اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

ز ضعفم تا عصا از کف رہا شد
مرا نقش قدم زنجیر پا شد

یعنی میں اسقدر کمزور ہو گیا کہ عصا ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میرا نقش قدم میرے پاؤں میں زنجیر ہو گیا۔

در جاناں پر پہنچکر اکثر غریبوں کی یہی حالت ہو جاتی ہے۔ لہذا محسن کی بات قابل یقین ہو سکتی ہے۔

ناصر نے جو اپنی لاغری کی تصویر کھینچی وہ کس قدر بھیانک ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کا ستم چنداں کہ جاں در قالب عریاں نشست
استخواں شد پنبہ داغے کہ بر دل داشتم

یعنی میں اتنا لاغر ہو گیا کہ میرے قالب میں جان عریاں ہو گئی۔ اور ہڈیاں دل کے داغ کے چاروں طرف ایسی معلوم ہونے لگیں جیسے روئی بنولے پر لپٹی ہو۔

مگر طالب کی تصویر میں خوبصورتی ہے جس کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

شد نہاں بسکہ گہر ریخت ز چشم تر ما
رشتہ ساں در گہر اشک تن لاغر ما

یعنی میری چشم تر نے اسقدر آنسو بہائے کہ میرا لاغر جسم ان میں ایسے چھپ گیا۔ جیسے موتیوں کے ہار میں تاگا۔

شوکت کا تو جسم ہی ایسا معدوم ہوا کہ وہ محض نام کے شوکت رہ گئے۔ فرماتے ہیں ؎

نماندہ است نشانی بغیر از من
مرا کسی کہ ببزم تو برد نامم را

یعنی مجھ میں سوائے نام کے اور کچھ نہیں رہ گیا پس اگر کوئی مجھ کو تمہاری بزم میں لے گیا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ صرف میرے نام کی وہاں شرکت ہوئی۔

میرزا بیدل کے جسم کی کمزوری سے تو ان کے نام میں اثر آ گیا۔

فرماتے ہیں ؎

چناں ضعیف شدم در غمت کہ چوں نامم
رقم کنند بخط جلی غبار شود

یعنی تمہارے غم میں میں اس قدر کمزور ہو گیا ہوں۔ کہ اگر میرا نام خط جلی میں لکھتے ہیں تو وہ خط غبار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

ایک عاشق مزاج نے اپنی کمزوری میں چہرے کے رنگ اڑنے سے جو فائدہ اٹھایا وہ کسی دوسرے کو نہیں سوجھی۔ فرماتے ہیں ؎

از ضعف بار منت قاصد نمی کشم
رنگم برائے بردن مکتوب می پرد

یعنی میں اپنی کمزوری میں قاصد کے بار نہیں اٹھاتا کیونکہ میرا رنگ خود میرا مکتوب لیجانے کیلئے اڑ جاتا ہے۔

رنگ کے اڑنے سے انکا ایک کام تو بن جاتا ہے مگر تکلیف بھی ہوتی ہے جس کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

بچشم من گرانیہا چناں از ضعف جا دارد ؎ کہ می آید بگوش من صدائے پائے رنگ من

یعنی کمزوری کیوجہ سے میری آنکھیں اسقدر بھاری ہو رہی ہیں کہ میرے کانوں میں میرے رنگ کے پاؤں کی دھمک پہنچتی ہے۔

مگر جب ان کو اپنے رنگ کے در جاناں پر پہونچنے کا خیال آتا ہے تو اپنی تکلیف بھول جاتے ہیں اور کس مزے میں فرماتے ہیں ؎

ز ضعف من دش آرایش دگر دارد ؎ بود پریدن رنگم کبوتر حرمش

یعنی کمزوری کیوجہ سے میرا رنگ اڑکر ان کے حرم پر جو پہنچا تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے ایک رنگین کبوتر پہنچا۔ اور اس سے انکے در پر ایک عجیب رونق ہو گئی۔

شاعر کے خیالات کی ان بلند پروازیوں کی داد دینا بہت مشکل ہے کس قدر افسوس کی بات ہے کہ فارسی کے شعرا کو عربی مجنوں کی مشق لاغری کی نوبت پسند آئی مگر ایرانی فرہاد کی ہمت سے کسی نے بھی سبق نہ لیا۔ جس نے حصول مدعا کیلئے پہاڑ کاٹنا شروع کر دیا تھا۔

طلب

از جناب سید فضا جالندھری فاضل ادب

مٹ چکی دل سے کارواں کی طلب
کھو گئے خود تو کیا نشاں کی طلب

درحقیقت ہے اک فریب خیال
کیا ہو پھر دل کو آشیاں کی طلب

خاک ہو کر بھی اے معاذ اللہ
مجھ کو ہے سعی رائیگاں کی طلب

کوئی دیکھے تو انتہائے وفا
مٹ کے پھر بھی ہے آستاں کی طلب

منتظر موسم بہار کے ہم
بجلیوں کو ہے آشیاں کی طلب

پھر مٹائیں گے داغ ناکامی
پھر جبیں کو ہے آستاں کی طلب

پھر تصور میں اُن کے جلوے ہیں
اب نہیں مجکو بوستاں کی طلب

حُسن کی دلفریبیوں کے نثار
پھر ہے آغاز داستاں کی طلب

فطرت دل ہے خود ہی کھو جانا
تا کجا جلوۂ نہاں کی طلب

خود ہی گم ہوں راہ محبت میں
اے فضا کیا ہو کارواں کی طلب

ماروی

سندھی افسانہ

از جناب رفعت ہاشمی

یہ ایک سچا قصہ ہے جسے سندھ کے بیشمار افسانہ نویسوں اور شاعروں نے اپنے اپنے رنگ میں نظم ونثر کا جامہ پہنایا ہے۔ اُمرا سے لیکر کشتی کھینے پر گانے والے فقرا تک اس داستان کی نظموں اور غزلوں کو ذوق وشوق سے گاتے ہیں۔ سندھ کے نامور ادیب میر طاہر محمد نے "راز ونیاز" نامی تصنیف کے علاوہ جس میں سندھی تمام حکایات دہرانہ نظم کی گئی ہیں ۱۶۲۱ء میں جب سندھ کی تاریخ "تاریخ طاہری" کے نام سے ترتیب دی تو اسمیں بھی یہ افسانہ کامل احتیاط اور تفصیل سے درج کر دیا۔

پھر ۱۷۶۶ء میں علی شیر قانع نے "تحفۃ الکرام" میں یہ کہانی قلمبند کی۔ مگر چونکہ یہ کتاب تاریخ طاہری سے ۱۴۴ برس بعد تصنیف ہوئی۔ اس لئے یہ واقعہ تاریخ طاہری ہی سے نقل شدہ معلوم ہوتا ہے۔

سندھ میں عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ شاہ عنایت ہی وہ پہلے (سندھی) شاعر تھے جنہوں نے سندھی زبان میں اس قصہ سے متعلق نظمیں لکھیں۔ اور بعد میں شاہ عبداللطیف بھٹائی (جو سندھ کے ایک مقدس بزرگ اور مایہ ناز شاعر تھے) کے سامنے بھی ماروی کی داستان غم بیان کر کے درخواست کی کہ وہ بھی اس موضوع پر کچھ لکھیں۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ جسقدر نظمیں اور غزلیں اس حکایت خونچکاں پر شاہ صاحب کے ذخیرۂ نظم میں دستیاب ہوتی ہیں۔ سندھ کے کسی اور شاعر کے مجموعۂ کلام میں نہیں ملتیں اس لئے جہاں میں نے تاریخ طاہری اور تحفۃ الکرام دونوں کتابوں کو نظر میں رکھ کر یہ افسانہ ترجمہ کیا ہے۔ وہاں شاہ صاحب کے اس کہانی سے متعلق نظم کردہ واقعات پر بھی نظر ڈال لی ہے۔

یہ غم انگیز واقعہ سندھ میں سومرو خاندان کے عہد حکومت میں تھر کے علاقے میں رونما ہوا "تھر یعنی ویرانہ" اس خطہ زمین کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کا بہت بڑا حصہ ویران ہے۔ تھر تین حصوں میں منقسم ہے جنوبی حصے کو کارُ کا تھر اور شمالی حصے کو پارکا تھر کہتے ہیں۔ درمیانی علاقہ ڈٹ کہلاتا ہے جسمیں "امرکوٹ" نامی شہر آباد ہے جو اس زمانے میں سلطنت سومرو کی راجدھانی تھا۔ اور اس حزنیہ ڈرامے کے دردناک آغاز اور المناک انجام کے درمیان ایک خوفناک شاہراہ ہے جہاں ایک ظالم وجابر بادشاہ عمر کا ظہور رہتا ہے جو صرف اس حیثیت کے علاوہ تاریخ عالم میں اور کوئی یادگار نہیں چھوڑ جاتا۔ بعض اہل قلم "دار الخلافے" کو "عمر کوٹ" کا نام بھی دیتے ہیں۔ مگر یہ غلط فہمی یا دماغی اپج ان سب افترا پردازیوں ہی کی طرح بے حقیقت ہے جو کم نظری و بے علمی کے باعث اس قصے میں جگہ جگہ کی گئی ہیں۔ شاہ صاحب اور اکثر ذمہ دار صاحب الرائے اشخاص نے "امرکوٹ" ہی کا لفظ استعمال کیا ہے جو مسٹر ٹاڈ کی کتاب "راجستھان" جلد ۲ صفحہ ۳۳۴ کے اس بیان کی روشنی میں صحیح معلوم ہوتا ہے۔ "کہ امرکوٹ کا شہر راجپوت خاندان پرمار کے ایک راجہ امر سنگھ نے غالباً گیارہویں صدی عیسوی میں آباد کیا تھا" بقول علی شیر قانع چونکہ عمر نے سندھ میں ۱۳۵۵ء سے ۱۳۹۰ء تک حکومت کی۔ اس لئے اس کا دار السلطنت کے نام سے کوئی واسطہ نہیں۔

ماروی کے ہندو یا مسلمان ہونے پر بھی سندھ کے عوام وخواص میں سخت اختلاف ہے۔ لیکن تاریخ طاہری اور مسٹر برٹن کی تصنیف "سندھ اور اس کے باشندے" میں ماروی کی داستان کا عمیق مطالعہ کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ایک ہندو گھرانے کی چشم وچراغ تھی۔ رفعت

سندھ میں عمر سومرو برسر اقتدار نہ تھا۔ بلکہ شراب حسن اور موسیقی کا وہ دور تھا جس میں رعایا کی جان ومال اور عزت ونجابت دست استبداد سے محفوظ نہ تھی۔ شاید عمر اپنی بے بس رعایا پر قہر توڑنا لازمۂ امیری اور اپنا مسلمہ حق سمجھتا تھا۔ اس کی ناشائستہ وناعاقبت اندیشانہ حرکات نے رعایا کو سخت نالاں اور پریشان کر رکھا تھا۔

اسی زمانے میں تھر کے علاقے کے ملیر نامی گاؤں میں پالنی نام ایک متوسط درجے کا زمیندار رہتا تھا۔ وہ تھر دگوالوں کی ایک قوم مارو سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے پاس بھیڑ بکریوں کے ایک چھوٹے سے گلے کے علاوہ تھوڑی سی زمین بھی تھی جسے اسکا ایک نوکر فوگ کاشت کیا کرتا تھا۔

پالنی اور اس کی بیوی مادھنی کی زندگی کا ماحصل اور زیست کا سہارا صرف ایک چاند سی لڑکی تھی جس کی خوبرو لی عمر کے ساتھ ساتھ روز افزوں ترقی پر تھی۔ جب اس نے عالم شباب میں قدم رکھا تو اس کے حسن وجمال کا شہرہ

دُور دُور تک پھیل گیا۔ اور ساتھ ہی مارو قوم کے نام سے دنیا آشنا ہونے لگی۔

ماروی کے بالے پن ہی سے فوگ اس کا گرویدہ تھا۔ اور اب جبکہ ملیر کی فضا اس کے جلووں کی تابانی سے خیرہ ہو رہی تھی۔ فوگ اس کا دیوانہ ہو چکا تھا۔ اور یہ دیوانگی اس قدر بڑھی کہ یارائے ضبط نہ رہا اور ایک دن موقع پاکر اس نے مادھوئی کے سامنے درد دل کا حال بیان کر ہی دیا۔

مادھوئی کو اس کی یہ دیدہ دلیری حد درجہ ناگوار گزری۔ اس لئے اس نے فوگ کو سخت سست کہکر اس کی اس نالائقی کا ذکر اپنے خاوند سے بھی کر دیا۔ جس نے فوگ کو بیک بینی و دو گوش ملازمت سے نکال باہر کیا اور ماروی کی نسبت اپنی قوم کے ایک خوشحال گھرانے کے خوبرو نوجوان کیسن سے کر دی۔

فوگ کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ وہ آتش زیرپا ہو گیا۔ اور غم و غصہ میں انتقام لینے کی تدابیر سوچنے لگا۔ اور چونکہ عمر سومرو کی نفس پرست زندگی کی رسوائے زمانہ حکایات سن چکا تھا۔ اس لئے اسے کسی [illegible] تدبیر سوچنے میں دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح ماروی کو عمر کے پنجے میں پھنسانے کا تہیہ کر لیا۔ اور اس تہیے کو عملی جامہ سے آراستہ کرنے کے لئے فوراً ہی ملیر کو خیرباد کہکر امرکوٹ کی طرف چل پڑا۔ جو ملیر سے صرف پچاس کوس کے فاصلے پر تھا۔

انسان کے دل و دماغ پر جب فکر و غضب قابض ہو جاتے تو وہ ایسی حرکتیں کرنے سے بھی باز نہیں آتا۔ جو کسی طرح بھی اس کے زیبا نہیں ہوتیں اور وہ سود و زیاں کے امتیاز سے بے نیاز ہو جاتا ہے ـــــ یہی حال فوگ کا تھا۔ فوگ دو دن کے مسلسل سفر کے بعد تیسرے دن شام کے وقت منزل مقصود تک جا پہنچا۔

فوگ بہت تھکا ہوا تھا۔ اس لئے وہ رات اس نے ایک سرائے میں بسر کی۔ اور دوسرے دن جبکہ عمر محفل رقص و سرود میں بیٹھا داد عیش دے رہا تھا۔ وہ قصرِ شاہی کے صدر دروازے پر پہنچا۔ اور دربان کی معرفت شاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ اور عرض کی کہ اگر بادشاہ سلامت اسے شرف باریابی بخشیں گے تو وہ ان کو ایک خوشخبری سنائیگا۔"

عمر نے اطلاع پاتے ہی اسے بلا بھیجا اور جب وہ بحال تباہ سامنے آکر آداب بجا لایا۔ اور سر جھکا کر خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ تو عمر نے دریافت کیا

"تو کون ہے اور کیوں آیا ہے؟"

فوگ نے دست بستہ گزارش کی۔ "ان داتا [illegible] کے اس غلام کو پردے میں کچھ عرض کرنا ہے۔"

عمر نے فوراً ہی اہل مجلس کو تخلئے کیلئے اشارہ کر دیا۔ اور ذرا سی دیر کے بعد کمرہ خالی ہو جانے پر پوچھا۔

"کہہ کیا کہنا چاہتا ہے۔؟"

فوگ نے [illegible] ملیر میں مارو قوم کی ماروی نام ایک لڑکی ہے۔ اس کے حسن کی کیا تعریف کروں۔ ہے تو وہ ایک زمیندار کی بیٹی۔ مگر سورج اس کے سامنے سر جھکاتا ہے۔ اس کے خوبصورت جسم پر دیہاتی کپڑے رہتے ہیں لیکن اسے اگر شاہی پوشاک پہنا دی جائے تو پریوں کو بھی شرمندہ کرے۔ ایسی حسین صورت شاہی محل میں رہنے کے قابل ہے۔"

مکار فوگ کی یہ بات سن کر عمر کے معصیت آلود دل میں ولولے اٹھنے لگے۔ وہ ماروی کا نادیدہ عاشق ہو گیا۔ اور اسے قبضے میں کرنے کا عزم صمیم کر لیا۔ چنانچہ دوسرے ہی دن چند آدمیوں کو فوگ کی رہبری میں ملیر کی طرف روانہ کر دیا۔

تمام راستے فوگ اور اس کے ہمراہی ماروی کو اڑا لے جانے کی تدابیر سوچتے رہے اور دوسرے دن جب افق سے [illegible] نور نے اہل ملیر کو آنے والے خونیں حادثہ کا پیغام دیا تو وہ گاؤں کے قریب آپہنچے۔

تھر کے کنوئیں بہت گہرے ہوتے ہیں۔ جن میں سے پانی نکالنے میں کافی وقت صرف ہو جاتا ہے۔ اس لئے گاؤں کی عورتیں منہ اندھیرے گھڑے اٹھائے کنوؤں پر آ جمع ہوتی ہیں۔ اور جو دن چڑھے تک سستی سے پڑی سویا کرتی ہیں۔ انہیں کنوئیں پر دیر سے آنے کی وجہ سے پانی بھرنے کی باری مشکل سے ملتی ہے اور گھر کا کام کاج بھی نپٹا نہیں سکتیں۔

ماروی بھی علی الصبح کنوئیں پر پانی بھرنے جایا کرتی تھی۔ اور اس دن بھی حسب معمول گھڑا لئے کنوئیں پر آئی۔ اسوقت وہاں دو عورتیں موجود تھیں۔ وہ اپنی باری کے انتظار میں ایک سہیلی سے باتیں کرنے لگی۔ کہ اچانک اس کی نظر سامنے چار پانچ آدمیوں پر جا پڑی۔ جو اپنے گھوڑوں کی لگام تھامے ان کی طرف آرہے تھے۔ ماروی کے چہرے پر حیرت کے نقوش ہویدا ہو گئے اور وہ کچھ سمٹنے لگی۔ یہ دیکھ کر دوسری عورت نے کہا۔

"کیوں گھبرا رہی ہے۔ یہ تو مسافر معلوم ہوتے ہیں۔ شاید پیاسے ہوں یا گھوڑوں کو پانی پلانا چاہتے ہوں۔ زیادہ سے زیادہ ہم سے پانی ہی مانگیں گے نا۔"

یہ سنکر ماروی بے فکر ہو گئی۔ اتنے میں وہ سب ان کے قریب آپہنچے۔ اور فوگ نے [illegible] قد آور اور مضبوط جوان آدمی کو پہلے ہی اشارہ کر دیا تھا کہ "ماروی یہی ہے" اس نے ذرا جھک کر التجا آمیز آواز میں ماروی سے کہا۔

"تھوڑا سا پانی پلا دو"

ماروی نے جونہی اس کی طرف سے پیٹھ موڑی، اس ظالم نے چشم زدن میں کپڑے کا حلقہ ماروی کے سر پر سے آگے کی طرف پھینک کر اس کی مشکیں کس لیں۔ ماروی اور کنوئیں پر کھڑی ہوئی دوسری عورتیں چیخنے چلانے لگیں مگر سب نے ملکر کمال چابکدستی سے ماروی کو ایک گھوڑے پر ڈالا۔ اور خود بھی سوار ہو کر گھوڑے سر پٹ دوڑاتے ہوئے یہ جا وہ جا نظروں سے غائب ہو گئے۔

آناً فاناً یہ وحشت انگیز خبر گاؤں کے ہر کس و ناکس کے کانوں پر جا پڑی پالنی کے رشتہ دار اور اس کی قوم کے بہت سے افراد بے تاخیر چاروں طرف پھیل گئے۔ مگر ایک ایک کر کے شام تک سب ناکام واپس لوٹ آئے۔

امرکوٹ پہنچنے کے بعد ماروی کو ایک عالیشان محل میں رکھا گیا۔ جب عمر نے اس مجسمۂ حسن و خوبی کو اپنی نفس پرست آنکھوں سے دیکھا۔ تو سراپا ہوس بن گیا اور اسے اپنی ملکہ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

فصلِ گل کی چودہویں رات کا چاند جب ولایت انجم میں نور کا تاج پہنکر اور رنگِ آسمان پر جلوہ گر ہوا۔ تو عمر ماروی کے پاس آیا۔ وہ گھٹاؤں ایسی سیاہ آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش برسا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر عمر اسے دلاسہ دیتے ہوئے بولا۔

" رونے دھونے سے کیا فائدہ ہوگا۔ ڈھیا ہوا دودھ واپس تھنوں میں نہیں جا سکتا۔ میری سب داسیاں تیری کنیزیں بنکر رہیں گی۔ اور میں بھی تا زیست تیرا غلام ہونگا۔"

مگر ماروی مہر بہ لب رہی۔ اسکے آنسو تیزی سے بہنے لگے۔ عمر پھر گویا ہوا " کوئی بات تو کرو۔"

ناچار وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

" رعایا کی جان و مال کے محافظ ہوتے ہوئے ایسے غلط راستے پر چل رہے ہو۔ میری منگنی ہو چکی ہے۔ اپنے پتی کے سوا کسی دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتی۔ مہربانی کر کے مجھے اجازت دو کہ میں واپس ملیر چلی جاؤں۔"

مگر عمر نہ مانا اسے یقین تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ ماروی اپنے خویش و اقارب کو بھولتی جائے گی۔ لیکن یہ خیال خام تھا۔ جوں جوں عرصۂ فراق طویل ہوتا گیا۔ ماروی کے دل میں عمر کی طرف سے نفرت و حقارت ترقی کرتی گئی وہ دن رات اپنے گاؤں۔ رشتہ داروں۔ کیت سین اور سہیلیوں کو یاد کر کے گھلی جا رہی تھی۔ مگر فکر و غم اور آنسو بہانے سے کیا ہو سکتا تھا۔

ملیر میں بھی ہر شخص کو علم ہو چکا تھا۔ کہ ماروی عمر کے پنجے میں ہے۔ ماروی کے خستہ حال و بینوا رشتہ دار بھلا ایک بادشاہِ وقت کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے۔ جس کی حکومت میں زندگی بسر کر رہے تھے چنانچہ بیچارگی میں خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ لیکن ماروی کے منگیتر کیت سین کا برا حال تھا۔ وہ ماروی کو اور ماروی اسے دیکھ چکی تھی۔ اور اب بے دیکھے دونوں کی زندگی تلخ ہو رہی تھی۔ پہلے پہل تو کیت سین کو کچھ سہارا بھی تھا۔ مگر ماروی کے عمر کے پاس ہونے کی جان لیوا خبر نے تو اس کی شمع امید بھی گل کر دی۔ وفورِ یاس و حسرت سے اس کا کھانا پینا چھوٹ گیا۔ یہاں تک کہ یہ لگن دیوانگی کی حالت تک جا پہنچی۔

دوسری طرف عمر اپنی ہٹ سے باز نہیں آ رہا تھا۔ روزانہ دن کے وقت ماروی کے پاس جا کر اسے سبز باغ دکھاتا اور طرح طرح سے لبھاتا مگر بات کی پکی ماروی نے کاخِ بلند کو اپنے جھونپڑے پر ترجیح نہ دی۔ عمر کی شاہانہ پوشاکیں اسے اپنے کمبل اور دیہاتی لباس سے مرغوب نہ ہوئیں اس نے زر و جواہر۔ مال و دولت۔ سامانِ آرائش و زیبائش اور انواع و اقسام کے شاہی لوازمات کو زہرِ قاتل سمجھا۔ اپنوں کے لئے جو آگ اس کے دل میں جل رہی تھی وہ مدھم نہ ہوئی۔ بلکہ روز بروز بڑھتی رہی۔ عمر نے ماروی کو جیتنے کیلئے بہت ہی سر پٹخا۔ مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ جس پر اس نے انتہائی غضب کی حالت میں اسے قلعہ میں قید کر دیا۔

اب بیچاری کی زندگی دونوں جانب سے زہر ہو گئی۔ اس طرف عمر کا جور و ستم۔ اس طرف ماروؤں کی بے دست و پائی کا خیال۔ کس ساعتِ منحوس میں کنوئیں پانی بھرنے آئی کہ دکھوں کے طوفان خیز سمندر میں جا گری۔ پرانی باتوں کے خیال سے صبح و شام خون کے آنسو بہاتی۔ اس کی آہ و زاری سن کر راہ گیر بھی روتے روتے گزر جاتے۔ اگر رشتہ داروں سے نامہ و پیام ہی کا کوئی سلسلہ قائم ہو جاتا تو بھی غریب قیدی قید کی تکالیف کو کسی قدر بھول جاتی ....قسمت!!!

ماروی کو اسیرِ غم ہوئے ایک سال گزر گیا۔

موسمِ بہار کا آغاز تھا۔ ہر طرف سبزہ و گل کی کثرت نے زمین کو صد رشکِ گلشن بنا دیا۔ غریب دیہاتی بھیڑ بکریاں لیکر سبزہ زاروں میں پھیل گئے۔ ہر شخص اپنے اپنے فرض کی انجام دہی میں سرگرم ہو گیا مگر بدقسمت و کم نصیب ماروی کا دل قلعہ کی اس تیرہ و تار اور دو زخ نما کوٹھڑی میں خنجرِ آرزو سے کٹ رہا تھا۔ نا امیدی اور مایوسی نے اسے گھیر لیا تھا۔ کپڑے شکستہ ہو کر دھجیوں کی صورت اختیار کر گئے تھے جسم پر سر سے پاؤں تک خاک جم گئی تھی۔ تواترِ حوادث اور شدتِ درد و کرب جب اسے تاریک زندگی سے عالمِ نوازی کی طرف لیجانے لگی تو عمر کو بلوا کر کہا۔

"میں اپنی قوم والوں کی لاج پر کلنک کا ٹیکہ ہوں - ان میں سر اونچا نہیں کر سکتی - میرا دل ٹوٹ چکا ہے - رات دن بیٹھی اپنی بھیڑ بکریوں اور گھاس پات کو یاد کرتی رہتی ہوں - میری آتما اُس جھونپڑی ہی میں اٹکی ہوئی ہے - صرف جسم اس قلعہ میں قید ہے - جو جلد ہی خاک ہو جائیگا - اس لئے زندگی بھر تو خوشی کا دن نصیب نہیں ہوا - اب اگر اپنوں کی یاد میں آہ و بکا کرتی ہوئی مر جاؤں تو پرماتما کیلئے میری لاش میرے انہی چیتھڑوں میں ڈھانپ کر ملیر روانہ کر دینا - میری آتما اور مارو نیر سے بہت شکر گزار رہوں گے"۔

اتنا کہکر وہ ضعف کیوجہ سے غش کھا کر زمین پر ایسے آ پڑی جیسے پتھر گر پڑا ہو۔

ماروی کا یہ حال تباہ اور اسے کوئی دم کا مہمان دیکھکر عمر کا دل خدا کے خوف سے ہل گیا - ماروی کا آہنی ارادہ قوی استقلال اور اخلاقی جرأت اپنا کام کر گئی - عمر نے فوراً اسے قید سے آزاد کر دیا اور دوسرے ہی دن ماروی سے عفو تقصیر چاہتے ہوئے اس کے رشتہ داروں کے نام بھی اسی مضمون کا ایک خط لکھا جس کے ساتھ اسے نہایت بیش قیمت اور اعلیٰ درجے کے تحائف اور ساز و سامان دیگر شاہانہ شان و شوکت سے محل میں بٹھایا اور ایک خاص فوجی دستے کی حفاظت میں ملیر کی طرف روانہ کر دیا - اور خود گزشتہ راصلاح اور آئندہ را احتیاط کے اصول پر صدق دل سے کاربند ہو گیا۔

دکھوں کی ماری ماروی جب ملیر میں اپنے گھر پہنچی تو وہاں ایک کہرام مچا ہوا تھا - مرد یا ہر صفِ ماتم پر بیٹھے تھے - اور عورتیں اندر مکان میں واویلا کر رہی تھیں۔

ماروی کا سنگیتر کیت سین فراق دوست کی صعوبتیں برداشت نہ کرتا ہوا اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کو سدھار چکا تھا - اس کے کریاکرم کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
(اقبال)

مشاعرۂ شاہجہانپور کی بہترین غزل

(از جناب تصدق شاہجہانپوری)

شوخی متین شرم شرارت لئے ہوئے
انکا جو رنگ ہے وہ قیامت لئے ہوئے

جس دن سے دل ہے سوزِ محبت لئے ہوئے
اک اک نفس ہے حسن کی نکہت لئے ہوئے

راس آگیا ہے عشق کا آزارِ دل گداز
دنیائے غم ہے عالمِ جنت لئے ہوئے

رکتی نہیں کہیں نگہِ حسن آشنا
ذوقِ نظر ہے شمعِ بصیرت لئے ہوئے

ہر سانس ایک جام ہے صہبائے شوق کا
رگ رگ میں دل ہے کیفِ محبت لئے ہوئے

اُن کے خرامِ ناز سے ہلچل سی دل میں ہے
اُٹھتا ہے جو قدم وہ قیامت لئے ہوئے

جلوے لطیف ہیں تو نگاہیں لطیف تر
وہ حسن کی، یہ عشق کی طلعت لئے ہوئے

اِس پاس اِس لحاظ کے قربان جائیے
ہر لطف، ہر ستم ہے نزاکت لئے ہوئے

کلیاں سی کھل رہی ہیں نگاہ خیال میں
ہر جلوہ ہے بہارِ مسرت لئے ہوئے

حسن اور اُن کا حسن، شباب اور وہ شباب
ایک ایک ادا ہے طرحِ قیامت لئے ہوئے

رہ رہ کے کوندتی ہیں تبسم کی بجلیاں
نازِ حیا ہے رنگِ اشارت لئے ہوئے

رہتے ہیں وہ کنارِ تصور میں رات دن!
پھر بھی ہے شکر شانِ شکایت لئے ہوئے

ادّعائے فراموشی

نظم

از جناب سیّد فیضی جالندہری ایم اے ایل ایل بی

خدا جانے مجھے رہ رہ کے تم کیوں یاد آتی ہو!

تمہارا شیوۂ ناحق دلیلِ ترکِ الفت ہے
مجھے بھی کاش سمجھا دو یہ آئینِ محبت ہے

ارادہ کر رہا ہوں شوق کو بیحال کر دونگا
امنگوں کی فراوانی کو میں پامال کر دونگا

بھلا دونگا نگاہِ ناز کے رنگین افسانے
میں ویراں کرکے چھوڑونگا تخیّل کے صنمخانے

خلش سی دل میں اٹھیگی نہ اب دردِ جگر بنکر
تصوّر میں نہ تم لہراؤ گی کیفِ نظر بنکر

یہ آنکھیں خون میں ڈوبی ہوئی آنکھیں نہ برسینگی
مری شب خیزیاں اب آنسوؤں سے منہ نہ دھوئینگی

ستارے اب نہ تڑپیں گے مری آشفتہ حالی پر
نہ روئینگی یہ راتیں مری ویراں خیالی پر

گزشتہ عہد کی واپس ملاقاتیں نہ آئینگی
وہ کیفِ وصل میں لپٹی ہوئی راتیں نہ آئینگی

سکھایا تم نے زنجیرِ تعلّق توڑنا مجھکو
بتایا شاہراہِ عشق سے منہ موڑنا مجھکو

مگر تکمیل سے شوقِ عمل ناکام رہتا ہے
مری شانِ وفا پر بدنما الزام رہتا ہے

بہت مشکل ہے میں بڑھتے ہوئے جذبات کو روکوں
دلِ طوفاں بکف کی موجِ احساسات کو روکوں

تخیّل کی نگاہیں بیخودی میں وجد کرتی ہیں
ادھر ہیں کچھ امّیدیں جو نہ جیتی ہیں نہ مرتی ہیں

میں دل کے آئینے سے گردِ مایوسی ہٹاتا ہوں
بھلاتا ہوں تمہیں ہر اک طریقے سے بھلاتا ہوں

خدا جانے مجھے رہ رہ کے تم کیوں یاد آتی ہ

ایک پارسی نژاد شاعر

کاؤس جی گوہر کے حالات

از نوابزادہ جاوید قیصری

کاؤس جی نام گوہر تخلص۔ پارسی نژاد تقریباً ۱۸۴۲ء میں بمقام کالی کٹ پیدا ہوئے۔ ان کی ماں ایک ڈچ یہودی خاتون تھی جس کی شکل و صورت ہی دیکھ کر کاؤس جی کے والد نے اپنی کف کے خلاف شریک حیات منتخب کر لیا تھا۔ اور تا زندگی اس کے حسن خداداد کی پوجا کرتا رہا۔ اس خاتون کے بطن سے ایک دوشیزہ "تبلی" پیدا ہوئی اور اس کے بعد گوہر لیکن گوہر کی عمر ابھی مشکل سے نو ماہ کی ہوگی کہ شفیق ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ باپ نے بچے کے خیال سے ایک مسلمان عورت سے جو اودھ کے کسی گاؤں کی رہنے والی تھی اور اپنے بیٹے کے ساتھ جو ساحلی تجارت کرتا تھا کالی کٹ میں مقیم تھی تعلقات استوار کئے۔ گوہر کی پرورش اسی خاتون کے زیر سایہ ہوئی۔

جب جوان ہوا تو باپ کا پیشہ (عطر فروشی) اختیار کیا۔ ریاستوں اور حکومتوں میں چکر لگاتا ہوا لکھنؤ پہنچا۔ اسوقت اس کی عمر ۲۰ سال ہوگی فارسی اپنی مادری زبان کی طرح بول لیتا تھا اور اردو سے بھی کافی آشنا تھا۔ یہاں ایک رئیس حیدر عباس خاں ماہر کی وساطت سے جو بجائے خود ایک خوش وضع باریاش رئیس تھے دربار میں رسائی ہوگئی۔ یہاں وہ وقت تھا کہ خزانہ لٹ رہا تھا نواب اور دیگر حکام و عمائدین آنکھیں بند کئے رنگ رلیاں منا رہے تھے بنگال کا سارا خزانہ اودھ ہی میں رہ گیا تھا اس لئے روپیہ کی مزید ضرورت ہی کیا تھی۔

ایسی سوسائٹی میں پڑ کر دنیا میں کون ہے جو جوہن آزادکیل ہوتے ہوئے کھو نہ جائے چنانچہ یہ بھی ایک کانپوری رقاصہ پر شیدا ہوگئے۔ گو وہ کا فر اتنی حسین نہ تھی کہ کسی داد کی مستحق ہوتی۔ لیکن ہوائیں اس قسم کی تھیں کہ کوئی دیکھے اور نظرانداز کر دے۔ ۱۸۵۶ء میں جب بادشاہ معزول کر کے کانپور بھیج دیا گیا تو لکھنؤ کا کارخانہ بھی پلٹا۔ یہ بھی کچھ جان سے عاجز کچھ معشوق کی بیوفائی سے نالاں بھاگے تو نواب معتمد دولہ بہادر سابق وزیر اودھ کے یہاں دم لیا۔ یہاں آ کر اس کافر ادا کی محبت نے کچھ اور اثر دکھایا اور ان کا حال غیر ہوا۔ اس وقت تک صرف نہیں لوگ کاؤس جی کے نام سے جانتے تھے۔ دیوانگی نے رنگ دکھایا اور یہ پریشان حالی میں وہیں تباہی بکتے جھکتے گھومنے لگے۔ اس وقت کانپور ادب و شعر کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ بڑے بڑے علما اور شعرا کا اجتماع تھا۔ نواب معتمد الدولہ پندرہ ہزار روپیہ پنشن کے علاوہ کروڑوں روپیہ کی مالیت لائے تھے جو بعد کو رلیں اور خدا جانے کس کس چیز کی نذر ہوگیا۔

ایک مشاعرہ میں یہ بھی گئے تھے۔ وہاں ایک نیم مجذوب حضرت فرد سے ملاقات ہوئی اور ان کی ہر ہر ادا گوہر کو بھا گئی۔ وہ اجاڑ گنبد "نون بن حافظ ملاق" والی مسجد میں رہا کرتے تھے۔ مصحفی کے شاگرد لکھنؤ میں آتش و ناسخ کے معرکوں میں شریک ہو چکے تھے۔ خود بھی دو چار مرتبہ ناسخ سے چل چکی تھی۔ استاد مصحفی کے زمانہ ہی میں تلامذہ کی اصلاح ان کے سپرد ہو چکی تھی۔ اس کے بعد کانپور چلے آئے۔ یہاں چرس اور گانجے نے ایسا رنگ جمایا کہ فنا ہو گئے۔ لاکھوں شعر کہے فی البدیہہ غزل کہا کرتے تھے۔ گوہر نے ان کی صحبت میں بہت کچھ سیکھا شعر و سخن کو ذریعہ اظہار جذبات خیال کر کے فرد کے شاگرد ہوئے۔ اور بالالتزام متعلق کانپوری کے ساتھ رہنے لگے کچھ روپیہ پس انداز تھا وہ ایک صاحب منشی واحد علیخاں کو دے دیا کہ نفع میں آدھا ساجھا کر لو۔ اس صورت سے فراغت حاصل کی اور مکمل طور پر عاشق اور شاعر بن گئے۔ گوہر طوائف کے نام پر اور اسی کی یاد میں تخلص رکھا۔ سب سے پہلی غزل اس طرح میں کہی تھی "انداز پس شوخ کے ایمان فدا ہے" قافیہ تھا ایمان، جان اور "فدا ہے" ردیف۔

گوہر رتی باتیں ہوں رہی جان فدا ہے: جب جان تھی جب جان اب ارمان فدا ہے

غزل میں گو کوئی خاص چیز ملس نہیں کی گئی تھی۔ لیکن ایک پارسی شاعر کا یوں سر مشاعرہ غزل سرا ہونا جس درجہ آج حیرت انگیز ہے اس سے کم تب نہ تھا۔ لوگ انگشت حیرت در دہان ہو گئے تھے۔ اس پہلی کامیابی نے بڑا کام کیا اور پھر تو یہ حال ہو گیا کہ کانپور کا ہر مشاعرہ "زینت گوہر" ہوتا۔

اپنی عمر میں صدہا غزلیات، رباعیاں، قطعہ اور مرثیہ لکھے سنتا ہوں کہ آجتک نواب نواب علیخاں کے کتب خانہ میں گوہر کا کوئی غیر مطبوعہ دیوان موجود ہے۔ مگر مجھے بزرگوں سے صرف اسی قدر اشعار مل سکے ہیں۔ جو بلا انتخاب پیش ناظرین کئے جائینگے۔ تمام عمر غیر شادی شدہ رہے۔ مرنے سے ایک سال پیشتر مسلمان ہو گئے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں پھوڑے سے کچل گئے۔ علاج کروایا لیکن فایدہ نہ ہوا۔ انتقال کے وقت ہمارے فرد مقیم۔ نواب۔ شیفتہ کشتہ۔ بیتاب۔ جواب۔ دراصل یہ تیر سب ہی تھے۔ مرنے کچھ کا اعزازات تھے کچھ روزنامچہ کچھ خطوط ——— رات ہی کو دیوار پر کوئلہ سے لکھ تا

سانس بھی آج ہوگئی رخصت تو ہمسفر کوئی دوسرا نہ ہوا

لوگ اس شعر کو پڑھتے تھے اور دھاڑیں مار مار کر روتے تھے۔ فرد جو بجائے خود دیوانہ تھے، بے اختیار اس مرگ بیکسی پر چیخ چیخ کر رو دئے ایک مرثیہ اس سانحہ عظیم پر لکھا جو فرد کے دیوان کی زینت ہے۔

ایک مرتبہ زندگی میں فرمایا تھا کہ مجھے ویرانہ میں مت دفن کرنا چنانچہ اس خیال کے زیر تحت انہیں بوچڑ خانہ میں دفن کیا گیا تھا اور ہر سال ایک مشاعرہ بڑے پیمانہ پر وہاں ہوتا رہتا تھا۔ لیکن حکیم خاں مقیم کے انتقال کے بعد ہی یہ یادگار بھی فنا ہو گئی۔ اور آج تو اس پارسی نژاد شاعر کی قبر کا نشان بھی مشکل ہی سے ملتا ہے۔ میراں شاہ نے تاریخ وفات کہی تھی۔ مجھے صحیح تو یاد نہیں۔ غالباً تھی "غرق بحر سخن ہوا گوہر" مسلمان ہونے پر عبدالعلی نام رکھا گیا تھا۔

مقابل روئے جاناں کے ہو مصحف روئے جاناں کا
یہ کافر لونڈے ٹڈے سبق پڑھتے ہیں قرآں کا

محبت ہے وہ دریا اس میں جو تیرا وہی ڈوبا
کنارہ تک نہ ہاتھ آیا تری چاہ زنخداں کا

رہے نہ کس لئے برہم معاملہ دل کا ملا ہے زلف پریشاں سے سلسلہ دل کا

مری لحد پہ وہ آکر چڑھا گئے دو پھول قبر میں بھی نہ ملا چین آہ گوہر کو

اے بتو رام کہانی نہ سنو تم میری بات کرنا بھی نہیں آتی ہے تمکو تو ابھی

قبر پر مجمع حسینوں کا لگا رہتا ہے بعد مرنے کے بھی مٹی مری برباد ہوئی

ہائے اللہ کوئی مجھ سے نہ پوچھے دل کو ورنہ ہو جائیگا یہ باعث رسوائی یار

تم مرے پاس کاش آجاتے مرے نالے مجھے رلا جاتے

درد کو کرلیا ہے اسیر
گوہر لاجواب کیا کہنا

امیروں کا کھیل

ایک باب کا ڈراما

از جناب ا-ح- پروانہ بریلوی بی اے

افراد

موہن —— ایک نیک سیرت اور فن کار صورت تراش
رادھا —— دیہات کی سادہ مزاج، بھولی اور کمسن دوشیزہ
مہابیر —— گاؤں کے زمیندار کا لڑکا
—— موہن کی بوڑھی ماں
—— رادھا کی ماں
—— نوکر وغیرہ وغیرہ
زمانہ —— یہی
مقام —— شہر سے ملحق ایک دیہات

منظر اوّل

(موہن چھپر کے سامنے اپنے مکان کے وسیع آنگن میں بیٹھا ایک صراحی کی گردن جوڑ رہا ہے۔ کچھ صراحیاں دھوپ میں سوکھ رہی ہیں صراحی کے کچھ ٹوٹے اور کچھ پورے حصّے سامنے پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک طرف بھیگی ہوئی چکنی مٹی کا ڈھیر لگا ہوا ہے چھپر کے برابر دیوار سے لگے ہوئے مٹکے اور ناندیں رکھی ہوئی ہیں۔
آنگن کے ایک کونہ میں بجھی ہوئی خاک میں پکے ہوئے آبخورے دکھائی دے رہے ہیں۔ اسی کونہ سے کچھ دور موہن کی بوڑھی ماں رحیاک پر آبخورے بنا رہی ہے موہن صراحی پوری کر کے ایک تیز چاقو سے اس پر پھول پتیاں بنانا شروع کرتا ہے اور بناتے بناتے صراحی توڑ ڈالتا ہے)

ماں۔ یہ کیا کیا موہن؟
موہن۔ بگڑ گئی تھی، ماں۔
ماں۔ کیا؟
موہن۔ دو پھول۔
ماں۔ ڈھلی ہوئی تو اچھی تھی۔
موہن۔ تو کیا ہوا۔
ماں۔ بک جاتی نا۔
موہن۔ ماں! میں دھوکا نہیں دے سکتا۔
ماں۔ اس میں دھوکے کی کیا بات تھی
موہن۔ ماں، گاہک انھیں پھول پتیوں کے لئے میری صراحی خریدتے ہیں اور جب وہی خراب ہو جائیں تو میں انہیں کیا خوش کر سکتا ہوں۔
ماں۔ نہیں۔ خیال سے بنانا۔ تم بڑی توڑ پھوڑ کرتے ہو۔
موہن۔ توڑ پھوڑ ہی سے بڑے بڑے کام ہو جاتے ہیں، ماں!
ماں۔ رہنے دو۔
موہن۔ (اٹھ کر جاتے ہوئے) ماں میں ابھی آتا ہوں۔
ماں۔ کہاں جاتے ہو؟
موہن۔ بھگوان کی مورتی میں رنگ بھر لوں۔
ماں۔ اچھا۔
(موہن جھپڑ کے اندر چلا جاتا ہے۔ رادھا آتی ہے)
رادھا۔ ماں!
ماں۔ رادھا! آبخورے بنانے آئی ہے کیا؟
رادھا۔ موہن کہاں ہے؟
ماں۔ سامنے چھپر میں۔
(رادھا چھپر کی طرف جاتی ہے)
رادھا۔ (اندر جا کر) کیا کر رہے ہو موہن؟
موہن۔ بھگوان کی مورتی میں رنگ بھر رہا ہوں۔ دیکھو کیسی ہے؟
(رادھا مورت کے پاس آتی ہے)
رادھا۔ (جھجک کر) مورت تو بڑی سندر ہے۔ مگر . . .
موہن۔ (جلدی سے) مگر کیا؟
رادھا۔ نہ مرلی کی تان ہے نہ رادھا!
موہن۔ یہ کیا کہا؟

(بستر پر پڑی ہوئی بانسری اُٹھا کر بجاتا ہے)

موہن - (رُک کر) اب تو مُرلی کی تان بھی ہے اور رادھا بھی۔

رادھا - کہاں؟

موہن - (رادھا کی طرف اشارا کرکے) یہ!

(دونوں ہنستے ہیں۔ موہن پھر بانسری بجاتا ہے۔ موہن کی ماں آتی ہے)

ماں - (ہنس کر) ارے! مورت سنا کے بناتے پوجا ہونے لگی۔

موہن - (بانسری بند کرکے) ہاں، ماں!

ماں - ذرا میں تو دیکھوں۔

(موہن کے قریب جاتی ہے)

موہن - ابھی مُرلی کا رنگ اڑ گیا ہے۔

ماں - مکھڑے کا رنگ تو خوب ملایا ہے۔

(جاتی ہے)

رادھا - چلو موہن تمہیں جامن کا باغ دکھالاؤں۔

موہن - لے لیا کیا؟

رادھا - ہاں، ہاں۔

موہن - بہار کی آئی ہیں؟

رادھا - خوب - دو ایک مینہ پڑ جائیں تو پھول کے کپا ہو جائیں گی!

موہن - ذرا ٹھیرو۔

رادھا - تمہارا دل نہیں گھبراتا۔ دن رات مٹی سے کھیلتے رہتے ہو۔ چلو باہر ہوا میں چلیں۔

موہن - (سنجیدگی سے) رادھا! ہمارا جیون ہی مٹی کا کھیل ہے۔

رادھا - ہوگا،

(جانا چاہتی ہے)

موہن - کیا خفا ہو گئیں؟

(خاموشی)

موہن - (ہاتھ پکڑ کر) ٹھہرو۔ میں بھی چل رہا ہوں۔

(موہن سب چیزیں رکھ کر، رادھا کے ساتھ باہر آتا ہے)

ماں - کہاں جا رہے ہو؟

موہن - رادھا کے باغ۔

ماں - رادھا کے باغ!

رادھا - ہاں - میرے باغ - میں نے جامنوں کا باغ لیا ہے۔

ماں - اچھا جاؤ۔

(دونوں آگے بڑھتے ہیں)

ماں - جلدی آنا۔

موہن - اچھا۔

ماں - (رادھا سے) رادھا۔

رادھا - کیا؟

ماں - ماں سے کہہ دینا میں سانجھ کو آؤنگی۔ کہیں جانے نا۔

رادھا - اچھا۔

(دونوں جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے)

منظر دوم

(شہر۔ مہابیر کا کمرہ۔ ایک بڑے کمرے میں ایک طرف پلنگ پر لیٹا ہوا اخبار پڑھ رہا ہے۔ کمرے کے بیچ میں ایک چھوٹی سی گول آبنوسی میز پڑی ہوئی ہے جس پر دو کتابیں، ایک خط لکھنے کا پیڈ اور فاؤنٹن پن رکھا ہوا ہے۔

اخبار ایک طرف رکھ کر کچھ گنگناتا ہے۔ پھر اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے اور رامو کو پکارتا ہے۔)

مہابیر - رامو۔

رامو - (آکر) جی سرکار۔

مہابیر - بابا جی کب آنے کو کہہ گئے تھے؟

رامو - جی، آج بدھ ہے کہہ گئے تھے۔ شکر کو۔ جی، شکر کو آئیں گے۔

(پیڈ میں سے خط نکال کر رامو کو دیتا ہے)

مہابیر - اسے جوہری بابو کے پاس لے جاؤ۔ اور کہنا کہ وہ شام کو ضرور آئیں گے۔

رامو - بہت اچھا سرکار۔

(جاتا ہے۔ مہابیر اُٹھ کر باہر برآمدے میں چلا جاتا ہے)

مہابیر - (برآمدے میں آکر) بادل گھر آئے۔ (گنگناتے ہوئے) ع

بادل آئے!
وہ نہیں آئے!
کون بلائے؟
کیسے جائے؟
بادل چھائے!

(دور سے آواز آتی ہے)

آواز - جامنیں ہیں کالی، کالی۔

مہابیر- (خوش ہو کر نئے کے ساتھ) آئے! وہ آئے!

(رامو نکل کر باہر جاتا ہے)

مہابیر- جا رہے ہو؟

رامو- جی۔

(رامو چلا جاتا ہے - جامن والی سامنے آتی ہے)

مہابیر- (جامن والی کو پکارتے) یہاں آؤ، رادھا۔

رادھا- یہاں لے لو۔

(بارش شروع ہو جاتی ہے۔ بادل گرجتے ہیں۔ رادھا مکان کے قریب آجاتی ہے)

مہابیر- وہاں کیسے آؤں؟ دیکھتی نہیں برآمدے میں بوچھار آرہی ہے میں بھیگ جاؤں گا آتی کیوں نہیں؟ چلی آؤ۔ ڈرتی ہو؟ میرے اوپر وشواش نہیں؟

رادھا- وشواس۔

مہابیر- آجاؤ۔

رادھا- نہیں۔

مہابیر- ڈرتی ہو؟

رادھا- ہاں۔

مہابیر- کیوں؟

رادھا- آپ مرد ہیں اور امیر!

مہابیر- تو کیا ہوا؟

رادھا- سماج ہمیں مرد اور امیروں سے ملنے کو منع کرتا ہے۔

مہابیر- ہٹیئے! جلنے بھی دو۔ سماج ہمارا ہے۔ سماج کو ہم نے بنایا ہے وہ ہمیں منع نہیں کر سکتا!

رادھا- سماج آپ کا ہے؟ آپ نے بنایا ہے!!

مہابیر- ہاں، ہاں۔

رادھا- لیکن میں عورت ہوں!

مہابیر- ٹھیک ہے۔

رادھا- مجھے سماج کا کہا ماننا ہی ہوگا!

مہابیر- (پکڑ کر لے جاتے ہوئے) ہونہہ۔ جانے بھی دو اسے۔ اندر آؤ۔ دیکھو تم بھیگ گئی ہو کپڑے سکھا کر چلی جانا۔ آج میں جامنیں پیٹ بھر کر کھاؤں گا۔ دھل کر کیسی چمک رہی ہیں!

رادھا- (زور کرتے ہوئے) چھوڑ دو! مجھے چھوڑ دو۔ کوئی دیکھ لے تو۔

مہابیر- یہاں تو برستے ہوئے بادلوں کے سوا کوئی بھی نہیں۔ چلو اندر چلو۔

(دونوں اندر جاتے ہیں۔ مہابیر کمرے کا دروازہ بند کر دیتا ہے رادھا ٹوکری رکھ کر الگ کھڑی ہو جاتی ہے)

مہابیر- سب کتنے کی ہیں؟

رادھا- (مسکرا کر) ٹھیک ٹھیک!

مہابیر- ہاں۔

رادھا- آٹھ آنے کی۔

مہابیر- ہم نے سب خرید لیں۔

رادھا- سب؟

مہابیر- ہاں سب۔

(جیب سے آٹھ آنے نکال کر دیتا ہے)

مہابیر- لو پیسے لو

(رادھا لیکر اپنی ساری کے کنارے میں باندھ لیتی ہے)

مہابیر- تم ہمیں وزن میں کھلاتی ہو؟

رادھا- ہاں۔

مہابیر- آج ہمارے ہاتھ سے ایک جامن کھاؤ۔

رادھا- کیا کہہ رہے ہیں آپ؟

مہابیر- اس میں برا کیا ہے؟

رادھا- (گھبرا کر) برا تو۔۔۔ کچھ نہیں۔

مہابیر- تو پھر کھا لو نا۔ ہم کھلا رہے ہیں!

(رادھا، مہابیر کی طرف دیکھتی ہے۔ مہابیر رادھا کے منہ میں جامن دینے کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ رادھا پیچھے ہٹتی ہے۔ مہابیر اسے اپنی گود میں بھر لیتا ہے۔ گود میں آتے ہی رادھا کو پسینہ آجاتا ہے۔ ایک جھرجھری کے ساتھ اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور اس کے ہاتھ پیر بے قابو ہو کر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ مہابیر اسے اور مضبوطی سے پکڑ کر دبا لیتا ہے۔ پردہ گرتا ہے)

منظر سویم

(شام کا وقت۔ سورج ڈوب رہا ہے۔ دور سے چرواہوں کے گانے اور چوپاؤں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں آرہی ہیں رادھا، موہن کے مکان کے قریب برگد کے پیڑ کے نیچے کھڑی ہوئی ہے دور سے موہن سر پر کھلونوں کی ڈھلیا رکھے ہوئے آتا دکھائی دیتا ہے۔ رادھا تیزی سے اس کے پاس جاتی ہے)

رادھا۔ (وہاں جاکر) تم آگئے موہن؟

موہن۔ (چلتے ہوئے) ہاں۔

رادھا۔ کہاں گئے تھے؟

موہن۔ برابر کے گاؤں کے میلے میں بازار لگا تھا۔ کھلونے بیچنے گیا تھا۔ سب بک گئے۔ سب! ایک بھی نہیں بچا۔

رادھا۔ (ڈوبی ہوئی آواز میں) ہاں۔ سب ہی بک جاتے ہیں!

موہن۔ کیا بات ہے رادھا! تم دکھی معلوم ہوتی ہو!

رادھا۔ ہاں موہن!

موہن۔ کیوں؟

رادھا۔ میں نے آج وہ کرلیا جو بہت دنوں بعد کرنا تھا۔ زرد رستے میں آج گنگا نہائی موہن!

موہن۔ کیا مطلب؟

رادھا۔ مطلب۔ ۔ جوانی مجھے لے اڑی میں ہوا میں اڑنے لگی۔ اپنے گاؤں اور اس ریتوں سے دور چلی گئی۔ اپنے پروں کی طاقت کا خیال کئے بغیر۔ میں اور میرا ساتھی خوشی خوشی اڑ رہے تھے۔ سماج کے بندھنوں سے دور۔ پریتا اور پریم کی دنیا میں! دیکھتے دیکھتے ہی ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور میرے ساتھی کو اڑا کر لے گیا۔ میں اکیلی رہ گئی۔ اڑنے کی کوشش کی۔ آگے بڑھنا چاہا، مگر میرے بازو تھک گئے اور میں ہوا میں بل کھاتی ہوئی میلے اور کیچڑ میں گر پڑی۔

موہن۔ (کچھ دبے سمجھتے ہوئے) پھر میں نے اسے میلے اور کیچڑ سے نکال لیا۔ اور پرماتما نے مینہ کی چھینٹوں سے اسے پاک کردیا۔

رادھا۔ نہیں وہ دھبّا پڑا ہی رہی۔ تم اسے نہیں بچا سکے۔

موہن۔ ایسی باتیں نہ کرو رادھا۔ (آبدیدہ ہوکر) مجھے دکھ ہوتا ہے!

رادھا۔ (ہنسکر) ایک بات کہوں!

موہن۔ کہو۔

رادھا۔ برا تو نہ مانوگے؟

موہن۔ تمہاری بات کا، رادھا!

رادھا۔ موہن جب میں جامنیں لیکر گاتی ہوئی شہر میں جاتی ہوں۔ شہر کے جوان مجھے گھور گھور کر دیکھتے ہیں اور بہت سے بلاکر میری جامنیں خریدنے کے بہانے مجھ سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ جب میں منہ پھیر کے گاؤں کی طرف چلنے لگتی ہوں۔ میں انہیں بکتے ہوئے سنتی ہوں "اس کا یہ بن جامنیں بیچنے کے لئے۔ کیسی سندر ہے۔ گاؤں کی رانی معلوم ہوتی ہے"۔ مجھے یہ سب بہت برا معلوم ہوتا ہے۔

موہن۔ کیوں؟

رادھا۔ (منہ پھلا کر) وہ جھوٹی خوشامد کرتے ہیں دھوکا دیتے ہیں۔

موہن۔ وہ سچ کہتے ہیں۔ تم سچ مچ رانی معلوم ہوتی ہو۔

رادھا۔ ہاں۔ تو پھر میں جانتی ہیں کیوں کہتی ہوں؟

موہن۔ گاؤں کی رانی جاتیں ہی بیجا کرتی ہے!

(باتیں کرتے ہوئے موہن اپنے مکان کے پاس آجاتا ہے)

رادھا۔ پھر ملیں گے۔

موہن۔ اچھا۔

(موہن گھر میں جاتا ہے۔ رادھا تھوڑی دور چلکر مہابیر کو جاتے دیکھتی ہے اور بڑھ کر کاندھے پر ہاتھ رکھ دیتی ہے)

مہابیر۔ کون؟

رادھا۔ میں!

مہابیر۔ (دیکھ کر) جانتیں نہیں لائیں۔

رادھا۔ اب میں اور زیادہ جانتیں نہیں سہہ سکتی!

مہابیر۔ کیوں؟

رادھا۔ تم کہہ رہے ہو یہ۔ میری طرف دیکھ کے کہو!

مہابیر۔ (منہ پھیر کے) میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم غریب ہو، چھوٹی ذات سماج ......!

رادھا۔ لیکن سماج تمہارا ہے۔ (زور سے) سماج کو تم نے بنایا ہے۔ وہ تمہیں منع نہیں کر سکتا!

مہابیر۔ لیکن تمہیں سماج کا کہا ماننا چاہئے۔

رادھا۔ اب سماج کا کہا مان کے کیا کروں؟

مہابیر۔ یہ تمہیں پہلے سوچ لینا تھا۔ میں مجبور رہوں۔

رادھا۔ تو آپ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ کچھ بھی آپ کے بس میں نہیں؟

مہابیر۔ میں مجبور ہوں رادھا! مجھے جانے دو کوئی دیکھ نہ لے۔

(مہابیر جاتا ہے۔ رادھا آم کے پیڑ تلے رک جاتی ہے)

رادھا۔ (پیڑ سے لگ کر) "یہ تمہیں پہلے سوچ لینا تھا۔ میں مجبور رہوں"۔ ..... امیر ... غریب ... کیا یہ دنیا امیروں کی ہے؟ ... کیا انھیں غریبوں کے جیون سے کھیلنے کا ادھیکار ہے، سماج کس کا ہے؟ دنیا کس کی ہے؟ سماج .... دنیا (آہستہ سے) ان کی ....

(پردہ گرتا ہے)

منظر چہارم

(رات کے دس بجے ہیں، ابر چھایا ہوا ہے۔ بادل گرج رہے ہیں ہوا کی تند ... سے پیڑوں کی شاخیں آپس میں ٹکرا ٹکرا کر شور مچا رہی ہیں۔ رہ رہ کر بجلی چمکتی ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ ہر طرف خوفناک خاموشی چھائی ہوئی ہے، صرف جھینگر کے نغمات گونج رہے ہیں۔

موہن اور اس کی ماں چھپر میں سو رہے ہیں۔ موہن کے برابر کرشن جی کون کا مجسمہ کھڑا ہے۔ مٹی کا دیا ہوا سے بچا ہوا پھیکی پھیکی روشنی پھیلا رہا ہے۔ اچانک موہن اٹھ کر باہر کی طرف بھاگتا ہے۔ اس کے بھاگنے سے الجھ کر مجسمہ گر کر ٹوٹ جاتا ہے۔ موہن کی ماں گھبرا کر اٹھتی ہے)

ماں۔ (اٹھتے ہوئے) موہن! موہن!..

(موہن بغیر کچھ جواب دیئے باہر بھاگتا ہے)

موہن۔ (بھاگتے ہوئے) رادھا۔ میں تمہیں میلے اور کیچ میں پڑا نہیں دیکھ سکتا!!

(بوڑھی ماں موہن کا پیچھا کرتی ہے۔ وہ بھاگتا ہوا رادھا کے گھر کی طرف جاتا ہے)

موہن۔ (دروازے پر آکر) رادھا! رادھا!!

(دروازے پر ہاتھ مارتا ہے۔ دروازہ کھل جاتا ہے۔)

موہن۔ (اندر داخل ہو کر) رادھا! رادھا!!

رادھا کی ماں۔ (سوتے سے اٹھ کر آنکھیں ملتے ہوئے) کون!

موہن۔ رادھا کہاں ہے ماں؟

ماں۔ کیا ... کیا ہے!

(دونوں بستر کی طرف دیکھتے ہیں۔ موہن کی ماں آتی ہے)

موہن۔ رادھا چلی گئی ماں۔ باغ گئی ہوگی۔

(باغ کی طرف بھاگتا ہے)

موہن کی ماں۔ کہاں جا رہے ہو بیٹا؟

موہن۔ ابھی آتا ہوں ماں! تم ٹھہرو۔

(جاتا ہے)

موہن۔ (مکان کے پیچھے باغ میں آکر) رادھا! رادھا! (زور سے) رادھا۔ رادھا!۔

(موہن بھاگتا ہوا ندی کنارے جاتا ہے)

موہن۔ (بجلی کی چمک میں رادھا کو ندی کنارے دیکھ کر) رادھا! !

رادھا۔ (پیچھے دیکھ کر) موہن ....!

(ندی میں کود پڑتی ہے - موہن بھی ندی میں کود پڑتا ہے اور تھوڑی دیر میں رادھا کو باہر نکال لاتا ہے)

موہن - آخر میں نے تمھیں بچا ہی لیا - بھگوان!

رادھا - (زمین پر پیڑ کے نیچے لیٹے ہوئے) بیکار - مجھے سماج کے آنچل پر داغ بنکر جینا پڑے گا -

موہن - کیوں؟

رادھا - نہ پوچھو -

موہن - بتانا ہوگا، رادھا!

رادھا - تمہیں رنج ہوگا -

موہن - ہرگز نہیں -

رادھا - امیری نے غریبی سے جھوٹ کا کھیل کھیلا - غریبی کمزور تھی ہار گئی!

موہن - کیا رادھا!

رادھا - یہی کہ امیروں نے مجھے پھول سمجھ کر اٹھایا اور سونگھنے کے بعد کیچ میں پھینک دیا -

موہن - (تعجب کی سے) یہ تو اس دنیا کی پرانی ریت ہے - یہ امیر امیر اس لئے ہیں کہ گاؤں کی بھولی اور غریب لڑکیوں کو بدنام کریں یہ دنیا اور زمانہ ان سے بدلہ نہیں دیتا - یہ دنیا صرف غریبوں پر حکومت کرتی ہے - یہ سماج صرف غریبوں کو ستا سکتا ہے - رادھا! امیروں نے تمھیں کیچ میں پھینک دیا - میں تمھیں وہاں پڑا نہیں دیکھ سکتا تھا امیر غریبوں کا کچھ خیال نہیں کرتے! وہ اُن کے جیون کو ستی کا کھلونا سمجھ کر اُس سے دل بہلاتے ہیں پھر اکتا کر اُسے توڑ کر پھینک دیتے ہیں! - لیکن غریب غریبوں کو نہیں بھول سکتے - رادھا! تم نے غلطی کی - تم اُس دنیا میں چلی گئیں - جہاں تمھیں نہ جانا تھا - آؤ میرے ساتھ آؤ - ہم دونوں غریب ہیں - غریب ہی غریب کی مدد کر سکتا ہے - آؤ میرے ساتھ آؤ!!

(رادھا روتے ہوئے اپنا ہاتھ موہن کے ہاتھ میں دے دیتی ہے - موہن اُسے اٹھا کر اپنے سہارے اُس کے مکان کی طرف لے جاتا ہے -)

ـــــــ پردہ گرتا ہے ـــــــ

لسانیات

موجودہ زمانے کے علوم و فنون کی نت نئی ترقی سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جو کچھ علمی کارنامے ہمارے سامنے ہیں۔ یہ سب عہدِ جدید کی پیداوار ہیں۔ انسانِ قدیم کی علمی استعداد محدود اور ناکافی تھی۔ نہ اس کو تحقیقات کا شوق تھا۔ نہ دقیق مسائل کے سمجھنے اور نہ مشکل باتوں کے سمجھانے کی صلاحیت تھی۔ یہ خیال ہماری تاریخی ماخذ کے غلط مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ جو باتیں آج پائی جاتی ہیں۔ پرانے زمانے میں اس درجہ کمال پذیر تو نہ تھیں۔ مگر علوم و فنون کے جزئی اصول کی کرید اور چھان بین ہر دور اور ہر زمانہ میں کی گئی ہے۔ اور یہی مسئلہ کہ ان باتوں کا علم ضرور تھا۔ ہماری موجودہ زمانے کی ترقیوں کا دارومدار اسلاف کے جزئی اصول اور ان کی معلومات پر منحصر ہے۔ خود یورپ جو علم و فن کی علمبردار ہیں۔ ایک وقت لاعلمی اور تاریکی میں گذار چکی ہیں۔ جب یونان کی علمی جد و جہد اور کمالات نے تمام عالم کو مسخر کر لیا۔ اس وقت یورپ میں علم و ہنر کا پتہ چاتک نہ تھا۔ نہ یونانی فلسفہ سے غرض تھی۔ نہ حکمت عملی کا شوق تھا۔ چھٹی صدی عیسوی کے آغاز ہونے پر یونانی سرمایہ لاطینی زبان میں منتقل ہوا۔ اہل عرب نے یونان کے علوم و فنون کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے بیداری پیدا کی۔ بوعلی سینا۔ ابونصر فارابی۔ اور اسحاق کندی، وغیرہ کے نام یورپ میں فضل و کمال کے مترادف تصور کئے جاتے تھے۔

جب سنہ ۱۳ھ میں اہل عرب نے شام، مصر، ایران، افریقہ اور دیگر مقامات پر اپنا تسلط جمایا۔ تو اس کے ساتھ ان کے علمی کارنامے بھی سارے ملکوں میں پھیل گئے۔ عباسی حکومت نے عرب کے علوم و فنون میں بہت اضافہ کیا۔ فن لسانیات یورپ میں انیسویں صدی کی ایجاد ہے مگر اس کے جزئی اصول پہلے سے معلوم ہو چکے تھے۔ یونان میں الفاظ و حروف کے مخارج پر کتب تصنیف کی گئیں۔ عرب میں ابن خلدون نے زبان کی ماہیت اور اس کے فلسفہ سے بحث کی۔ اور اصول مدون کئے۔ امام ثعالبی نے فقہ اللغۃ میں مترادف الفاظ کے معانی بتائے۔ جو ماہرین بصرہ اور کوفہ میں پیدا ہوئے انہوں نے زبان کے ان الفاظ کی چھان بین کی جو مختلف قبیلوں میں بولے جاتے تھے۔ اسلوب کلام کا مطالعہ کیا۔ اور ان باتوں کو کتابوں میں جمع کر کے ایک مستقل فن بنا دیا۔ ابو الاسود، میمون بن اقرن، عبداللہ اور عیسیٰ بن عمر اور خلیل ابن احمد نے جو علم لغت اور الفاظ کے مسلّم عالم سمجھے جاتے تھے۔ ان

ادبی مقالہ

از جناب سید یوسف علی مودودی۔ اجمیری

عالموں کے بعد سیبویہ نے فن لسانیات میں امامت کا درجہ حاصل کیا۔ "الکتاب" اسی فاضل کی تصنیف ہے۔ اور لسانیات کے فن میں جو کتابیں لکھی گئیں۔ ان سب کا ماخذ یہی کتاب ہے۔ خلیل ابن احمد نے سنہ ۱۷۰ھ میں "کتاب العین" لکھی تھی جس میں حروفِ معجم کی لغت کو مرتب کیا۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ تھی کہ الفاظ کے ذخیرہ کو ان کے مخرج کے مطابق ترتیب دیا تھا۔ پہلے حروف حلقی۔ پھر لسانی پھر سنیہ پھر شفویہ۔ ان کی ترتیب حسب ذیل تھی۔

(۱) ع۔ ہ۔ خ۔ ق۔ ک

(۲) ج۔ ش۔ ص۔ ض۔ س۔ ز۔ ط۔

(۳) د۔ ت۔ ظ۔ ذ۔ ث۔ ر۔ ل۔ ن۔ ف۔ م۔ و۔ ا۔ ی۔

سنسکرت کی لغت کی ترتیب میں بھی پہلے حلقی۔ پھر لسانی اور سنیہ اور شفویہ حروف آتے ہیں۔ ان دونوں میں مطابقت پائی جاتی ہے۔

حروف پر نقطے لگانا سنہ ۶۷ھ کی ایجاد ہے۔ ابو الاسود دؤلی نے جو علم نحو کا موجد تھا ایسے نقطے مقرر کئے تھے۔ جن سے فعل، حرف اور اسم میں امتیاز ہو سکتا تھا۔ حقیقت میں نقطوں کی ایجاد سریانی زبان کے اثر کا نتیجہ ہے۔ نقاط کے موجد اہل عرب ہیں۔ عجم والے س۔ ش۔ د۔ ذ۔ ب۔ ث وغیرہ میں کچھ امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے عبدالملک بن مروان کے عہد میں اس کی درستی کی طرف توجہ کی گئی۔ اور حجاج بن یوسف کے ایماء سے نصر بن عاصم نے نقطے ایجاد کئے۔ کسی حرف پر ایک نقطہ لگا۔ کسی پر ۲ لگانا بعض حروف کے نیچے بعض کے اوپر نقطے اسی عالم کی راست لگائے گئے۔ اہل عرب کے یہاں پہلے ۲۸ حروف تھے۔ مگر اہل عجم نے چار حرف اور بڑھائے اور حروف تہجی ۳۲ ہو گئے۔ یہ حروف آج تک اسی ترتیب سے تمام دنیائے اسلام میں رائج ہیں۔

افریقہ۔ ترکستان۔ عرب۔ ایران اور ہندوستان میں یہ حروف یکساں طریقے سے لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لسانیات کی تدوین جیسی آج کل ہو رہی ہے۔ پہلے مجموعی صورت میں نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ فن میں اس کا وجود نظر آتا رہا۔ یورپ جو آج اس فن میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے جیسا کہ بتایا جا چکا ہے سنہ ۶۰۰ء سے پہلے اس ذخیرہ سے اس کا علمی سرمایہ بالکل خالی نظر آتا ہے۔ جب یونانی علوم و فنون عربی میں منتقل ہوئے تو اہل

عرب سے یہ خزانہ لاطینی زبان میں آگیا۔ یہ تو دور تراجم کے برکات تھے کہ یونان اور عرب اور یورپ میں فلسفہ اور دیگر علوم و فنون کا چرچا پھیلا۔ مگر رفتہ رفتہ ترجمے کے بعد تالیف اور پھر تصنیف کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ اور تا امکان ہر فن میں تصنیفات کا مستقل ذخیرہ پایا جانے لگا۔ مغرب میں لسانیات کی تحقیق انیسویں صدی میں ہوئی۔ اس سے پہلے کا ذخیرہ محض قیاسی تھا۔ اور وہ الہیاتی کام تھا۔ جس پر لسانیات کا اطلاق مجازاً ہو سکتا ہے۔ زمانہ حال میں اس فن میں اتنی چھان بین کی گئی ہے کہ یہ فن ایک جامع اور مستقل شعبہ بن گیا ہے۔

یورپ کی زبانوں میں لسانیات کے اصول نے جو ہمہ گیری حاصل کی ہے اس سے بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ یہاں تو محض یہ ظاہر کرنا مقصود ہے۔ کہ جن مستشرقین نے ہماری ہندوستانی زبان میں تحقیقات کی۔ اور نتائج اخذ کئے ہیں۔ اور جنہوں نے زبان کے اصول سے بحث کی ہے وہ کون تھے۔ پہلا مستشرق میکس مولر (Max Muller) اس فاضل نے آریائی زبانوں کا تقابل مد نظر رکھ کر ایسے اصول بنائے تھے جن پر چل کر ہماری ملکی زبانوں کی اصلیت معلوم ہو سکتی تھی لیکن چونکہ یہ سرزمین موجودہ زمانے سے پہلے کا ہے۔ اس کے بہت سے اصول آج کل محض قیاسی سمجھے جاتے ہیں۔ بوپ (Bope) اور بیمس (Beams) نے ملکی زبانوں کی تحقیق کافی طور سے کی ہے۔ اور ان اہم نکات کا انکشاف کیا ہے جن کا گمان بھی نہ تھا آئندہ اس فن کی ترقی خواہ کتنی ہی ہو۔ مگر انہوں نے ایسے مسلمہ اصول بتلائے ہیں۔ جن کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بوپ (Bohe) کو لسانیات کا باوا آدم کہنا چاہیئے۔ اس نامور فاضل کے بعد گرائرسن (Grierson) ای سی وولنر (E. C. Woolner) اور ہروڈنر (Harwodtner) کا نام آتا ہے جنہوں نے انگریزی فلولاجی (Philology) کے اصول پر ہندوستانی زبان کا مطالعہ کیا ہے۔ اور لسانیات کا ایک نیا باب کھول دیا ہے

یہ مستشرقین جس شاہراہ پر گامزن ہوئے تھے۔ اسی پر ہندوستان کے چند مایہ ناز ماہرین نے قدم اٹھایا۔ ڈاکٹر بھنڈارکر جسٹس کرامت حسین، مولانا آزاد۔ پنڈت شیام سندر داس منشی احمد دین۔ پروفیسر محمود شیرانی۔ ڈاکٹر محی الدین۔ مولانا عبد الحق صاحب وغیرہم نے اس فن کے اصول کا مطالعہ کیا۔ اور لسانیات ہند کی بنیاد ڈالی۔ ان رہنمایان فن کی نیک رائے اور مشورے پر عمل پیرا نہ ہونا اور ان کی ادبی خدمات کا اعتراف نہ کرنا خود علم کی توہین ہے۔ انسانی سرشت کی تاریخ میں اس سے زیادہ بدنصیبی کی بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ ادبی خدمات کو شخصی یا قومی رنگ میں دیکھا جائے۔ ہمارے خالص علمی شغف ہی کا یہ نتیجہ ہو سکتا ہے۔ کہ کسی وقت ہندوستانی زبان کا ذخیرہ ایک مکمل فن کی صورت اختیار کرے۔ اور بہت بڑی حقیقت کا انکشاف ہو جائے اور جب ایکدفعہ صراط مستقیم پر جادہ پیمائی شروع ہو جائے۔ تو اس کے تسلیم کرنے میں کیا توقف ہو سکتا ہے۔ کہ ہماری ملکی زبانیں ایک دوسرے سے متعلق ہو کر ہمارے قدیم اشتراک عمل کو دہرائیں۔ اس ذہنیت کے قائم ہونے کے بعد اب تک جو کچھ باتیں معلوم ہوئی ہیں اور آئندہ ہوں گی۔ ان سے ہماری زبان کے لسانیات کا مواد تیار ہو جائیگا۔ اور فن لسانیات کی ابتدائی منزل پر پہنچنے کی تدبیر مکمل ہو گی۔

اب تک ہندوستان کی بولیوں کا شمار تقریباً سو تک بتایا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب چھوٹی بڑی اور قدیم و جدید بولیاں ہیں جن میں سے بعض کے تو قواعد بھی مرتب نہیں ہیں۔ مثلاً تبت اور برما کی زبانوں کے مستقل قواعد نہیں ہیں لیکن قواعد کی ترتیب اور چیز ہے۔ اور زبان کی مکمل حیثیت چیزے دیگر است اردو زبان کی حیثیت کو دیکھئے۔ اولاً اس کے قواعد کو عربی فارسی کے قواعد کے تحت میں رکھا گیا۔ اور بالآخر اس تقلید سے تنگ آ گئے۔ اور دوسری قسم کی ترتیب جو انگریزی زبان کے اثر سے ماخوذ ہے۔ بعض نے پسند کر لی۔

ترتیب خواہ کسی زبان کی ہو۔ ایک حالت پر قائم نہیں رہتی۔ ہر زبان اپنی ترتیب۔ ترکیب اور لغت کے سبب سے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ یہ کسی خاص زبان کا نہیں ہے۔ بلکہ خواہ کوئی زبان بولی جاتی ہو۔ یا وہ مر چکی ہو۔ اور محض تحریر میں منضبط ہو کبھی اصلی حالت میں نہیں رہتی۔ اس لئے ہماری ملکی زبانوں کی بھول بھلیاں اب بھول بھلیاں نہیں رہ سکتیں۔ اس میں ایسے صاف اور سیدھے راستے نکل سکتے ہیں۔ جن پر چل کر ہم اردو یا ہندی زبان کی اصل حقیقت تک آنکھ بند کر کے پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن ہم کو ایسی حالت میں ان دونوں زبانوں کو ایک ہی لڑی میں پرونا پڑے گا۔ جبکہ ان کے صحیح ماخذ یا نکاس کے بارے میں گفتگو کرنا پڑے گی۔ اور اس سے یہ فائدہ ہو گا۔ کہ اصل و فروع کا بخوبی پتہ چل جائیگا اور کٹر سے کٹر شخص بھی اس سے انکار نہ کر سکے گا۔

ہندی اردو میں باہمی نہایت قوی تعلقات ہیں۔ جن کی تلاش میں ابتدا میں تو راستہ بالکل صاف اور سیدھا نظر آتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ بے پروا مسافر بھی بغیر کسی گمراہی کے اصل منزل پر پہنچ سکتا ہے لیکن اصل بات یہ ہے۔ کہ منزل مقصود پر پہنچنے کیلئے بڑی سخت محنت کے علاوہ بڑی دوربینی اور تدبر علم کی ضرورت ہے۔ اب تھوڑی دیر کیلئے ہم اردو ہندی کی عام شاہراہ سے ہٹ کر جہاں دونوں میں روزمرہ اور لغات کا فرق نظر آتا ہے۔ یہ سوال کرتے ہیں۔ کہ ہم لفظ "سے" بولتے ہیں۔ اس کو پہلے "سوں" بولتے تھے۔ مدلول دونوں کا ایک ہے۔ لیکن لفظ میں تغیر کیونکر پیدا ہو گیا؟ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے۔ کہ "سوں" ہندی کا لفظ ہے۔ اور ہندی کی ترتیب کا رشتہ پراکرت سے ہے۔ اور پراکرت کا سنسکرت سے ہے۔ تو ایسی حالت میں

اس لفظ کے پیدائشی ذکر سے تعلق ہوجائے گا۔ اور ہم زمانہ حال سے ماضی میں پہنچکر اس سے آگے اس مقام پر پہنچ جائیں گے۔ جہاں اس شاہراہ پر نہ تو کسی نشان کا پتھر نصب ہے۔ اور نہ تاریخ مختصر راہ بنتی ہے۔ اس سے نئے لسانیات کی تشریح نہیں ہوسکتی۔

ہمیں چاہیئے کہ ایک باقاعدہ اور منظم طریقے سے بحث کریں اور بتائیں۔ کہ اردو و ہندی میں باہمی تعلق کیا ہے۔ لیکن اس بارے میں ذاتی رائے یا تجربہ سے کچھ کہہ دینا یا نظریہ قائم کر لینا کافی نہیں۔ بلکہ لفظوں سے شہادت پیش کرنی پڑے گی۔ جو ہمارے دعوے کی صداقت پر کافی روشنی ڈالے۔ یہ دعویٰ کرنا کہ ہمارے ملک میں مختلف صوبوں میں طرح طرح کی بولیاں بولتے ہیں جن میں کہیں کہیں بہت فرق نظر آتا ہے۔ اور کہیں بہانے نام۔ اور کسی جگہ زبان کا روزمرہ ایسا ہے۔ جو زیادہ توجہ کا محتاج ہے۔ ایک سچی بات ہوگی اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ جب ایک سیاح ملک کے تمام صوبوں میں گھومتا ہے۔ تو اس کو ہر جگہ ایسی جماعتیں ملتی ہیں جو اردو ہندی بولتی ہیں یا کوئی اور زبان لیکن ان زبانوں میں مقامی رنگ مزید چڑھا ہوتا ہے پس ان میں یہ شک نہیں پیدا ہوسکتا۔ کہ یہ زبانیں الگ الگ ہیں۔ بلکہ وہ یہ تاویل کرے گا۔ کہ اس ملک کے سارے آدمی کسی وقت ایک ہی زبان بولتے ہوں گے۔ مگر جب بستیاں پھیلتی چلی گئیں۔ اور دور دراز مسافت کا سلسلہ جاری رہا تو ہر جگہ جغرافیائی اور تمدنی اثرات سے زبان نے بھی اپنا رنگ بدل لیا۔ اگر یہ سیاح ہندوستان کی موجودہ زبانوں کے سہارے قدیم زبانوں سے دور دراز تاریخی میدانوں میں نکل جائے تو اس کو قدم قدم پر یہ بات صاف صاف نظر آئے گی۔ کہ کچھ عرصہ پہلے یہاں فلاں فلاں قومیں آباد ہوئی گئیں۔ اور زبانوں کے الفاظ کو بھی اپنی ضرورت کے مطابق ڈھالتی رہیں اردو زبان کا کچھ حصہ لیا ہے۔ جو آریائی زبان میں ملا جس کو اسلام ایران سے ساتھ لیکر آئے تھے۔ یہ شہادت اس قدر واضح اس لئے ہو جاتی ہے۔ کہ تاریخ کے صفحات میں اس کی تائید کے اسباب پائے جاتے ہیں جس شخص کی مادری زبان اردو ہو۔ اور جس نے اردو زبان میں فارسی زبان کی تحصیل سے بھی اضافہ کر لیا ہے۔ اُسے غالباً حیرت ہوگی۔ اور یقین بھی ہوگا کہ اصلی مواد اور بناوٹ کے لحاظ سے یہ زبانیں (اردو و فارسی ملتی جلتی ہیں)۔ لیکن تجربہ نے یہ بتایا ہوگا۔ کہ اگرچہ اردو قدیم فارسی سے ملتی جلتی ہے لیکن بعض اردو دان اپنی زبان کے سوا فارسی نہیں بول سکتا۔ بات کو سمجھ لے یا لفظ کے معنے نکال لے۔ لیکن بے تکلف نہ بات چیت کر سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے۔ اس سے اگر یہ نتیجہ نکالا جائے۔ کہ دونوں زبانیں الگ الگ حکومت کے زیر اثر رہ چکی ہیں۔ اور اس لئے وہ ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔

تو ہم اس بات کو تسلیم کرنے کیلئے ہرگز تیار نہیں۔ کیونکہ کسی زمانے میں کوئی زبان کسی حادثہ کسی کی آزاد مرضی یا غور و سر حکومت کی وجہ سے نہیں ہوئی۔ بلکہ اردو زبان میں ترقی یا سماجی زندگی کے تقاضے سے تخلیق ہوئی۔ اور اسے تمام ملک نے رواداری سے اور رواداری برتنا ہی چاہی۔ کیونکہ اس کے سوا تبادلہ خیال کیلئے اور کوئی دوسری راہ نہیں ہوسکتی۔

جب اردو زبان نے مستقل صورت اختیار کی۔ تو اس میں پرانی الفاظ اور پرانی تراکیب کارفرما تھیں جن کی آج ہماری موجودہ زبان کی ترکیبیں شہادت دیتی ہیں کہ اضافت عطف معطوف اور مسند مسندالیہ کے برتنے میں ایک خاص اسلوب اور قرینہ پیدا ہو گیا۔ لیکن اس اسلوب کے علاوہ لفظوں میں الٹ پھیر اور تبدیلیاں بہت نمایاں ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یا تو لفظ اپنی اصلی ہیئت بدل کر اردو زبان میں ڈھل گئے حقیقت میں سنسکرت فارسی کی بہن ہے اس نے اپنے الفاظ اردو کو فراخدلی اور فیاضی سے عطا کئے ہیں ایسی لفظی ارتباط کا یہ نتیجہ نکلا کہ اردو ایک ایسی بولی بن گئی جو کبھی سنسکرت یا بھاکھا کے الفاظ کو اپنا عنصر سمجھتی ہے اور کبھی فارسی الفاظ کے ذخیرے سے مالا مال نظر آتی ہے پھر ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جن کے فارسی اور سنسکرت میں ایک ہی معنی ہیں اور سنسکرت نے ان کو انقلابی اثرات سے بچا کر اردو کے حوالے کر دیا ہے۔

"رُسوائی"

افسانہ

ترجمہ جناب محمود احمد صاحب بی اے (علیگ)

ایک صبح دفتر جاتے وقت بس میں بیٹھ کر جیسے ہی میں نے اخبار کھولا میری نظر ایک جلی سُرخی پر پڑی "ایک ایکٹرس نامعلوم طریقہ پر قتل کر دی گئی" اخبار کے پہلے صفحہ پر اس کا فوٹو بھی تھا جس کے نیچے لکھا تھا! "جان ایلس جس کی عمر ۲۵ سال کی تھی کل شب اپنے کمرے میں مردہ پائی گئی" میں اس لڑکی کی تصویر دیکھ کر چونک پڑا مجھے اس کا چہرہ کچھ مانوس دکھائی دیا۔ شاید میں نے اس سے قبل اُسے کہیں دیکھا ہے۔ اس کے متعلق کچھ مزید معلومات حاصل کرنے کی نیت سے میں نے اس کے واقعات پر ایک نگاہ ڈالی "جان ایلس جس کا مسیحی نام ہیلن مارٹن تھا" اتنا پڑھتے ہی مجھے یاد آیا کہ میں اس سے ۵ سال پہلے ایک دوست کی پارٹی میں مل چکا ہوں۔ اس وقت وہ ہیلن مارٹن کہلاتی تھی۔ وہ میرے ساتھ غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کر رہی تھی لیکن میں اس کی طرف مائل نہیں ہوا کیونکہ انہی دنوں ایگنس گبن سے میری شناسائی ہو گئی تھی جس سے میں محبت کرتا تھا۔ اور جس سے بعد میں میری شادی ہو گئی۔ قطع نظر اس امر کے مجھے اس کے ساتھ دلی ہمدردی تھی اور اس کی حیرتناک موت کا مجھے افسوس تھا جب میں اپنے دفتر پہنچا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میری سکریٹری مسز براؤن نے اطلاع دی کہ ایک خفیہ پولیس کا عہدہ دار میرا منتظر ہے۔

"خفیہ پولیس کا عہدہ دار" میں نے پوچھا "وہ میرے پاس کس مقصد سے آیا ہے؟" "میں نہیں جانتی" مسز براؤن نے جواب دیا "اس نے مجھ سے اپنے آنے کا مقصد بیان نہیں کیا" میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک چوڑے شانے والا آدمی مجھ سے مصافحہ کرنے کو بڑھا۔

"کیا آپ مسٹر اسمتھ ہیں" اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"جی ہاں"

"میں ایک سراغ رساں ہوں"

میرے سیکرٹری نے مجھ سے یہی کہا۔" ایک لمحہ تک وہ مجھ کو تجسس بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔"

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں" میں نے کہا "میں کچھ معلومات فراہم کرنے یہاں آیا ہوں"

"کس کے متعلق" وہ مسکرانے لگا۔

"مسٹر اسمتھ کیا آپ نے آج کا اخبار نہیں پڑھا"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" میں نے جواب دیا۔

"کیا آپ بالکل نہیں سمجھے" "بالکل نہیں" ایک لمحہ تک خاموش رہی۔

"سنئے" میں نے کہا "یہ سب کس لئے آپ کس کے متعلق معلومات فراہم کرنا چاہتے ہیں"

"میں ایک لڑکی کے متعلق معلومات فراہم کرنا چاہتا ہوں۔ جس کا نام جان ایلس ہے" یہ کہتے ہوئے وہ میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگا۔

"میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا" میں نے جواب دیا "شاید آپ غلطی سے یہاں آگئے ہیں"

"کیا میں غلطی پر ہوں"

"ہاں"

"آپ اسے جانتے ہیں، کیا میرا خیال ٹھیک نہیں ہے؟"

"میں اس سے چند بار ملا تھا لیکن اس واقعہ کو ۵ سال کا عرصہ ہوتا ہے"

"اس کے بعد پھر آپ اس سے کبھی نہیں ملے؟"

"نہیں"

"کبھی اس سے گفتگو بھی نہیں کی مثلاً ٹیلیفون وغیرہ پر؟"

"نہیں"

"اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ صرف چند بار اس سے ملے۔ جس کو ۵ سال کا عرصہ ہوا"

"جی ہاں صرف اسی قدر" میں نے کہا "مجھے اس سے کیا کام میں ایک شادی شدہ آدمی ہوں اور میں دوسری عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا"

سراغ رساں میرے بیان کو لکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر غیر تشفی بخش علامات تھے۔

"سخری لڑکی" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

وہ کرسی پر سے اٹھا اور میرے پاس آیا

"مسٹر اسمتھ آپ کا شکریہ"

"مجھے امید ہے کہ آپ کا شبہ دور ہو گیا ہوگا مجھے اس قتل سے کوئی واسطہ نہیں۔"

"نہیں بالکل نہیں" سراغرساں ہنسنے لگا۔

"مجھے بڑا اطمینان ہوا۔" میں نے ظرافت سے کہا۔ "سچ تو یہ ہے کہ میں مشکل اس عورت کو جانتا ہوں۔ میں سمجھ نہ سکا کہ آپ یہاں کیوں آئے ہیں کس تحریک پر آپ یہاں اس کے متعلق معلومات فراہم کرنے آئے ہیں۔"

"اس کا روزنامچہ مسٹر اسمتھن"

"کیا میرا نام اس کے روزنامچہ میں ہے۔"

سراغ رساں دروازے تک آیا اور دروازہ کھول دیا

"جی ہاں" یہ کہتے ہوئے وہ دروازے کے باہر چلا گیا۔ میں اس کے آخری لفظ پر غور کرنے لگا۔ اس نے جس طرح جواب دیا تھا میں اسے قطعی پسند نہ کرتا تھا۔ اس طرز بیان نے مجھے پھر ایک نئی پریشانی میں ڈال دیا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا۔ آخر میرا نام کیوں جان الیس کے روزنامچہ میں موجود ہے کوئی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ مجھے خوف تھا کہ میں کسی طرح اس قتل کے لپیٹ میں نہ آجاؤں میں جانتا تھا کہ اس قسم کی شہرت میری بیوی کی مرضی کے خلاف ہوگی یوں تو پہلے ہی اس سے کچھ خوشگوار تعلقات نہ تھے۔ میری شادی شدہ زندگی اس قدر خوش آئند نہ تھی جیسا کہ میں خیال کرتا تھا۔ اگنس دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتی تھی جس کا خاندان شاہی نسل سے تھا۔ اس کے والدین مجھے نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ میں ایک غریب کا لڑکا تھا لیکن مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی جب تک اگنس مجھ سے محبت کرتی تھی لیکن ایک سال کے اندر ہی اگنس میں بڑا تغیر ہوگیا۔ اس کے برتاؤ میں وہ پہلی سی بات نہ رہی اور ایسا معلوم ہوتا کہ اس کی نظروں میں میری کوئی وقعت نہیں ہے۔ روز بروز میرا یہ خیال حقیقت کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا میں اپنی پوری قوت سے اس بات کی کوشش کر رہا تھا کہ ہمارے درمیان میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے وہ پُر ہو جائے اور میں اب اپنی کوششوں میں کچھ کامیاب ہوتا نظر آ رہا تھا لیکن اس ذلت میں اگر میرا نام بھی شریک ہوگیا تو پھر میری شادی شدہ زندگی کا خاتمہ ہے یہ خیال سوہان روح بنا ہوا تھا۔ اسی رات گھر آ کر جب شام کا اخبار میں نے کھولا تو وہ قتل کے حالات سے بھرا ہوا تھا لیکن زیادہ تر اس لڑکی کے محبت کے قصے اس میں درج تھے۔ اور ایک اطلاع کے بموجب اس کے عاشقوں کی تعداد کل ۲ تھی۔ میں نے بغور ان ناموں کو پڑھا کہ شاید اس میں میرا بھی نام ہو لیکن خوش قسمتی سے میرا نام کہیں نظر نہ آیا۔ اس سے مجھے بڑی حد تک تسکین ہوئی دوسری صبح ایک نئی داستان سننے میں آئی۔ پولیس نے اس کا روزنامچہ حاصل کر لیا۔ یہ سرخی پڑھتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جب میں اپنے دفتر کے قریب پہنچا تو ایک نیا خیال میرے دل میں آیا میں ایک راستے سے ٹیلیفون گھر میں گیا اور اپنے دفتر سے فون کیا۔ جب مسز براؤن نے جواب دیا تو میں نے اس کی آواز سے اندازہ لگایا کہ کوئی نئی بات ضرور پیش آئی ہے

"مسٹر اسمتھن" اس نے مجھ سے کہا۔ "یہ جگہ پاگلوں کا خیرات خانہ معلوم ہوتی ہے۔ اور رپورٹروں سے بھری ہوئی ہے۔ الیس کے معاملے میں وہ یہاں آئے ہیں"

"ان سے کہہ دو کہ میں اسکے متعلق کچھ نہیں جانتا۔"

"لیکن وہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔"

"لیکن میں تو ان سے ملنا نہیں چاہتا" یہ کہہ کر میں غصے میں وہاں سے بھاگا اور تمام دن ادھر ادھر گھومتا رہا آخر تھک کر ایک پارک میں پہنچا اور ایک گوشہ میں بیٹھ گیا۔ لیکن میری بے چینیوں اور پریشانیوں نے مجھے وہاں بھی دیر تک بیٹھنے نہ دیا۔ مجھے الیس سے کیا تعلق ہے۔ یہی سوال میں دل میں دہراتا رہا اور یہ رپورٹر مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں جب دوپہر کا اخبار بازار میں آیا۔ تو مجھے اپنے سوالوں کے جوابات ملے اخبار کے پہلے صفحہ پر میری ایک بڑی تصویر نظر آئی۔ جس کے نیچے لکھا تھا "الیس کا واحد محبوب" جب میں نے یہ دیکھا تو تقریباً زمین پر گرتے گرتے بچا۔ صدمے سے بیہوش ہوتے ہوتے میں نے سرخی پڑھی "غم انجام لڑکی کی ناکام محبت" اس کے نیچے روزنامچے سے چند اقتباسات درج کئے گئے تھے۔ میں نے معلوم کیا کہ جان الیس پہلی ہی نظر میں میری محبت کا دم بھرنے لگی تھی یہ دیکھ کر کہ میں اس سے دلچسپی نہیں لیتا اور میں کسی دوسری عورت سے محبت کرتا ہوں اس نے مجھے ناامید ہو کر چھوڑ دیا لیکن اس تمام عرصے میں میری یاد اس کے دل سے جدا نہ ہوئی۔ میں اس کے خیالوں میں بسا رہا۔ اور وہ مجھ سے محبت کرتی رہی۔" جب یہ میں یہ پڑھ چکا تو میرے ہوش و حواس غائب ہو چکے تھے۔

غریب جان الیس کے خیال سے نہیں اور نہ اس کی قابل قدر محبت سے بلکہ اگنس کے تصور سے دل بیٹھا جاتا تھا۔ وہ اخبار پڑھ کر کیا کہے گی اور رپورٹروں کے نامعقول سوالات سے کتنی خفا ہوگی۔ میں تمام دن گلیوں میں پھرتا رہا میں گھر جانے سے اور اگنس کے سامنے ہونے سے خوف کھا رہا تھا۔ آخر کار آدھی رات گئے میں ہمت کر کے گھر میں داخل ہوا۔ اگنس میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھ کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ایک نیا رنگ آ گیا۔ ایک لمحہ تک مکمل خاموشی رہی۔ آخر اس نے کہا۔ "تم آج معمول سے بہت دیر گھر آئے کیا تمہیں اس کا خیال ہے۔" وہ بہت نرمی سے بولی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اور گھبرا گیا۔ کیونکہ وہاں خلاف امید کچھ اور ہی بات نظر آتی تھی

"تم کمزور دکھائی دیتے ہو" اس نے کہا

"کیا میں . . . ." میں نے جواب دیا۔

"کیا تم نے کچھ کھایا ہے۔"

"نہیں کچھ نہیں"

"میں تمہارے لئے کچھ کھانا لاتی ہوں" ہم کھانے کے کمرے میں پہنچے میز پر اخبارات رکھے ہوئے تھے میں نے ان میں سے ایک میں اپنی تصویر دیکھی۔

"یہ ایک خطرناک حقیقت ہے" میں نے کہا

"بہت خطرناک" اس نے بھی تسلیم کیا

"میں شرمندہ ہوں اگنیس" میں بولا

"کس سے"

"صرف تم سے" اگنیس نے بڑی عاجزی کی نظروں سے دیکھا

"میں سمجھتی ہوں کہ تم اپنے آپ سے بھی پشیمان ہو" اس نے کہا

"ہاں مجھے اس کا احساس ہے"

"اس لڑکی جان الیس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے کہا کہ وہ ہم دونوں سے زیادہ ہمدردی کی مستحق ہے" یہ کہتی ہوئی وہ باورچی خانہ گئی اور کھانا لاکر میز پر رکھ دیا۔ اور میرے پاس بیٹھ گئی۔

"اگنیس" میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا "کیا یہاں کوئی رپورٹر آیا تھا"

"ہاں ان کی ایک بڑی جماعت"

"کیا تم نے ان سے کچھ کہا"

"میں ان سے کیا کہہ سکتی۔ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتی تھی"

"اور بھی اس کے متعلق تم سے کچھ ہی زیادہ جانتا ہوں میں ایمانداری سے کہتا ہوں اگنیس تم کو مجھ سے اس کیلئے نفرت نہ کرنا چاہئیے"

"تم سے نفرت ہے میں تم سے نفرت کیوں کروں اس میں تمہاری کوئی خطا نہیں" میں نے اس کو تشکر بھری نظروں سے دیکھا۔ اس نے ایک اخبار اٹھایا جس میں میری تصویر تھی اور میری تصویر کو گھورنے لگی۔ کیا تم جانتے ہو پیارے تم بہت خوبصورت ہو" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "میں اچھی طرح سمجھ گئی کہ وہ لڑکی تم سے کیوں محبت کرتی تھی اور تمہاری الفت کا دم بھرتی تھی"۔ اس وقت سے ہمارے اور میری بیوی کے درمیان جو پردہ حائل تھا۔ وہ دور ہو گیا اور یہ بخت کی رسوائی بجائے آفت جان ہونے کے میرے لئے بڑی نعمت ثابت ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ صرف اس واقعہ کی وجہ سے میں دوبارہ اپنی بیوی کے دل میں جگہ پا سکا۔

——— ترجمہ

تقاضائے تجدید

نظم

از حضرت امین حزیں سیالکوٹی

رواں ہے قافلہ دشتِ بلا میں — تلاشِ چشمۂ آبِ بقا میں
اندھیرا چار سو چھایا ہوا ہے — سیاہی نے غضب ڈھایا ہوا ہے
چھپے ہیں بادلوں میں چاند تارے — کسی حد تک جو رہبر تھے ہمارے
حقیقت اک فسانہ بن گئی ہے — فسادوں کا بہانہ بن گئی ہے
سمندِ عقل کی جولانیاں ہیں — تخیّل کی جنوں سامانیاں ہیں
کسی کو جب نہ منزل کا پتہ ہو — رہِ منزل کی پھر تعیین کیا ہو
کہیں کو منہ اُٹھائے جا رہے ہیں — اور اکثر منہ کی کھائے جا رہے ہیں
سفر افتاں و خیزاں کٹ رہا ہے — جگر بے دم ہوا ہے پھٹ رہا ہے

سحر ہے بھی کہیں اس شب کی یارب!
مسلّط ہم پہ ہے یہ کب کی یارب!

قسم تیرے محمد مصطفےٰ کی — ضرورت ہے ہمیں صدق و صفا کی
ریا کی ہے جہاں میں حکمرانی — اجیرن ہو رہی ہے زندگانی
مٹا ہے دہر سے اخلاص کا نام — نہیں دنیا کو اب اخلاص سے کام
زباں دانی "خدا دانی" بنی ہے — ہوا بازی "سلیمانی" بنی ہے
ہوس رانی سے اندھے ہو رہے ہیں — ہمہ دانی سے اندھے ہو رہے ہیں

جوانی میں حیا باقی نہیں ہے ‏ ‏ ذرا خوفِ خُدا باقی نہیں ہے
بہیمیت کی پوجا ہو رہی ہے ‏ ‏ شرافت منہ چھپائے رو رہی ہے
جسے دیکھو وہی مسحُورِ زر ہے ‏ ‏ زمانے کا زمانہ بدگہر ہے

اندھیرا چار سُو چھایا ہُوا ہے
الٰہی! مہر گہنایا ہُوا ہے

خضر کوئی کہیں سے بھیج یارب ‏ ‏ ضیا عرش بریں سے بھیج یارب
جو اِن تاریکیوں کو دُور کر دے ‏ ‏ اندھیری رات کو کافور کر دے
مٹا دے تفرقہ پردازیوں کو ‏ ‏ بنا دے رشکِ رومی رازیوں کو
جو بخشے دیدۂ صدیقؓ ہمکو ‏ ‏ جو دے تصدیق کی توفیق ہمکو
عمرؓ کی حق نوازی کا سبق دے ‏ ‏ ہمیں جو بے نیازی کا سبق دے
جو عثمانؓ غنی ایسا غنا دے ‏ ‏ ہمیں جو جرأتِ شیرِ خداؓ دے

دل و گردہ ہمیں حسنینؓ کا دے
شغف عشقِ شہِ کونین کا دے

رفتار زمانہ

عالمگیر واقعات پر ماہانہ تبصرہ

از شبلی بی کام

بلقان کی تقسیم

اس مہینہ جنگ کا رُخ زیادہ تر بلقان کی طرف رہا کیونکہ ہٹلر کو دوبارہ انگلستان کو پچھاڑ کر جزیرہ برطانیہ پر قبضہ کرنے میں کامیابی ہوئی۔ اور نہ افریقہ میں مسولینی کی تمنائیں پوری ہو سکیں۔ اس لئے اب یہ دونوں ڈکٹیٹر انگریزی فنکی تو یہ جنگ کے لئے بعض دوسرے موریوں کی طرف منتقل کرنے کی فکر میں ہیں۔ قارئین سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ روس۔ جرمنی اور اٹلی کی حریصانہ نگاہیں عرصہ دراز سے ریاستہائے بلقان سے سرسبز و شاداب میدانوں کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف جرمنی چاہتا تھا کہ رومانیہ اور بلغاریہ کی حدود پھاند کر بحیرہ اسود کے مغربی ساحل تک پہنچ جائے۔ دوسری طرف اطالیہ یونان کو پامال کر کے ترکی کے در پر مسلط ہونے کا متمنی تھا۔ اور تیسری طرف روس کی مرضی تھی کہ درہ دانیال اور درہ باسفورس کے رستہ سے گذر کر بحیرۂ روم بحرہ ہند اور خلیج فارس کی موجوں پر اپنا بیڑا اُتار لے۔

چنانچہ موجودہ جنگ میں اس پروگرام کو ان تینوں ملکوں نے عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے رومانیہ کی چیر پھاڑ کر کے اُس کی رہی سہی قوت کو ختم کیا۔ پھر جرمنی اپنی فوجیں لیکر اُس کے سینہ پر چڑھ بیٹھا۔ اور اب بحیرہ اسود کے مغربی ساحل پر پہنچ کر مزید پیش قدمیوں کے لئے استحکامات میں مصروف ہے اس غاصبانہ پیش قدمی سے اطالیہ کو بھی موقع مل گیا ہے۔ کہ وہ یونان۔ شام۔ فلسطین۔ سعودی عرب اور بحرین میں اپنے قدم جمانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ اس کے بمبار طیارے ان ممالک پر منڈلا رہے ہیں! اور اگر برطانیہ کی مزاحمت کو وہ ناکام بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ تو مشرقی بحیرۂ روم پر اٹلی کا قبضہ بھی ہو جائے گا پریذیڈنٹ روزویلٹ کے الفاظ میں یورپی ڈکٹیٹروں کی پالیسی یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ وہ مختلف ممالک میں پھوٹ ڈال کر اُن پر قابض ہو جائیں۔ چنانچہ روس۔ جرمنی اور اٹلی ریاستہائے بلقان کے اتحاد و اتفاق کی سد سکندری کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اب ان پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یوگوسلافیہ۔ بلغاریہ اور ترکی اُن کے رستہ میں سب سے بڑی روک تھے۔ اُن میں سے یوگوسلافیہ کے ساتھ جرمنی نے ایک تجارتی معاہدہ کر لیا ہے جس کی رُو سے جرمنی یوگوسلافیہ کے ترجیحی سلوک تو نہ کرے گا۔ البتہ محصولات کے تعین میں اس کا پورا پورا خیال رکھے گا یہ معاہدہ صرف تجارتی نہیں بلکہ جیسا کہ یوگوسلافیہ کے وزیر خارجہ نے کہا۔ اس کی ایک سیاسی نوعیت بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس معاہدہ کے بعد جرمنی اور یوگوسلافیہ کے درمیان جنگ کا کوئی احتمال نہیں رہا۔ دوسرے الفاظ میں جرمنی نے یوگوسلانیہ کے گلے میں تاریخ کی غلامی کا طوق پوری طرح سے ڈال دیا ہے۔ اور اب ان ممالک کی خارجہ سیاست مشترک ہو گی

رومانیہ اور یوگوسلانیہ کی روک دور کرنے کے بعد یقین کیا جاتا ہے۔ کہ اب بلغاریہ کو اکسایا جائے گا۔ کہ وہ یونان اور یوگوسلانیہ کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرے اور ظاہر ہے کہ ان مطالبات کو منوانے کے لئے نازی اور فاشستی ڈنڈا ہر طرح سے مصروف عمل رہے گا۔ اگر بلغاریہ ڈکٹیٹروں کے پھندے میں آگیا تو یونان، ترکی اور اُس کے بعد مشرقی بحیرۂ روم۔ نہر سویز اور ممالک عربیہ کا مستقبل جس قدر تشویشناک ہو جائے گا۔ وہ محتاج تصریح نہیں یونان اور البانیہ کی سرحد کو اطالوی فوجیں عبور کر چکی ہیں۔ سعودی عرب اور بحرین کی غیر جانبداری کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے۔ اطالوی طیاروں نے اُن پر گولے بھی برسائے ہیں اس لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ بلقان اور ممالک عربیہ کا مستقبل بہت زیادہ خطرے میں ہے۔ لیکن چونکہ اس حصہ ارضی میں دفاعی انتظامات بھی کافی مستحکم ہیں۔ اور ترکی نہ صرف اپنی بلکہ ان ممالک کی حفاظت کا بھی اعلان کر چکا ہے۔ اس لئے اٹلی اور جرمنی کا اپنے مقاصد میں کامیاب ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔

فرانس اور اسپین پر ڈورے

جرمنی اور اطالیہ کی اس جنگ میں

———

عورت کا سینہ

عورت کا سینہ (یعنی پستان) بہت بدنما ہو کر نیچے کو ڈھلک جاتے ہیں اور ان میں ڈھیلا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں مشہور دوا "البریسٹین" کا استعمال کرنا چاہیئے پستان اپنی اصلی حالت پر آ کر گول اور سخت ہو جائیں گے اور عورت از سر نو جوان معلوم ہوں۔ بیحد قیمتی دوا ہے۔ اور بہت جلد اثر کرنے والی ہے اس دوا کے استعمال سے دودھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یعنی کو دودھ پینے والا بچہ برابر دودھ پی سکتا ہے۔ ایک شیشی بریسٹین کی قیمت چار روپے پندرہ آنے ہے اور محصولڈاک اس پر سات آنے لگتا ہے۔

منگانے کا پتہ

جنرل مینیجر زنانہ دواخانہ اے۔ پی نمبر ۲۴ دہلی

آپ کو دمہ کا مرض ہے

مگر آپ ناحق تکلیف اٹھا رہے ہیں کیا آپ کو معلوم نہیں کہ دوا سانسول نے ہزاروں مریضوں کو تندرست کر دیا۔ دمہ کا دورہ سانس کی پریشان کن تکلیف اور بلغم اور کھانسی کی زیادتی سے آپ کو یہ دوا بہت جلد چھٹکارا دلا سکتی ہے اس دوا کے ہزاروں سارٹیفکیٹ ہمارے پاس موجود ہیں۔ اور ملک میں سالہاسال سے ڈاکٹر اور طبیب دمہ کے مریضوں کو اکثر یہی دوا استعمال کرا کے مکمل تندرست کر دیتے ہیں ایک شیشی سانسول کی قیمت صرف ایک روپیہ چھ آنے ہے اور اس پر محصولڈاک سات آنے لگتا ہے۔ تین شیشی ایک ساتھ منگانے پر محصولڈاک معاف

جنرل مینیجر زنانہ دواخانہ اے۔ پی نمبر ۲۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھ کر بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لیجیئے۔ اور ترکیب مطابق استعمال کیجیئے دمہ کا مرض اس دوا کے استعمال سے دیکھتے دیکھتے ختم ہو جاتا ہے

---

(۲) دو روپے میں فوٹو کیمرہ

ہزاروں آدمی یہ فوٹو کیمرہ خرید کر چکے ہیں۔ اتنا سستا اور ایسا کارآمد فوٹو کیمرہ صرف دو روپے میں فروخت ہو رہا ہے۔ یہ انتہائی حیرت کی بات ہے ہر قسم کی تصویر جب چاہو لو۔ گھر میں بچوں کے بڑوں کے جیسے چاہو فوٹو خود اتار لو۔ ترکیب استعمال بے حد آسان ہے۔ سیکھنے کی ضرورت ہی نہیں اس کیمرے کے ہندوستان میں آنے کے بعد بڑی قیمتوں کے فوٹو کیمرے بکنے یقیناً کم ہو جائیں گے اگر آپ کو فوٹو لینے کا شوق ہو تو

مینیجر کامیاب بکڈپو اے۔ پی نمبر ۲ دہلی

کو ایک خط لکھ کر فوٹو کیمرہ بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لیجیئے۔ کیمرہ کیساتھ فلم کا ڈبہ فوٹو دھونے کا مسالہ اور ترکیب استعمال وغیرہ سب کچھ مفت ملتا ہے یعنی یہ کیمرہ مکمل روانہ کیا جاتا ہے قیمت مکمل کیمرہ (۲) دو روپے محصول ڈاک سات آنے لگتا ہے۔

(دو فوٹو کیمرے ایکساتھ خریدنے پر محصول ڈاک معاف کر دیا جاتا ہے)

سفید بال سیاہ ہو گئے

ہندوستان کے متعدد ڈاکٹر حیران ہیں کہ ایک ہندوستانی نے عجیب غریب خضاب ایجاد کر دیا جس سے سفید بال ایک ہفتہ میں سیاہ ہو جاتے ہیں۔ یہ خضاب لگایا نہیں جاتا کھایا جاتا ہے یعنی کھانے کی دوا ہے اس کے استعمال سے سر اور داڑھی کے بال بھی رفتہ رفتہ کالے ہوتے جن لوگوں نے ابھی تک اس حیرت انگیز دوا سے فائدہ نہیں اٹھایا وہ فورا کر دیکھیں صرف ایک ہفتہ کے استعمال کے بعد اس دوا کا ثبوت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے یعنی جو بال اب تک سفید ہو گئے ہیں ان کی جڑیں بھی سیاہ ہو جائیں گی۔ اور آئندہ سے بال سیاہ پیدا ہوں گے ہندوستان کے ہزاروں مرد اور عورتیں اس عجیب ایجاد سے فائدہ اٹھا چکے ہیں ہر جگہ اس دوا نے زندہ ثبوت پیش کیا ہے۔ اس دوا کا نام کیشول ہے ایک شیشی میں پورا کورس دوا ہوتی ہے۔ قیمت فی شیشی چار روپے محصول ڈاک گیارہ آنے جن لوگوں کو ضرورت ہو وہ آج ہی

مینیجر صاحب زنانہ دواخانہ اے۔ پی نمبر ۲۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھ کر کیشول کی ایک شیشی بذریعہ وی پی پارسل منگا لیں

آیندہ کامیابی کا انحصار بحیرۂ روم پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں ممالک جبل الطارق سے نہر سویز تک بحیرۂ روم کو اپنے قبضہ میں لانے کے لئے سر توڑ کوششیں کر رہے ہیں۔ اور اگر ایک طرف بلقان کے اتحاد و اتفاق کی زنجیر توڑنے میں مصروف ہیں تو دوسری طرف اسپین اور فرانس سے سلسلۂ جنبانی کر رہے ہیں۔ گذشتہ مہینے ہر فان ربن ٹراپ نے سائنر سونر کو برلین میں طلب کیا تھا۔ لیکن غالباً جرمنی کا جادو نہ چل سکا اس لئے اب ہٹلر بنفس نفیس جنرل فرانکو سے اسپین و فرانس کی سرحد پر ملاقات کرنے کے لئے گیا اور لگے ہاتھوں مارشل پتیان سے بھی مل آیا۔ طرفین میں کیا گفت و شنید ہوئی۔ ابھی اس راز سے پردہ نہیں اٹھ سکا۔ تاہم قیاس کیا جاتا ہے کہ ہٹلر ایک طرف اسپین کو جنگ میں کود نے پر مجبور کرنا چاہتا ہے تو دوسری طرف مارشل پتیان سے مطالبہ کر رہا ہے کہ وہ فرانس کی طرف سے برطانیہ کے خلاف باقاعدہ جنگ کر دے اور اپنے جملہ وسائل و ذرائع بھی جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہٹلر کے سپرد کر دے چنانچہ ایک غیر مصدقہ اطلاع منظر ہے کہ محوری طاقتوں نے پتیان گورنمنٹ سے حسب ذیل مطالبات کئے۔

(۱) السیس لورین کا علاقہ جرمنی کو اور نائس اٹلی کے حوالہ کر دیا جائے۔

(۲) ٹیونس کو فرانس اور اٹلی کے درمیان تقسیم کر دیا جائے اور الجزائر فرانسی ہی رہے۔

(۳) مراکش کا شمالی حصہ اسپین کو دے دیا جائے۔

(۴) افریقہ کی بقیہ نوآبادیوں پر فرانس، جرمنی اور اٹلی کی مشترکہ حکومت ہو۔

(۵) فرانسی ہندچینی جاپان کے حوالہ کر دیا جائے

(۶) بحیرہ روم کا تمام فرانسیسی بیڑا جو اس وقت شمالی افریقہ کی بندرگاہوں میں ہے۔ محوری طاقتوں کے لئے وقف کر دیا جائے

(۷) اگر ان شرائط کو فرانس منظور کرے تو رود بار کے مشرقی ساحل کے سوا جرمنی تمام مقبوضہ فرانس سے اپنی فوجیں واپس بلا لے گا۔

ابھی معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ ان شرائط پر مارشل پتیان کس حد تک "ہاں" کہے گا۔ تاہم یہ ظاہر ہے۔ کہ جب تک اٹلی اور جرمنی کی تلوار سر پر لٹک رہی ہے وہ چون و چرا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا باقی رہا جنرل فرانکو تو وہ اسپین کی فتح کے لئے اٹلی اور جرمنی کا بہت حد تک ممنون ہے۔ تاہم چونکہ اسپین کی اقتصادی حالت ابھی تک سدھر نہیں سکی۔ اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ بلا سمجھے سوچے کس حد تک ہٹلر اور مسولینی کی امداد پر کمربستہ ہو جائے گا؟

مشرق بعید

برما روڈ جو اینگلو جاپانی معاہدہ کے مطابق گذشتہ تین ماہ سے بند تھی۔ مسٹر چرچل کے اعلان کے مطابق ۷، ۱ اکتوبر کو دوبارہ کھول دی گئی۔ جاپان اگرچہ برطانیہ کے اس فیصلہ پر چین بجبیں ہو رہا ہے۔ تاہم اس نے دھمکی دی ہے کہ وہ اس سڑک پر بمباری کر کے فرانسیسی ہندچینی کو بالکل پامال کر دے گا۔ چنانچہ اس کے بمبار طیارے کونمنگ کی خوبصورت آبادی پر منڈلا رہے ہیں۔ اور وہ چاہتا ہے کہ فرانسی ہندچینی کو پامال کر کے ینان کی پہاڑیوں پر چڑھ جائے۔ جہاں چینی بہادر سپاہیوں کو شکست دے کر وہ چین کے تابوت میں آخری میخ گاڑنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تین ماہ تک سڑک چونکہ بند رہی۔ اس لئے چین کو غیر ممالک سے اسلحہ درآمد کرنے کا موقع نہ مل سکا اور اب وہ محسوس کر رہا ہے۔ کہ وہ نہ صرف پہلے کی بہ نسبت کمزور ہو چکا ہے بلکہ روم۔ برلین۔ ٹوکیو اتحاد کی وجہ سے اس کے دشمن کی طاقت میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ تاہم چین کو خوفزدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ روم و برلین تجارتی و عسکری لحاظ سے موجودہ صورتِ حال میں جاپان کی کوئی امداد نہیں کر سکتے یہ ممالک یورپ اور افریقہ کے میدان جنگ میں اتنے مصروف ہیں کہ ان کے مشرق بعید کی طرف آنے کا امکان نہیں ہے۔ دوسرے اس معاہدہ سے برافروختہ ہو کر چونکہ امریکہ و برطانیہ نے جاپان سے اپنے تجارتی تعلقات منقطع کر لئے ہیں۔ اس لئے اقتصادی لحاظ سے جاپان کے مضبوط ہونے کا بھی کوئی امکان نہیں ہے۔ جاپان ایشیا میں ایک "نئے نظام" کے قیام کا تمنائی ہے۔ اس لئے وہ امریکہ کے مقبوضات کی طرف بھی حریصانہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے لیکن امریکہ یہ ہرگز برداشت نہ کر سکے گا۔ کہ بحرالکاہل کے امریکی مفاد پر کوئی دوسری طاقت دست درازی کرے۔ اس لئے اگر جاپان نے

زیادہ ہلچل کی تو امریکہ کا بحری بیڑا یقیناً اس کا سر کچلنے کے لئے ٹوکیو کے دروازے پر آ پہنچے گا۔ جہاں تک برطانوی مقبوضات کا تعلق ہے وہ اپنے استحکامات مکمل کر رہے ہیں اور یہ حالت میں جمہوری ممالک کا ساتھ دینے پر آمادہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جاپان نے ولندیزی جزائر شرق الہند سے تجارتی معاہدہ کر لیا ہے۔ لیکن اول تو اس معاہدے سے جاپان کی قوت میں چنداں اضافہ نہیں ہو سکا۔ اور اگر ہو بھی تو یہ ضروری نہیں کہ بٹاویہ کے مفاد جاپان کی اغراض سے ہم آہنگ ہوں۔ جاپان کی دست درازی سے ہندوستان کو بھی کافی سے زیادہ خطرہ ہے۔ اس سلسلہ میں یہ خبر بہت خوشی سے سنی گئی کہ ہندوستان نے جاپان کو کچا لوہا نہ بھیجنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس سے نہ صرف جاپان کو تجارتی نقصان پہونچے گا۔ بلکہ اُسے ہندوستان کی ناراضی کا بھی کافی سے زیادہ احساس ہو جائے گا۔

سیام وفرانسیسی ہند چینی کے سرحدی تنازع کا ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ اور سیام (تھائی لینڈ) نے فرانسیسی ہند چینی کو متنبہ کر دیا ہے۔ کہ اگر اُس کے مطالبات کو منظور نہ کیا گیا تو وہ اُس پر فوج کشی کرے گا۔

سیاسیات ہند

جب سے جنگ کی بجلی کڑکی ہے۔ کانگرس کی حالت اُس یورپین لڑکی کی طرح رہی ہے۔ جو شادی کی تجویز پر یہ فیصلہ نہیں کر سکتی کہ "ہاں" کہے "یا نہیں" وہ نہ تو انگریز کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوتی تھی۔ اور نہ اُسے اتنی ہمت تھی کہ کھلے بندوں جنگ کی مخالفت کر سکے۔ اسی گومگو کی حالت میں پورا ایک سال گزر گیا۔ اور اُس کا طرز عمل پُر اسرار سے پُر اسرار ہوتا چلا گیا۔ کبھی وہ گاندھی جی کو "اہنسا" اور "شانتی" کا دیوتا مان کر اپنا حاکم مطلق بنا لیتی۔ اور کبھی عدم تشدد کے عقیدہ سے بیزار ہو کر عمل و جہاد میں کودنے کا فیصلہ کر لیتی آخر گاندھی جی کی جادوگری کامیاب ہوئی اور انہوں نے کانگرس کو اپنے ڈھب پر لا کر ایک مضحکہ خیز "سول نافرمانی" کا اعلان کر دیا جس کا مقصد یہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ چونکہ وائسرائے ہند نے کانگرس کے مزعومہ مطالبات پر صاد نہیں کیا۔ اس لئے جنگ کے برطانوی مقاصد کے خلاف تقریریں کر کے حکومت کو پریشان کیا

جائے۔ گاندھی جی کے "فرمان واجب الاذعان" کے مطابق یہ سول نافرمانی فی الحال محدود اور انفرادی رہے گی۔ چنانچہ سب سے پہلے مسٹر ونوبا بھاوے کو جو سیاسیات کی دنیا میں بالکل اجنبی اور غیر معروف ہیں قربانی کا بکرا بنایا گیا۔ ونوبا جی نے دو دن تک تو اپنے غیر عسکری دوستوں کے سامنے مقاصد جنگ کے خلاف تقریریں کیں لیکن حکومت نے انہیں درخور اعتنا نہ سمجھا۔ آخر تیسرے دن وہ قانونی وفاع ہند کے ماتحت دھر لئے گئے اور اس وقت ناگپور کے جیل میں نظر بند ہیں۔ یہ سول نافرمانی نہ تو اصول کے لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ اور نہ عملی طور پر اس سے کسی ٹھوس فائدے کی توقع ہو سکتی ہے۔ اصولی لحاظ سے یہ امر قابل غور ہے کہ فرض کیجئے ہندوستان میں کانگرسی حکومت ہوتی ہے اور اس پر کوئی غنیم چڑھ آتا تو کیا کانگرس یہ برداشت کر سکتی کہ ملک میں بعض ایسے لوگ بھی پیدا ہو جائیں۔ جو غنیم کا مقابلہ کرنے کے رستہ میں روڑے اٹکائیں؟ اگر نہیں تو موجودہ صورت حال میں وہ برطانیہ کی مخالفت کیوں کرتی ہے؟ کانگرس تو یہ بھی برداشت نہیں کر سکتی کہ مسٹر ایم این رائے۔ یا مسٹر کھارے یا مسٹر ناریمان پبلک پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر کانگرس کے ناواجب طرز عمل پر معقول نکتہ چینی کریں۔ چہ جائیکہ وہ اپنی خارجہ سیاست میں کسی غیر معقول مخالفت کا تصور بھی کر سکے۔ پس موجودہ سول نافرمانی خود کانگرس کے گذشتہ طرز عمل کے صریح خلاف ہے۔ پھر عملی طور پر بھی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ کہ اس سول نافرمانی سے کوئی خوشگوار نتیجہ برآمد ہوگا کیونکہ انفرادی حرکتیں حکومت کے ایوان اقتدار کو ہرگز متزلزل نہیں کر سکتیں۔ اگر انفرادی حرکتوں سے کوئی نتیجہ مرتب ہو سکتا تو ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۱ء تک تمام سیاسی تحریکوں میں اجتماعی جوش وخروش پیدا کرنے کی ضرورت نہ ہوتی اس کے علاوہ جن لوگوں نے یہ سول نافرمانی شروع کی ہے وہ نہ تو قومی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ انہیں قومی جماعتوں پر کسی اثر و رسوخ کا دعویٰ ہو سکتا ہے۔ اس لئے اُن کی آواز "صدا بصحرا" سے زیادہ ثابت نہ ہوگی۔ اور حکومت کو چاہیئے کہ وہ اس بے معنی اور بے اثر تحریک کو دبانے کی کوشش میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کرے۔

(باقی بر صفحہ ۷۲)

پیشاب کے بعد سفید قطرہ

اگر پیشاب کرنے کے بعد یا پیشاب سے پہلے سفید رنگ کا پانی خارج ہوتا ہو تو یہ بہت خطرناک بات ہے اسے جریان کی بیماری کہتے ہیں رفتہ رفتہ یہ مرض بڑھ جاتا ہے۔ تو پھر آدمی شادی کے مطلب کا نہیں رہتا اس کی قوت مردمی ختم ہو جاتی ہے۔ اس واسطے جن مردوں کو یہ شکایت ہو یعنی پیشاب کرنے سے پہلے یا پیشاب کے بعد یا بیوی کے قریب جانے سے پیشتر ہی سفید رنگ کی رطوبت خارج ہو جائے۔ یا رات کو سوتے میں احتلام ہو جائے (یعنی خواب ہو جائے) تو اس خطرناک مرض سے غفلت نہ کرنی چاہیئے۔ ورنہ ایک دن زندگی کا خاتمہ کر دے گا۔

جریان کا مرض صرف ایک ہفتہ میں ختم کیا جا سکتا ہے۔

اور صرف ساڑھے تین روپے خرچ ہوں گے۔ دہلی کے مشہور زنانہ دواخانہ کی تیار کردہ دوا جواہر اعظم اس مرض کے لئے اکسیر کا کام کرتی ہے صرف ایک شیشی جواہر اعظم سے بڑے بڑے پرانے مریضوں کو تندرستی ہوگئی ۱۹۲۸ء کے انعامی مقابلہ میں بھی یہ دوا سرتاج رہی اور یقین کیا گیا کہ جواہر اعظم جریان کے مرض کا بہترین علاج ہے چنانچہ اس وقت سے آج تک اس دوا پر محصول ڈاک معاف ہے۔ جن لوگوں کو ضرورت ہو وہ

جنرل مینیجر زنانہ دواخانہ اے بی نمبر ۲۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھ کر جواہر اعظم کی ایک شیشی بذریعہ وی۔ پی منگائیں۔ ایک شیشی کی قیمت تین روپے آٹھ آنے ہے (۳؍۸) پارسل کا محصول کسی ہندوستانی خریدار سے نہیں لیا جاتا۔

سوزاک کے مریض ختم

اندازہ کیا جا رہا ہے۔ اگر دوا "گلوزول" اسی طرح سوزاک کے مریضوں کو تندرست کرتی رہی۔ تو بہت جلد وہ وقت آ رہا ہے کہ جب ہندوستان بھر میں سوزاک کا مریض نہ مل سکیگا۔ سوزاک نیا ہو یا پرانا ہر حالت میں صرف ایک شیشی دوا "گلوزول" سوزاک کے مرض کا پوری طرح خاتمہ کر کے مریض کو بالکل تندرست اور جوان بنا دیتی ہے۔ یعنی آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی سوزاک کے مریض نے دوا "گلوزول" استعمال کی ہو۔ اور اسے فائدہ نہ پہنچا ہو کیونکہ یہ دوا ہندوستانی آب و ہوا کے لحاظ سے بہت مجرب ثابت ہوئی ہے۔ لوگ اسے جادو کی دوا کہنے لگے ہیں۔ پس جو لوگ سوزاک کے مریض ہوں انہیں چاہیئے کہ وہ

جنرل مینیجر زنانہ دواخانہ اے بی نمبر ۲۴ دہلی

کو خط لکھ کر ایک شیشی دوا گلوزول بذریعہ وی۔ پی پارسل طلب کریں استعمال کرنیکی تمام ہدایات دوا کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ایک شیشی دوا گلوزول کی قیمت صرف دو روپے نو آنے ہے اور محصول ڈاک سات آنے لگتا ہے۔

عورت کو حمل سے بچاؤ

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے۔ کہ بچوں کی اکثریت سے مرد پریشان ہو جاتا ہے۔ یا عورت کی تندرستی زیادہ بچے پیدا کرنے سے خراب ہو جاتی ہے تو ایسی حالت میں عورت کو چاہیئے۔ کہ کچھ عرصہ کے لئے اولاد کا پیدا کرنا بند کر دے تاکہ اس کی تندرستی پھر ٹھیک ہو جائے اس کی ترکیب یہ ہے کہ ایک شیشی دوا "زوحمل" منگا کر عورت اپنے پاس رکھ لے اور خاص وقت سے پہلے دوا اس دوا کی ایک خوراک کھا لے حمل نہ ٹھہر سکے گا چنانچہ جب تک یہ عمل رہیگا عورت کو حمل نہ ٹھہر سکیگا اور جب اس دوا کا استعمال ترک کر دیگی حمل ٹھہر جانا ممکن ہے اس دوا سے عورت کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا ایک شیشی میں سے کئی مرتبہ استعمال کے لائق دوا ہوتی ہے اسکی قیمت چار روپے آٹھ آنے ہے اور محصول ڈاک گیارہ آنے لگتا ہے۔ اگر کسی کو ضرورت ہو تو وہ مصیبت ہے

مینیجر زنانہ دواخانہ اے بی نمبر ۲۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھ کر بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا کر اپنے پاس رکھ لیں۔

صوبہ سندھ میں قتل و جرم کی وارداتوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ بمبئی اور سندھ کے غیر مسلم سیاست دان گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے ہیں۔ کہ سندھ میں اصلاحات کا تجربہ ناکام رہا ہے۔ در اصل سندھ کی بدامنی اور بے نظمی میں ان لوگوں کا سازشی ہاتھ کام کر رہا ہے۔ جو سندھ میں مسلم اکثریت کے حاکمانہ عروج سے انگاروں پر لوٹ رہے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ انتظامی اعتبار سے سندھ کو اس درجہ ناکارہ ثابت کیا جائے۔ کہ حکومت اس صوبہ سے اپنی اصلاحات کو واپس لینے پر مجبور ہو۔ اور اس کی قسمت کو بمبئی کے دامن سے دوبارہ وابستہ کر دیا جائے۔ سندھ پراونشل مسلم لیگ نے فسادات سندھ کی تحقیق کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس کی رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس رپورٹ کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سکھر کے فسادات اور سندھ کی ابتری کی ذمہ داری

کانگرس اور ہندو مہاسبھا کے اس متعصب عنصر پر ہے جو بمبئی کے سرمایہ داروں کی انگیخت پر سندھ کے مسلمانوں کا قافیہ تنگ کرنے کا عزم بالجزم کر چکا ہے۔ گاندھی جی نے پراونشل مسلم لیگ کو یقین دلایا ہے کہ وہ سندھ میں امن و امان قائم کرنے کے لئے اسکا ہاتھ بٹانے کو ہر طرح سے تیار ہیں۔ خدا کرے کہ سندھ کا فہیم طبقہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنے کے اہل ہو سکے۔ اور اس صوبہ میں امن و اتحاد کی داغ بیل ڈالنے کے لئے کوئی موثر قدم اٹھائے۔

جنگ ہندوستان کے دروازے پر پہنچ چکی ہے ایک طرف بحرالکاہل کی ہنگامہ طرازیوں سے خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ خلیج بنگالہ اور برما کے رستہ سے جاپان ہندوستان کی سیاسیات میں مداخلت کی کوشش کرے گا۔ تو دوسری طرف جبر ہند کا مستقبل اٹلی۔ روس اور جرمنی کی دست درازیوں

حقائق و معارف

ہٹلر نے مہذب دنیا کی نہ صرف متحارب آبادی کو آگ اور خون کے دریا میں غوطے کھانے پر مجبور کیا ہے بلکہ اس کی غیر مصافی آبادی کو بھی ہولناک اقتصادی مصائب کے جنگل میں گرفتار کرا دیا ہے۔ چنانچہ میدان جنگ میں نہ صرف انسانی خون کی ارزانی ہے بلکہ روپیہ بھی پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ چند ماہ ہوئے سر جان سائمن (وزیر مالیات برطانیہ) نے اعلان کیا تھا کہ جنگ پر ساٹھ لاکھ پونڈ یا قریباً ۸ کروڑ روپے روزانہ خرچ آ رہا ہے۔ اب وائسرائے ہند نے سامان جنگ کے مصارف کی تفصیل بہم پہنچائی ہے جس کے مطالعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ موجودہ جنگ تہذیب یافتہ دنیا کو کتنی مہنگی پڑے گی اور اس کے اقتصادی اثرات کتنے مہیب اور خوفناک ہونگے؟

فوج کا سالانہ خرچ (لاکھ میں)

انڈین کیولری رجمنٹ (مسلح)	۱۰٫۵۰	روپیہ سالانہ
انڈین کیولری رجمنٹ (جس میں گھوڑے ہیں)	۷٫۵۰	" "
انڈین انفنٹری بٹالین	۶٫۵۰	" "
طیارہ شکن بیٹری ۳٫۷ انچ (۸ توپوں والی)	۶٫۰۰۰	" "
فیلڈ بیٹری۔ آر۔ اے (نئی تیار کردہ)	۸٫۷۰	" "
میڈیم بیٹری آر۔ اے	۵٫۵۰	" "
ماؤنٹین بیٹری	۲٫۵۰	" "
سیکشن آر۔ آئی۔ اے۔ ایس۔ سی (موٹر ٹرانسپورٹ):۔	۱٫۴۰	" "
پلٹن آر۔ آئی۔ اے۔ ایس۔ سی (اینیمل ٹرانسپورٹ):۔	۶۰	" "
فیلڈ ایمبولینس	۲٫۰۶	" "
سیکشن ایمبولینس (موٹر ٹرانسپورٹ)	۰٫۱۵	"

بعض سازو سامان کی ابتدائی قیمت۔

کروزنڈ ٹینک	۱۸۶۳۰۰	روپیہ
انفنٹری ٹینک	۱۸۶۳۰۰	"

جنگ کے مصارف

از:۔ ادارہ

لائٹ ٹینک (پورے ہتھیاروں سے مسلح)	۶۰۰۰۰	روپیہ
آرمرڈ کیریر (" " ")	۱۲۰۰۰	"
ٹن ۳/۴ ۲ ٹن کی لاری	۶۲۴۰	"
۳۰ کلو واٹ کی لاری	۴۹۰۰	"
۱۵ کلو واٹ کی ٹھیلہ گاڑی	۴۱۲۰	"
موٹر ایمبولینس	۴۰۰۰	"
چار نشست والی موٹر کار	۴۰۰۰	"
دو " " "	۳۰۰۰	"
موٹر سائیکل	۱۱۳۰	"
طیارہ شکن ۳٫۷ انچ والی توپ (حرکت کرنے والی)	۲۷۵۰۰۰	"
۶- انچ دہانے والی توپ اور گاڑی	۴۳۰۰۰	"
۴٫۵ انچ دہانے والی توپ اور گاڑی	۳۰۰۰۰	"
۳٫۷ " " " "	۲۳۲۱۰	"
وائیکرز مشین گن	۱۸۰۰	"
۳- انچ والی چھوٹی توپ	۹۵۰	"
وائیکرز برتھیر توپ	۹۰۰	"
بوائیز اینٹی ٹینک رائفل	۷۰۰	"
سنگین والی رائفل	۱۰۰	"

مندرجہ ذیل کا ایک کل راونڈ:۔

۶- انچہ دہانے والی توپ کا گولہ بارود	۱۱۵	روپیہ
۴٫۵- انچ " " " " "	۵۰	"
۳٫۷ " " " " "	۴۰	"
۱۰۰۰ راونڈ ۳۰۳٫- انچہ ایس۔ اے۔ اے	۸۰	"

فضائی طاقت

بھاری بمبار ہوائی جہاز۔

۱- دستہ مع ریزرو	۴۵۰۰۰۰	روپیہ

کل ہوائی جہاز	۲۷۰۰۰۰	روپیہ

درمیانہ درجہ کے بمباز ہوائی جہاز:-

۱- دستہ مع ریزروز	۳۸۰۰۰۰۰	"
۱- کمل ہوائی جہاز	۱۹۸۰۰۰	"

لڑنے والے ہوائی جہاز:-

۱- دستہ مع ریزروز	۳۳۸۰۰۰۰	"
۱- کمل ہوائی جہاز	۱۴۰۰۰۰	"

بڑی فوج کے ساتھ تعاون کرنے والے ہوائی جہاز:-

۱- دستہ مع ریزروز	۲۲۳۳۰۰۰	"
۱- کمل ہوائی جہاز	۱۲۰۰۰۰	"
فضائی مشین گن	۱۲۵۰۰	"
فضائی بم (بہت کارآمد قسم کا)	۲۲۰	"

شاہی ہندوستانی بحری بیڑہ

ذیل میں شاہی ہندوستانی بحری بیڑہ کے بعض دستوں اور ساز و سامان کی لاگت درج کی جاتی ہے:---

۱-	ایکسورٹ جہاز	۵۵۰۰۰۰۰	روپیہ
۲-	مائن سویپنگ ٹرالر	۸۰۰۰۰۰	"
۳-	موٹر تارپیڈو کشتی	۶۰۰۰۰۰	"
۴-	سالویج ٹگ	۶۰۰۰۰۰	"
۵-	موٹر اینٹی سب میرین جہاز	۳۵۰۰۰۰	"
۶-	موٹر مائن سوئینگ جہاز	۳۰۰۰۰۰	"
۷-	موٹر پٹرول لانچ	۲۵۰۰۰۰	"
۸-	طیارہ شکن گولوں کے لئے میکنیکل ریکارڈ	۵۵۰۰۰	"
۹-	ایس-ڈبلیو-بی-۸ وائرلیس ٹرانسمیٹر	۵۰۰۰۰	"
۱۰-	گریڈ ہائی سپیڈ وائرلیس ٹرانسمیٹر	۲۵۰۰۰	"
۱۱-	ویسٹرن سیکیٹو وائرلیس اپنے لائیزر معاوسیلٹر	۲۰۰۰۰	"
۱۲-	طیارہ شکن لوئس گن کا ایک جوڑہ	۱۶۰۰۰	"
۱۳-	ہمیرلونڈ وائرلیس رلیسیور	۱۲۰۰۰	"
۱۴-	۶۵ء۰ انچ طیارہ شکن ملٹی پائل مشین گن	۳۰۰۰	"

اگر دشمن کے فوجی مصارف کا بھی تصور کیا جائے تو "کل نقصان" کا عدد اتنا طویل ہوگا کہ غالباً ایک ریاضی داں بھی اسے بیک نظر پڑھنے سے قاصر ہوگا ——!

رنگِ شفق

طبیعت اُن سی پھری تو خراب ہوکے پھری

علامہ شفق رضوی

اثر کو ساتھ لئے کامیاب ہو کے پھری
فلک سے میری دُعا مستجاب ہو کے پھری

خیال بن کے تصوّر کسی کا دل میں پھرا
کسی کی شکل نگاہوں میں خواب ہو کے پھری

صبا نے غنچوں کے بندِ نقاب کھول دیئے
چمن میں نکہتِ گل بے حجاب ہو کے پھری

جلایا مر کے زلیخا کو عشق صادق نے
بس انتہا ہے کہ پیری شباب ہو کے پھری

بھر آیا دل جو مری بیکسی پہ قاتل کا
گلے پہ تیغ رواں آب آب ہو کے پھری

دعائیں دیتی ہے تاثیر کو فغاں میری
کہ نا اُمید گئی کامیاب ہو کے پھری

یونہیں پھر آیا کئی بار میکدے جا کر
پھری جو شیخ کی نیت خراب ہو کے پھری

نہ تھا سراب سے کم دورِ ہستئ فانی
مری نگاہ میں دُنیا حباب ہو کے پھری

جلا لیا مجھے آ کر جو اُس مسیحا نے
اجل قریب سے ناکامیاب ہو کے پھری

قبول ہو گئی اس در پہ التجا میری
سوال بن کے گئی تھی جواب ہو کے پھری

شفق نہ بھولینگے ہم مصرعِ جنابِ وحید
"طبیعت اُن سی پھری تو خراب ہوکے پھری"

رقص شیطانی

جنگل کی دلگداز کہانی

از جناب سید اخلاق حسین صاحب رضوی

(۱)

شام ہو چلی تھی۔ تاریکی کی چادر اجالے پر سرعت سے پھیلتی جا رہی تھی۔ غریب کسان دن بھر کے تھکے ہارے اپنی اپنی جھونپڑیوں اور پھوس کی مڑیاں میں آکر لیٹ بیٹھ چکے تھے ایک مختصر سا گاؤں جس کو شہر کی چہل پہل اور دلفریبیوں سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا اپنی کس مپرسی کی حالت میں بھی قناعت کی چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ وہاں ایسے لوگ رہتے تھے جو غریب اور فاقہ کش تو ضرور تھے مگر سرمایہ داروں کے بے اطمینان قلب کی بےچینیوں سے بیگانہ، وہ اپنی قوت بازو پر مطمئن تھے اور ان کے دل اپنے پالنے والے کی محبت سے لبریز۔ دنیا میں سیکڑوں نشیب و فراز ہوں سلطنتیں بدل جائیں۔ حکمراں تبدیل ہوں انھیں اپنی روکھی سوکھی روٹی سے غرض اور اطمینان سے کام۔ گاؤں سے باہر تھوڑی دور پر دیوی کا مندر تھا جہاں وہ روز علی الصباح اپنے عقیدے کے مطابق ہار پھول چڑھاتے۔ منتیں مانتے آرزوؤں کا اظہار کرتے۔ عقیدت میں ہاتھ جوڑ کر جبین نیاز جھکاتے اور دیوی کے قدموں کی خاک، پھول اور سیندور اپنے ماتھوں سے لگا کر پچھلے قدم مودبانہ واپس لوٹ آتے یہ ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ دیوی ان کی تمنائیں بر لاتی۔ دیوی کی کرپا سے ان کی آرزوئیں پھلتیں پھولتیں اور دیوی ہی ان کے لئے سب کچھ تھی ان کی روزمرہ کی زندگی تغیر و تبدل سے ناآشنا تھی۔

آج اسی گاؤں کے قریب آموں کے باغ میں کچھ لوگ آکر ٹھہرے ان کی چھوٹی سی جماعت صرف تین افراد پر مشتمل تھی جن میں دو مرد تھے اور ایک عورت۔ ایک تو تقریباً پچیس سال کا گورا چٹا گھونگھر والے بالوں والا نوجوان تھا۔ بڑی بڑی شربتی آنکھیں۔ وجیہ اور متناسب جسم، دوسرا قوی الجثہ، خوفناک آنکھیں۔ بھیڑ کے سے اینٹھے بال۔ بڑے بڑے کان۔ چوڑا چکلا جسم اتنا سیاہ جیسے آبنوس۔ عورت خوبصورت، تشکیل اور نوعمر تھی۔ بوسا قد اٹھتے کے دن۔ شباب کی بارش اور رعنائیوں کی شورش۔ ایک طرف تو اس کی قیامت بھری جوانی۔ دوسری طرف اس کی سادہ روش۔ یہ لوگ نہایت سراسیمگی کے عالم میں تھے۔ ان کا سامان چاروں طرف بے ترتیبی سے پھیلا ہوا تھا۔ لڑکی کھانا پکانے میں مصروف، ان میں سے ایک شخص بیٹھا خشک پتوں کی کابیاں بنانے میں منہمک تھا اور دوسرا اپنی نگاہیں آسمان پر جمائے اختر شماری میں مشغول اس کے بشرے سے سنجیدگی کا اظہار ہو رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گہرے خیال میں گم ہے۔

یہ لوگ اسی طرح دو دو چار چار دن ایک جگہ سے دوسری جگہ ڈیرے ڈال کر اپنے کرتب کی نمائش کیا کرتے اور اسی پر ان کی بسر اوقات ہوتی تھی۔ حبشی نژاد آدمی پتوں کی تین رکابیاں بنا کر فارغ ہوا تو چونا ملا کر کھانے کا تمباکو ہتھیلی پر رکھ کر ملنے لگا۔ لڑکی کھانا پکانے سے فارغ ہو چکی تھی۔ نوجوان ہنوز اپنی نظریں آسمان پر جمائے ہوئے تھا ماہ کامل کی تجلیات سے سارا عالم بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ درختوں کی ڈالیوں اور سبز پتوں سے زرد شعاعیں چھن چھن کر زمین پر گر رہی تھیں۔ فضا خاموش تھی۔ باغ کے سناٹے میں کبھی کبھی جھینگر کی جھنکار سنائی دیتی تھی۔ کبھی کبھی دور نور میں نہائے ہوئے کھیتوں میں گیدڑوں کی بھیانک صدائیں بلند ہو کر سکوت میں ہیجان پیدا کر دیتیں اور —— پھر وہی سناٹا۔ اتنے میں گورا آدمی جو کسی گہری فکر میں تھا اپنی کہنی کو زمین پر ٹیک کر اٹھا اور دوسرے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"مادھو! تم کھانے سے فارغ ہو کر سب سامان ٹھیک کر لو میں صبح ہوتے ہی گاؤں میں رقص کرونگا۔"

لڑکی کو جیسے کسی نے خائف کر دیا ہو۔ وہ اس جملہ کو سن کر چونک پڑی اور کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ اس کے ہونٹوں تک آکر رک گئے۔ وہ کچھ سوچنے لگی۔ پھر ہمت کر کے بولی "راجن! ابھی تمھیں صحتیاب ہوئے کتنے دن ہوئے۔ ایسی صورت میں —— تم جانتے ہو کہ رقص تمھارے لئے خطرناک ہے"۔

"دیوانی ہے تو سکھیا ——!" مادھو دخل انداز ہوا،

"فضول بکواس مت کرو"۔ راجن فیصلہ کن انداز میں بولا۔ "آخر کب تک یونہیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہینگے! روزی کے وسیلے کو بند کئے کب تک گذارا ہوگا؟"

سکھیا خاموش اور مضمحل ہو گئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بہت سی شکایات کرنا چاہتی ہے۔ راجن پھر بولا۔

"ہاں اور دیکھو سکھیا! تم بھی کام سے فارغ ہو کر میری تلوار پر صیقل کر لینا"۔

کھانا تیار ہو چکا تھا وہ لوگ کھانا کھانے کے لئے بیٹھ گئے اور اس سے فارغ ہو کر مادھو اپنا کمبل لئے کچھ دور ہٹکر ذراسی دیر میں تمام تفکرات و آلام کو خرالوں میں تحلیل کر کے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ راجن اپنی سابقہ جگہ پر جا کر لیٹ رہا اور سکھیا برتن باسن سنبھالنے لگی۔ چاند کی نورانی شعاعیں باغ کے ٹمٹماتے ہوئے چھوٹے سے چراغ کو شرما رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد سکھیا ہاتھ میں ایک گلاس لئے آہستہ آہستہ راجن کے بستر تک گئی اور چپکے سے بولی ——

"راجن! —— راجن —— !!"

راجن نے کروٹ بدلی اور سکھیا کو پاس کھڑے دیکھ کر دریافت کیا،

"کیا ہے سکھیا؟"

"کچھ نہیں ذرا سا گرم دودھ ہے اسے پی لو۔ تم نے آج کچھ کھایا بھی نہیں" اس نے محبت بھرے لہجہ میں کہا۔

"نہیں، میں نہیں پیونگا۔ تم پی جاؤ۔" اس نے سکھیا کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ اور ٹکٹکی باندھے اس کے ملکوتی حسن کا لطف اٹھاتا رہا۔ ماہ نیم ماہ کی ضیا پاشیاں اس کے چاند سے چہرے کو چار چاند لگا رہی تھیں۔ راجن کے دل و دماغ پر نجانے کون سے تخیلات چھائے ہوئے تھے۔ شاید اس وقت اس کیلئے منظر وارفتہ سا ہو چلا تھا۔ ہواؤں میں نکہت بڑھ رہی تھی۔ فطرت اپنی بیساختہ رعنائیوں کا دامن پھیلائے اس کے سامنے تھی اور وہ کسی رومانی جزیرے میں لیٹا ہوا —— کوئی رنگین خواب دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہارے ہوتے ہوئے میں . . . . دراصل تمہاری نقاہت ہنوز باقی ہے۔ تمہیں یہ مفید ہوگا۔" سکھیا شرمائی ہوئی نظریں گلاس پر جمائے ہوئے بولی۔

راجن نے مصلحتاً دودھ پی لیا۔ وہ اُسے ناخوش نہیں کرنا چاہتا تھا اور گلاس واپس کرتے ہوئے وہ حسب سابق کروٹ بدل کر لیٹ رہا۔ سکھیا ایک لمحہ تک کھڑی اُسے دیکھتی رہی پھر اپنی جگہ واپس آ گئی اس کے چہرے پر بشاشت رقصاں تھی۔ آبادی سے دور کھیتوں میں گیدڑوں کی "ہکّا ہوآں ہکّا ہوآں" سے فضا میں ایک ارتعاش پیدا ہوا۔ پھر خاموشی مسلط ہو گئی —— سکھیا تلوار کو صیقل کرنے لگی۔ تھوڑے فاصلہ پر اس کی امیدوں کا "دیا" روشن تھا اور وہ دھیمے سروں میں کچھ گنگنا رہی تھی —— نغمۂ حیات!

(۲)

دوسرے دن صبح گاؤں والے تماشائیوں کا جم غفیر نووارد مداریوں کے کرتب دیکھنے جمع ہو گیا۔ بیچارے دیہاتی، سیدھے سادے لوگ جو معمولی سے معمولی شعبدہ بازی سے بھی محظوظ ہو سکتے تھے ان کے لئے یہ بہت کچھ تھا۔ مجمع سے بار بار تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہو ہو کر بازیگروں کی ہمت افزائی کر رہی تھیں اور مداری اپنے کرتب کی نمائش میں بڑی پھرتی، چالاکی اور تندہی کا دکھا رہا تھا، تاکہ تماشائی زیادہ سے زیادہ محظوظ ہو سکیں اسی طرح کافی وقفہ تک انواع و اقسام کی شعبدہ بازیوں اور کرتبوں کی نمائش ہوتی رہی حتیٰ کہ تماشا ختم ہونے سے قبل ہی درمیان میں بچھی ہوئی چادر مختلف قسم کے پیسے اور پیسوں سے بھر گئی۔ اس کے بعد ہی بازیگروں کا آخری شعبدہ بھی دکھا دیا گیا یعنی تلوار نگل کر بتائی گئی۔ راجن ان تمام کرتبوں کی نمائش کرتا رہا اور سکھیا اپنی ڈھولک اور مادھو اپنی نفیری بجاتا رہا۔ راجن تلوار کو اپنے داہنے ہاتھ میں لیکر تماشہ گاہ کے وسطی حصہ میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ مجمع تعجب کا اظہار کر رہا تھا، سکھیا نے تماشائیوں سے خاموش ہو کر کرتب پر توجہ دینے کی گذارش کی تماشائی خاموش ہو گئے۔ اُس نے اپنا تلوار والا ہاتھ ہوا میں بلند کیا اور بلند آواز سے کہنے لگا۔

"سجنو! اور بھائیو! ابھی میں نے آپ کو قریب قریب تمام کرتب دکھائے مگر ایک بہت اہم اور حیرت انگیز کام ابھی آپ لوگوں کو دکھانا باقی رہ گیا ہے یعنی "رقص شیطانی" —— جس کے متعلق آپ لوگوں نے سنا ہوگا مگر آج تک دیکھا نہ ہوگا۔ لہٰذا وہ بھی ہم آپ کو دکھائے دیتے ہیں۔"

مجمع سے تخاطب کے بعد اس نے مادھو اور سکھیا کی طرف کنکھیوں سے دیکھا پھر اپنی ٹانگوں کو کشادہ کر کے چہرے کو آہستہ آہستہ زمین تک لایا حتیٰ کہ اس کی ناک زمین سے مس ہو گئی۔ اس وقت نفیری اور ڈھولک سے مل جل کر نکلتی ہوئی آوازوں میں ایک پرسوز ارتعاش تھا اس غم آلود ترنم نے مجمع کے ہر متنفس پر سکوت کا عالم طاری کر دیا ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اور سب کی نگاہیں مداری پر جمی ہوئی تھیں۔ ساز کا نغمۂ غم احساسات کو چھیڑ چھیڑ کر دلوں کو بھینچ رہا تھا۔ نفیری کے سوراخوں سے بلند ہونے والے درد بھرے نغمے مجمع پر جادو کا کام کر رہے تھے ہر لمحہ ڈھول کی بھد۔ بھدر۔ بھد اور ڈمڈم ڈمڈم زور پکڑتی جاتی اور ساتھ نفیری کی کرزدار آواز بھی ماتم کناں تھی اور مداری اس طرح ہچکولے لے رہا تھا —— جیسے بے چین دل کی دھڑکن —— !

ایک مرتبہ وہ زمین سے تھوڑا سا اٹھا پھر دو زانو ہو کر آہستہ آہستہ بیٹھ گیا اس کے چہرے کا رنگ فق ہو چکا تھا بڑے بڑے سفید دانت باہر نکل آئے تھے، اور جبڑے کی ہڈی نمایاں ہو گئی تھی۔ شربتی آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں۔ اس کے خوشنما بال بکھر گئے۔ اس کی اس حالت نے تماشائیوں کو تعجب میں ڈال دیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے اسے دیکھ کر گودیوں میں سہم گئے اور کچھ بڑوں کی ٹانگوں سے چمٹ کر پیچھے دبک چکے تھے یہ منظر انہیں خائف کئے دے رہا تھا۔ ایک مرتبہ پھر وہ راگنی کے سُروں پر آہستہ آہستہ اٹھا اور

وہ قدم آگے بڑھ کر اپنے بدن کے حصوں کو کئی جگہ سے موڑا جس کے اندر سے لچکیلی کی تلوار صاف دکھائی دے رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے بدن کے حصوں کو اس طرح لپیٹ لیا جیسے سانپ کنڈلی مار کر سو رہا ہو۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر زمین پر ٹکا اور سر پیر سکوڑ کر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے شیر کسی شکار کو دیکھ کر اس پر جھپٹنے کی غرض سے چھلانگ مارنا چاہتا ہو۔ پھر وہ اسی طرح بڑھتے ہوئے دور تک چلا گیا اب اس نے دوسری ہیئت بدلی اور وہ بچھو کی طرح سانس کے توڑ پر چل رہا تھا۔ پھر اچانک وہ کھڑا ہو گیا اور تلوار کو نکال کر ہاتھ میں لیتے ہوئے گھما گھما کر رقص کرنا شروع کر دیا۔ جس طرح ایک دیوانہ اپنے جوش کھو کر کوئی وحشیانہ حرکت کرتا ہو اس کی تلوار سن سن کرتی ہوئی کبھی ادھر کبھی ادھر بجلی کی طرح کوند رہی تھی اور تلوار کا پھل سورج کی روشنی میں قیامت انگیز چمک پیدا کر رہا تھا۔

تماشہ ختم ہوتے ہی بچھی ہوئی سفید چادر پر بے شمار پیسے برسنا شروع ہو گئے ساتھ ہی واہ واہ کے نعرے فضائے بسیط میں بلند ہوئے اور تالیوں کی خوش آہنگ گونج میں گم ہو کر رہ گئے۔ اس کے بعد مجمع اس طرح منتشر ہو گیا جیسے ساون بھادوں کی گھنگھور گھٹا برس کر چھٹ جاتی ہے۔

مادھو نے نفیری کو چھوڑ کر چادر سمیٹی اور پیسے اکٹھا کر کے گننا شروع کر دیا۔ سکھیا میدان میں پھیلا ہوا سامان اکٹھا کر کے تھیلوں اور پٹاریوں میں رکھنے لگی۔ مگر راجن اپنی تلوار ہاتھ میں لئے بدستور میدان کے اسی حصہ میں کھڑا رہا جہاں اس نے اپنے آخری کرتب کی نمائش ختم کی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے "رقص شیطانی" کی نمائش سے قبل اس کے سیکھنے میں کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائیں اور کیا کیا مشکلات اس کے رستے میں حائل ہوئیں مگر پھر بھی اسے بہت جلد غیر معمولی کامیابی ہوئی اور اسی وجہ سے وہ اپنے لمحات زندگی نہایت اطمینان و فارغ البالی سے بسر کر رہا ہے انہی خیالات میں الجھا ہوا وہ ایسی دنیا میں پہنچ گیا جہاں اس کا دماغ تیز رفتار انجن کے پہیوں کی طرح گھوم رہا تھا اور اس کے دل کی آنکھیں عالم کی نیرنگیوں کا نظارہ کرنے میں مصروف تھیں یہاں تک کہ وہ ایک لمحہ کے لئے اپنے گرد و پیش کی چیزوں سے بے خبر سا ہو گیا تا آنکہ —— وہ اپنے آپ کو بھی بھول گیا۔

(۳)

اسی طرح اس چھوٹے سے قافلے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنے شعبدوں اور کرتبوں کی نمائش کرتے کرتے تین ماہ گزر گئے حتیٰ کہ وہ لوگ ایک دن شام ہوتے ہوتے ایک گاؤں میں پہنچے جہاں حسب معمول انہوں نے گاؤں سے باہر باغ میں ڈیرا ڈال دیا اور کھانے پینے سے فارغ ہو کر اپنی اپنی جگہ الگ الگ سو گئے۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ آسمان پر تارے اس طرح جگمگا رہے تھے جیسے سیاہ پشواز پر طلائی ستارے ٹانک دیئے گئے ہوں۔ آکاش پر ظلمت کا پردہ اس طرح پڑا ہوا تھا جیسے روشن خیالات پر تاریکی باطن اور سیہ قلبی کا پردہ۔ گھگھو کی کرخت اور منحوس آواز نے فضا کے سکوت میں برہمی پیدا کر کے سکھیا کو اس رنگین خواب سے چونکا دیا جس میں وہ مستقبل کی خوش آئند چٹان پر خیالات کی فلک بوس عمارت تعمیر کر رہی تھی۔ وہ چونکی اور —— اور گھبرا کر اٹھ بیٹھی اس کے سر پر درخت کی کسی شاخ پر بیٹھا ہوا گھگھو اپنی منحوس بولی بول رہا تھا۔ اس نے ایک کنکر اٹھا کر درخت پر ایک طرف پھینکا۔ پتے کھڑکھڑائے اور ساتھ ہی ایک بڑا سا پرندہ پھڑپھڑا کر اڑتا ہوا کسی طرف کو چلا گیا۔ وہ پھر اپنے بستر پر لیٹ رہی مگر اس مرتبہ اس کے کانوں نے ایسی آواز سنی جیسے کوئی کراہ رہا ہو اس نے گردن اٹھا کر دیکھا اور اپنے کان اس دردناک آواز کو دوبارہ سننے کے لئے مستعد کر دیئے۔ ایک وقفہ —— پھر وہی کراہ —— اس نے جانا کہ راجن کسی تکلیف سے کراہ رہا ہے اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ اٹھی اور اپنی آنکھیں ملتی ہوئی راجن کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی نگاہیں راجن پر جما دیں اور جھک کر آہستہ سے اس کا بازو چھوتے ہوئے بولی۔

"راجن! —— کیا ہوا راجن؟ —— مجھے بتاؤ! کیا تکلیف ہے تمہیں؟"

راجن نے کروٹ لی اور اپنی آنکھیں نیم وا کرتے ہوئے آہستہ سے بولا

"اوہ، سکھیا تم ہو؟" اور پھر مسکرانے کی بیکار کوشش کی، سکھیا اس کے اوپر جھک گئی اور پھر پوچھا "کیا ہوا تمہیں؟"

مگر اس مرتبہ سکھیا کے سوال پر وہ مسکرا کر خاموش ہو رہا۔ پھر ایک لمحہ کے بعد بولا۔ "کچھ نہیں سکھیا! —— میں اچھا ہوں —— بالکل اچھا ہوں" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک دبی آہ کھینچی۔

سکھیا کو راجن کے ساتھ رہتے رہتے کافی عرصہ گزر چکا تھا مگر اب تک وہ اس کے پاس ایسے وقت میں تنہا نہ آئی تھی پھر بھی انسانی ہمدردی اور احساسات مودت ایک دوسرے کے وقت پر کام آنے کی تلقین کرتے تھے لیکن وہ اس وقت اس کے قریب بیٹھ کر کسی دوسری دنیا میں پہنچ چکی تھی۔ اس کے جذبات میں ایک تلاطم بپا تھا اور اعضا میں کپکپی۔ مگر بہت جلد اس نے جذبات پر قابو پا کر حالات کو درست کر لیا۔ اور پھر انسانی فرائض کی بجا آوری کے لئے مستعد ہو کر ملتجیانہ انداز میں کہا۔

"راجن! مجھے بتاؤ نا تمہیں کیا تکلیف ہے؟"

وہ مسکرایا۔ "کچھ نہیں! اک ذرا سا میٹھا میٹھا درد ہو رہا ہے مگر تم اس کے لئے مشوش نہ ہو ——" اس نے بمشکل یہ جملہ ختم کیا ہوگا کہ اس کا سانس رکا اور شدت درد کو برداشت کرتے ہوئے اس نے ہاتھ سے دل کو دبا لیا۔ سکھیا سب کچھ سمجھ گئی وہ اٹھی اور جا کر جلد جلد آگ تیار کی اُسے تھوڑے

ہی سکھیا دوڑ کر راجن کے پاس لے آئی پھر تیل کی مالش کر کے راجن کے سینہ کو سینک کیا۔ اس کے ہاتھ کی ہر جنبش پر راجن کے دل کی دھڑکن گھڑی کے پنڈولم کی طرح حرکت کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"راجن! ——— بھلا تمہیں کٹ پور کا ہسپتال بھی یاد ہے؟" سکھیا نے مالش کرتے اور سینکتے ہوئے راجن سے پوچھا۔

"مطلب ———؟"

سکھیا نے راجن کے سوال کی پروانہ کی اور اپنے جملے کے تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے پھر کہنا شروع کیا۔ "اور تمہیں ہسپتال کے وہ ایام بھی یاد ہونگے جب تم علالت کے سلسلے میں داخل ہوئے تھے ۔ . . . اور جب تم وہاں سے رخصت ہوئے تھے تو یاد ہے ڈاکٹر نے تم سے کیا کہا تھا؟ ——— یہی ناکہ تم اپنی صحت کا خصوصیت کے ساتھ خیال رکھنا۔

راجن سے ڈاکٹر نے صرف یہی کہہ کر اکتفا نہیں کی تھی بلکہ اس نے سکھیا اور مادھو کو الگ بلا کر بتایا تھا کہ مریض کا دل بہت کمزور ہے۔ ——— گر راجن سکھیا کی یہ تمام سن کر خاموش تھا۔ وہ پھر بولی۔

"تمہیں جواب دینا چاہتے ہو تم؟ ——— اچھا ———" ایک آہ سرد بھر کر وہ خاموش ہو گئی۔

"ہاں تو اس سے کیا ہوا؟" راجن سٹپٹا کر بولا۔

"ہوا یہ کہ تم مجھ سے وعدہ کرو اور قسم کھاؤ کہ آج سے رقص شیطانی نہ کرو گے ———؟"

"کیا ——— ؟" اس نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ مگر فوراً ہی سینے کے درد میں اضافے کے باعث وہ بدستور سانس روک کر گر پڑا۔

"یہی کہ تم قسم کھاؤ کہ آج سے رقص نہ کرو گے۔"

"بیوقوف لڑکی! تیرا دماغ پھر گیا ہے۔" اس نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

"میں پاگل سہی! اگر میں تم سے آج وعدہ لیکر رہونگی۔"

سکھیا نے راجن کی وقتی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہا کیونکہ راجن سے وہ تندرستی کی حالت میں ایسی باتیں نہ کر سکتی تھی۔ گویہ فائدہ اس کے خیال سے دونوں کے لئے تھا اور خصوصیت سے راجن ہی کے لئے مگر سکھیا کی نگاہوں کے سامنے مستقبل کا بھیانک عکس منڈلا رہا تھا۔

راجن کی بھی یہی کیفیت تھی۔ وہ بھی اپنے تخیلات کی دلفریبی کا احساس کرکے کیف میں ڈوب چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک اس کے قلبی واردات اور دھندلا سا نقشہ پیش کر رہی تھیں۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنی بھاری پلکیں اٹھائیں اور سکھیا کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ سے معلوم ہوا جیسے وہ آج اس سے وعدہ لیکر ہی چھوڑیگی۔ راجن کے دل میں سکھیا کی گذشتہ خدمات کی یاد تازہ ہو گئی اور گذشتہ زندگی کی پرکیف تصویریں اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگیں۔ وہ پرانی زندگی ——— معصومیت اور مسرت کے دن اسے یاد آگئے۔ جس سے ایک ایسا جذبہ پیدا ہو گیا کہ اس نے اپنا داہنا ہاتھ سکھیا کی طرف بڑھا دیا۔ مگر الفاظ لبوں تک آئے اور تھرتھرا کر رہ گئے ——— زبان کا فرض آنکھوں کو انجام دینا پڑا۔

سکھیا نے راجن کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنا نازک ہاتھ رکھ دیا۔ دونوں ملنے سے بجلی کی ایک لہر ایک دوسرے کے جسم میں دوڑ گئی۔ رات کے اندھیرے میں ان کی نگاہیں جن میں دلوں میں دبے ہوئے ارمانوں کے بر آنے کی تمنائیں جھلک رہی تھیں۔ چار ہوئیں ——— دور ——— آسمان پر ان کی قسمتوں کے متبسم ستارے بھی ہم آہنگ ہوتے نظر آرہے تھے۔ راجن کی آواز میں حسرت و انبساط کی خنکی تھی جب اُس نے سکھیا سے آہستہ سے کہا کہ۔

"میں قسم کھاتا ہوں ———"

آناً فاناً جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو راجن کو تسکین ہونا شروع ہو گئی اور تھوڑی ہی دیر میں اس کا درد مفقود ہو چکا تھا۔

سکھیا اپنی جگہ لوٹ آئی اور بہت جلد دونوں پھر لیٹ کر بےخبر ہو گئے۔

(۴)

دوسرے دن صبح جب مادھو کے کانوں تک یہ خبر پہنچی کہ آج سے شعبدہ بازی اور کرتب سے رقص شیطانی کا جزو نکال دیا جائے گا تو وہ بہت جز بز ہوا آخر یہ کیا حماقت ہے ———؟ رقص کی وجہ سے ہم لوگوں کو خاصی آمدنی ہے گذشتہ تین ماہ میں ہم لوگوں کے حصہ میں سَو روپیہ فی کس رقم ہاتھ آئی اخراجات خورد و نوش کا کوئی حساب ہی نہیں۔ تمہارے رقص ہی نے تو مقبولیت حاصل کر کے یہ اچھے دن دکھائے ——— اور میں تم سے بار بار کہتا ہوں کہ اس رقص سے کافی آمدنی ہوگی۔

راجن اپنے رقص کی تعریف سُن سُن کر پھولا نہیں سما رہا تھا۔ وہ دوبارہ آمادہ ہو جاتا اگر سکھیا سے وعدہ بھی تو کر چکا تھا۔

راجن نے نیچی نظروں سے سکھیا کو دیکھا اور ہاتھ باندھے ٹہلتا ٹہلتا کچھ دور چلا گیا۔ سکھیا نے وحشیانہ نگاہوں سے حبشی مادھو کو دیکھا اس کی نگاہوں میں مادھو کی طرف سے حقارت و نفرت کے جذبات تھے آخر کار وہ اُسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

"مادھو! تمہارے دماغ میں مغز تو ہے ہی نہیں اگر اس مرتبہ انھوں نے پھر رقص کیا تو خاتمہ ہی سمجھو میں کہتی ہوں کہ ان کا دل بہت ہی کمزور ہے کیا تمہیں کٹ پور کے ڈاکٹر کی ہدایات یاد نہیں؟"

"ہاں یاد ہیں۔ تو یہ کہو نا کہ تم نے بیچ میں ٹانگ اڑائی ہے۔ نہیں رو دیے

سے محبت نہیں — تمہیں اس کی ضرورت نہیں — دخل در معقولات کرتی پھرتی ہے — واہیات چھوکری —" مادھو گرج کر بولا۔

سکھیا نے مادھو کی بات ان سنی کر کے اُڑا دی۔ وہ اس کی کب پروا کرتی تھی اور ہاتھ میں چاولوں کی تھالی لئے ہوئے اس پر ناک سکوڑتی ہوئی ایک طرف کو چلی گئی۔

اس واقعہ کے دوسرے دن یہ لوگ قریب کے ایک گاؤں میں پہنچے جہاں آج کسی تہوار کی وجہ سے کافی چہل پہل تھی۔ زرد آفتاب کی الوداعی کرنیں پہاڑ سے سبزہ زاروں پر مُنہ مل رہی تھیں پرند غول در غول ایک طرف سے دوسری طرف فضائے بسیط میں تیرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ باغوں میں چڑیوں کی زمزمہ سنجی فضا پر مستیوں کی بارش کر رہی تھی۔ لوگ صاف ستھرے کپڑے پہنے کاندھوں پر رومال ڈالے۔ ہاتھوں میں موٹی موٹی لاٹھیاں لئے چُرمُر کرتے ہوئے گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ راجن نے شام ہو جانے کی وجہ سے آج گاؤں میں کھیل کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنا ارادہ کل پر ملتوی کر کے وہ لوگ بدستور اپنا ڈیرا ڈال کر مقیم ہو گئے۔

اس جگہ ان کا قیام گاؤں سے ملحقہ کھجور کے کُنج میں تھا اب خاصہ اندھیرا ہو چلا تھا اور رات کی پہلی نشانی کے طور گاؤں کے چھوٹے چھوٹے چراغ روشن ہو چکے تھے۔ مادھو اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے کسی فکر میں غوطہ زن گردن جھکائے آہستہ آہستہ چہل قدمی کر رہا تھا۔ اس کا داہنا کلہ تمباکو اور پان کے اُبھار سے سوجا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے تصور و تخیل میں روپیوں کا ایک بڑا ڈھیر ایک طرف تھا اور دوسری طرف سکھیا کی ناقابل عفو دخل اندازی — ایک طرف تو وہ روپیوں کے اس ڈھیر کا کافی حصہ اپنی ملک سمجھ رہا تھا اور دوسری طرف سکھیا کی ترغیب سے راجن کا رقص سے اجتناب اُسے بےچین کئے ہوئے تھا آخرکار تخیلات کے نقوش رفتہ رفتہ دھندلے ہو کر اس کے دماغ سے مفقود ہو گئے اور ساتھ ہی روپیوں کا وہ ڈھیر بھی سمیٹ لے گئے جو مادھو کے دماغ پر مسلط تھا۔

حسب سابق وہ آہستہ آہستہ اسی نوعیت سے چلا جا رہا تھا کہ اس کے کانوں میں لطیف قہقہوں کی صدا آئی۔ وہ چونکا اور اپنے سامنے والی کھجور کی جھاڑی کو چیر کر تاریکی میں دیکھنا چاہا۔ سامنے کے منظر نے اس پر اتنی بیخودی و محویت طاری کر دی کہ اس کا مُنہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ پان کی سرخی اور تمباکو کی آمیزش سے ملا جُلا لعاب دہن اس کے کالے کالے دانتوں کی کھڑکیوں سے رِس رِس کر ہونٹ کے راستے ڈاڑھی کے بالوں پر بہتا ہوا زمین پر گر کر جذب ہوتا جاتا تھا اور وہ پھٹی ہوئی نظروں سے سامنے کے منظر کو دیکھ رہا تھا۔

جذبات کے اُمڈے ہوئے سیلاب کی شورشوں سے مغلوب سکھیا اپنے تئیں راجن کی مضبوط گرفت سے چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی — وہ شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی —" ہٹو — چھوڑ دو — مجھے جانے دو — کوئی دیکھ لیگا —" وہ راجن کے بازوؤں کی گرفت کو ڈھیلا کرتے ہوئے گردن جھکائے دُہری ہوئی جا رہی تھی۔ مدبھری آنکھیں مستی و کیف سے لبریز تھیں سیاہ اور خوبصورت بال شاخ سنبل کی طرح شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور جوں جوں وہ اپنے آپ کو علیحدہ کرنے کی کوشش کرتی وہ سیاہ ناگن کی طرح بل کھا کھا کر کمر میں اُلجھتے جاتے۔ پاؤں اگرچہ ننگے اور خاک آلود تھے لیکن ساق سیمیں کی نزاکت راجن کے نگاہوں کو جذب ہونے کی دعوت دے رہی تھی مگر اس کی یہ کوشش ظاہری تھی — اس کے اصلی جذبات کچھ اور تھے۔ اگرچہ شرم و حیا نفس پروری کے ہچکولوں سے دور بھاگ جانے کو کہتی تھی مگر نسائیت احساس شکست سے چور چور ہو رہی تھی — جذبات و احساسات کی آخری فتح!

مادھو کی کیفیت ناقابل ذکر تھی۔ حسد کی آگ اس کے دل میں شعلہ زن تھی۔ اس کی رگوں میں خون کی حرارت تیز ہو چلی تھی اور جذبات کی کشمکش اس کو دیوانہ بنا رہی تھی۔ وہ اس منظر کے مشاہدہ سے گریز بھی کرنا چاہتا تھا مگر اپنی جگہ سے حرکت کرنے سے مجبور تھا۔ اس کی نظروں میں لالچ کا شائبہ بھی تھا اور رشک و حسد کا طوفان بھی۔ آخرکار وہ جل کا توں بت بنا کھڑا رہا — اسی جگہ — ہاتھوں سے کُنج کو وا کئے ہوئے — حسد و رشک کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جلتا ہوا۔

سکھیا نے کسی طرح راجن کی گرفت سے آزاد ہو کر بھاگنا چاہا مگر راجن نے اس کا زمین پر لوٹتا ہوا ساڑی کا پلو پیر سے دبا لیا اور جھپٹ کر اسے پکڑ لیا اُس نے سکھیا کے گداز بازوؤں کو اپنے مضبوط بازوؤں کے حلقہ میں لیکر اپنے جوش سے بھرے ہوئے ہونٹ اس کے مرمریں رخساروں پر رکھ دیئے — سکھیا مجبور ہو کر راجن کی گود میں نڈھال ہو گئی۔

مادھو کو یہ منظر اب زیادہ دیر تک دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ وہ کھجور کے پتوں کو چھوڑ کر پیچھے مڑا اور کچھ دور تک بے تحاشا دوڑتا ہوا چلا گیا۔ حسد، رشک دیوانگی اور وحشت، وہ ان تمام جذبات کا بیک وقت شکار ہو رہا تھا۔ اس میں اب قوت برداشت نہ تھی، اس کے دل و دماغ، تصور و تخیل میں سکھیا چھائی ہوئی تھی۔ اس کی ساڑی زمین سے گھسٹتی ہوئی۔ انگیا کمر سے اوپر چڑھی ہوئی سیاہ کاکل بے ترتیبی سے شانوں پر بکھرے ہوئے۔ سانچہ میں ڈھلا ہوا قد، بیج اور گول چہرہ۔ حسین خد و خال، مخمور آنکھیں اور وہ بھی مستی میں اوپر چڑھی ہوئی آج اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اُسے سکھیا کی ضرورت ہے اسی طرح کھویا کھویا سا وہ نہ معلوم کتنی دیر تک ٹہلتا رہا کہ کچھ فاصلہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"مادھو —!" یہ راجن کی آواز تھی،

مادھو آواز کی طرف مخاطب ہوا، دیوانگی سے پُر حسد و نفرت کا ایک

شعلہ بھڑکا ہیں نے اس کے احساسات ــــ مجروح اور زخمی احساسات ــ کو ایک ٹھیس لگادی۔ اس کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکل سکا بلکہ وہ بہوت کھڑا ان لوگوں کو دیکھا کیا۔

"اسے کیا آج کھانا نہیں کھاؤ گے؟" راجن نے سوال کیا۔ مگر وہ اس مرتبہ بھی کچھ جواب دیئے بغیر ان کے پیچھے ہو لیا۔ وہ لوگ ہشاش بشاش سرگوشیاں کرتے ہوئے آگے آگے چل رہے تھے اور مادھو کبھی کبھی ان کی طرف گردن اٹھا کر اس طرح دیکھتا جیسے وہ ابھی ان دونوں کو کچل کر رکھ دیگا۔

یہ لوگ اسی طرح آگے پیچھے چلتے ہوئے اپنے ڈیرے پر پہنچ گئے کھانے کا چونکہ ابھی وقت نہ آیا تھا اس لئے سکھیا نے چراغ روشن کرکے ایک پتھر پر رکھ دیا۔ اور اس کی روشنی میں تلوار نکال کر صیقل کرنے بیٹھ گئی۔ مادھو کی غضب آلود نگاہیں اس کے چہرے پر جمی رہیں۔

راجن ان دونوں کے درمیان کھڑا ہوا تھا اور بانس کی ایک پتلی قمچی سے جو اس کے ہاتھ میں تھی قریب کی جھاڑی پر مارتا جاتا جس کے پتے اور پتلی پتلی کونپلیں ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر گرتی جاتی تھیں اور ساتھ ہی ٹوٹی ہوئی جگہ سے دودھ کی سفید بوندیں بھی نکل نکل کر زمین پر ٹپک رہی تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر بار بار مادھو کی طرف دیکھ کر جھجکتا۔ آخر کار اس نے اُسے مخاطب کیا۔

"مادھو! ہمیں تم سے کچھ مشورہ لینا ہے۔"

مادھو نے نظر اٹھا کر راجن کو دیکھا پھر سکھیا کو۔ پھر راجن کی بات کا انتظار کرنے لگا۔

"سکھیا اور ہم آپس میں منسلک ہو جانا چاہتے ہیں ــ تم ہمیں اس بارے میں کیا مشورہ دیتے ہو؟"

مادھو کے جذبات پر دوسری ضرب۔ آج راجن اپنی سنجیدگی فراموش کرکے لڑکپن کی حرکات پر اُتر آیا تھا۔ اس نے ہاتھوں سے سر کے بال اینٹھ کر ایک انگڑائی لی مادھو ابھی تک خاموش تھا۔

"خیر، شادی کا مسئلہ تو ہم لوگوں نے طے ہی کر لیا ہے مگر (؟) ــ سکھیا کا خیال ہے کہ اب میں رقص و شعبدہ بازی کی نمائش کے قابل نہیں رہا ہوں۔"

مادھو نے سکھیا کی طرف دیکھا اور رفتہ رفتہ اس کی نگاہیں اس کے بالوں میں لگے ہوئے ایک سرخ پھول پر پڑیں جو چراغ کی روشنی میں انگارے کی طرح دہک رہا تھا اسے دیکھ کر وہ نہ معلوم کن وحشتناک خیالات میں ڈوب گیا راجن نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"اور ان کا خیال ہے کہ شادی کے بعد ہم یہ کام قطعی طور پر موقوف کرکے ایک چھوٹی سی دوکان کھول لیں ــ یہی بیڑی، سگریٹ، دیاسلائی، چار، تمباکو اور صابن وغیرہ کی ــ اور اس کے لئے ہمارے پاس جو موجودہ رقم ہے۔ وہی کافی ہوگی۔"

مادھو نے سوال کیا ــ "تو تم اس کام کو بالکل چھوڑ دینا چاہتے ہو؟"

اسے یہ انقلاب کسی طرح گوارا نہ تھا۔

"ہاں ــ!" اس مرتبہ سکھیا کی سریلی آواز دخل انداز ہوئی اس کی آنکھوں میں شیرنی کی سی بہادری اور ایک مستحکم ارادے کا ظہور تھا۔

"لیکن مادھو، ہم یہاں کل ایک آخری رقص کی نمائش کرینگے۔" راجن نے اس سے تسکین آمیز لہجے میں کہا۔ "ایک آخری رقص، ــ اپنا قدیم پیشہ ترک کرنے سے پہلے۔ مگر ہماری تجویز کی بابت تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا تم اس میں ہمارے شریک نہ رہو گے ــ؟"

"اوں ہوں ــ نہیں ــ" مادھو نے نڈھال ہو کر جواب دیا تماشہ کے وسطی حصہ میں بچھے ہوئے سفید کپڑے پر پیسوں کی بارش، اناج کے جابجا ڈھیر، چاروں طرف تماشائیوں کا اجتماع سب مادھو کے تصور میں آ آ کر مفقود ہوتے جا رہے تھے اور وہ ان پر الوداعی نظریں ڈال رہا تھا۔ زندگی کے اس دور کا ڈراما بھی ختم ہو رہا تھا ــ جس کا آخری منظر کل نمائش کے لئے باقی رہ گیا تھا۔

مادھو کی نفرت بھری نگاہیں سامنے بیٹھی ہوئی سکھیا کا طواف کر رہی تھیں۔ باوجودیکہ وہ اسے شدت سے چاہنے لگا تھا مگر وہ سمجھ چکا تھا کہ اس انقلاب کی بانی وہی ہے ــ اور وہ اب اپنی زندگی کے ماحصل کو لیکر اڑ جانا چاہتی ہے۔"

اب اس کی نگاہیں چمکتی ہوئی تلوار پر پڑیں اور اس کے دل میں ایک انتقام کی آگ بھڑکی۔ ایک ہی لمحہ میں اس کا دل و دماغ کسی سوئے فتنے کو بیدار کرنے کی تجاویز مرتب کر رہا تھا اور تھوڑی دیر میں وہ اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے طریقے مرتب کر چکا تھا ــ کل رقص کے موقع پر ــ!

(۵)

دوسرے دن صبح ــ ڈم ڈم ڈڈم ــ ڈڈم ڈڈم ــ ڈھول کی آواز رقص کی آخری نمائش کے موقع پر سنائی دی جس کو سن کر تماشائی اکٹھا ہونا شروع ہو گئے اور رفتہ رفتہ سیکڑوں آدمیوں کا اجتماع ہو گیا راجن نے تالیوں کی آواز اور تحسین و آفرین کی صداؤں کے درمیان اپنے کرتبوں اور شعبدوں کی یکے بعد دیگرے نمائش شروع کر دی ــ آخر کار بڑی دیر کے بعد تلوار نگلنے کی آخری نمائش کی باری بھی آ گئی اور راجن نے اپنی تلوار کو بھی کمل کر تایا اور پھر تلوار نکال کر تالیوں اور تعریفوں کی صداؤں کی وجہ سے مسرت و انبساط سے ان کا دل چھلک اٹھا اور وہ اپنے ہاتھ میں

تلوار لیکر تماشہ گاہ کے وسطی حصہ میں کھڑا ہوگیا۔

سکھیا اپنی ڈھولک بجا رہی تھی اور مادھو اپنی نفیری مگر تماشہ ختم ہونے کے بعد بھی مادھو نے نفیری بجانا موقوف نہ کی ——— کیوں ——؟ سکھیا ٹکٹکی نگاہوں سے اُسے گھور رہی تھی۔ راجن اس کی طرف حیرت و استعجاب سے دیکھ رہا تھا مگر مادھو ——— اپنے کام سے غافل ہوئے بغیر بڑی تندہی سے ایک درد بھری راگنی گا رہا تھا۔ تماشائی مبہوت اور مست نظر آرہے تھے۔

یکایک راجن کا تلوار والا ہاتھ غیر ارادی طور پر ہوا میں بلند ہوا اور اس کے بعد ہی وہ رقص میں منہمک ہوگیا۔ اب اس کی شکل ڈراؤنی ہو چلی تھی اور وہ اپنے افعال پر قدرت رکھنے سے قاصر ہو کر نفیری سے نکلتی ہوئی صدا پر کٹھ پتلی کی طرح رقص کر رہا تھا ——— یہ مادھو کے خوفناک انتقام کی تمہید تھی۔

سکھیا بچوں کی طرح کبھی مادھو، کبھی مجمع اور کبھی راجن کو دیکھتی۔ ڈھول بجانے والی لکڑی اس کے ہاتھ میں تھی اور حیرت سے اس کا مُنہ کھلا ہوا تھا اس کی آنکھوں سے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ ایک مرتبہ راجن کی گرجتی ہوئی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھتی ہے؟ بجاتی کیوں نہیں اپنی ڈھولک" راجن نے سکھیا کی طرف غضبناک نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ سکھیا ڈھول بجانا چاہتی تھی کہ راجن نے پھر ڈانٹ کر کہا۔

"بجا اپنی ڈھول سکھیا ——— جلدی کر ——— جلدی ———" راجن مدہوشی کے عالم میں یہ الفاظ کہہ رہا تھا اور بیخودی کے عالم میں اس کا رقص جاری تھا۔ نہ معلوم کس قوت سے مغلوب ہو کر؟ اس کا علم اس وقت یا تو مادھو کو تھا، یا سکھیا کی ان خوفزدہ نگاہوں کو ——— جو اس کے آخری انجام کو سمجھ رہی تھیں۔

سکھیا کے ہاتھ بھی ڈھول پر چلنے لگے۔ اس کے کانوں میں کچھ ایسی آوازیں آرہی تھیں ——— ایسی خاموش جیسے کسی دُور کے جنگل کی صدائیں وہ آوازیں کچھ بڑھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ آخرکار رفتہ رفتہ اب صاف اور باریک آواز اسے سنائی دی ——— (قہقہہ)

"ہاہاہا۔ ہاہا، تُو ——— تُو ——— اس سے شادی کرنا چاہتی ہے ——— اپنی موجودہ جماعت کو تاخت و تاراج کرنے کے لئے ——— ہاہاہاہا ——— بچا ——— بچا لے اسے ——— اب دیکھوں کیسے بچاتی ہے اسے تو ———؟" یہ مادھو کی نفیری سے نکلتے ہوئے دل ہلا دینے والے جملے تھے جو سکھیا کی قوت سامعہ پر چھلے جا رہے تھے۔

مگر راجن کو بچانا اس کی قوت سے بعید تھا۔ حتیٰ کہ یہ بھی اس کی طاقت سے باہر تھا کہ وہ اپنا ڈھول بجانا موقوف کردے ——— وہ دونوں مسحور ہو چکے تھے،

تماشائی اس منظر سے اس قدر متاثر ہو چکے تھے کہ نہ اب اُن کے مُنہ سے تحسین و آفرین کے دل خوش کن نعرے بلند ہوتے تھے اور نہ تالیوں کی گونج، بلکہ وہ بغیر پلک جھپکائے عالم محویت میں کھڑے راجن کا رقص دیکھ رہے تھے۔

سکھیا راجن کے نتھنوں اور دہانوں سے خون کی بوندیں ٹپکتی دیکھ رہی تھی مگر وہ اپنا ڈھول بجانا موقوف کرکے اس کی مدد کو نہیں جا سکتی تھی، آہ بے بس لڑکی! ——— آخرکار اسی طرح دیوانگی میں رقص کرتے کرتے راجن کے مُنہ سے ایک مرتبہ خون کی ایک دھار نکلی ——— سرخ! گرم لہو، اور وہ اپنے دونوں ہاتھ مدد کے لئے پھیلاتا ہوا زمین پر گر پڑا ——— مجمع میں کھلبلی مچ گئی ——— مادھو نے نفیری بجانا موقوف کردی، وہ اپنا کام کر چکا تھا سکھیا اب سحر کے اثرات سے بیدار ہو چکی تھی ——— اُس نے راجن کی حالت دیکھی ——— اور جھپٹ کر اس کے پاس گئی اور دوزانو بیٹھ کر اس کا سر اپنی آغوش میں لے لیا ——— وہ بیہوش ہو چکا تھا۔

(۶)

گاؤں کے وید راج نے اپنے مکان کے باہر پڑے ہوئے چھپر میں راجن کا معاینہ کیا اور تشخیص میں یہ بتایا کہ مریض کے دل کی نسیں کٹ چکی ہیں جس سے اس کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔

سکھیا اپنی آغوش میں راجن کا نڈھال سر رکھے حسرت بھری نگاہوں سے اس کا مُنہ تک رہی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کا راجن اب چند لمحوں کا مہمان ہے۔ شدت الم سے اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے اور وہ ایک عجیب محویت کے عالم میں ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانے والے راجن کو دیکھ رہی تھی امیدوں اور تمناؤں کا وہ لہلہاتا ہوا باغ جس کے متعلق اس کو خیال تھا کہ مستقبل قریب میں بار آور ہو کر ثمر محبت کی پہلی لطافت سے اس کے ننھے سے دل کو شگفتگی بخشے گا۔ باد خزاں کے بیرحم ہاتھوں اُجڑ چکا تھا۔ آرزو کا وہ تار ٹوٹ چکا تھا جس سے وہ اپنی زندگی کی آئندہ رنگینیوں کا رشتہ باندھ چکی تھی۔ اب اُسے اپنے گرد حسرت و ناکامی کے تاریک بادل منڈلاتے نظر آرہے تھے۔

تھوڑے فاصلہ پر بیٹھا ہوا مادھو اپنے خبیث کرتوت اور دہشتناک عمل کے نتیجہ پر مسکرا رہا تھا ——— وہ مسرور تھا اور آئندہ سکھیا کو اپنے دل کی ملکہ ——— اور زینت آغوش بنانے کے حسین خواب دیکھ رہا تھا ——— مگر وہ عورت کی فطرت سے ناواقف تھا ——— بدبخت مرد!

دن گذر چکا ——— رات آگئی۔

تقریباً تین بجے شب کو راجن کچھ کچھ ہوش میں آیا اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحہ تک وہ سکھیا کے ملول و غم آلود چہرے کو تکتا رہا اس کے

بعد اس کی حسرتناک نگاہیں قریب ہی سوئے ہوئے حبشی نژاد جادوگر پر پڑیں، اور پھر سکھیا کی طرف پلٹ آئیں جو ہنوز راجن کا سر اپنے زانو پر رکھے بیٹھی ہوئی تھی ——— وہ اس کی طرف جھکی۔ اس کی نگاہوں میں راجن کی مزاج پرسی کی ادا تھی۔ راجن نے اپنے برف کے مانند ٹھنڈے ——— دونوں ہاتھ سکھیا کی گردن میں حمائل کر دیئے اور نظریں ملاتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"سکھیا! آج کا رقص ... کیسا رہا ——— ؟"

اُس نے بمشکل یہ جملہ ختم کیا ہوگا کہ ہلکی سی ہچکی ——— اس کی گردن کو ایک خفیف سی لرزش ——— اس کا چہرہ نڈھال ہو چکا تھا، اور روح جسم خاکی کی بندشوں سے آزاد ہو کر ——— عالم بالا کو پرواز کر چکی تھی.. . دُور .... دُور ——— افق پر ایک چمکتا ہوا تارہ ٹوٹا ——— ایک ہلکی سی روشنی ——— اور ایک ہی لمحہ میں ——— وہ فضا میں جذب ہو چکا تھا ———،

جذباتِ فضا!

میرے نالے کیا مری فریاد کیا

از حضرت فضا جالندہری

حد سے گذرا شکوۂ بیداد کیا
اب نظر ہے مائلِ فریاد کیا

ہر فضا پر چھا رہا ہے اک غبار
خاکِ دل بھی ہو چکی برباد کیا

حُسن کی دنیا ہے اب تک بے خبر
میرے نالے کیا مری فریاد کیا

ہو گیا وابستہ طبعِ حُسن سے
انقلابِ عالمِ ایجاد کیا

بن گیا ہوں صورتِ شمعِ خموش
عشق ہے بیگانۂ فریاد کیا

دیکھ لو حالِ دلِ حسرت نشاں
نامرادِ عشق کی روداد کیا

صحنِ زنداں پر خموشی چھا گئی
ہو چکا جوشِ جنوں آزاد کیا

حُسن ہر الزام سے ہے بے نیاز
بندگی میں شکوۂ بیداد کیا

ذرّے ذرّے پر ہے چشمِ جستجو
آ گیا راہِ طلب میں یاد کیا

نالہ کش کیوں ہے قفس میں عندلیب
پھر نشیمن ہو گیا برباد کیا

ہو چکی دنیائے دل پر بھی محیط
سحر تھی چشمِ ستم ایجاد کیا

نالۂ عاشق سے ہل جاتا ہے عرش
چرخِ نیلی فام کی بنیاد کیا

اے فضاؔ کیوں آج تم خاموش ہو
اب نہیں دل مائلِ فریاد کیا

محسوسات ماہر

شیخ بھی ساقیٔ میخانہ ہوا جاتا ہے

از حضرت ماہر القادری

دل حریفِ مے و میخانہ ہوا جاتا ہے
ہر قدم لغزشِ مستانہ ہوا جاتا ہے

منتشر گیسوئے جانانہ ہوا جاتا ہے
ایک عالم ہے کہ دیوانہ ہوا جاتا ہے

چشمِ ساقی سے جو یارانہ ہوا جاتا ہے
شوق لذّت کشِ پیمانہ ہوا جاتا ہے

آپ اس شانِ تغافل سے کہاں جاتے ہیں
میرا گھر دیکھئے ویرانہ ہوا جاتا ہے

مجھ کو ڈر ہے کہ کہیں ضبط کی حد ٹوٹ نہ جائے
ہر نفس شوق کا افسانہ ہوا جاتا ہے

وہ بھری بزم میں آئے ہیں جو پیمانہ بکف
شیخ بھی ساقیٔ میخانہ ہوا جاتا ہے

مجھکو تسکین سی ملتی ہے مسلسل ماہر
دل جو امید سے بیگانہ ہوا جاتا ہے

کاغذ کی اس صبر شکن گرانی کے زمانہ میں عالمگیر بکڈپو سے زیادہ سے زیادہ کتابیں خرید کر رسالہ عالمگیر کی بقاء ترقی میں کوشش کرنا ہر بہی خواہ علم و ادب کا اوّلین فرض ہے کیا آپنے اس فرض کا احساس فرمایا ہے؟

اقبالؒ کی نظر میں اقبالؒ

ناقدانہ مقالہ

از جناب میرزا محمد بشیر ایم-اے، بی-ٹی

مجھکو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں — کی اسکی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے — کچھ اسمیں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

(بانگ درا)

اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیر دام آیا

(بال جبریل)

علامہ اقبال کی شاعری اور سوانح حیات کے متعلق "حدیث دیگراں" تو آپ سُن چکے اور بہت کچھ سُنیں گے لیکن سچ پوچھیے تو یہ داستان خواہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو خود اس شاعر رنگیں نوا کی زبان ہی سے بھلی معلوم ہوتی ہے۔ "بال جبریل" میں کیا خوب کہا ہے ؎

اک اضطراب مسلسل غیاب ہو کہ حضور
میں خود کہوں تو مری داستاں دراز نہیں

یہ بات بتا دینا ضروری ہے کہ اس مضمون میں ہم نے ان اشعار سے فائدہ اٹھایا ہے جن میں شاعر نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے یا اپنے کلام و خیالات کے متعلق خود کچھ کہا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ان کے کلام سے ان کی زندگی کے جزوی واقعات و حالات کا بہت کم اظہار ہوتا ہے اتنا ہے کہ کہیں کہیں کچھ اشارے سے ملتے ہیں مثلاً "ضرب کلیم" میں اپنے خاندان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مشہور بات ہے کہ ان کے اجداد کشمیری برہمن تھے۔

میں اصل کا خاص سومناتی — آبا مرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد — میری کف خاک برہمن زاد

اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں اقبال نے ایک مکالمہ لکھا تھا۔ "زہد و رندی" جس میں اپنی آزاد طبیعت اور خیالات کو دلکش پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ ایک مولوی صاحب اقبال کے ہمسائے میں رہتے تھے اور اقبال کی متضاد طبیعت کی کرشمہ سازیاں ظاہر بیں نظروں سے دیکھ کر لوگوں سے دریافت فرماتے تھے ؎

حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا — اقبال کہ ہے قمری شمشاد معانی
سُنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا — ہے ایسا عقیدہ اثر فلسفہ دانی

ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا — تفضیل علیؓ ہم نے سُنی اُس کی زبانی
کچھ عار اُسے حسن فروشوں سے نہیں ہے — عادت یہ ہمارے شعراء کی ہے پرانی
مجموعہ اضداد ہے اقبال نہیں ہے — دل دفتر حکمت ہے طبیعت خفقانی

اپنے کلام کے متعلق خود صاحب کلام نے جو کچھ کہا ہے وہ ایک ایسی صداقت ہے کہ جس کو تسلیم کرنے کے لئے ہم کو کسی خارجی شہادت کی ضرورت نہیں یہ وہ حقیقت نما آئینہ ہے کہ جس میں ان کی شاعری کے اصلی خد و خال نظر آتے ہیں ان کی شاعری "حدیث دلبری" کی رنگین داستان نہیں بلکہ قوموں کے لئے "شکوہ خسروی" کا جلیل القدر پیغام اور قلندری کی تفسیر ہے۔ "پیام مشرق" میں ایک لطیف طنز کے ساتھ ارشاد ہوتا ہے۔ ؎

من شکوہ خسروی او را دہم — تخت کسریٰ زیر پائے او نہم
او حدیث دلبری خواہد ز من — رنگ آب شاعری خواہد ز من

(پیام مشرق)

اب بال جبریل میں خود شاعر کی رائے اپنے کلام کے متعلق سنئے۔

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری — وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے
مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور — عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرور
مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

یہ حقیقت ہے کہ اقبال نے اپنی غزلوں سے اردو شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ کیا ہے ان کی غزلیں ہمہ تن جوش و خروش ہیں۔ ان میں رسمی محبت کی ٹھنڈی گرمیاں نہیں بلکہ عشق و عمل کی دہکتی ہوئی آگ اور آتش رفتہ کے بھڑکتے ہوئے شعلے ہیں۔ ان غزلوں کے متعلق خود شاعر کا قول سنئے ؎

میں کہ مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سُراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو
اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو
میں شاخ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر — مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
میری مینائے غزل میں ہے ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ یہ بھی ہے حرام اے ساقی!

اپنی شاعری کے ہمہ گیر اثر، مقبولیت اور ولولہ انگیزی کا اظہار خود کیا ہے
اس کو خودستائی نہ سمجھئے بلکہ یہ حقیقت نفس الامر ہے ؎

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو — لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
جو کو کنار کے خوگر تھے ان غریبوں کو — تری نوا نے دیا ذوقِ جذبہ ہائے بلند

یوں دادِ سخن دیتے ہیں مجھ کو عراق و پارس
یہ کافرِ ہندی ہے بے تیغ و سناں خونریز

——— (بالِ جبریل)

اک صدقِ مقال ہے کہ جس سے — میں چشمِ جہاں میں ہوں گرامی
اللہ کی دین ہے جسے دے — میراث نہیں بلند نامی

——— (ضربِ کلیم)

اسی مقبول کلام کے لئے جو ان کے دل کے "درد انگیز نالے" تھے ان کو
ایک "سینۂ پرسوز" کی تلاش تھی ؎

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھکو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ درد انگیز نالے ہیں

——— (بانگِ درا)

ضربِ کلیم میں ایک قطعہ ہے۔ "اپنے شعر سے" فرماتے ہیں ؎

ہے گلہ مجھ کو تری لذتِ پیدائی کا — تو ہوا فاش تو اب ہیں مرے اسرار بھی فاش
شعلے سے ٹوٹ کے مثلِ شررِ آوارہ نہ رہ — کر کسی سینۂ پرسوز میں خلوت کی تلاش

اقبال کی زندگی میں ان کے کلام پر بڑے بڑے طوفان اٹھے اور کیسی کیسی
دل آزار تنقیدیں و تنقیصیں شایع ہوئی ہیں مگر اس "مردِ خود آگاہ" نے سوائے
خاموشی کے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ "بانگِ درا" میں فرماتے ہیں ؎

بُرا سمجھوں انھیں مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبال اپنے نکتہ چینوں میں

یہ محض باتیں ہی باتیں نہ تھیں بلکہ حقیقت تھی ——— اپنی کمزوری پر
خود نکتہ چینی کرتے ہیں ؎

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

یہ گفتار کا غازی "حق گوئی" میں بہت بیباک تھا۔ سیاسی، مذہبی، معاشرتی
و اخلاقی مسائل کے باب میں نہ تو وہ کٹ ملائیانہ تہذیب کا پجاری۔ وہ "مردِ مومن"
تھا اور راست گفتاری اس کا شیوہ تھا۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق !!
نہ ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند

اس بندۂ بیباک کی گرم گفتاری کا چرچا بارگاہِ خداوندی تک پہنچا
شکوہ و شکایت کے دفتر کھلے۔ فرشتوں نے غمازی کی مگر یہ بندۂ گستاخ
باز نہ آیا، خود فرماتے ہیں ؎

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی
گستاخ ہے کرتا ہے فطرت کی حنا بندی

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے
آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

اقبال نے حب دین و وطن کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے
بعض کوتاہ بینوں نے ان کو حبِ وطن سے بیگانہ تصور کر لیا ہے لیکن ان کے کلام کا
صحیح مطالعہ لوگوں کے اس بے بنیاد تصور کو رد کر دیتا ہے۔ وطن کی محبت کا ایک
ہمہ گیر ثبوت اقبال کا "ترانۂ ہندی" ہے جس میں بقول ڈاکٹر جگر درتی "اقبال
کی وطن پرستی تمام ہندوستان کے باشندوں کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے"
یہ ہندوستان کی محبت ہی تو تھی جو ان کو ملک کی بربادی اور اہلِ وطن کی نااتفاقی
پر آٹھ آٹھ آنسو رلاتی تھی ؎

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

——— (بانگِ درا)

وہ اپنے ہم وطنوں کو یورپ کی دستگیری سے آزاد ہو کر اپنے پیروں پر
کھڑے ہونے کی تعلیم دیتے تھے ؎

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کا احساں — سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

——— (ضربِ کلیم)

ہندوستان کے بعض فرقہ سازوں کی خود غرضی اور فرقہ پرستی کے کر

ان کا درد آشنا دل بےچین ہو جاتا تھا اور وہ تڑپ اُٹھتے تھے ؎

یہ ہندی کے فرقہ ساز اقبالؔ آذری کر رہے ہیں گویا

بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہِ حجاز ہو جا

لیکن ان خیالات نے ان کو ہندوستان سے متنفر نہیں کیا۔ ضربِ کلیم میں ان کا یہ شعر ہندوستان کے لئے باعث فخر ہے ؎

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز

اقبالؔ کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب (ضربِ کلیم)

صرف ہندوستان ہی سے نہیں بلکہ ان کو سارے ایشیا سے محبت تھی جس میں وہ بیداری کی روح پھونکنا چاہتے تھے ؎

عطا ہوا خس و خاشاک ایشیا مجھ کو

کہ میرے شعلہ میں ہے سرکشی و بیباکی

آخر آخر درویشی و قلندری نے ان کو مشرق و مغرب، ہند و ایران تمام سے بیگانہ و برتر بنا دیا تھا ؎

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی

گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی

رومی ہے نہ شامی ہے کاشی نہ سمرقندی

——————— (بالِ جبریل)

اقبالؔ نے مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کی تھی۔ ان کا کلام شاہد ہے کہ ان ملکوں کے حالات سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں اقبال تعلیم کی غرض سے انگلستان تشریف لے گئے مغربی قوموں کی عملی جد و جہد اور رجحانات دیکھ کر مدیر مخزن یعنی علامہ سر عبد القادر کے نام یہ پیام بھیجا ؎

مدیر مخزن سے جا کے اقبالؔ کوئی میرا پیام کہدے

جو کام کچھ کر رہی ہے قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

اُسی زمانہ میں اپنے عزیزوں کی تسلی کے لئے لکھا تھا ؎

جو گھر سے اقبالؔ دور ہوں میں تو ہوں نہ محزوں عزیز میرے

مثالِ گوہر وطن کی فرقت کمال ہے میری آبرو کا!

——————— (بانگِ درا)

مصر فلسطین اور ہسپانیہ کی سیاحت کے بعد انھوں نے اپنے تاثرات "بالِ جبریل" میں پیش کئے ہیں جن میں سچا اسلامی عشق و جوش کارفرما ہے ارشاد ہوتا ہے ؎

تھی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے

دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

ہوائے قرطبہ شاید یہ ہے اثر تیرا

مری نوا میں ہے سوز و سرورِ عہدِ شباب

غرناطہ بھی دیکھا مری آنکھوں نے ولیکن

تسکینِ مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں

اقبالؔ نے ایک قومی رہنما و مصلح کی حیثیت سے مسلمانوں کو خوابِ غفلت میں دیکھ کر اپنے "جبریل آشوب" نغموں سے جگایا۔ مسلمانوں کی پست و شکستہ حالت دیکھ کر ان پر قنوطیت کا جذبہ نہیں طاری ہوا بلکہ تاریکی میں اُمید کی جھلک نظر آئی ؎

دیا اقبالؔ نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا

یہ اک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

"ساقی نامے" میں اپنی تمناؤں کا اظہار کیا ہے ؎

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے   مرا عشق میری نظر بخش دے

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں   مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز   مری خلوت و انجمن کا گداز

اُمنگیں مری آرزوئیں مری   اُمیدیں مری جستجوئیں مری

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر   اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے

لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے (بالِ جبریل)

سیاست اور اُس کی پیچیدہ چالوں سے ان کو سخت نفرت تھی ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

غواص تو فطرت نے بنایا ہے مجھے بھی

لیکن مجھے اعماقِ سیاست سے ہے پرہیز

لیکن یورپ کے سیاسی فریبوں اور مظلوم قوموں پر ستم رانیوں کا پردہ فاش کرنا ان کا حصہ تھا۔ "دامِ تہذیب" میں کہتے ہیں ؎

اقبالؔ کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے   ہر ملتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار

کمزور قوموں سے ان کو گلہ ہے کہ وہ اپنی طاقت اور قوت کھو کر یورپ کی غلام کیوں بن گئیں چنانچہ ہندوستان کے لئے کہتے ہیں ؎

تو کیوں ہوا یورپ کی غلامی پہ رضامند

مجھکو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

حضرت اقبالؔ کی شاعری مولانا جلال الدین رومیؒ کے جذباتِ عالیہ کی بہت کچھ مرہونِ منت ہے۔ اقبالؔ کو ان کے عرفانی کلام سے جو روحانی

فیض پہنچا ہے اس کا اعتراف ہر جگہ کیا ہے ؎

تو بھی ہے اسی قافلہ شوق میں اقبال
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومیؒ

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

صحبت پیر روم سے مجھ پر ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سربجیب، ایک کلیم سربکف

انھوں نے یورپ کی مادہ پرستی اور فرنگیت کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے یہ فی الحقیقت پیر روم کی صحبت کا نتیجہ تھا۔ کیا خوب ارشاد فرمایا ہے ؎

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا ۔۔۔ تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

ان کے کلام کی روح رواں قلندری و فقیری ہے یہ وہ درویشی ہے جو رومی سے اقبال تک پہنچی ہے اور جس کے آگے شہنشاہیت و ملوکیت بھی سر جھکاتی ہے ؎

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے ۔۔۔ خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکارا ہوا
قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

انھوں نے جرمنی کے مشہور مجذوب فلسفی نطشہ (جرمن فلسفی، نطشے) کے خیالات کی تنقید اپنی نظموں میں اکثر کی ہے۔ وہ نطشہ کے لئے لکھتے ہیں

"جرمنی کا مشہور مجذوب فلسفی نطشہ جو اپنی قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کر سکا اور اس لئے اس کے فلسفیانہ افکار نے غلط راستے پر ڈال دیا" (بال جبریل صفحہ ۸۲)

یہ عبارت بال جبریل کے حاشیہ پر درج ہے جہاں اقبال نے اس گمراہ فلسفی کے لئے کہا ہے ؎

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں ۔۔۔ تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے
حریف نکتہ توحید ہو سکا نہ حکیم ۔۔۔ نگاہ چاہئے اسرار لاالٰہ کے لئے

(ضرب کلیم)

ان اشعار سے یہ نہ قیاس کر لینا چاہیئے کہ اقبال اس حکیم المانوی کی فکر بلند کا قائل نہ تھا۔ اقبال کے دل میں نطشہ کی کتنی عظمت تھی خود انھیں سے سنتے چلئے۔ "جاوید نامہ" میں کہتے ہیں ؎

من بہ رومی گفتم "ایں دیوانہ کیست؟" ۔۔۔ گفت "ایں فرزانۂ المانوی ست"

باز ایں حلاج بے دار و رسن ۔۔۔ نوع دیگر گفتہ آں حرف کہن
حرف او بیباک و افکارش عظیم ۔۔۔ غربیاں از تیغ گفتارش دو نیم

شاعر کی فلسفیانہ قابلیت اور وسعت نظر کا ایک زمانہ معترف ہے۔ خود شاعر نے اس کا اعتراف اسی اپنی فطری انکساری کے ساتھ اپنے کلام میں کیا ہے ؎

ہے فلسفہ میرے آب و گل میں ۔۔۔ پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبال اگرچہ بے ہنر ہے ۔۔۔ اس کی رگ رگ سے باخبر ہے

ان کی شاعری ان کے فلسفۂ خودی کی تفسیر ہے۔ اس نظریہ سے دنیا کو روشناس کرانے کا سہرا اقبال کے سر ہے۔ "ضرب کلیم" میں ان کا ایک قطعہ ہے۔ "اقبال" ؎

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی
مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش
حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
اک مرد قلندر نے کیا راز خودی فاش

اقبال موجودہ تعلیم کی جانب سے بہت ہی غیر مطمئن اور متنفر تھے۔ وہ مذہب کو تعلیم و تربیت کا جزو لاینفک سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ موجودہ تعلیم بچوں میں پست و غلامانہ ذہنیت پیدا کرتی ہے۔ اس تعلیم سے خود ان کی "خودی" کا خون ہوتا ہے۔ ؎

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا (بانگ درا)

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا
موزوں نہیں مکتب کیلئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات (ضرب کلیم)

اپنی آخری تصنیف "ضرب کلیم" میں انھوں نے طبقۂ نسواں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ان کو اس طبقے کی مظلومیت کا بہت احساس اور غم تھا مگر اس کے نازک مسائل کا حل وہ نہ پیش کر سکے اور یہ کہہ کر خاموش ہو گئے ؎

میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

شہرت و عظمت جو اس شاعر اعظم کو اپنی زندگی میں حاصل ہوئی خدا کی دین تھی جس کا وہ شکر گزار رہتا لیکن اس کو خدا سے یہ شکایت جیتے جی رہی

کہ اُسے بجائے ایک آزاد ملک میں پیدا کرنے کے ایک ایسے دیس میں پیدا کیا جو غلامی کا دم بھر رہا ہے۔ "پیام مشرق" میں اپنا مقابلہ جرمنی کے مایہ ناز شاعر گوئٹے (Goethe) سے کرتے ہوئے کس حسرت سے کہتے ہیں ؎

او چمن زادہ چمن پروردۂ — من دمیدم از زمینِ مردۂ

شکر و شکایت

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا
رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

(ضربِ کلیم)

وہ "شاعرِ فردا" جب عصرِ حاضر کو اپنے جلیل القدر پیغامات پہنچا چکا تو "دانائے راز" بن کر اسی قلندرانہ شان سے یہ کہتا ہوا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید — نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے — دگر دانائے راز آید کہ ناید

(اقبال رحؒ)

صحیفۂ عرش

زمانہ آج بھی مصروفِ انقلاب میں ہے!

از حضرت عرش حیدری

دل آج حد سے سوا جوشِ اضطراب میں ہے — صد آفتاب کی گردش اک آفتاب میں ہے
فقط ازل پہ نہ بھیں کُن کی شورشیں موقوف — زمانہ آج بھی مصروف انقلاب میں ہے
تری نگاہ سے رنگینیٔ سحر پیدا — جو رات ہے تو مرے عالمِ شباب میں ہے
کبھی یہ راز کو کمبخت راز رکھ نہ سکا — یہی تو بات دلِ خانماں خراب میں ہے
ہزار تیری نظر میں حرام ہے واعظ — تری بہشت کا حاصل اسی شراب میں ہے
مجھے ہے نیند پہ اپنی گمانِ بیداری — الٰہی آج یہ کس کا خیال خواب میں ہے؟
غلط ہے موت سے پہلے سکونِ دل اے عرش
مری حیات کا مقصد ہی اضطراب میں ہے

بغاوت

انقلابی افسانہ

از جناب بدر ہاشمی!

"ظلم کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ہم لوگ کب تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ستم کی چکیوں میں پستے رہیں گے۔ نوجوانو! کیا تمھاری رگوں میں خون منجمد ہوگیا ہے؟ کیا تمھارا خون پانی ہوگیا ہے؟ تمھاری آنکھوں کے سامنے تمھاری ماں بہنوں کی عصمت اور عفت کی توہین ہوتی ہے تم سب دیکھتے ہو اور مہر بلب رہتے ہو۔ کیا تمھیں شرم نہیں آتی؟ تمھارے بال بچے اور ماں بہنیں بھوک سے تڑپتے ہیں۔ تمھارا شہنشاہ انھیں دیکھتا ہے اور مسکراتا ہوا نکل جاتا ہے۔ تمھارے سینے پر مونگ دلی جاتی ہے لیکن تمھارے کان پر جوں تک نہیں رینگتی کیا تمھارے دست و پا شل ہوگئے ہیں؟ کیا تمھاری آنکھیں بے نور ہوگئی ہیں؟ کیا تمھارا دل بے حس ہوگیا ہے؟

بڑھو! آگے بڑھو!! قصر شاہی کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ انھیں انہی کے استبداد کے شکنجوں میں پیس ڈالو۔ وہ جواب تک ہم پر ظلم کرتے آئے ہیں انھیں آزادی کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں بہا دو۔ انھیں صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا ڈالو۔ انہی کے خونوں سے ان کے قلعوں کو سرخ رنگ دو۔ جوانمردو، بڑھو آگے بڑھو۔ اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالو۔ بڑھو آگے بڑھو"

وہ جوش سے اُبل پڑا۔ تھرتھرانے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر گر کر اس کے جھریوں والے گالوں پر بہنے لگا۔ اس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی، وہ آگے نہ بول سکا۔ بادشاہ کے ظلم و ستم سے ملک کے تمام باشندے تنگ آگئے تھے لیکن کوئی شخص اپنے بادشاہ کے خلاف آواز نہ اٹھا سکتا تھا۔ اس کے رُعب سے تمام رعایا کانپتی رہتی تھی۔

باغیوں کا ایک دَل پہاڑ کی کھوہ میں ہر روز بیٹھکر بغاوت کی ترکیبیں سوچتا۔ جو کارگر ثابت نہ ہوتیں۔ نجات کی کوئی صورت نہ تھی۔ شہنشاہ کو سب کچھ معلوم تھا۔ ہزاروں باغی موت کے گھاٹ اتارے جاچکے تھے ان کے پیچھے جاسوس چھوڑے جاچکے تھے لیکن سازش جاری تھی۔

بُڈھے کی پرجوش تقریر نے نوجوانوں کا خون کھولا دیا۔ ہر شخص موت یا آزادی کا خواہشمند تھا۔ رات کی تاریکیوں میں پہاڑی کے دامن میں بڈھے نے اپنا آخری پیغام نوجوانوں کو پہنچایا اور آفتاب کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اُسے سولی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔

شاہزادہ ہرن کے تعاقب میں تھک کر چور گھوڑے پر آہستہ آہستہ واپس جارہا تھا۔ پیاس کے باعث اس کا حلق سوکھ گیا تھا۔ وہ اپنے ہونٹوں کو زبان سے چاٹ رہا تھا کہ یکایک اس کی نظر ایک جھرنے پر پڑی جس کے کنارے ایک درخت کھڑا جھوم رہا تھا۔ ایک حسین دوشیزہ پانی میں پاؤں لٹکائے ہاتھ میں ایک گھڑا لئے کچھ گنگنا رہی تھی۔ شاہزادہ کی آنکھیں فرط مسرت سے چمک اٹھیں اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور جھرنے پر آگیا۔ لڑکی کانپ گئی اس کے منہ سے ہلکی سی ایک چیخ نکل گئی۔

"ڈرو مت! میں تمھیں کوئی تکلیف پہنچانے نہیں آیا — پانی پلاؤ گی؟ بہت پیاسا ہوں —!" شاہزادے نے گھوڑے سے اُترتے ہوئے کہا۔

لڑکی نے ڈرتے ڈرتے اس کے کاسے میں پانی اُنڈیلا۔

"تم اتنی خوفزدہ کیوں ہو؟ میں بھی تو تمھاری طرح انسان ہوں۔" شاہزادے نے اسے سرسری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں ... میں ... ڈرتی ہوں" لڑکی کے الفاظ ٹوٹے ہوئے تھے!

"کیوں؟" شاہزادے نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں!" اُس نے شرماتے ہوئے کہا۔

"کس لئے؟" شاہزادے نے حیرت سے پوچھا۔

"شہنشاہ کے حاکم لڑکیوں کو پکڑ کر دربار میں لے جاتے ہیں۔" اُس نے معصومانہ انداز میں جواب دیا۔

"نہیں تو! "یہ جھوٹ ہے"۔ شاہزادے نے کہا۔

"میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی"۔ اس نے کانپتے ہوئے کہا۔

شاہزادے نے ایک طلائی زنجیر اپنی گردن سے اُتاری اور ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن میں ڈالدی۔

"تم بہت حسین معلوم ہوتی ہو" شاہزادے نے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے کہا اور اپنی راہ لی۔ وہ ہر روز سرِ شام جھرنے کے پاس آتا اور پانی پی کر چلا جاتا وہ اسے چاہتا تھا لیکن اظہار محبت نہ کرسکتا تھا۔

ایک چاندنی رات جب ساری دنیا نیند کی آغوش میں مُردہ پڑی تھی پہاڑ کے دامن میں چاند مسکرا رہا تھا۔ ہر سو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ فضا رنگین اور دلکش تھی وہ دونوں جھرنے کے پاس ایک ٹیلے پر بیٹھے آہستہ آہستہ باتیں

کررہے تھے۔ جھرنے کے کنارے درخت پر سرخاب کا ایک جوڑا بیٹھا تھا۔

"شمیم ـــ!"

"کیا ہے زرینہ ـــ؟"

"تم شاہزادہ ہو ـــ؟"

"تو کیا ہوا ـــ؟"

"ظلم کو کیوں نہیں روکتے؟"

"میرے بس کی بات نہیں زرینہ!"

"تم شاہزادہ ہوکر بھی ظلم کو نہیں روک سکتے؟"

"چھوڑو ان باتوں کو ـــ؟"

"ہاں ـــ!"

"تم بہت پیاری معلوم ہوتی ہو۔"

"سچ ـــ!"

شمیم کے مرتعش ہونٹوں نے زرینہ کے عنابی ہونٹوں کو "سچ" کی مہر سے بند کردیا۔ عریاں گوری باہیں شمیم کی گردن کے گرد حمائل ہوگئیں۔ بادل کے ایک سفید ٹکڑے نے بڑھ کر چاند کو اپنی آغوش میں لے لیا اور فطرت نے ان دو معصوم ہستیوں کو پریم کی ڈور میں منسلک کردیا۔

شاہزادے کی زندگی میں یکایک انقلاب رونما ہوا۔ وہ اداس کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ اور اس کے بعد زرینہ سے کچھ گریز کرنے لگا۔ زرینہ کے یہ الفاظ "تم شاہزادہ ہوکر بھی ظلم کو نہیں روک سکتے" اس کے دل ودماغ پر چھاگئے تھے اس کی آنکھیں اپنے باپ کی ظالمانہ روش کو دیکھتیں۔ لیکن وہ چپ تھا۔

رات اندھیری اور ڈراونی تھی۔ جنگلی جانوروں کی ہیبتناک آوازیں فضا کو مہیب اور وحشتناک بنا رہی تھیں۔ شمیم اپنے بستر پر پڑا کسی خاص خیال میں غرق تھا۔ یکایک وہ بستر سے اٹھا اور تاریکیوں میں گم ہوگیا۔

شاہزادہ کا کوئی پتہ نہ تھا۔ شاہی محل میں ایک شور بپا تھا۔ شہنشاہ نے تلاش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا لیکن شمیم نہ ملنا تھا نہ ملا۔

زمانہ کی رفتار کے ساتھ شہنشاہ شمیم کو بھولتا گیا اور پھر اپنی ظلم کی چکیوں میں غریب رعایا کو پیسنے لگا۔

"مجھے چھوڑ دیجیے، جانے دیجیے جہاں پناہ! میری عصمت پر رحم کیجیے میں اپنی عصمت کی بھیک مانگتی ہوں عالم پناہ۔ رحم! آپ اتنے بڑے شہنشاہ ہیں! میری بیکسی اور بے بسی پر رحم کیجیے۔ میری دولت مجھ سے نہ چھینیے۔ آپ نے مجھے یتیم کیا میں کچھ نہ بولی۔ شہنشاہ! میں شاہزادی ہوکر کیا کرونگی۔ مجھے میرے گاؤں واپس جانے دیجیے۔" زرینہ نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

"ہاہاہا! ہاہاہا! تمھاری مدبھری جوانی۔ تمھارا حسین بھولا چہرہ، تمھیں میری گود میں آنا ہی پڑے گا۔" بادشاہ نے اسے ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔

"شمیم! شمیم! تم کہاں ہو؟" وہ بے بسی میں چلانے لگی۔

"شہنشاہ! شرافت کی حد سے آگے نہ بڑھو۔ ظلم کی حد سے زیادہ باہر قدم نہ رکھو۔ ورنہ برا ہوگا۔ زرینہ پر ہاتھ اٹھانا اچھا نہیں۔ ایک معصوم لڑکی کی عصمت دری بجا نہیں۔ اگر اپنے ارادوں سے باز نہ آئے تو سر تن سے جدا کردیا جائے گا۔" ایک نقاب پوش نے غصے میں کانپتے ہوئے کہا اور آن کی آن میں محل سے نکل گیا۔ شہنشاہ نے پلٹ کر دیکھا۔ زرینہ غایب تھی۔

شہروں اور دیہاتوں میں کھلم کھلا بغاوت ہورہی تھی۔ بغاوت کا بڑھتا ہوا سیلاب قصر شاہی سے ٹکرایا۔ باغیوں کا سردار حیدر ہاتھ میں سیاہ جھنڈا بلند کیے تیزی سے محل کی جانب بڑھتا چلا آرہا تھا۔ شاہی فوج کے سر کٹ کٹ کر ڈھیر ہورہے تھے۔ باغی اپنے خون سے ہولی کھیل رہے تھے۔ وہ مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ موت ان کے لئے کھیل تھی۔ وہ ظلم کی دیواروں کو توڑنے آئے تھے ان کا سینہ ظلم کے تیروں کے سامنے ڈھال بنا ہوا تھا۔ وہ شاہی ظلم کے خلاف انصاف کی تلوار پر سر ٹیکے ہوئے تھے۔

حیدر نے قلعہ کے پاس پہنچتے ہی گرج کر کہا۔ "پھاٹک توڑ دو" حیدر کی تلوار بیدردی سے پھاٹک کے پہرہ داروں کا گلا کاٹ رہی تھی۔ کسی نے اندر سے پھاٹک کھول دیا۔ باغی قلعہ میں گھس پڑے۔ محل کا دروازہ بند تھا۔

وہ چابیوں کا گچھا لئے بھاگی جارہی تھی۔ شہنشاہ نے اسے دیکھا تلوار کا وار کیا۔ اس کا دایاں بازو جدا ہوگیا۔ سپاہیوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ دانتوں میں چابی دبائے بائیں ہاتھ سے دشمنوں کا مقابلہ کرتی ہوئی "شمیم شمیم" چیختی ہوئی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔

وہ محل کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اس نے تالا کھول دیا۔ ناگاہ شہنشاہ کی تلوار چمکی اور زرینہ کے سینہ میں پیوست ہوگئی۔ دروازہ کھل گیا۔ وہ شمیم کہتی ہوئی حیدر کے قدموں پر گر پڑی۔

شمیم کی آنکھیں سرخ ہوگئیں اس نے پلٹ کر دیکھا اور شمیم کی تلوار بادشاہ کے سینہ میں پیرنے لگی۔ بادشاہ کے منہ سے بیساختہ نکل گیا ـــ "حیدر تم شمیم تھے ـــ؟" شمیم زرینہ کی لاش پر جھکا اور کہنے لگا۔

"تم خاموش ہوگئیں زرینہ! میں نے اپنا فرض انجام دے دیا۔ دیکھو میں نے ظلم کو مٹا دیا۔" کسی نے پیچھے سے شمیم کا سر تن سے جدا کردیا۔ وہ تڑپ کر زرینہ کی لاش سے لپٹ گیا۔

وجدانیات!

زیست اس خواب کی تعبیر ہے جو یاد نہیں!

ازحضرت آرزو سہارنپوری

عشق مجبورِ فغاں اے دلِ ناشاد نہیں — یہ تو اک حسن کی تائید ہے فریاد نہیں
لذتِ بیخودیٔ دید کی روداد نہ پوچھ — اک فسانہ ہے جو کچھ یاد ہے کچھ یاد نہیں
اب مرے عشق کی پرواز وہاں ہے کہ جہاں — حسن بھی وجہِ سکونِ دلِ ناشاد نہیں
موت دراصل ہے بیداریٔ احساس کا نام — زیست اس خواب کی تعبیر ہے جو یاد نہیں
وہ ستمگر ہے اب آمادۂ فریاد رسی — وائے فریاد کہ اب طاقتِ فریاد نہیں
میرے معیارِ محبت کو نہ پوچھو مجھ سے — انتہا یہ ہے کہ اب تم بھی مجھے یاد نہیں
تیرا ہر درد ہے سرمایۂ ادراکِ وجود — گنجِ احساسِ محبت ہے تری یاد نہیں
ایک پابندِ وفا، ایک جفا کا پابند — عشق مجبور سہی حسن بھی آزاد نہیں
حسنِ معنی کی تماشائی ہیں نظریں میری — پڑھ رہا ہوں وہ صحیفے جو مجھے یاد نہیں
یوں تو کیا کچھ نہیں دنیائے محبت میں مگر — ہائے وہ قید کہ جس قید کی میعاد نہیں
عہدِ رنگین ستم، مشقِ جفا، دورِ فراق — مجھ پہ گزرا تو بہت کچھ ہے مگر یاد نہیں
لذتِ عشق ہے بیدادگری کے دم سے — وہ چمن ہی نہیں جس میں کوئی صیاد نہیں
میرے دل میں تری تسکین کے سو پہلو تھے — او مرے بھولنے والے تجھے کیا یاد نہیں؟

اب بھی ملتا ہے مجھے آرزو عشرت کا پیام
مائلِ عیش مگر خاطرِ ناشاد نہیں!

حسن و عشق

کوئی تجھ بن نہیں ہے جب موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے ؟ (غالب)

دنیائے عشق کی دلگداز داستانیں کچھ داغی عیاشی ہی کا سامان نہیں بلکہ ان حسرت واندوہ سے لبریز افسانوں میں عرفان و معرفت کے نہایت باریک نکتوں کی تشریح کردی گئی ہے جن سے عشق حقیقی کا پتہ چلتا ہے اس لئے بیجا نہ ہوگا اگر کہدیا جائے کہ ایک عاشق صادق "جویائے حق" اور محبوب مجازی، محبوب حقیقی کی حیثیت رکھتا ہے۔

کیجیے عشق مجازی سے حقیقی کا پتہ
دیکھیے اللہ کو انسان کی پوشاک میں ! (نوح ناروی)

یہ عشق جذبۂ اعلیٰ ترین فطرت ہے
یہ نور قلب و چراغ رہ طریقت ہے (مدہوش ایم اے)

لیکن راہ طریقت نہایت دشوار گزار اور پرخطر ہے جس میں اولین شرط دنیاوی حرص و ہوس پر قابو پانا ہے۔ جس کے بعد طلب، عشق، معرفت استغنا، توحید، حیرت اور فقر، سلوک کی تمام منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں اور جب مستقل مزاجی، ایمان، عبادت اور ریاضت سے۔ بالآخر فقر کی آخری منزل تک رسائی ہو جاتی ہے تو مرکز تحقیق کا پتہ چلتا ہے۔

بتلادیا ہے راہنما نے مجھے پتہ
دنیا بھی اک مقام تری رہگذر میں ہے ! (اسمٰعیل میرٹھی)

مٹ چلے ہیں عذاب و ثواب کے مفہوم
رموز عشق میں اے شیخ دینیات نہیں (فراق گورکھپوری)

راہ سلوک میں مقام حیرت کی "آخری حد" ہمہ اوست ہے۔ جہاں طالب وفور شوق سے وحدت کے عمیق بحر کو خود میں سمایا ہوا پاتا ہے اور کائنات (جواس کا ادنیٰ سا جزو ہے) کی ہر شے میں اُسے محبوب کا جلوہ نظر آتا ہے وہاں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ طالب کے دل میں بجز دیدار دوست اور کوئی تمنا باقی نہیں رہتی جس کے باعث وہ ان مجازی جلوؤں پر ہی مفتون ہو کر محبوب کی تلاش ترک کر دیتا ہے۔ گویا جسم و جان کی بازی لگا کر ایک اعلیٰ اور ارفع مقام پر پہنچنے کے بعد پھر بے راہ ہو جاتا ہے۔

تصوّف

از جناب فرحت ہاشمی !

ؔ راہ طلب میں ایسے خود رفتہ ہو رہے ہیں
منزل پہ ہم پہنچکر منزل کو ڈھونڈتے ہیں ! (جلیل مانکپوری)

ؔ عشق کی مستیوں میں ہستی کیسی بت پرستی میں خود پرستی کیسی !
بیخودی نے شراب دی ایسی بھولا نہ میں جہاں کو تو مستی کیسی !
(فرحت کانپوری)

بلاشبہ یہ ایک حقیقت ہے کیونکہ محویت لازمہ محبت ہے اور محویت کا انجام بیخودی ہے جس میں منزل کا ہوش ناممکن ہے۔ بقول کسے۔

"عشق کا پہلا قدم عقل کی آخری ہچکی ہوتی ہے"

یعنی ؔ ہے آرزوئے دید تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی ! (اقبال)

اس بیخودی کو خالص محبت کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ ایسی خرابی میں بھی لاکھ تعمیریں مضمر ہوتی ہیں کہ طالب جلوہ ہائے خیال ہی میں محو ہو کر "فنا فی المحبوب" کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اور چونکہ خدائے عزوجل کے نزدیک شرک انسان کے تمام گناہوں سے بدترین گناہ ہے اس لئے وہ ایسے عاشق صادق کو جو آئینہ ایسے دل کا مالک ہوتے ہوئے نفس کے آخری وار کا شکار ہو جاتا ہے ہرگز ہرگز ہاتھ سے جانے نہیں دیتا کیونکہ جب لو لگ جاتی ہے تو طالب و مطلوب میں فرق نہیں رہتا۔ دونوں ایک دوسرے کے شیدا اور متلاشی ہو جاتے ہیں۔ یہی راز منصور کے بیگانۂ ہوش و خرد ہو کر "اناالحق" کہنے کا تھا۔ جہاں طالب کو حضرت آدم علیہ السلام کی طرح کچھ عرصہ سرگرداں رہنے کے بعد مطلوب

ؔ نیم جاں بستاند و صد جاں دہد
آنچہ در وہمت نہ آید آں دہد (مولانا روم)

گویا ؔ بگاڑا دل کو گننہ نے سنوارا تو بنے
یہ گھر خراب کئے سے خراب ہو نہ سکا (بیخود دہلوی)

شعرا ہمیشہ سے اس حقیقت کا اظہار کرتے آئے ہیں ؔ

جانا جس نے اس نے مانا تجھکو مانا جس نے اس نے جانا تجھکو
کھونا تجھکو ہے ڈھونڈنا آپ کا آپا کھونا ہے صاف پانا تجھکو
(ثاقب کانپوری)

۵ جز خودی کچھ نہیں کوئے حبیب میں
جب ہو گیا میں گم تو ملا راستہ مجھے! (جمیل ٹکپوری)

۵ بلندیوں کی ہوس میں مائل افتادگی ہو جا
کہ شبنم قوتِ پرواز پاتی ہے پستی میں! (اقبال ترسی)

۵ کمالِ بندگی کی رفعتیں مضمر ہیں پستی میں
کہ معراج پائی خاک پر میں نے جبیں رکھ کر! (متین لکھنوی)

۵ شاہدِ عصمت کو پردے سے نکل آنا پڑا
حسن با پردہ بھی یارب کس قدر ناچار تھا! (بیخود موہانی)

۵ تعالی اللہ تا دمِ عشق پہنچا ہے کہاں میرا
جبینِ حسن ہے اب سنگِ آستاں میرا! (سیماب اکبرآبادی)

۵ ابتدا یہ تھی کہ میرے لب پہ اس کا نام تھا
انتہا یہ ہے کہ اس کے لب پہ میرا نام ہے! (خلیق)

۵ حسن تجھکو ڈھونڈنے آئیگا او گرم تلاش
عشق کی معراج یعنی جذب کامل چاہئے! (اختر جالندھری)

گویا مطلوب اس مشکل ترین حالت میں پریشان نہیں ہوتا بلکہ نہایت آسانی سے مخاطب کے پاس آ پہنچتا ہے۔ سائٹرائیکٹ ایک مشہور جرمن فلسفی کا قول ہے کہ:-

"جو حق سے چھپتا ہے وہ آخر اس کی گود میں آ پہنچتا ہے۔"

ایک انگریز صوفی شاعر فرانسیس ٹامس اپنی ایک مشہور نظم (HAND OF HEAVEN) میں اس نرالی طلب کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ:- "انسان جو روز ازل ہی سے طالب حق ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق بھی انسان کا خواہاں ہے" حقیقت میں طالب مطلوب اور مطلوب طالب ہے

ع عشق اول در دلِ معشوق پیدا می شود

پاسکل ایک فرانسیسی حکیم کہتا ہے —— "اگر ہم نے خدا کو تلاش کر لیا ہوتا تو ہم اس کی جستجو نہ کرتے"

ٹیگور فرماتے ہیں —— "خدا محبت ہے!"

۵ شمع کا جلنا ہے یا سوزشِ پروانہ ہے
چند لفظوں میں یہی عشق کا افسانہ ہے! (اختر موہانی)

۵ ہوں شاہدِ تنزیہ کے رخسار کا پردہ
یا خود ہی میں شاہد ہوں کہ پردے میں چھپا ہوں (مصحفی امروہی)

۵ پھر رخِ گلرنگ سے یوں حسن نے الٹی نقاب
مجھ پہ پھر میرے ہی جلوؤں کو عیاں کر دیا! (وصل بلگرامی)

۵ مجھی کو دیکھ لیں اب تیرے دیکھنے والے
تو آئینہ ہے مرا تیرا آئینہ ہوں میں (امیر وارثی)

۵ حسن و عشق ایک ہیں ظاہر میں فقط ہیں دو نام
یہ سچ ہے تو کیا ان کے برابر ہم ہیں (شاد عظیم آبادی)

مولانا رومؒ نے بھی مثنوی میں یہی نغمہ سنایا ہے ؎

تشنگاں گر آب جویند از جہاں
آب ہم جوید بعالم تشنگاں

کائنات کس قدر وسیع کیوں نہ ہو اور وہ انسان جس میں حسن ستیز ہو خود کو کسی گوشہ میں کیوں نہ چھپا دے خدا (جو عالم الغیب اور اس پر شیدا ہے) کی دوررس نگاہیں اسے ظلمت سے اجالے میں لے آتی ہیں۔

ان اللہ جمیل یحب الجمال!!

اسی طرح عاشق و معشوق ہر دو میں سے کوئی کسی کے سامنے نہیں آتا تو یہ فراق دیرپا ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ محبت کے سامنے باطل کاریوں کو کوئی بقا نہیں ہوتی۔

"عشق حسن کو اور حسن عشق کو ڈھونڈ لیتا ہے۔" (ماخوذ از سنگم)

پجاری بولا۔ "اور اس کمال کا راز محبت میں مضمر ہے۔ محبت ہی تو دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے سچا اصول ہے کیشب!"

کیشب نے کہا۔ "نہیں دوست! یہ بہت پر خطر رستہ ہے۔ سنسار جھوٹا ہے اسے اور اس کی ہر چیز کو تیاگ دو۔ یہ چک صرف مہاتما بدھ کے قدموں ہی میں مل سکتی ہے۔ تم اپنا تن من دھن سب انہیں کے چرنوں میں ارپن کر دو۔"

پجاری بولا۔ "مدت ہوئی جب سے سونپ چکا ہوں مگر وہ اُسے قبول نہیں کرتے۔"

"رو اور گڑگڑا کر پرارتھنا کرو۔"

"وہ نہیں سنتے۔"

"اپنے دل کی خواہش کو کچل ڈالو کہ یہ پاپ ہے ——— ہر جذبہ کو نکال کر پھینک دو۔"

"کیشب! یہ آگ اب بجھائے نہیں بجھتی۔"

پجاری اٹھا اس نے مہاتما بدھ کے مندر پر ایک نظر ڈالی اور چل دیا، کیشب پکارتا رہا —— "دوست! ——— دوست!"

شانتا ہر روز مندر جاتی کہ شاید اسی بہانے اسے کہیں پجاری مل جائے اور وہ اُسے کہیں دیکھ سکے۔ وہ زندگی کے اس دور سے گزر رہی تھی جس سے شباب اپنا مفہوم پاتا ہے۔ وہ حسن کے خوابوں کی تعبیر تھی جیسے مصور کی گرمیٔ جنون زندگی سے ہمکنار ہو گئی ہو۔ جیسے فطرت کی رعنائیاں شباب کی ملکاریٔ کرتم گئی ہوں لیکن کرشمہ سازیٔ محبت! کہ وہ شانتا جس نے صرف پرستش کئے جانے ہی کے لئے جنم لیا تھا خود پجاری کی مجسم پوجا بنی جا رہی تھی۔ آہ! محبت نے کس کے قلب کو تاراج نہ کیا؟ پہلے وہ مندر میں مہاتما بدھ کی پوجا کو آتی تھی شروع شروع میں جب اس نے پجاری کو دیکھا تو اپنے قلب میں ایک نیا مدوجزر محسوس کیا ——— ایک نئی دھڑکن۔ پہلے پہل اس نے اس کے سمجھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی یا اگر کبھی سمجھنے کی کوشش کی تو سمجھ نہ سکی اور جب سمجھی تو مداوا غیر ممکن تھا۔ وہ راج محل کی مطربہ و مغنیہ تھی۔ اس لئے بارہا سرود و ساز کی تصویریں کھینچی تھیں اور ان میں جب اور جس طرح چاہا تھا رنگ بھر دیا تھا۔ اس نے اپنے رباب کے تاروں کی لرزشوں میں دلوں کی کسک سنی تھی ——— آخر، اپنا رباب لیکر اٹھی اور پجاری کی گزرگاہ کے قریب اپنی شدید ابدی رو کی کو چھیڑ دیا۔ کچھ عرصہ یہی اس کا مشغلہ رہا۔ وہ روز آتی اور ایک نیا راگ چھیڑ دیتی محبت اپنا پیغام آپ ہوتی ہے۔ پجاری جب اس راگنی کو سنتا تو محسوس ہوتا کوئی اس کا دامن پکڑ کر کھینچ رہا ہے۔ کوئی اس کے کانوں میں کہہ رہا ہے

"چل پجاری —— چل پجاری ——!"

آخر ایک دن وہ نغمہ کے تموّج میں بہتا ہوا شانتا تک پہنچ ہی گیا۔ شانتا جوش میں پاگل بنی جا رہی تھی۔ اس کی تمام ہستی کسی نامعلوم شعلے سے پھنکی جا رہی تھی۔ وہ رو رہی تھی اور بجا رہی تھی۔ پجاری خاموش کھڑا اس کا نغمہ سنتا رہا۔ نغمہ جو اس کی ہستی سے ساز باز کرتا ہوا اس پر چھاتا گیا۔ آخر اس نغمہ کا سحر رقیق بن کر اس کی آنکھوں سے بہنے لگا۔ شانتا نے منہ اٹھا کر پجاری کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے چھلکتے ہوئے ایک عنابی آنسو کو دیکھا۔ بولی "پجاری تم آ گئے ——؟" یہ کہہ کر اس نے اپنا رباب توڑ کر پھینک دیا اور چلی گئی۔ پجاری اُسے کھڑا دیکھتا رہا۔

اس بات کو ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ شانتا مندر آتی رہی۔ مگر اب وہ مہاتما بدھ کی نہیں اپنے دیوتا کی پوجا کرنے آتی تھی۔ یکایک ایک روز پجاری مندر سے غائب ہو گیا۔ عرصہ گزر گیا مگر وہ نظر نہ آیا کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں گیا۔ شانتا کی دیوانہ وار نظریں اس کا تعاقب کرتیں اور ناامید واپس لوٹ جاتیں۔ پجاری کو غائب ہوئے اسی طرح دو سال ہو گئے۔ راج محل کی مغنیہ شانتا اب ساز و نغمہ سب کچھ فراموش کر چکی تھی۔ اب وہ خود اپنے ہی جذبات کا ایک کھویا ہوا خواب تھی۔ اس کی حالت کو دیکھ کر خود محبت بھی اپنے کئے پر مدت سے آنسو بہا رہی تھی۔

پجاری اس تمام عرصہ میں دُور بہت دُور سب کچھ فراموش کر دینے سب کچھ بھول جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی روح تشنہ تھی۔ وہ اپنی زندگی کو طفلانہ بہلاوے دے دے کر بہلا رہا تھا مگر بے سود! محبت بھڑک کر پھر کبھی نہیں بجھتی ——— آخر کار وہ اپنی تمام قوت کو مجتمع کر کے مہاتما بدھ کے مندر میں شانتی حاصل کرنے اور ایک بالکل آخری فیصلہ کر لینے کے لئے رات کے وقت حاضر ہوا تھا۔ یہ اس کی کشمکش کی آخری رات تھی۔

شانتا نے اب مندر جانا بھی چھوڑ دیا۔ دو تین روز سے اس کی سہیلیاں اس سے کہہ رہی تھیں کہ مندر کے رستے میں دل میں ایک ہوک ڈال دینے والی راگنی کی آواز آتی ہے مگر شانتا کو اب اس میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ رباب کو توڑ کر پھینک دینے کے بعد اس نے کبھی کوئی راگنی نہ چھیڑی تھی۔ کوئی ساز نہ بجایا تھا۔ مہینوں گزر گئے۔ مندر کے رستے میں راگنی کی آواز آتی رہی۔ شانتا پجاری کے فراق میں اشکبار رہی اس کی سکھیوں نے اس کا غم بٹانا چاہا مگر وہ یہ کہہ کر ہٹ گئی۔

"غم میں دوسروں کو شریک کرنا گناہ ہے۔ یہ چیز بانٹی نہیں جا سکتی

یہ دولت بار بار نہیں ملتی، یہ تو ایک نعمت ہے جس سے زندگی اپنے مدارج پہچانتی ہے۔ پختہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر ہو جاتی ہے۔"

بہت دنوں کے بعد ایک تہوار آیا۔ سب مندر کو جانے لگے۔ مجبور ہو کر شانتا کو بھی جانا پڑا۔ جب اس مقام پر پہنچی جہاں بیٹھ کر وہ پجاری کے لئے رباب بجایا کرتی تھی تو ٹھٹک کر رہ گئی گویا کسی نے پیروں کو پکڑ لیا۔ تمام پچھلے واقعات ذہن میں آ گئے۔ دفعتہً ایک راگنی کی آواز آئی۔ شانتا کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ نہ معلوم کیوں اس کا بدن لرزنے لگا۔ آنسوؤں کا تار اس کی آنکھوں سے جاری ہو گیا پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے خون کی گردش تیز ہو گئی جیسے تمام جسم میں کسی نے آگ دے دی ہو۔ وہ بھول گئی کہ کہاں جا رہی ہے؟ وہ آواز کی طرف بڑھتی گئی اور آواز دور تھی بہت دور ــــ شانتا بالکل مست اور مدہوش تھی۔ اسے رستے کے الجھنے والے جھاڑ اور جھنکار کا بھی ہوش نہ تھا۔ پیروں کے تلوؤں میں چبھ چبھ کر خون بہا دینے والے کانٹوں کی بھی خبر نہ تھی۔ آنکھوں سے بہہ بہہ کر تمام چہرے کو تر کر دینے والے آنسوؤں کا بھی احساس نہ تھا اس کے دماغ میں ایک ہیجان برپا تھا وہ دیوانہ وار آگے بڑھے چلی جا رہی تھی۔ آخر وہ ایک جگہ رکی۔ اب آواز بالکل قریب تھی۔ شانتا نے بجلی کی طرح پلٹ کر دیکھا۔ جھاڑی کی آڑ میں پجاری بیٹھا ہوا رباب بجا رہا تھا۔ وہی شانتا کا ٹوٹا ہوا رباب جس کو اس نے اٹھا کر جوڑ لیا تھا۔ شانتا اسے دیکھ کر چیخ اٹھی۔ "پجاری!" پجاری کے ہاتھ سے رباب چھوٹ گیا۔ بولا۔ "شانتا تم آ گئیں؟"

شانتا بولی۔ "ہاں اب کبھی نہ جانے کے لئے"

پجاری نے کہا۔ "ہاں کبھی نہ جانے کے لئے۔ شانتا اب میں نے فیصلہ کر دیا ہے۔ اب میری زندگی کی منزل تم ہی ہو۔ تمہاری پوجا ہی اب میرا دھرم ہے۔ چلو شانتا چلیں۔"

"کہاں ــــ؟"

"جہاں محبت کی دنیا ہے ــــ جہاں چاند ستارے انسان کے ساتھ کھیلتے ہیں ــــ جہاں تڑپتے ہوئے دلوں کو جدا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی ــــ جہاں پتھروں سے ٹکریں ہی مارنا انسان کی زندگی کا مقصد نہیں ہے۔"

"چلو ــــ!" شانتا نے کہا۔

"چلو ــــ!" پجاری نے جواب دیا۔

طائرِ نغمہ

(ٹیگور)

جب مغرب کی جانب سے
شام نمودار ہوتی ہے
تو فضا میں آوارہ پرندوں کے
پروں کو جنبش ہوتی ہے
جب آسمان چمکدار ستاروں کا
خوشنما تاج پہن لیتا ہے
تو خوابوں کی بستیاں
قلوب انسانی میں اپنا مسکن بنا لیتی ہیں۔
جب کنول کے پھولوں کو
شب پر اعتماد نہیں رہتا ــــ
تو وہ اضطراب میں
اپنی پنکھڑیوں کو بند کر لیتے ہیں۔
ایک پرندہ ہے۔ جو خاموشی سے
اپنے آشیانہ کو چھوڑتا ہے
اور آسمان کی لامتناہی پگڈنڈیوں میں
اپنا "گیت" تلاش کرتا ہے۔

مترجمہ
شیخ عبدالرحمٰن۔ راولپنڈی،

صبحِ بنارس

دلپذیر مشاہدہ

از جناب سید محمد عسکری طبا طبائی بی۔اے

صبح! اے مشاطۂ قدرت کا زرّیں شاہکار   دخترِ لیلائے شب اور نور کی سرمایہ دار
آسماں کی زیب و زینت چاند تاروں کا نکھار   عشرتِ نظارہ ہے ہر رنگ میں تیری بہار
یوں تو ہر حصہ پہ گیتی کے غضب ڈھاتی ہے تو
پر بنارس میں پہنچکر حشر بن جاتی ہے تو

جھلملاتے اختروں کے پھول برساتی ہوئی   ریشمی گھونگھٹ شفق کا رُخ سے سرکاتی ہوئی
مسکراتی، رقص کرتی، بھیرویں گاتی ہوئی   بادلوں کو چھیڑتی تھم تھم کے اٹھلاتی ہوئی
سکۂ زرِ مہر کا جھولی میں بھر کر دان کو
آتی ہے گنگا پہ تو کس ٹھاٹ سے اشنان کو

کس نے دیکھا ہے بھلا معشوق تیرے ڈھنگ کا   کون ہے دنیا میں ہمسر تجھ سی شوخ و شنگ کا
کس ادا سے دیکھ کر آئینہ رودِ گنگ کا   مانگ میں صندل بھرا قوسِ قزح کے رنگ کا
بال جھٹکے تو خزانہ اوس کا بکھرا دیا
موتیوں کا صفحۂ عالم پہ مینہ برسا دیا

سر اُٹھائیے تا افق اس سمت کوہِ پُر وقار   اُن کے دامن میں پھلے پھولے درختوں کی قطار
چہچہے کرنے کو طائر آشیاں میں بیقرار   دل میں تیری آرزو آنکھوں کو تیرا انتظار
اور تو تکمیلِ حسن و رنگ کر چکتی نہیں
آئینہ خانہ میں فطرت کے سنور چکتی نہیں

دفعتاً بن ٹھن کے نکلی اور غضب ڈھانے لگی   آڑے ترچھے تیر مشتاقوں پہ برسانے لگی
دوش پر اپنی سنہری زلف بکھرانے لگی   گیند پھولوں کا بنایا اور ٹھکرانے لگی
گاہ دستِ نازنیں میں ساغرِ زر لے لیا

سُرمئی آنچل گھٹا کا گاہ رُخ پر لے لیا

شہر میں پہنچی تو نقشہ حشر کا دکھلا دیا گُدگُدا کر فتنۂ خوابیدہ کو چونکا دیا
یا اک ذرّہ کے دل کو نور سے چھلکا دیا سینۂ عارف میں شعلہ شوق کا بھڑکا دیا

سر جھکائے عشق مندر کو بھجن گاتا چلا
حُسن اپنی خوابگہ سے جانبِ دریا چلا

اُٹھ کے کچی نیند سے سُرخ انکھڑیاں ملتی ہوئی چہرہ کا عالم کہ جیسے چاندنی ڈھلتی ہوئی
نور کے تڑکے میں سائے کی طرح چلتی ہوئی رس بھری تازہ ہوا میں پھولتی پھلتی ہوئی

گھاٹ پر کھنچ کھنچ کے پریاں آب کی آنے لگیں
رنگ بن کر دامنِ نظارہ پر چھانے لگیں

دوش پر زلفِ سیہ ناگن سی بل کھائی ہوئی ہونٹ پپڑائے ہوئے اور آنکھ شرمائی ہوئی
ایک مدہوشی کہ جیسے نیند ہو آئی ہوئی بات گھبرائی ہوئی اور چال اٹھلائی ہوئی

کیفِ دوشیں سے کسی کے ہوش میں کچھ فرق ہے
کوئی اپنے حسن کی نیرنگیوں میں غرق ہے

کوئی ہے آئینہ کے مانند حیران و خموش ہیں کسی کے لعلِ لب شکّر فشاں گوہر فروش
اس میں مستی حسن کی اس میں جوانی کا خروش اک سے اک بڑھ کر غرض غارتگرِ ایمان و ہوش

عفو کے قابل ہے انساں دام میں آیا اگر
اور پڑی گنگا نہایا، دل بچا لایا اگر

نیم رس، نوخیز مہوش، لڑکیوں کی ٹولیاں تازہ پھولوں سے بھرے باریک رنگیں جھولیاں
گنگناتیں گاہ دوہے گاہ گاتی ہولیاں بھولی بھولی صورتیں اور میٹھی میٹھی بولیاں

چہلیں کرنے کو کبھی ٹھہریں کبھی چلنے لگیں
گورے گورے پیروں سے دھرتی کا دل ملنے لگیں

گھاٹ تک بادِ صبا کے ساتھ دم بھرتی ہوئی سیڑھیوں پر ناز سے رنگیں قدم دھرتی ہوئی
ٹپّا گلوں سے راگ کے طوفاں بپا کرتی ہوئی دل ہی دل میں مستِ موجوں سے ذرا ڈرتی ہوئی

کود کر دریا میں ظالم رنگ ہی لاتی ہیں اور
صاف پانی میں نہا دھو کر نکھر جاتی ہیں اور

سیڑھیوں پہ ہے بیٹھی وہ ہے پانی میں کھڑی　　کوئی جھجکی اور سہیلی سے کوئی چھینٹے لڑی
کوئی ہمجولی کو اپنی غوطہ دینے پر اڑی　　کشمکش میں کوئی سمٹی، یہ کھلی وہ گر پڑی
شوق میں بڑھکر جو گھبرا موج کی آغوش نے
آگ دریا میں لگا دی شعلۂ خاموش نے

ناؤ پر جادو جگاتی اک سلونی سانولی　　نیند آنکھوں میں بھری ماتھے پہ ٹیکا صندلی
جسم میں پوشاک بھیگی، ہاتھ میں گنگا جلی　　اوس میں ڈوبی ہوئی کچنال کی کچی کلی
ہر کو پانی چڑھایا اس اچھوتی شان سے
حسن پر کرنیں نچھاور ہو گئیں سو جان سے

صبح، یہ سب اک طرف لیکن تری شان اک طرف　　تو اکیلی اک طرف سارا پرستان اک طرف
حسن گیتی اک طرف فردوس کی جان اک طرف　　سب کا اشنان اک طرف اور تیرا اشنان اک طرف
تو نے سیلِ نور سے دریا کا دامن بھر دیا
وادیِ گنگا کو رشکِ طور و ایمن کر دیا

یہ بھنور پڑتے ہیں گنگا میں کہ ہے پھولوں کا باغ　　یہ حباب اٹھتے ہیں پانی میں کہ ہیں رنگیں ایاغ
ایک چاندی کی لگن میں جلتے ہیں لاکھوں چراغ　　باصفا سینے میں ہوں جیسے غمِ الفت کے داغ
بہ رہا ہے مست دریا جھومتا گاتا ہوا
یا سرودِ آتشیں ہے راگ برساتا ہوا،

شوق کی بیتابیوں میں ولولوں کے جوش میں　　آبِ گنگا بڑھ کے جب لے تجھ کو آغوش میں
اور کہے رازِ نمودِ عشق تیرے گوش میں　　کس کو یارا ہے کہ دیکھے اور رہے بھی ہوش میں
ہائے! یہ بیباک لمحہ روح کو تڑپا گیا
صبح، بس اللہ نگہباں، یاد کوئی آ گیا

زیب النساء اور عاقل خان

ایک تاریخی غلط فہمی کا ازالہ

از ابوالمکارم محمد نعیم اللہ صاحب کوڑھوی

ادب اور تاریخ کے متعلق میرا نظریہ ہے کہ دونوں متضاد علوم ہیں ادب اپنی وسعت کے لئے لغات کا رہین منت نہیں لیکن تاریخ اپنے عروج کے لئے واقعات کا محتاج ہے اول الذکر میں مبالغہ کو اسی قدر دخل ہے جس قدر پارلیمنٹ کو برطانیہ میں اور موخر الذکر کو واقعیت سے اسی قدر تعلق ہے جس قدر شہنشاہ برطانیہ کو پارلیمنٹ سے۔ ادب میں غلط العوام فصیح اور تاریخ کی شریعت میں افسوسناک گناہ ہے۔ ادب کے لئے واقعیت قطعاً غیر ضروری شے ہے۔ اور تاریخ کی اساس ہی واقعیت پر ہے۔ ادب میں دلچسپ و خوشنما جھوٹ (افسانے) شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں اور تاریخ کا مایہ ناز سرمایہ خشک تحقیقات ہیں ادب کا غلط نویس (بروزن غلط گو) قابل صد تحسین قرار پاتا ہے اور تاریخ کا مبالغہ گو (کاذب) ہدف مطاعن (ملعون) ہوتا ہے۔ اس لئے ادب نے بعض مواقع پر تاریخ کو ناقابل تلافی نقصانات پہنچائے ہیں جس کا ذکر آگے ہوگا۔

ایشیائی قصوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ابتدا کسی مشہور و معروف شخصیت یا عموماً بادشاہ سے ہوتی ہے۔ ہندوستان کا اردو ادب یہاں کی شاعری سے بہت متاثر ہوا اور یہاں کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ابتدا مبالغہ کی انتہا سے ہوتی ہے اس لئے یہاں کے ادب میں صفت مبالغہ گوئی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔

قصہ حاتم طائی، بیربل و اکبر، پدماوت رانی (علاء الدین و پدمنی) مجنوں و لیلیٰ۔ شیریں و فرہاد۔ گل بکاولی وغیرہ میرے دعوی کے ثبوت ہیں۔ ان قصص میں کسی کو بھی واقعیت سے دور کا واسطہ نہیں اور ہر قصہ کسی نہ کسی بادشاہ یا اس کے رشتہ مند سے متعلق ہے۔

اردو جب غالب کے اختراعات ادبی و لطافت شعری، مومن کی نکتہ آفرینی اور ذوق کی سلاست سے اپنے دامن ادب کو مالا مال کر رہی تھی اس وقت ہندوستان پر ادبار کی گھٹا چھائی تھی سلطنت مغلیہ کے خاکستر سے اردو کی عمارت کی بنا ڈالی گئی لیکن اس طوائف الملوکی کے زمانہ میں خصوصاً غدر کے بعد جب اسلامی ریاستیں رفتہ رفتہ فنا ہونے لگیں دربار تباہ ہونے لگے تو قصہ گویوں کی ایک معقول تعداد درباروں سے نکل کر بے خانماں ہو رہی تھی۔ مطابع نے انہیں لپک لیا۔ پھر تو فورٹ ولیم سے قصہ چہار درویش، نولکشور پریس سے گل بکاولی

امیر حمزہ، الف لیلہ کی اشاعت شروع ہوئی۔ جب قومیں انحطاط پذیر ہوتی ہیں تو ان کا مذاق بھی بدل جاتا ہے۔ عوام مبتذل اور سوقیانہ ناول یا قصوں کی طرف رجوع کرنے لگے ان کی نظریں اب کتاب الاخلاق ہدایہ وقایہ پر نہیں پڑتی تھیں وہ متلاشی تھے صرف سوقیانہ ناولوں کے۔ نوابوں کی عیش پرستی کے چرچے تھے۔ اس زمانہ میں منشی محمد الدین خلیق نے ایک کتاب زیب النساء کے متعلق تدوین فرمائی۔ منشی احمد الدین نے در مکتوم میں اس جلیل القدر خاتون کے حالات کو یکجا کیا لیکن انھوں نے حالات کیا یکجا کئے تاریخ پر ظلم کر دیا۔ اب تو ان کی کتاب کا ترجمہ بھی انگریزی زبان میں ہو چکا ہے۔ مسز وسٹ بروک ہی اس کتاب کو انگریزی میں منتقل کرنے والی تھیں۔

مجھے مصنف کی نیت پر اعتراض نہیں ممکن ہے انہیں زیب النساء سے عقیدت ہی ہو لیکن جس طرز سے کتاب لکھی گئی ہے وہ بیحد قابل اعتراض ہے کیونکہ اسے تاریخی رنگ دیکر اس باعصمت خاتون کے کیرکٹر پر حملہ کیا گیا ہے اور جس طرح مسٹر بنکم چٹرجی نے شاہجہاں کی لڑکیوں کے حالات لکھا کئے ہیں، یا فرشتہ نے علاء الدین و پدمنی کے افسانہ کو اپنی تاریخ میں جگہ دیکر یا مسٹر یدوناتھ سرکار (جن کا یہ خیال ہے کہ نعوذ باللہ زیب النساء شیواجی سے محبت کرتی تھیں) نے ایک ناول لکھ کر تاریخ پر احسان کیا ہے اسی طرح انھوں نے زیب النساء کے حالات لکھ کر تاریخ پر احسان کیا ہے اگر اسے تاریخی رنگ نہ دیا جاتا تو جس طرح اکبر و بیربل کے (ہنسا ہنسا کر پیٹ میں بل ڈال دینے والے) قصے غیر و قبیح سمجھے جاتے ہیں وہی وقعت اس کی بھی ہوتی۔ اس قصہ پر محاکمہ سے قبل قصہ کو خود مصنف کے منہ سے سن لیجئے۔

واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ سنہ ۱۶۶۲ء میں اورنگ زیب بیمار پڑا، طبیبوں نے تبدیل آب و ہوا کا مشورہ دیا۔ آخر مع اہل و عیال اورنگ زیب لاہور آیا۔ زیب النساء نے ایک باغ کی تیاری کا حکم دیا یہاں کا گورنر ایک وزیر کا لڑکا عاقل خاں تھا۔ چونکہ خود شاعر تھا اس لئے زیب النساء کے حسن کلام سے متاثر ہوا اور اس پر غائبانہ عاشق ہو گیا تھا۔ نگہبانی کے فرائض خود انجام دینے لگا تاکہ دیدار نصیب ہو جائے۔ حسن اتفاق سے ایک روز دھانی لباس میں بام پر دیکھ کر بیساختہ یہ مصرع موزوں کیا۔ ع سرخ پوشے بلب بام نظر می آید،

زیب النساء جو شاید اسی موقع کی منتظر تھی فی البدیہہ کہا ع نہ بزاری نہ بزورے نہ بزر می آید۔ واہ واہ واقعی بدیہہ گوئی کا کمال ہے۔ اُفوہ کس قدر زبردست شاعرہ تھی۔ ہو گئے نا آپ قائل عشق بہ یک نظر کے۔ پھر تو عشق کا جادو سر پر چڑھ کر بولنے لگا۔ سترہویں صدی نے مجنوں نے عاقل خاں کے نام میں جنم لیا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ حضرت عشق نے باغ میں مزدوری کرائی یہاں بھی مبادلہ اشعار ہوتا رہا۔ اورنگ زیب نے جب معاشقہ کی خبر سنی تو اسے سانپ سونگھ گیا ساری حمیت دینی غایب یعنی زیب النساء کو شادی کیلئے مجبور کیا اور تصاویر برائے انتخاب شوہر زیب النساء کو بھیجیں۔ حسب توقع زیب النساء نے عاقل خاں کی تصویر کو پسند کیا۔ متاخرین کو افسوس ہے کہ انہیں وضاحت کے ساتھ نہیں معلوم ہو سکا کہ کن خوش قسمت اشخاص کی تصاویر بھیجی گئی اور علمائے دین حیران ہیں کہ اورنگ زیب نے کیونکر اس دینی حکم کی خلاف ورزی کی جس میں وضاحت کے ساتھ تصویر کے حرام و ناجائز ہونے کا ذکر ہے؟ خیر عاقل خاں مطلوب ہوا۔ یہ عاشق صادق جس نے آخر میں اپنی معشوقہ کی آن کی خاطر جاں گوارا کر لیا اور اُف نہیں کیا جان کی خاطر حاضر نہیں ہوا بعد میں خود یہ کہتا رہا ع چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی۔ اسے سات سال تک بارگاہ شہنشاہی سے معتوب کر دیا گیا اور ایک روز جب خفیہ طور پر زیب النساء سے گفتگو کر رہا تھا اورنگ زیب کی چاپ سن کر دیگ میں بیٹھ گیا اورنگ زیب نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے اس دیگ کو جسے زیب النساء نے پانی کا دیگ کہا تھا آگ پر چڑھوا دیا اور زیب النساء کو درّے یا سنگ کی سزا تو نہ دی البتہ پنشن کے ساتھ قید کر دیا۔

تاریخ ان واقعات کو براہ راست تو نہیں مگر جھٹلا ضرور رہی ہے۔

تاریخ یہ بتانے سے قطعاً قاصر ہے کہ کس وزیر کو عاقل خاں کے پدر بزرگوار ہونے کا فخر حاصل تھا۔ ہاں البتہ ایران کے رہنے والے خوافی الاصل تھے۔ شاہ برہان الدین رضا الہی کے مرید تھے اور اسی مناسبت سے راضی تخلص کرتے تھے مذاق صوفیانہ تھا۔ عہد شاہجہانی میں گورنر دکن اورنگ زیب کے جلودار تھے ۱۶۵۸ء میں خواتین کو قلعہ دولت آباد میں اور قلعہ کو ان کی نگرانی اور شہر کو ان کی گورنری میں چھوڑ کر اورنگ زیب دہلی آیا۔ ۹ فروری سے گورنری اور اگست ۱۶۵۸ء سے ۱۶۵۹ء کے آخر تک قلعہ کی نگرانی اس کے سپرد رہی۔ اقبال ہمایونی نے جب دہلی کو فتح کیا تو یہ دوآبہ کے فوجدار بنائے گئے لیکن ۱۳-۱۴ مہینے کے بعد علالت کی وجہ سے ملازمت سے دستکشی اختیار کی (جولائی ۱۶۶۱ء) ۲ نومبر ۱۶۶۳ء میں عالمگیر کی مراجعت کشمیر کے بعد ایک ہفتہ تک داروغہ غسلخانہ ہوئے واضح ہوے یہ بہت اعتماد کا عہدہ تھا۔ ۱۶۶۹ء میں داروغہ ڈاک چوکی بنا دیئے گئے اپریل میں مستعفی ہو کر سات سال تک [illegible] کرتے رہے تاریخ اس مدت میں ساکت ہے

پھر ۱۶۷۶ء میں ایکبار رہا ہوا پنشن مقرر ہوئی ۱۶۷۹ء میں بخشی کی اسامی پر بحال ہوئے۔ اسی سال جنگ راجپوتانہ میں داد شجاعت دی۔ ۱۶۸۰ء میں دہلی کی صوبیداری ملی ۱۶۹۶ء میں قضا کر گئے۔ بقول بدایونی بیٹے کا نام قیم خاں دامادوں کے نام شاکر و شکر اللہ خاں ہیں بوقت وفات عمر قریباً ۷۰-۷۵ برس کی ہو گی۔

زیب النساء ۱۶۳۸ء میں پیدا ہوئیں ابتدائی تعلیم حافظ مریم سے پائی، حافظہ بہت قوی تھا۔ سات سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر چکی تھیں عربی و فارسی کی اعلیٰ کتابیں ملا جیون اور ملا سعید سے پڑھی تھیں۔ ملا محمد عاقل سے مذہبی امور میں مشورہ لیتی تھیں خواجہ معصوم خلیفہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی معتقد تھیں خود خواجہ صاحب بھی ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔

عربی و فارسی میں کافی دستگاہ تھی۔ بلا کی ذہین تھیں بدیہہ گوئی میں کمال حاصل تھا ان کے اور کسی عرب کے عربی کلام میں تمیز کرنا مشکل ہوتا تھا مخفی تخلص کرتی تھیں۔ کلام دقیق و پر از معرفت ہوتا تھا۔ جملہ اراکین دربار و ادبائے عصر فضل و کمال کے معترف تھے۔ علوم مذہبیہ فقہ، کلام و حدیث میں بھی دسترس حاصل تھا مغلوں کا دستور تھا کہ ۲۵ برس کی عمر میں شادی کرتے تھے چونکہ اس عمر میں ان کا مذاق صوفیانہ ہو گیا تھا اس لئے دنیا کے بکھیڑوں سے دور رہنے کے لئے شادی سے انکار کر دیا سب بھائیوں میں اکبر کو بہت مانتی تھیں اسی وجہ سے جب اکبر نے اورنگ زیب کے خلاف بغاوت کر دی تو اورنگ زیب نے احتیاطاً اپنی عزیز ترین بیٹی کو نظر بند کر دیا۔ ملا محمد عاقل جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اکبر کی تخت نشینی کے حق میں فتویٰ دے چکے تھے۔ اورنگ زیب نے ملا محمد عاقل کے خطوط کی نگہداشت کا حکم دیا۔ وجہ یہ تھی کہ ملا صاحب (جن سے یہ اکثر مشورہ لیتی تھیں) کے ذریعہ سے اکبر سے اس کی خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ حالت نظر بندی ہی میں ۲۶ مئی ۱۷۰۲ء میں عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئیں۔ یہ ہیں اس جلیل القدر خاتون کے حالات جس کے متعلق بے بنیاد الزامات لگائے جاتے ہیں۔

ان تاریخی شواہد کے پیش نظر عاقل کو زیب النساء سے ملاقات کا سب سے اول موقع ۱۶۵۸ء میں دولت آباد میں ملا ہو گا جہاں وہ تقریباً ایک برس خواتین کے ساتھ رہا مگر مصنف کا احسان ہے کہ انھوں نے ایک سال کی طویل مدت کو نظر انداز کر دیا اور محبت کی ابتدا ۱۶۶۲ء سے کی۔

پھر عاقل سے زیب النساء کے ملنے کے مواقع یہ ہو سکتے ہیں۔ ۱۶۶۲ء میں ایک ہفتہ کے لئے لاہور میں پھر ۱۶۶۹ء میں آگرہ میں پھر ۱۶۸۰ء تا ۱۶۹۶ء دہلی میں پھر ۱۶۷۸ء تا ۱۶۷۹ء میں جنگ راجپوتانہ میں۔ ان مواقع میں ۱۶۵۸ء و ۱۶۸۱ء میں اورنگ زیب حالات سے غیر حاضر ہوا اس لئے ممکن ہے کہ محبت

انہی دو برسوں میں ہوئی ہو۔

مگر ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارا اندازہ غلط ثابت ہوا، [illegible] تو ابتدائے عشق سے ۵ سال پہلے کا سال اور [illegible] انتہائے عشق سے ۵×۲=۱۰ سال پہلے کا سال ہے۔

بفرضِ محال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہماری تاریخی شہادت غلط ہے تو کیا ممکن ہے کہ یہ لوگ [illegible] سے ۹۶ تک محبت کرتے رہے لیکن کسی تاریخ داں نے ذکر نہ کیا۔ مصنف اس قدر تفصیل سے واقعات لکھ رہے ہیں جیسے معلوم ہو کہ خود ہی عاقل خاں کا پارٹ ادا کرتے رہے تھے مگر خوافی خاں بھیم سین منوچی وبرنیر وغیرہ کے کانوں میں اس کی بھنک بھی نہ پڑی۔ مصنف تو کہہ رہے تھے کہ برنیر نے ان کی ہمزبانی کی ہے لیکن میں تو تلاش کرتے کرتے تھک گیا اس بیچارے نے کوئی واقعہ بھی اس کا ماخوذ نہیں [illegible]ن کیا البتہ منوچی نے جہاں آرا کے متعلق کچھ لغو قسم کی خامہ فرسائی یا حاشیہ آرائی کی ہے۔ ع

دروغ گو را حافظہ نباشد

پھر مصنف محترم تو فرماتے کہ وہ اورنگ زیب جس سے آج ہندو بھائی صرف اسی لیے خفا ہیں کہ اس نے احیاء اسلام کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور جس کی مذہبی سخت گیری کے متعلق ہر تاریخ داں شاہد ہے جسے دنیا کٹر مسلمان کہتی ہے، باوجود یہ طاقت رکھتے ہوئے کہ وہ زیب النسا کو گرفتار کر سکتا ہے۔ کم از کم عاقل ہی کو قتل کیوں نہیں کراتا؟ بلکہ الٹے اسے مراتب ومناصب میں اضافہ کرتا جاتا ہے۔ ہاں عاقل کا وزیر بنا ہونا "ایجادِ بندہ" تو نہیں؟

اور ان لوگوں کی محبت بھی دائمی تھی کہ ۳۴ برس تک ایک آن بان اور ایک طرح سے محبت کرتے رہے اور پھر عشق نے ایسا والہانہ جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ زیب النسا عاقل کی بیوی کی موجودگی کو عورت کی فطرت کے خلاف روا رکھتی ہے۔ پھر اورنگ زیب کبھی زیب النسا کو شادی کے لئے مجبور کرتا ہے مگر عاقل خاں کے استعفا کے بعد بالکل خاموش ہو جاتا ہے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

افسوس ہے کہ ان صریح ثبوت کی موجودگی میں بھی ابتک یہی جھوٹا قصہ بار بار رسائل میں شایع ہوتا ہے اور عوام میں مغلیہ شاہزادی کے متعلق بدظنی پھیلاتا ہے۔ اس طرح ایک ناول کی تصنیف نے ممکن ہے ادب میں کسی قسم کا اضافہ کیا ہو لیکن تاریخ کو ایک صدمۂ عظیم پہنچایا ہے اور عوام اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ زیب النسا نعوذ باللہ فاحشہ تھی اور اس کا الزام صرف ان اشخاص پر عائد ہوتا ہے جو اس قسم کے افسانے رسائل میں شایع کراتے ہیں، آج کل ہزاروں مبتذل اور سوقیانہ اشعار کسی نہ کسی پست واقعہ سے متعلق کر کے زیب النسا کے ساتھ منسوب کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے زیب النسا کے کمالات ادبی کو ظاہر کر کے اس پر احسان کرتے ہیں حالانکہ یہ ان پر صریح ظلم ہوتا ہے۔ ان الزامات کے متعلق زیب النسا نے اپنی زندگی ہی میں لکھ دیا تھا

قسم بہ قاضیٔ حاجات و احمد مرسلؐ
کہ پاکبازیٔ من باعث گناہ من است

حسنِ بے حجاب

شبلی بی کام

جب تک عالمِ شباب رہا   زہد و تقویٰ سے اجتناب رہا
آئینہ بن گئی نقاب تری   حسن پردے میں بے حجاب رہا
اُس کے گیسو کہیں نہ اُلجھے ہوں   کیوں مرے دل کو اضطراب رہا
ہائے وہ رات یاد آتی ہے جب   میرے پہلو میں ماہتاب رہا
جو محبت میں ہو گیا ناکام   زندگی میں وہ کامیاب رہا
صبح کیوں مجھ سے مُنہ چھپاتا ہے   شب جو خلوت میں بے حجاب رہا
مست آنکھوں کی یاد میں شب بھر   ہاتھ میں ساغرِ شراب رہا
اس کا جلوہ ہی بن گیا پردہ   بے حجابی میں بھی حجاب رہا

چین سے سوئیں قبر میں شبلی
زندگی بھر تو اضطراب رہا

مرد کی محبّت

دلچسپ رومان انگیز افسانہ

از جناب ظفر واسطی۔ شاہ آبادی

نصیب ایک دفتر میں کلرک تھا اور راحت ایک مدرسہ میں استانی!

دونوں کی پہلی ملاقات نصیب کے ایک رشتہ دار کے یہاں ہوئی تھی۔ رشتہ دار کی لڑکی نے راحت کو اپنے یہاں رہنے کے لئے بلا رکھا تھا۔ نصیب بھی اتوار ہونے کی وجہ سے گھر آیا ہوا تھا۔ رشتہ دار کے یہاں گیا تو راحت اور طلعت بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔ بے دھڑک اندر چلا گیا۔ راحت اور طلعت تکتی کی تکتی ہی رہ گئیں۔ راحت حیران تھی کہ اٹھ کر کمرے میں بھاگ جائے یا وہیں بیٹھی بیٹھی چادر اوڑھ لے۔ طلعت سوچ رہی تھی کہ نصیب کو باہر جانے کے لئے کہے یا نہ کہے اور نصیب راحت کو ——— ایک اجنبی لڑکی کو دیکھ کر فکر میں تھا کہ کیا کرے۔ اسی فکر اور حیرت میں نصیب اور راحت کی آنکھیں چار ہوئیں، اور اس ایک لمحہ میں خدا جانے آنکھوں نے آنکھوں سے کہا کہ وہ دونوں اس اتفاق پر خوش تھے۔ نصیب خوش تھا کہ راحت جوں کی توں بیٹھی رہی اور راحت خوش تھی کہ نصیب بغیر آواز دیئے چلا آیا۔

یہ پہلی ملاقات تھی اس لئے وہ آپس میں زبان سے تو بات نہ کر سکے مگر آنکھوں سے انھوں نے ایک دوسرے کے حسن اور شباب کی داد بھی دی اور [illegible] بھی پوچھے۔ پھر اس کے بعد راحت نے نصیب سے پردہ ہی نہیں کیا۔ طلعت اس کی بہت پیاری سہیلی تھی۔ نصیب، طلعت کا رشتہ کا بھائی تھا یہ عذر کافی تھا اور پھر جس کے سامنے ایک دفعہ آ گئی اس سے کیا پردہ؛ نصیب کے آنکھ مل [illegible] سے زیادہ محبت ہو گئی اور طلعت کے کام [illegible]

[illegible]

اگر اُدھر سے کوئی پیغام آئے تو انکار نہ کیجئے۔ ایسا رشتہ روز روز نہیں ملتا۔

راحت کی ماں بھی وہی کام کرتی تھی جو راحت، دونوں ماں بیٹی ایک ہی مدرسہ میں استانیاں تھیں۔ پرائمری [illegible] تھا۔ راحت انچارج تھی اور ماں سب انچارج۔ دونوں کی اچھی خاصی گزر ہو رہی تھی۔ راحت کا باپ مدت ہوئی چل بسا تھا اس کے مرنے کے بعد راحت کی ماں کو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ سرکاری نوکری کر لے۔ اسی ملازمت کے طفیل وہ لڑکی کو میٹرک تک تعلیم دلانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

قصہ مختصر نصیب نے اپنے والد کو لکھا۔ وہ اس سے بھی تیز نکلے۔ جواب میں لکھ بھیجا کہ تم بالغ بھی ہو اور عقلمند بھی۔ جہاں مناسب سمجھو رشتہ کر لو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ اس نے پھر لکھا۔ اس کے اصرار پر انھوں نے راحت کی ماں کو خط لکھ دیا۔ راحت کے باپ نہیں تھا کہ نصیب کے آبا انھیں خط لکھتے اور نصیب کے ماں نہیں تھی کہ راحت کی ماں سے خط و کتابت کرتیں۔ طلعت نے پہلے ہی رنگ جما رکھا تھا۔ لہٰذا راحت کی ماں تھوڑی سی رسمی حجت کے بعد مان گئیں اور دبے الفاظ میں اقرار کر لیا۔ اس اقرار سے جتنی خوشی نصیب کو ہوئی اس سے کہیں زیادہ راحت کو۔

اس کے بعد شادی کا سوال درپیش تھا۔ نصیب نے خیال ہی خیال میں شادی کے متعلق سب باتوں کا جائزہ لیا سوچا کہ ابھی ساٹھ روپے تنخواہ تو ہے۔ میاں بیوی کے لئے یہ رقم کافی تو ہو سکتی ہے اگر کہ [illegible] گزارا کیا جائے۔ پھر خیال آیا کہ ابھی بھائی کو کالج میں داخل [illegible] کرانا ہے۔ [illegible] ضرور کرانا ہے۔ والد صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible]

اپریل میں مستعفی ہو۔

ہر ہفتے نئے نئے تحفے خرید کر لائے۔ پھر کچھ دیر کے لئے خیال آیا کہ بھائی نے میٹرک تو کر ہی لیا ہے اسے کہیں نوکر کرا دو لیکن بھائی کی محبت اور اس کا ذوق تعلیم اس خیال پر غالب آگیا۔ آخر موقع پا کر ایک دن راحت سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم شادی کی بات پکی تو کر رہے ہیں لیکن مجھ سے شادی کرنے کے لئے تمہیں چار سال انتظار کرنا پڑے گا۔ جب وہ یہ بات کر رہا تھا تو اس کے دل میں محبت کی آزمائش کا خیال تھا۔ راحت تو سراپا محبت تھی بولی۔ آپ سے شادی کرنے کے لئے چار سال تو کیا اگر ساری عمر بھی انتظار کرنا پڑے تو میں کروں گی سو اس کی اپنی بھی یہی خواہش تھی کہ ابھی کم سے کم دو تین سال نصیب شادی کا زور نہ دے۔ اس سے محبت ہونے سے پہلے راحت کی سب سے بڑی تمنا تھی کہ بی۔ اے کر کے بی۔ ٹی کر کے کسی سکول میں ہیڈ مسٹرنی ہو جائے۔

لہذا دونوں نے خدا کو اور طلعت کو گواہ دے کر عہد و پیمان لئے کہ وہ ایک دوسرے سے شادی کرنے کے لئے چار سال انتظار کریں گے۔ اس عرصہ میں خواہ کیسی ہی کتنی ہی مصیبتیں کیوں نہ آئیں لیکن وہ اپنی محبت اور اپنے عہد پر ثابت قدم رہیں گے۔

ایک برس بخیر و عافیت گذر گیا۔ طلعت کی معرفت شوق سے بھری ہوئی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس ایک سال کی مدت نے انہیں بتا دیا کہ ان کی محبت چار سال میں اب سے تین گنا زیادہ ہو جائیگی۔ ہر سنیچر کی شام کو انہیں محسوس ہوتا کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھنے کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ بیقرار ہیں اور اتوار کی شام کو جدا ہوتے ہوئے وہ ایک دوسرے کی محبت کے پہلے سے کہیں زیادہ معترف ہوتے اور گو سات دن تک جدا رہنے کے رنج نے دلوں پر قبضہ کیا ہوتا لیکن پھر بھی انہیں ایک سکون ایک اطمینان حاصل ہوتا۔ راحت سوچتی کہ نصیب کہیں بھی رہے میرا ہے اور نصیب کے دل میں آتا کہ راحت کو مجھ سے زیادہ کسی سے محبت نہیں ہو سکتی۔

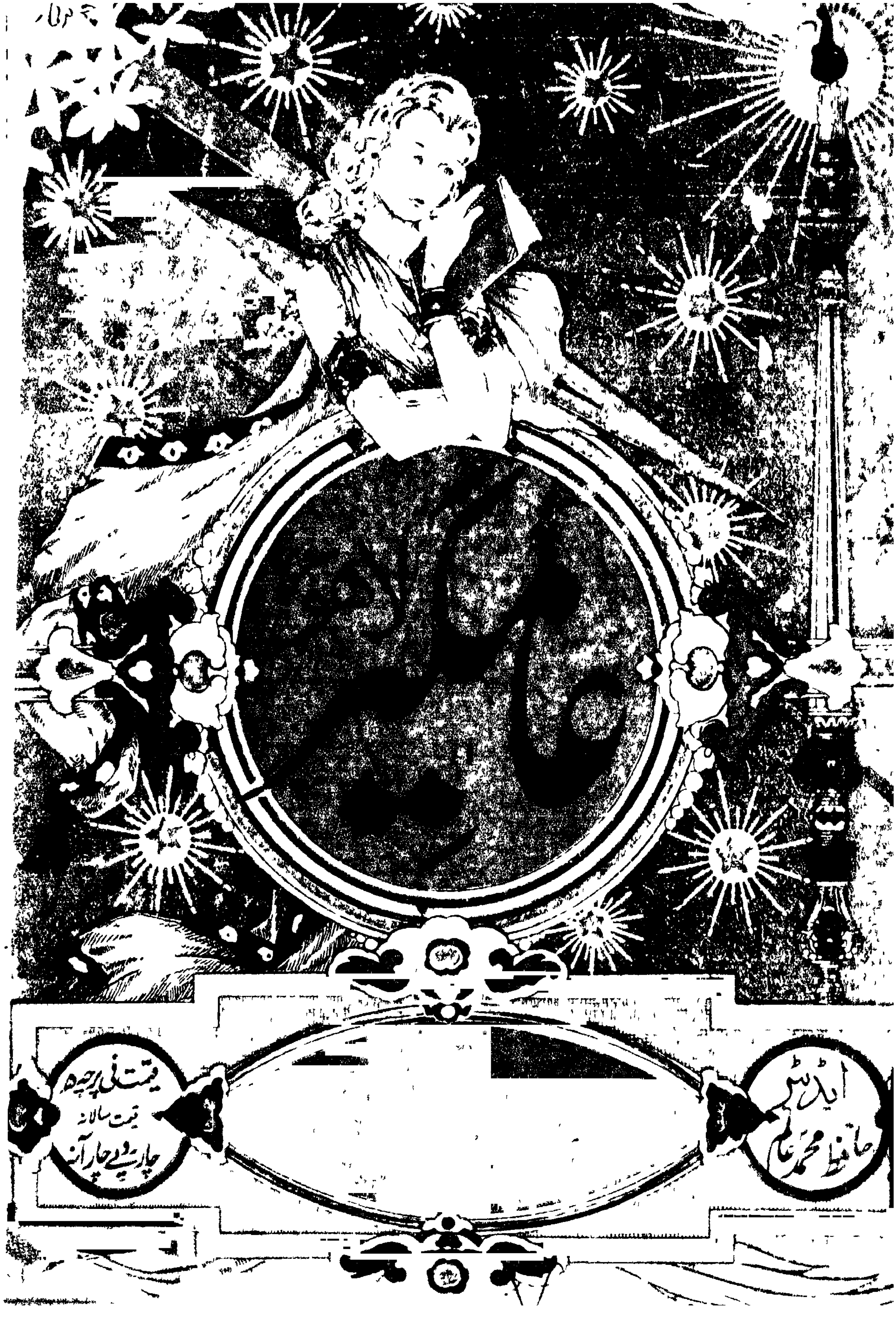
ایک دن راحت بیٹھی ایک اخبار دیکھ رہی تھی کہ اس کی نظر ایک اشتہار پر پڑ گئی۔ راولپنڈی کی میونسپل کمیٹی ایک زنانہ مسلم ہائی سکول کھول رہی تھی اس کے لئے چند استانیوں کی ضرورت تھی سال کی موجودہ اسامیوں [illegible] بہت وہاں تنخواہیں بھی زیادہ تھیں اور ترقی کے امکان بھی۔ درخواست [illegible] ئی تو ساتھ ہی نصیب کا بھی خیال آیا کہ اس آٹھویں دن کی [illegible] جائیگی۔ وہاں وہ کبھی آیا بھی تو سال میں ایک آدھ دفعہ [illegible] خط تو آتے رہینگے خط سے آدھی ملاقات ہو جاتی [illegible] وہاں کوئی عورت نہیں ملتی۔ وہاں ایم۔ اے بی۔ ٹی [illegible] اور بھی کتنی استانیاں ہونگی ان کی صحبت میں رہنے سے تعلیم کا اور شوق بڑھے گا اور ان کی مدد سے یہ کٹھن منزل آسانی سے طے ہو جائیگی۔ ماں سے مشورہ کیا اس کی طرح ان کے راستے میں نصیب کی محبت حائل نہ تھی۔ انھوں نے فوراً فیصلہ کر کے کہا کہ آج ہی درخواستیں بھیج دو۔ راحت پھر سوچنے لگی اور بڑی تیزی سے سوچنے لگی۔ اسے نصیب کے عہد و پیمان بھی یاد آئے اور اس کی محبت کی شدت کا احساس بھی ہوا اور ان دونوں باتوں نے اسے فیصلہ کرنے میں بہت مدد دی۔ درخواستیں بھیجنے کی وہ آخری تاریخ تھی۔ اخبار کسی پہلی تاریخ کا تھا جو اخبار راحت پڑھا کرتی تھی اس میں تو وہ اشتہار نکلا ہی نہ تھا یہ اخبار اس کی ایک شاگرد اپنے گھر سے کتاب پر کاغذ چڑھانے کیلئے اٹھا لائی تھی۔

راحت نے ابھی اور اپنی ماں کی عرضی لکھ کر بھیج دی۔ اتفاق سے اس ہفتہ نصیب آ نہ سکا دفتر میں سال کے ختم ہونے کی وجہ سے کام زیادہ تھا، اس لئے اتوار کو بھی کام کرنا پڑا۔ راحت کو خیال آیا کہ شگون اچھا نہیں ہوا عرضی بھیجتے ہی نصیب کی ملاقات رک گئی لیکن اس نے اس خیال کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی۔ راولپنڈی میں سکول کے لئے استانیوں کا انتخاب کرنے والوں میں خوش قسمتی سے راحت کی ماں کی استانی بھی تھی جنھوں نے انھیں ٹریننگ سکول میں تعلیم دی تھی اور جو ان پر بہت مہربان تھیں لہذا ان کی وجہ سے ان دونوں کی عرضیاں منظور ہو گئیں اور جواب آ گیا کہ فوراً چلی آؤ۔ وہاں سے فوری بلاوا آیا تو بڑی دقت پیش آئی استعفے دینے سفر کا سامان درست کرنا اور سب سے بڑی مصیبت دوستوں رشتہ داروں سے رخصت ہونا ——

نصیب گھر آیا تو اسے پتہ چلا کہ راحت اور اس کی ماں راولپنڈی جا رہی ہیں اس خبر سے اس کے دل پر ایک دھکا سا لگا۔ راحت سے پوچھا کہ یہ تم نے کیا کیا اس نے پہلے ہی سے جواب سوچ رکھا تھا اس ساری بات کا ذمہ دار اپنی والدہ کو ٹھہرایا اور کہنے لگی کہ رنج سے کیا فائدہ یہ جدائی کی مدت آنکھ جھپکنے کی دیر میں ختم ہو جائیگی۔ پھر میں ہونگی آپ ہونگے اور کبھی نہ ختم ہونے والی خوشیاں ہونگی۔

"وہ تو جب ہوگا دیکھا جائیگا اب تو میری راحت مجھ سے دور بہت دور جا رہی ہے —— بغیر راحت کے زندگی بسر کرنا اور پھر متواتر تین سال —— اچھا تمہارے لئے یہ بھی برداشت کرونگا۔"

نصیب نے کچھ ایسے درد سے یہ فقرے کہے کہ راحت تلملا اٹھی اس کے جی میں آیا کہ نئی جگہ جانے سے انکار کر دے لیکن پھر اپنی تیاریوں کا خیال آ گیا اور بی۔ اے کرنے کی خواہش یاد آ گئی۔ اس کے علاوہ ان کی جگہ مدرسہ میں نئی استانیوں کا تقرر کیا جا چکا تھا۔


ایڈیٹر
حافظ محمد عالم
قیمت فی پرچہ
قیمت سالانہ
چار روپے چار آنہ

جب وہ جدا ہونے لگے تو راحت نے کہا ——— "نصیب! میں نہ صرف اپنا عہد یاد رکھونگی بلکہ اس پر قائم بھی رہونگی اور مجھے یقین ہے کہ تم بھی مجھے فراموش نہ کروگے"۔

راولپنڈی پہنچ کر کئی دن رہنے سہنے کا انتظام کرنے اور نئی جگہوں کا کام سنبھالنے میں صرف ہوگئے ان سے فرصت ملی تو راحت نے طلعت کو اپنے سفر کی تمام کیفیت لکھی کہ کس طرح اسے طلعت اور نصیب یاد آتے رہے اور نئی فضا سے اس کا دل کتنا پریشان ہے۔ دو چار مہینے طلعت کی معرفت ان میں خط و کتابت ہوتی رہی پھر انھوں نے اپنے درمیان سے طلعت کو بھی علیحدہ کردیا اور براہ راست ایک دوسرے کو خط لکھنے لگے۔ پہلے ہر ہفتہ ملاقات ہوتی تھی اب ہر ہفتہ خط آنے جانے لگے گو وہ ایک دوسرے کی دیدار کی لذتوں سے محروم تھے لیکن اس بات سے مطمئن تھے کہ خط میں ایسی باتیں لکھ لیتے تھیں جو زبانی نہ کہہ سکتے تھے راحت جو اشاروں کنایوں سے اپنی محبت کا اظہار کیا کرتی تھی اب کھلے الفاظ میں اپنے عشق کو ظاہر کرنے میں اسے ذرا بھی حجاب نہ تھا۔

ایک سال اور بیت گیا۔

راحت پہلے سے ایف۔اے کی تیاری کر رہی تھی راولپنڈی آکر اس نے اور زیادہ محنت کی اور خدا کے فضل سے پاس بھی ہوگئی اپنے شوق کی آدھی منزل طے کرکے اسے بے انتہا خوشی ہوئی اس خوشی میں تمام استانیوں کو دعوت دی اور اس دعوت کی مٹھائی پارسل کرکے نصیب کے پاس بھی بھیجی۔ گو اتنے داموں کی مٹھائی نہیں تھی جتنے کہ پارسل پر ٹکٹ لگ گئے اور بڑے شوق سے بی۔اے کے امتحان کی تیاری شروع کردی۔

دوسرے سال نصیب کے خط دیر میں آنے لگے۔ پہلے سال وہ مہینے میں چار خط لکھا کرتا تھا اب دو خط لکھنے لگا۔ لیکن راحت متواتر چار خط لکھتی رہی کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ نصیب کے خطوں میں اب پہلا سا محبت کا جوش نہیں ہوتا مگر وہ اس خیال کو زیادہ دیر کے لئے اپنے دل میں جگہ نہ دے سکی، وہ اس کی محبت میں اتنی زیادہ سرشار تھی کہ خیال میں بھی کوئی بری بات نصیب سے منسوب کرنے میں اسے تکلیف ہوتی۔ ابھی دوسرے برس کے چار پانچ مہینے ہی گزرے تھے کہ اس کی والدہ کے پاس اس کے لئے مقامی ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر کا پیغام آگیا۔ ان کی تنخواہ بھی اچھی تھی، خاندان بھی اچھا تھا اور ظاہر کوئی برائی بھی نہیں تھی۔ ماں نے دو ایک دن سوچنے کے بعد اس سے پوچھا۔ یہ کچھ ادب کے مارے کچھ شرم کے لحاظ سے چپ ہوگئی۔ وہ سمجھیں کہ یہ رضامند ہے لہذا ہیڈ ماسٹر کے اوصاف بیان کرنے لگیں اور بولیں کہ میرے خیال میں میں ان سے انکار نہ کروں۔ راحت کی نظروں میں تو نصیب بسا ہوا تھا اسے کسی اور کے اوصاف کیا جچتے۔ آخر اسے بولنا ہی پڑا۔

"امی! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا ہوگیا۔ جب آپ میرے لئے ایک جگہ اقرار کر چکیں تو دوسری جگہ کا ذکر کرنے سے کیا حاصل؟"

"وہاں ہم نے سگائی کی کوئی رسم تو ادا کی نہیں اور اس کے علاوہ میں نے کوئی خاص اقرار بھی نہیں کیا۔"

"شریف آدمیوں کا زبان سے ہاں کہہ دینا بہت ہے"۔

"ہمارے پاس کون آیا تھا جس سے میں نے ہاں کہی تھی؟"

"کوئی آیا تھا یا نہیں آیا تھا لیکن میرا فیصلہ جو ہونا تھا ہو چکا اب آپ آئندہ کسی کے پیغام کا مجھ سے ذکر نہ کیجیئے گا"۔

راحت نے زندگی میں پہلی دفعہ ماں کو ایسا خشک اور سخت جواب دیا اور انھیں اس کا جواب لگا بھی برا لیکن اس وقت وہ خاموش ہوگئیں پھر مناسب موقعوں پر دو ایک دفعہ اور سمجھانے کی کوشش کی اور یہ دیکھ کر کہ اس کی مرضی نصیب سے شادی کرنے کی ہے ہیڈ ماسٹر صاحب کو جواب نہیں دیا بلکہ کہدیا کہ ابھی ہمارا ارادہ شادی کرنے کا نہیں ہے۔ وہ بی۔اے کرلے تو دیکھا جائے گا۔

اس طرف سے سکون ہوا تو راحت نے اپنی تمام توجہ بی۔اے کی تیاری میں صرف کردی۔ وہ بہت اعلیٰ نمبروں سے پاس ہونا چاہتی تھی البتہ جب نصیب کو خط لکھنے بیٹھتی تو سب کچھ بھول جاتی۔ اس وقت کتابوں کا خیال نہ آتا اس وقت وقت کے ضایع ہونے کا احساس نہ ہوتا۔ لکھتی رہتی گھنٹوں لکھتی رہتی۔ سارے ہفتہ کے ایک ایک واقعہ کی روداد لکھتی۔ اور جب وہاں سے دو دو طویل خطوں کے جواب میں ایک مختصر سا خط آتا تو اسے رنج ہوتا اور اس رنج سے بچنے کے لئے اس نے کئی دفعہ شکایت کے طور پر لکھا کہ میں آپ کو ایک ایک بات لکھدیتی ہوں اور آپ اتنے اختصار سے جواب لکھتے ہیں کہ میری آنکھیں اور قلب تشنہ رہ جاتے ہیں۔

اسی طرح ان کے عہد و پیمان کا تیسرا سال بھی ختم ہوگیا۔

راحت کی تیاریاں تو خوب ہوگئی تھیں لیکن وہ امتحان میں نہیں بیٹھی زیادہ سے زیادہ نمبر لینے کے خیال نے نہ بیٹھنے دیا اب وہ اور زیادہ سکون قلب کے ساتھ کتابوں کا مطالعہ کیا کرتی۔ امید تھی کہ چوتھا سال ختم ہوتا ہے ادھر بی۔اے کے امتحان سے فارغ ہونگی اُدھر شادی کے انتظام شروع ہو جائیں گے۔ گو اس کے دل میں نصیب کی طرف سے کچھ شبہے بھی پیدا ہوتے لیکن یہ انھیں اپنے دل میں زیادہ دیر نہ ٹھہرنے دیتی اس نے یقین کرلیا تھا کہ نصیب کو دفتر میں بہت زیادہ کام کرنا پڑتا ہے اور اس نے اس بات کا

بھی یقین کر لیا تھا کہ نصیب اس لئے زیادہ محنت کرتا ہے کہ بابو کے دوسرے کلرکوں سے جلد از جلد بازی لیجا کر ہیڈ کلرک بن جائے اور اس کی محبت اور عشق کا توانت بہت مدت ہوئی یقین آ چکا تھا۔ چوتھے سال کے شروع میں جب نصیب نے مہینے میں دو خط لکھنے میں بھی ایک کی کمی کر دی تو بھی اس نے کچھ زیادہ خیال نہ کیا۔ خود پابندی سے متواتر چار خط لکھتی رہی اور چار خطوں کے جواب میں ایک خط آنے پر بھی خوش ہو جاتی۔ سمجھ بیٹھی تھی کہ وہ عنقریب ہیڈ کلرک ہو جائے گا اور میں بی۔اے ہو جاؤنگی ——— آئندہ زندگی کے خواب بڑے دلکش اور سہانے ہوتے۔ انہیں دلکش اور سہانے خوابوں کے سہارے وہ جدائی کی تلخیاں برداشت کر رہی تھی۔

پھر کئی مہینے نصیب کا خط نہیں آیا۔ سوچتی رہی اور تاویلیں کرتی رہی طلعت کو بھی کئی خط لکھے اس نے بھی جواب نہیں دیا حالانکہ پہلے طلعت کے برابر خط آتے رہتے تھے۔ وہ بھی اپنے خطوں میں نصیب کی دفتری مصروفیتوں کا ذکر کرتی اور لکھتی کہ اب وہ مسلسل ایک ایک مہینہ وطن نہیں آتا۔

دو ایک مہینے اسی کشمکش میں گزر گئے کہ کیا کرے؟ اور اس کے ساتھ امتحان کی تیاری بھی کرنی تھی۔ یہی جی میں آتا کہ بی اے کا امتحان دے کر ان کے وطن جائے۔ طلعت کو ملے بھی کئی سال ہو گئے ہیں۔

آخر بی۔اے کے امتحان سے بھی فراغت حاصل کر لی اور وہ طلعت سے ملنے جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ نصیب کا خط آ گیا۔ یہ خط بڑا مایوس کن تھا اور بڑا روح فرسا۔ لکھا تھا،

" راحت! ——— اپنے بدنصیب کا آخری سلام قبول کیجیئے، اس خط میں میں نے آپ کو "پیاری" سے مخاطب نہیں کیا۔ اب مجھے ایسا لکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں نے آپ کو کافی عرصے سے خط نہیں لکھا آپ یقیناً حیران ہوئی ہونگی اور پریشان بھی۔ میری غم بھری کہانی بہت لمبی ہے اور بہت دردناک اور میں نہ آپ کا قیمتی وقت ضائع کرنا چاہتا ہوں نہ آپ کو رنج و غم میں مبتلا کرنا۔

بات یہ ہوئی کہ آپ کے یہاں سے جانے کے دوسرے سال ہی ہمارے محکمہ میں تخفیف کی گئی اور اس کے ظالم پنجہ سے میں بھی نہ بچ سکا۔ چھ سات مہینے کسی دوسری ملازمت کی تلاش میں مارا مارا پھرا۔ پھر تنگ آ کر والد صاحب سے کچھ روپیہ لیا اور اپنا جمع کیا ہوا سارا روپیہ بنک سے نکال کر دوکان کر لی۔ خدا کے فضل سے دوکان تھوڑے ہی عرصہ میں چل پڑی اور مجھے بہت فائدہ تھا کئی مہینے ہوئے ایک رات اس میں آگ لگ گئی اور میرا سارا سرمایہ جل کر خاک ہو گیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میرے خطوں سے پہلا سا جوش اور اطمینان اچانک غائب ہو گیا تھا یہ اسی وقت کی بات ہے دوکان چل پڑنے پر خیال تھا کہ آپ کو مفصل خط لکھونگا اور ابھی اس خیال کو عملی جامہ نہ پہنانے پایا تھا کہ میرے سارے خیال اور ساری آرزوئیں دوکان کے مال کے ساتھ جل گئیں۔

مختصر یہ کہ اب میں آپ کے قابل نہیں رہا ——— آہ اب مجھے اب وہ عہد و پیمان یاد آ رہا ہے جو ہم نے آج سے چار سال پہلے خدا اور طلعت کو گواہ دے کر باندھا تھا۔ اور اس کی یاد سے میرے دل پر آرے چل رہے ہیں لیکن راحت خدا کے لئے مجھے بھول جایئے اب میں آپ جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ خصائل کی حامل ہستی کے ہرگز ہرگز قابل نہیں رہا ہوں۔ اتنے عرصہ تک جو میں نے آپ کو اپنے حالات سے مطلع نہیں کیا تو اس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں اس تمام مدت میں مجھے امید رہی کہ میرے برے دن جلد ختم ہو جائینگے لیکن ایسا نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ ہر نیا مہینہ میرے لئے نئی مصیبتیں لے کر آیا۔ خیر خدا کرے آپ مجھے بھولنے میں کامیاب ہو جائیں "۔ فقط

خط پڑھکر راحت پر بجلی سی گر پڑی۔ خوابوں کے عالیشان محل فوراً اسی دم میں گر کر مٹی میں مل گئے۔ امید تھی کہ نصیب ہیڈ کلرک بن جائیگا۔ وہ کلرکی سے بھی گیا۔

کئی دن اس رنج و الم میں گزر گئے اسے اس بات کا اتنا زیادہ غم نہ تھا کہ جس کے ساتھ زندگی گزارنے کا عہد کیا ہوا ہے وہ غریب اور مفلس ہو گیا ہے جتنا کہ نصیب کی تکلیفوں کے احساس کا غم تھا۔ خط کے الفاظ سے ظاہر تھا کہ نصیب نے ایک ایک لفظ انتہائی درد و کرب کے ساتھ لکھا ہے۔ رنج کا اتنا غلبہ تھا کہ جواب تک نہ لکھ سکی۔ جب بھی لکھنے بیٹھتی تو الفاظ نہ ملتے جن سے اپنے دل کا حال بیان کر سکتی۔

پھر ایک نیا گل کھل پڑا والدہ کے پاس اس کے لئے ایک اور پیغام آ گیا یہ ایک ای۔اے۔سی کا پیغام تھا۔ اس نے پچھلے سال گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کیا تھا اور اس سال ای۔اے۔سی کے امتحان میں اول نمبر پر کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کی ماں نے اس رشتہ کی خوبیاں بیان کرنے میں اپنا تمام زور لگا دیا۔ راحت نے مغموم دل سے ماں کا وعظ سنا اور خاموش رہی پھر اس کی ماں نے دوسری استانیوں سے زور دلوایا اور خود کھلے الفاظ میں نصیب کی برائیاں کرنے لگیں نصیب کی محبت کا کیا اعتبار اتنے عرصہ سے اس کا خط تک نہیں آیا اور پھر وہ تو صرف ایک کلرک ہی ہے وہاں تمہیں یہ آرام و آسائش نہیں مل سکتا زیادہ سے زیادہ اب اسکی تنخواہ سو روپے ہو گئی ہوگی۔

راحت نے ماں کے بتلانے سے پہلے ہی یہ سب باتیں سوچ لی تھیں سو روپے تو کیا اب تو اسے وہ ساٹھ روپے بھی تنخواہ نہیں ملتی جو پہلے ملتی تھی۔ نصیب کی طرف صرف راحت کی محبت تھی اور ای۔اے۔سی کی طرف راحت کی ماں، استانیاں اس کا شاندار مستقبل اور زندگی کے عیش تھے۔ لیکن نصیب کے لئے راحت کی محبت کچھ کم طاقتور نہ تھی جو اتنے حریفوں سے بہ آسانی شکست کھا جاتی۔ راحت نے

نصیب سے جدا ہو کر اس کی محبت اس شدت سے محسوس کی تھی کہ اس نے کئی دفعہ خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگی تھی کہ اے خدا میری محبت آزمائش میں ڈال دے میں نصیب پر ظاہر کرنا چاہتی ہوں کہ میں اس سے کتنی محبت کرتی ہوں نصیب کی مصیبتوں کا حال پڑھ کر اس نے خیال کیا کہ شاید یہ اس کی دعاؤں ہی کا اثر ہے۔ خدا نے اس کی محبت کو آزمائش کا موقع مہیا کر دیا ہے۔ اس نے خوب سوچا اور آخر والدہ سے ایک ستانی کی معرفت کہہ دیا کہ وہ نصیب کے اور صرف نصیب کے لئے ہے آپ دنیا کی کششوں کو دیکھ کر میرے لئے پریشانیاں خواہم نہ کیجئے وہ بہت بگڑیں کیونکہ وہ نصیب کو راحت کی نظروں سے نہ دیکھ سکتی تھیں انھوں نے راحت سے کہا تو پاگل ہو گئی ہے جو نصیب کے لئے اپنی اچھی زندگی کو لات مارتی ہے۔ مرد کی محبت کا کیا اعتبار۔ اس نے اتنے عرصہ سے تمھاری خبر بھی نہ لی۔ تمھیں کوئی تحفہ بھی نہ بھیجا اور اس رشتہ کو آج منظور کر لینے دو کل دیکھو تمھارے لئے کیا کیا تحفے آتے ہیں؛ تحفوں کا ذکر سن کر راحت کو نصیب کی مصیبتیں یاد آگئیں اور وہ رونے لگی۔

آخر راحت کی ماں راحت کی ماں تھیں انھیں اس پر رحم آ ہی گیا اور انھوں نے ای۔اے۔سی کو بھی وہی جواب کہلا بھیجا جو ہیڈ ماسٹر کو بھیجا تھا ادھر سے اطمینان ہونے کے بعد راحت نے نصیب کو لکھا کہ آپ کی تکلیفوں کا حال پڑھ کر مجھے انتہائی رنج پہنچا میں آپ کے لئے اور صرف آپ کے لئے ہوں اگر آپ کی نوکری چھوٹ گئی یا اگر آپ کی دوکان کو آگ لگ گئی تو اس سے میری محبت میں فرق نہیں آ سکتا جتنی جلدی ممکن ہو یہاں چلے آیئے جو کچھ میں نے اس عرصہ میں جمع کیا ہے وہ بذریعہ منی آڈر بھیج رہی ہوں آپ فوراً چلے آیئے میں بیتابی سے آپ کے روانہ ہونے کے خط کا انتظار کرونگی۔

یہ خط بھیج کر اسے ایک روحانی تسکین ہوئی کہ اس کی محبت پر آرام و عیش کا لالچ غلبہ نہ پا سکا لیکن جب اس خط کا جواب بھی کئی دن تک نہ آیا اور پھر منی آڈر واپس آ گیا تو اس کا رنج اور فکر پھر بڑھ گیا آخر ماں کو لیکر ان کے وطن پہنچی وہاں پہنچکر اسے معلوم ہوا کہ نصیب نے تقریباً ایک سال ہوا طلعت سے شادی کر لی ہے اور وہ بدستور اسی دفتر میں ملازم ہے۔

اطلاع عامل حکیم کریم الدین طبیب روحانی انارکلی لاہور آج کل گگڑ بھانہ ضلع امرتسر تشریف لے گئے ہیں لاہور کے ملاقات کرنے والے اصحاب خط و کتابت کے ذریعہ وقت ملاقات مقرر کر کے ملاقات کر سکتے ہیں گگڑ بھانہ آنے والے اصحاب امرتسر دروازہ رام باغ سے لاری موٹر پر سوار ہو کر گگڑ بھانہ تشریف لا سکتے ہیں رہائش و کھانے کا انتظام فری۔ فیس مشورہ معاف ہو گی۔

مینجر دفتر عامل حکیم کریم الدین۔ گگڑ بھانہ۔ ضلع امرتسر،

نوائے راز

ہر اک بات اُس کی دنیا سے جدا معلوم ہوتی ہے

از ابو الفاضل حضرت راز چاندپوری

مری فطرت، حقیقت آشنا معلوم ہوتی ہے
نظر پڑتی ہے جس شے پر خدا معلوم ہوتی ہے

سراپا سوز، لیکن جانفزا معلوم ہوتی ہے
صدائے سازِ دل، حق کی صدا معلوم ہوتی ہے

یہ ساغر! اے جزاک اللہ ساقی! واہ کیا کہنا
حقیقت ہر طرف جلوہ نما معلوم ہوتی ہے

بہت خوش ظرف و خوش ہیں بسے فضائے وادیٔ غربت
بظاہر ہمدم و درد آشنا معلوم ہوتی ہے

مُسلّم واعظ خوش گو کی حق گوئی، مگر تو یہ
ہر اک بات اُس کی دنیا سے جدا معلوم ہوتی ہے

یہ کیسی زندگی ہے اے اسیرِ دامِ خوش فہمی
جفائے باغباں بھی اب وفا معلوم ہوتی ہے

یہ سچ ہے اس جہاں میں زندگی کی ابتدا میں ہوں
مجھے پر زندگی کی انتہا معلوم ہوتی ہے

محبت کیا ہے، نیرنگی ہے اک حسنِ طبیعت کی
کبھی کافر کبھی حق آشنا معلوم ہوتی ہے

میں اُس منزل میں ہوں اب گام فرسا اے زہے قسمت
نگاہ راہزن بھی رہنما معلوم ہوتی ہے

یہ طرزِ شعر گوئی، راز یہ طرزِ غزلخوانی
تری فطرت حقیقت آشنا معلوم ہوتی ہے

قدیم آریائی موسیقی

عناصر پرستی حسن دوستی اور شوق عبودیت کی تراز نیز کارفرمائیاں

(مولانا خدا بخش اظہر امرتسری)

موسیقی کی ابتدائی تاریخ پر بے خبری کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس لئے یہ اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ کہ انسان نے اپنی آواز کو کب ترنم ریز بنایا اور اس حرکت کے اسباب و محرکات کیا تھے؟ لیکن جب قدیم اقوام کے عابدانہ مشاغل پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ فن بھی ذوق عبادت کی پیداوار ہے۔ زمانہ قدیم کے عابد جب معبود کی حمد و ستائش میں مصروف ہوتے تھے۔ تو ان کی آواز جوش عقیدت کے باعث نغمہ و ترانہ کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ یا وہ اپنی آواز کو دلکش بنانے کے لئے ایسا طرز تکلم اختیار کرتے تھے۔ جس سے صدا کو نغمہ بننے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس زمانہ کی موسیقی اگرچہ مزامیر کی امداد اور فن کی قیود سے محروم تھی۔ لیکن وہ ایک مشعل تھی جس کی روشنی میں عہد وسطیٰ کے مغنیوں کو قواعد فن بنانے کا موقع ملا اور یہی سادہ ابتدائی حالات زمانہ کے مطابق قدیم ترقیوں سے ہم آغوش ہوتی رہی۔ اور اصلاح و تربیت کے تمام مرحلوں سے گزر کر رفعت و کمال کی اس منزل پر آ گئی۔ جہاں ہندوستانی موسیقی ساری دنیا کو حیران کر رہی ہے۔

مذہبی عقیدت کا اظہار

آج ہندوستان میں جس قسم کی موسیقی رواج پذیر ہے۔ اس کے آغاز کا سہرا قدیم آریائی اقوام کے سر ہے جو اپنے معبود کی حمد و توصیف میں آواز کو مترنم بنایا کرتے تھے۔ آریائی موسیقی کو سرود مذہبی سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ ان کی ترانہ ریزی کا ماحول و ماخذ سر تا پا مذہبی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اجمال کی مختصر تفصیل کرتے وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جب آریائی اقوام دریائے آمو اور شمالی و غربی پامیر میں مقیم تھیں۔ ان کا مذہب کیا تھا؟ کس کی پرستش کرتے۔ اور کس معبود کی مدح و توصیف ان کے عقائد میں داخل تھی ان سوالوں کا جواب یہی ہو سکتا ہے۔ کہ قدیم آریہ کا جو مذہب تھا۔ وہ بلحاظ تصور و معنی موجودہ زمانہ کے دینی نظریہ سے بالکل مختلف تھا۔ اس اختلاف کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ ان میں کسی پیغمبر کا ظہور نہیں ہوا کیونکہ تمام مرسلین سامی النسل ہوئے ہیں۔ اس لئے آریہ اپنی زندگی کے قدیم دور میں جو ولادت مسیح سے تقریباً ۵ ہزار برس سے شروع ہوتا ہے تاریخی

و مذہبی حیثیت سے نہیں پہچانے جا سکتے۔ البتہ آثار قدیمہ، مناظر طبعی اور علامات فطری ان کی طبیعت پر گہرے اثر ڈالتے تھے۔ سورج ان کے ماحول کو گرم رکھتا تھا۔ چاند شب کی سیاہی کو نقرئی رنگ کا لباس عطا کرتا تھا۔ ستارے رات کے سینے میں نورانی ہنسی کا اظہار کرتے تھے۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک ان کے ماحول کو مضطرب کر دیتی تھی۔ کالی رات کی خوفناک سیاہی ان کے دلوں کو خوف زدہ کر دیتی تھی۔ لیکن اس کے بعد جب سورج کی شعاعیں شفق کی رنگینیوں کے ساتھ پیراہن شب کو تار تار کر کے فرحت بخش روشنی پھیلا رہی تھیں۔ تو وہ رات کے مہیب اثرات سے بے نیاز ہو جاتے تھے۔ قدرت کی یہ کارفرمائیاں آریاؤں کے دلوں میں عبودیت و عقیدت کے مختلف جذبات پیدا کر دیتی تھیں۔ یہی جذبات رفتہ رفتہ مذہب کی صورت اختیار کر گئے۔ اور ان کے دلوں کا اعتقادی رشتہ مناظر طبعی سے استوار ہو گیا ہے۔ اور اس تعلق کو احترام مناظر طبعی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

طبعی اور فطری مذہب

محولہ بالا امور سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ آریائی دین بالکل طبعی حیثیت رکھتا تھا۔ کیونکہ عناصر قدرت کا خوف و احترام ان کی طبیعت کا جز بن چکا تھا۔ اور آہستہ آہستہ یہی احترام عابدانہ عقیدت کی صورت اختیار کر گیا لیکن آریائی مذہب کے ابتدائی تعین سمجھنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی کوئی مذہبی عبادت گاہ بھی تھی یا نہیں؟ کیا ان کی عبادت کا رخ کسی شکل و مجسم کی طرف تھا؟ اگر تھا۔ تو ان کے معبود ارضی کی وضع و صورت کیا تھی۔ ان سوالوں کے جواب نفی میں بھی ہو سکتے ہیں۔ اور اثبات میں بھی اگر کہا جائے۔ کہ آریوں کا کوئی مندر اور بت نہ تھا۔ تو یہ بھی غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ موجودہ زمانہ کا جو انداز پرستش ہے۔ اس کے مطابق وہ کوئی عبادت خانہ یا مصنوعی معبود نہ رکھتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ عبادت خانہ اور معبود مصنوعی سے محروم نہ تھے۔ تو یہ بھی غیر درست نہ ہوگا۔ کیونکہ ان کا معبد اور معبود ان کے فطری مذہب کی طرح سادہ اور شکل و صورت کے تعلقات سے پاک تھا۔ مناظر قدرت کا دامن ان کا عبادت خانہ تھا۔ اور فطری عناصر کی مدح و ستائش ان کی

عبادت تھی۔

عابدانہ موسیقی کا مظاہرہ

جب صبح کاذب نمودار ہوتی اور دنیا کے چہرے سے رات کا سیاہ پردہ اٹھتا تھا تو آریائی بوڑھے جوان، بچے، عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں آزاد فضا کے کسی خوشگوار کھلے میدان میں جمع ہوتے۔ یہ جگہ سبزہ و گلدستہ کی زیبائش سے آراستہ ہوتی تھی۔ اور اس کے درمیان چشمہ ابلتا تھا۔ تمام حاضرین درختوں کے گھنے سائے میں بیٹھ جاتے۔ اور اپنے درمیان جھونکے ایک بہت بڑی مہرسل رکھ لیتے تھے۔ جس وقت سورج کی پہلی کرن افق سے سر نمود ہو کر دریچہ مشرق سے جھانکتی تھی۔ تو آریائی عورتیں سب سے پہلے "سوما" کی قربانی کرتیں سوما ایک شربت تھا۔ جو پہاڑی بوٹیوں اور دودھ کو ملا کر بنایا جاتا تھا۔ اس کے بعد عناصر طبیعی کی حمد و مدح میں اشعار و منظومات ترنم کے ساتھ پڑھے جاتے۔ چند لوگ نغمہ ریزی کرتے۔ اور باقی حاضرین نہایت خاموشی کے ساتھ گیتوں کو سنتے تھے۔ یہ ہے آریائیوں کی سب سے پہلی اور قدیم ترین عبادت۔

عناصر قدرت کی تشکیل

یہی طرز عبادت تدریجی ترقیوں اور زمانہ کے انقلابات سے اصلاح پذیر ہوتا ہوا اس مرحلے پر آن پہنچا۔ جہاں طبعی عناصر و قویٰ کو شکل و صورت اور نام کی خلعت بخشی گئی۔ مختلف قوائے قدرت کو دیوتاؤں کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اور ان کے اوصاف اعجاز ربوبیت سے تعبیر ہونے لگے۔ اس کے بعد جب آریائی علماء کا دائرہ فکر و نظریات زیادہ وسیع ہو گیا۔ تو انہوں نے دیوتاؤں کی حجری تصویریں بنانا شروع کر دیں غالباً اسی عہد میں آریائی صنم پرستی کا آغاز ہوا۔ علماء و شعراء کا حلقۂ فکر جس قدر وسیع ہوتا گیا۔ اسی قدر صنم سازی اور صنم پرستی فن اور فلسفہ کی صورت اختیار کرتی گئی۔

جب ہم اس مسئلہ پر فکر و تحقیق کی روشنی میں بحث کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسی عناصر پرستی پر آریاؤں کے مذہبی سرود کی بنا ہے کیونکہ وہ قدرت کے ہر دلکش شاہکار میں شان ربوبیت دیکھتے اور اس کی مدح و تعریف میں نغمہ سرائی کرنے لگتے تھے۔ اس کے بعد جب آریاؤں کے مجلسی دائرہ میں قربانی اور دوسری رسوم داخل ہو گئیں۔ تو ضرورت وقت کے مطابق ان کے نغمہ و سرود کا حلقہ بھی وسیع ہوتا گیا۔

امیر الشاپدر

آریائی خاندان میں نغمہ سرائی ہر شخص کا مذہبی فریضہ تھا۔ بچے سے لے کر بوڑھے تک فن موسیقی سے واقف ہوتے تھے۔ لیکن باپ کا فرض تھا کہ مرنے سے پہلے دوسری مادی چیزوں کی طرح موسیقی کے وہ اسرار و رموز جو اس کے دماغ میں محفوظ ہوتے۔ اپنے بیٹوں کو بتا کر مرے۔ چنانچہ ہر شخص جب اپنے آپ کو زندگی کے آخری کنارے پر محسوس کرتا تھا۔ تو اپنی اولاد کو بلا کر تمام اصول نغمہ سرائی اور مذہبی قوانین و رسوم سکھا دیتا تھا۔ آریائی موسیقی دولت خاندانی تھی۔ جو ہر بیٹے کو اپنے باپ سے ورثہ میں ملتی تھی۔

حسن پرستی

آریائی موسیقی کا سلسلہ صرف مذہبی امور تک محدود نہیں تھا۔ بلکہ وہ دوسرے مراحل زندگی میں بھی نغمہ سرائی کرتے تھے۔ شادی کے وقت خوشی کے گیت گائے جاتے غمی کی ساعت میں مرثیہ خوانی ہوتی تھی۔ اور جنگ کے میدان میں رجز کے ذریعہ سے جہاد و شجاعت کا پیغام دیا جاتا تھا۔ لیکن آریاؤں کے تمام مذاہب خوبصورتی کے کسی نہ کسی پہلو سے متعلق ہوتے تھے۔ وہ ایسی سرزمین میں رہتے تھے۔ جس کا گوشہ گوشہ بہار جنت سے ہمکنار ہوتا تھا۔ جس میں نقرئی چشمے بہتے تھے۔ اور زمین کا ذرہ ذرہ لالہ و گل کے لباس میں جلوہ گر ہوتا تھا۔ اس لئے حسن پرستی ان کی فطرت میں داخل تھی۔ وہ طبعی طور پر عاشق مزاج تھے۔ اس لئے حسن خواہ وہ شگفتہ پھولوں کے دامن میں ہو خواہ انسانی عارض پر مسکراتا ہو۔ پرستش و احترام کا مستحق سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کا مقولہ ہے کہ ہر حسن ایک گوہر گراں ہے۔ جس سے مخلوقات کو بنایا جاتا ہے۔ یہی احساس حسن پرستی ہے۔ جو آریاؤں کو نغمہ و موسیقی کی طرف لانے کا موجب ہوا چونکہ ترنم ریزی آریاؤں کی آبائی وراثت ہے۔ اس لئے آج کل کی آریائی قوموں میں بھی موسیقی کا شوق پایا نظر آتا ہے۔

موسیقی کا مولد

آریائی موسیقی کے محرکات پر اس سے پہلے نظر ڈالی جا چکی ہے۔ اس ضمن میں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے۔ کہ نغمہ سرائی آریاؤں کی فطری عادات میں داخل ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی جائے ولادت کونسی ہے۔ متذکرہ بالا امور سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان کی ترنم ریزی نے قدیم آریائی وطن یعنی پامیر و باختر میں جنم لیا چونکہ یہ کارنامہ ۳۰۰۰ ق م سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے مورخ کی نظر میں یہ مسئلہ بہت زیادہ واضح نہیں۔ اور تاریخی تجسس سے جو گیت میسر آسکے ہیں ان میں کوہ سہند کا اثر نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آریائی موسیقی کا ابتدائی قبل از ہجرت کے عہد سے متعلق ہے حقیقت بھی یہ ہے کہ آریا عناصر پرستی کا عہد اپنے آبائی وطن کے ساتھ لائے تھے۔ اور اسی عقیدہ کے جلو میں موسیقی کی جگنیاں بھی دوڑ رہی تھیں۔ اس کے بعد ۔۔۔ ق م میں جب آریاؤں نے اپنے آبائی وطن

سے ہجرت کی۔ اور کوہ ہندوکش کے جنوبی دامن اور افغانستان کے گلستان نما وادیوں میں آ گئے۔ تو ماحول کی رنگینی کے باعث ان کے جذبات شوق کو بہت زیادہ تقویت پہنچی جس کے باعث ذوق نغمہ سرائی بہت زیادہ بڑھ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آریائی موسیقی کو اصلاح و ترتیب اور ترقی و مقبولیت کے آغوش میں پرورش پانے کا موقع ملا۔ بہترین گیت اور موسیقی کے دلکش اسلوب اسی سرزمین میں ظہور میں آئے۔ اس کے بعد جب وہ دریائے گنگا کے حسین ساحلوں پر خوش خرامی کرنے لگے تو ماحول کی مناسبت کے باعث ان کی موسیقی نے ایک باقاعدہ فن کی صورت اختیار کر لی۔

گیتوں کے چار مجموعے

آریائی سرود کی حقیقی حیثیت پر وضاحت کے ساتھ بحث نہیں ہو سکتی لیکن احتمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۰۰ ق م سے سنہ ۱۵۰۰ ق م تک جو آریائی گیت گائے گئے۔ ان کی فضا کوہ ہندوکش کے جنوبی دامن سے لے کر چترال سوات۔ پنجشیر، تگاب، سرخاب، لغمان اور مشرقی افغانستانی وادیوں تک وسیع تھی۔ آریائی گیتوں کا جو تاریخی مجموعہ دستیاب ہو سکا ہے۔ اسے ذیل کے چار حصوں پر تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) رگ وید (۲) یجر وید (۳) سام وید - (۴) اتھرو وید۔ جن لوگوں نے آریائی گیتوں کی مندرجہ بالا تقسیم پر اجتہادی نظر ڈالی ہے۔ انہوں نے تقسیم چہارگانہ کی مندرجہ ذیل تعریف کی ہے۔ حصہ اول ان گیتوں پر مشتمل ہے۔ جو ان کی زندگی کے ابتدائی شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ (۲) حصہ دوم ان نظموں کا مجموعہ ہے۔ جو وادی کابل سے مشرق کی طرف بڑھتے ہوئے موزوں کی گئیں۔ اس لئے ان پر عجز اور فاتحانہ تفاخر کا رنگ غالب ہے۔ (۳) حصہ سوم کے گیت دریائے گنگا کے ساحلوں پر فاتحانہ ورود کی یاد دلاتے ہیں۔

تاریخی بحث

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آریوں کے مذہبی سرود کا ابتدائی حصہ افغانستان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے مجموعہ سرود پر آریائی افغانوں کی قدیم تاریخ پر بہترین روشنی ڈال سکتا ہے۔ "رگ وید" جو آریائی گیتوں کا قدیم مجموعہ ہے۔ آج تک اپنی تاریخی حیثیت کو بہت زیادہ روشنی میں نہیں لا سکا۔ البتہ مشرقی محققین کا خیال ہے۔ کہ رگ وید کے گیت سنہ ۱۵۰۰ ق م میں گائے جاتے تھے۔ مسٹر میکس مولر جس نے ویدوں کا جرمن ترجمہ چار حصوں میں شائع کیا ہے۔ اپنی تحقیق کے مطابق لکھتا ہے۔ کہ ویدوں کے ظہور کا جدید وقت سنہ ۱۲۰۰ ق م اور قدیم ساعت سنہ ۱۵۰۰ ق م سے متعلق ہے۔ میکس مولر کا خیال ہے کہ یہ نظریہ بہت زیادہ دور اندیشی پر مبنی نہیں۔ اس زمانہ کو سنہ ۱۵۰۰ ق م و سنہ ۱۲۰۰ ق م : سمجھ کہا جا سکتا ہے۔ اڈمائر لکھتا ہے۔ کہ رگ وید کی قدیم ترین تاریخی حیثیت سنہ ۱۵۰۰ ق م سے متجاوز نہیں ہو سکتی۔ موسیو رمنہ گرد سے جو فرانسیسی مورخ رگ وید کے پہلے حصہ کو سنہ ۱۵۰۰ ق م سے اور دوسرے حصہ کو سنہ ۱۲۰۰ ق م سے منسوب کرتا ہے۔ اور آخری حصہ کو سنہ ۱۰۰۰ ق م سے نسبت دیتا ہے بہرحال یہ امر محقق ہے کہ رگ وید ایک ہی دن میں تصنیف پذیر نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے اشعار بتدریج موزوں کئے گئے۔ جو انسانی حافظہ کے ذریعہ سے مختلف زبانوں اور ملکوں میں منتقل ہوتے رہے۔

ویدی سنسکرت

جس زبان میں یہ گیت تھے۔ اسے افغانستان اور ہندوستان کی قدیم زبان کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہی زبان ہے جس کے اجزا کی ترمیم تقلیب اسعادی حادثے سے ایشیا کی اکثر زبانیں عالم وجود میں آئیں۔ اس زبان کو "ویدی سنسکرت" کہا جاتا ہے۔ اور موجودہ پشتو کو سنسکرت کی کسی حد تک بگڑی ہوئی صورت کہا جائے۔ تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ رگ وید کی زبان کا لہجہ پشتو سے بڑی حد تک ملتا ہے اور ہندوکوہ جنوبی کے دامن میں جو آبادی ہے۔ ان کی کوہستانی زبان بڑی حد تک سنسکرت سے مشابہ ہے۔

غزل

از جناب طفیل شملوی

مضمحل سی قلب میں ہے شورشِ ارماں ہنوز یاد ہیں مجھکو ترے ٹوٹے ہوئے پیماں ہنوز

اے نظر افروز اتنی بے رخی اچھی نہیں تیرے جلوے دیدۂ حیراں میں ہیں پنہاں ہنوز

آہ کتنی دلفریبی ہے کسی کی یاد میں عہدِ ماضی کے تصور سے ہوں میں خنداں ہنوز

ماہ انور بدلیوں میں چھپ گیا جانے کہاں ہے نظر کے سامنے وہ چہرۂ رخشاں ہنوز

ہو گئے گم کس قدر ارماں نگاہِ شوق میں انتظارِ دوست پر ہے زندگی نازاں ہنوز

سوزِ ناتمام

دلگداز المیہ

از محترمہ مس جمیلہ عبداللہ

گاڑی تیزی سے چلی جا رہی تھی۔ اور میرے دل میں طرح طرح کے خیالات چکر لگا رہے تھے۔ میں پورے سات سال کے بعد اپنی خالہ کے پاس چاندپور جا رہا تھا۔ میرے والد بمبئی میں ریشم کے ایک کارخانے کے مالک تھے۔ والدہ چونکہ بچپن ہی سے مجھے چھوڑ کر چل بسی تھیں۔ اس لئے والد صاحب نے مجھے بڑے پیار سے پالا تھا۔ اور مجھے اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں ایم اے کے امتحان میں اعلیٰ نمبروں پر پاس ہوا۔ اور اس خوشی میں انہوں نے مجھے چاندپور جانے کی اجازت دے دی۔

"سگرٹ پی جئے گا"۔ ایک بھدی سی آواز آئی۔ میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

"نہیں جناب مجھے سگرٹ کی عادت نہیں" میں نے جواب دیا۔

دو چار ادھر ادھر کی باتوں کے بعد مخاطب چپ ہو گیا اور میرے خیالات کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ اور نازلی بھی تو کرسمس کی چھٹیاں گھر گذارنے آ رہی ہے۔ میں نے دل میں کہا۔ اور مجھے بچپن کی تمام باتیں یاد آ گئیں۔ "کیا وہ اب بھی اتنی ہی شریر ہو گی"۔ میں نے سوچا۔ میں دل ہی دل میں اس کے خیال سے خوش ہو رہا تھا۔ کیونکہ بچپن ہی میں میری اس سے منگنی ہو چکی تھی۔

گاڑی یکایک رکی۔ "چاندپور آ گیا" کسی نے کہا۔ میں بھی اپنا بیگ سنبھالتا ہوا گاڑی سے باہر نکلا۔ اور تانگہ کرائے پر لے کر چل دیا۔ تانگہ کوٹھی کے صدر دروازے پر آ کر رکا۔ اور دروازے پر جا کر میں نے گھنٹی بجائی۔ تھوڑی ہی دیر میں دروازہ کھلا۔ اور میں نے ایک نازک اندام حسین لڑکی کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ حیرت سے میرا منہ کھلا رہ گیا۔ میں نے سمجھا میں بھول کر کسی دوسری کوٹھی میں آ گیا ہوں۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں۔ لطیفہ خانم کی کوٹھی کون سی ہے"۔ میں نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔ "یہی ہے میں ان کی ملازمہ ہوں"۔ اور اس کی معصوم و دلکش آنکھیں میری طرف اٹھ گئیں۔

"اچھا تو اندر اطلاع کر دو نسیم میاں آئے ہیں"۔

چند ہی لمحوں میں خالہ جان ننگے پاؤں ننگے سر آ کر مجھ سے لپٹ گئیں۔ میری آنکھوں سے بھی مسرت کے چند آنسو بہ نکلے۔ پھر وہ مجھے اندر لے گئیں۔ اور ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ بار بار میرے دل میں خیال آیا۔ کہ میں ان سے اس لڑکی کے متعلق پوچھوں لیکن پھر کسی مصلحت کی بنا پر چپ ہو رہا۔

"عذرا نسیم میاں کے لئے اوپر والا کمرہ صاف کر دو"۔ خالہ جان نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

"بہت اچھا"۔ ہلکی اور ملائم آواز آئی۔

آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ "یہ لڑکی کون ہے"۔ میں نے پوچھا۔

"بے چاری مصیبت زدہ معلوم ہوتی ہے۔ در بدر بھیک مانگتی پھر رہی تھی۔ میں نے رحم کھا کر نوکر رکھ لیا"۔ میرا کمرہ دوسری منزل پر واقع تھا۔ وہاں سے باغ کا نظارہ بے حد بھلا معلوم ہوتا تھا۔ کمرہ بے حد صاف تھا۔ کمرے کی الماری میں لائبریری سے چند کتابیں لا کر سجا دی گئی تھیں۔ کمرے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا غسل خانہ بھی تھا۔ جہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ مجھے وہ کمرہ بے حد پسند آیا۔ دوسرے دن صبح ابھی میں بستر پر ہی تھا۔ کہ عذرا داخل ہوئی۔ اور صفائی کر کے چلتی بنی۔ جاتے ہوئے اس نے ایک اچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں ایک جادو تھا۔

دو دن کے قیام ہی میں مجھے معلوم ہو گیا۔ کہ عذرا کا اقتدار گھر میں بہت بڑھا ہوا تھا۔ ہر اہم کام اسی کے سپرد ہوتا۔ اور باقی تمام نوکروں پر اس کا رعب تھا۔ خالہ جان بھی اسے بہت اچھا سمجھتی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ گھر کی پرانی ملازمہ کبلی اس سے حسد کرتی تھی۔ اس سے ہمیشہ لڑتی رہتی تھی۔ اس کی ہر بات ہر فعل سے حسد ٹپکتا تھا۔ کیونکہ عذرا سے پہلے گھر میں اس کا اقتدار تھا۔ تیسرے دن دوپہر کو نازلی آ گئی۔ وہ ایک مہینہ گھر پر گذارنے آئی تھی۔ سارے گھر میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اُف کتنی شریر تھی نازلی۔ بات بات میں مذاق۔ ہر حرکت میں شرارت۔ خالہ جان بھی اپنی اکلوتی بیٹی کو دیکھ کر پھولے نہ سماتی تھیں۔ آخر اب لے دے کر ان کی زندگی کا سہارا نازلی ہی تو رہ گئی تھی۔ نازلی کے والد اسے دس برس کا چھوڑ کر چل بسے تھے۔ لیکن ماں نے ایسی پرورش کی۔ کہ وہ باپ کا غم بھول گئی۔ میں بھی اس کے آنے سے بے حد خوش تھا۔

ایک ہفتہ اسی مسرت میں گذر گیا۔ عذرا اور نازلی کی آپس میں بڑی

کاڑھی جیتی تھی۔ جب دونوں پاس پاس بیٹھی تھیں۔ تو عذرا بالکل ایک کالج کی لڑکی کی طرح لگتی تھی۔ اور دونوں تھیں بھی ہم عمر۔ بجلی اس بات سے بہت جلتی تھی۔ کیونکہ جب وہ دونوں کو اکٹھا دیکھتی۔ تو اس کے چہرے کا رنگ حسد کی وجہ سے سیاہ پڑ جاتا۔

ایک دن میں باغ میں اکیلا ٹہل رہا تھا۔ کہ جھاڑیوں کے جھنڈ میں سے مجھے پیلے رنگ کا ایک نہایت خوبصورت جنگلی پھول دکھائی دیا۔ میں نے سوچا۔ اسے توڑ کر نازلی کو تحفے کے طور پر پیش کروں گا۔ غرض میں جھاڑیوں میں گھس گیا۔ جب پھول توڑ کر نکلنے لگا۔ تو پتلون کا پائنچہ کانٹوں میں الجھ گیا۔ میں اُسے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ نزدیک سے بجلی کی آواز آئی۔ وہ غصے میں کچھ کہہ رہی تھی۔ میں وہیں ٹھٹک کر دیکھنے لگا بجلی کے ساتھ ساتھ عذرا چلی آ رہی تھی۔ وہ رو رہی تھی۔ بجلی کہہ رہی تھی "اب بھی مان جا۔ لے دس کی بجائے پندرہ روپے لے لے اور اس گھر سے چلی جا"۔ لیکن عذرا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "اچھا سُن میں بھی تجھے اس گھر سے رسوا کر کے نکلواؤں گی"۔ بجلی نے گرج کر کہا۔ اور وہ دونوں تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی برآمدے کی طرف چل دیں۔ "کتنی بھولی لڑکی ہے"۔ میں نے پھول سے مخاطب ہو کر کہا۔ اور نازلی کے کمرے کی طرف چل دیا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

کچھ دنوں کے بعد میں اور نازلی سینما جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میز پر دیکھا تو گھڑی گم تھی۔ میں بہت پریشان ہوا۔ سونے کی نہایت قیمتی گھڑی تھی۔ بہتیرا ڈھونڈا۔ لیکن گھڑی نہ ملی تاآخر خالہ جان کے پاس پہنچی۔ سارے نوکروں کو بلایا گیا۔ ان کی تلاشی لی گئی۔ لیکن گھڑی نہ ملی۔ رپورٹ بھی ہوئی۔ لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر بجلی آگے بڑھی اور کہنے لگی۔

"تُسے ہے بی بی۔ عذرا کی بھی تلاشی لی ہوتی۔ میاں صاحب کا کمرہ تو وہی صاف کرتی ہے۔ اور تو کوئی ان کے کمرہ میں جاتا ہی نہیں"۔ پہلے تو خالہ جان نہ مانیں لیکن بجلی کے کہنے سننے پر اس کے کمرے کی تلاشی ہونے لگی۔

"یہ رہی"۔ یکایک بجلی نے عذرا کے بستر سے کوئی چیز اٹھاتے ہوئے کہا۔ اور میری گھڑی اس کے ہاتھ میں تھی۔ حیرت سے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ "کس قدر کمینی حرکت ہے"۔ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا میں نے عذرا کے منہ کی طرف دیکھا۔ پہلے تو اس کا چہرہ سرخ اور پھر برف کی مانند سفید ہو گیا۔ اور پھر دو موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ سارے اسے لعنت ملامت کر رہے تھے۔ خالہ جان کو بھی بےحد غصہ آ رہا تھا۔ اور بجلی تو بےحد بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہی تھی۔ لیکن عذرا چپ تھی۔

"بس اب چھوڑئے اس قصے کو"۔ نازلی نے خالہ جان سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اے ہے بیوی کوئی معمولی بات ہے! پیسہ دو پیسہ نہیں کھٹے گھڑی پر ہی ہاتھ ڈالتا"۔ بجلی نے کہا۔

نازلی کچھ اُداس سی ہو گئی۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گیا۔ مجھے خود بےحد غصہ تھا۔ "مہربانی سے تم اس کے ساتھ زیادہ میل جول نہ رکھو۔ کیا خبر وہ چوروں کے کسی بڑے گروہ سے ملی ہوئی ہو"۔ میں نے نازلی سے کہا پہلے تو اُسے یقین نہ آیا۔ مگر بعد میں اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ ہرگز اس سے بات نہیں کرے گی۔

رات کے ایک بجے کا عمل ہو گا۔ سارے لوگ سو رہے تھے میں بتی جلائے پڑھ رہا تھا۔ آہستہ سے دروازہ کھلا۔ اور عذرا اندر داخل ہوئی اس کی آنکھیں رونے کے باعث سوج رہی تھیں "کیا کام ہے"۔ میں نے درشتی سے پوچھا۔

"میں نے آپ کی گھڑی نہیں لی تھی"۔

"تو کیا اس کے پاؤں لگ گئے تھے۔ جو وہ تمہارے کمرے میں جا پہنچی"۔

"شاید"۔

"شاید وائد میں کچھ نہیں جانتا۔ مہربانی سے یہاں سے چلتی ہو"۔

"تو آپ کو یقین نہیں ......"

"کہہ تو دیا۔ کہ چوروں کے سر پر کیا سینگ ہوتے ہیں"۔

اس نے آہستہ آہستہ اپنی لمبی اور گھنی پلکیں اوپر اٹھائیں۔ اُس کی آنکھیں پرنم تھیں۔

"میں کمینی نہیں ہوں۔ میں چور نہیں ہوں"۔ اس نے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالتے ہوئے کہا۔ اور باہر نکل گئی۔ اس نظر کا مجھ پر گہرا اثر ہوا۔ اور میں بےچین ہو گیا۔ "نہیں وہ کبھی چور نہیں ہو سکتی"۔ میں نے دل میں کہا۔ میں نے بتی بجھا دی۔ لیکن مجھے نیند نہ آئی۔ میں اپنے کئے پر پشیمان تھا۔ بےچاری کو کتنا صدمہ ہوا۔ اور رو بھی تو رہی تھی کہ مجھے اس پر بےحد ترس آ رہا تھا۔ لیکن اگر وہ چور نہیں تھی۔ تو اس نے اسی وقت خالہ جان کے سامنے صفائی پیش کیوں نہ کی۔

انہی خیالات میں مَیں سو گیا۔ اور رات بھر اسی کے خواب دیکھتا رہا دوسرے دن عذرا حسب معمول میرے کمرے کی صفائی کے لئے آئی اور چلی گئی۔ اس کا چہرہ بےحد غمگین تھا۔ میرے دل کو ٹھیس لگی۔ اسی دن کے بعد میں نے عذرا کو کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ دن اور گذر گئے لیکن میرے دل کو اطمینان نہ ہوا۔ میں عذرا کو دیکھتا۔ تو میرے دل میں ایک

ہیجان برپا ہو جاتا۔ مجھے اپنی حالت کی خود بھی سمجھ نہ تھی۔ تیسرے دن بھی عذرا کمرے کی صفائی کے لئے آئی اور چلی گئی۔ میں بھی نہانے کے لئے غسلخانہ کی طرف چل دیا۔ وہاں پہونچا تو خیال آیا کہ تولیہ میلا ہو رہا ہے صاف نکال لوں۔ میں دروازہ کھولنے ہی لگا تھا کہ مجھے اپنے کمرے میں کسی ہلکے ہلکے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ میں وہیں ٹھہر گیا۔ اور دروازے کی درز میں سے جھانکنے لگا۔ دیکھا کہ بجلی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی میز کی طرف بڑھ رہی ہے۔ میز پر سے اس نے میری چمکتی ہوئی گھڑی اٹھائی۔ اور چل دی۔ میں بھی آہستہ سے دروازہ کھول کر اس کے پیچھے چل دیا۔ بجلی بڑی بے پروائی سے چلی جا رہی تھی۔ صحن میں پہنچ کر اس نے اپنا رخ عذرا کے کمرے کی طرف کیا۔ اس کے کمرے کے دروازے کے پاس جا کر ذرا ٹھٹھکی اور اطمینان کر لینے کے بعد اندر گھس گئی۔ میں بھی ٹہلتا ٹہلتا اس کمرے کے سامنے سے نکل گیا۔ دیکھا کہ بجلی عذرا کے صندوق میں کچھ چیز جلدی جلدی رکھ رہی ہے۔ میں اب سارا معاملہ جان گیا۔ روشن والی بات مجھے یاد آ گئی۔ اور مجھے بجلی کی چالاکی کا پتہ چل گیا۔ میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

میرے دل میں ایک ہیجان برپا تھا۔ اور آہستہ آہستہ وہ ایک لطیف جذبے میں تبدیل ہو گیا۔ عذرا کی وقعت میری نظروں میں بہت بلند ہو گئی۔ وہ ایک دیوی کی طرح بلند مقام پر کھڑی تھی۔ اور میں ایک حقیر پجاری کی حیثیت سے اس کے پاؤں چھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ لطیف جذبہ مجھے ہر لحظہ عذرا کے نزدیک تر کرتا گیا۔ حتیٰ کہ مجھے نازلی کی شوخ اور پرلطف باتوں میں بھی دلچسپی نہ رہی۔ سارا دن نازلی میرے پاس رہی لیکن میرے خیالات کہیں اور ہی پرواز کر رہے تھے۔ شام کے وقت مجھے گھڑی کا خیال آیا۔ میں آہستہ سے اٹھا۔ اور چپکے سے موقع پا کر اس کے کمرے میں گھس گیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ میں عذرا کے صندوق کی طرف بڑھا۔ اسے کھول کر دو چار کپڑے الٹے پلٹے تو گھڑی سامنے نظر آ گئی۔ جیب میں ڈال کر واپس کمرے میں آ گیا۔ دوسرے دن میری آنکھ کھلی۔ تو عذرا کمرہ صاف کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔ اور چہرے پر بے حد بیکسی چھا رہی تھی۔ مجھے اس کا سبب اچھی طرح سے معلوم تھا۔ کیونکہ نازلی بھی اب اس سے بات نہ کرتی تھی۔ اور مجھے اپنی غلطی کا احساس تھا۔ کئی دفعہ دل چاہا کہ عذرا سے کوئی بات کروں۔ لیکن زبان نے یاوری نہ کی۔ جاتی دفعہ عذرا نے میری طرف نہایت ہی مظلوم نظروں سے دیکھا۔ اس کی نگاہیں کسی چیز کی ملتجی تھیں۔ میں تڑپ اٹھا۔ مگر وہ جلدی ہی چلی گئی۔ برعکس اس کے بجلی آج بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ وہ عذرا سے لڑنے کے لئے بہانے ڈھونڈتی رہی۔ اور کئی مرتبہ اس سے لڑی۔ پھر اس نے میری گھڑی کا کئی بار ذکر کیا۔ مگر میں چپ رہا۔ خاص سے نہ رہا گیا۔ تو کہنے لگی "میاں نسیم کہیں آپ کی گھڑی تو نہیں گم ہو گئی؟"

لیکن میں پھر بھی چپ رہا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اس حکایت کو ڈھنکے کی چوٹ باہر نکال دوں۔ نہ جانے میرا دل عذرا کی طرف کیوں خود بخود کھینچا چلا جا رہا تھا۔ بہتیری کوشش کرتا۔ لیکن اس کا خیال پیچھا نہ چھوڑتا۔

نازلی بھی میرے گم سم رہنے کی وجہ سے کچھ پریشان سی تھی۔

رات کو میں باوجود کوشش کے نہ سو سکا۔ سخت بے چینی تھی۔ گھڑیال نے ایک بجایا۔ میں اٹھا۔ سخت سردی ہونے کے باوجود گرمی لگ رہی تھی۔ میں اٹھا اور کھڑکی کھول دی۔ چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ چاندنی کی وجہ سے میرا کمرہ روشن ہو گیا۔ میں آسمان پر ستاروں کو دیکھنے لگا۔ کس قدر سہانا سماں تھا۔ آسمان کی سیر کرتی ہوئی میری نظر زمین پر پہونچی۔ چاندنی کے باعث باغ کا چپہ چپہ روشن تھا۔ یکایک میری نگاہیں روش والی بنچ پر جا کر ٹھہر گئیں۔ یہ کیا؟ وہاں کوئی انسانی چہرہ مجھے نظر آیا۔ اس کی میری طرف پشت تھی۔ کوئی نسوانی جسم کسی چیز پر جھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

کون ہو سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں اپنے آپ کو باغ کی روش پر چلتا پایا۔ ایک نامعلوم کشش مجھے اس طرف لے جا رہی تھی۔ عذرا کی میری طرف پشت تھی۔ وہ کسی چیز پر جھکی ہوئی تھی۔ اور اس کا ہاتھ بلا ارادہ تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ میں اس کے قریب گیا۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ نہ جانے کیوں؟ چاند کی چاندنی میں وہ کچھ لکھ رہی تھی۔ زیادہ قریب آنے پر میں نے دیکھا۔ تو تعجب سے میرا منہ کھل گیا۔ وہ انگریزی میں کاغذ پر کچھ لکھ رہی تھی۔ کیا وہ پڑھی ہوئی ہے؟ میرے دل نے سوال کیا۔ میں اچھی طرح دیکھنے کے لئے جھکا۔ تو میرے سر کا سایہ سفید کاغذ پر جا پڑا۔ وہ ڈر گئی۔ اور گھبرا کر اٹھی۔

"میں ہوں" میں نے کہا "ڈرنے کی کوئی بات نہیں"

"اچھا ہوا۔ آپ آ گئے۔ کیونکہ میں اب جا رہی ہوں"

"کہاں"

"جہاں قسمت لے جائے"

"رات کے وقت اور اکیلی"

"ہاں"

"ڈر نہیں لگتا"

"کمینے لوگوں اور چوروں کو کسی بات کا کھٹکا نہیں کرنا چاہئے" اور ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر دوڑ گئی۔

میں ترم سے پانی پانی ہو گیا۔ وہ میرے ہی الفاظ دہرا رہی تھی۔ "عذرا مجھے معاف کر دو۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں" میں نے عاجزی سے کہا۔

اس نے سنی ان سنی کر کے کہا "لیجئے میرے جانے کے بعد اسے پڑھ لیجئے"

عالمگیر ہندوستان بھر کے معیاری علمی و ادبی باتصویر رسالوں میں سب سے پہلے مہینہ کی پہلی تاریخ کو چھپتا ہے

جلد ۳۳	فہرست مضامین ماہ جولائی	شمارۂ دوم

[illegible] کا افسانہ جس کو ہمارے [illegible] اور تاریخ [illegible] ناول نویسوں نے اپنے فتور دماغ اور فساد ذہنیت کے باعث تراش رکھا ہے، ابوالمکارم محمد نعیم اللہ صاحب نے اس طومار خرافات پر حقیقت کی ہلکی سی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے تاہم یہ مقالہ ایک نیم تاریخی غلط فہمی کا ازالہ کرتا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مسئلہ پر شرح و بسط سے بحث کی جائے۔ اگر فرصت

منظومات کے متعلق کچھ لکھنا دوپہر کے سورج کو شمع دکھانا [illegible] کے مترادف ہے۔ جس محفل میں سید محمد عسکری طباطبائی، باسط بھوپالی، امین حزیں، راز چاندپوری، مخمور جالندھری اور آرزو سہارنپوری شامل ہوں اس کی [illegible] کیفیات کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے۔ (ادارہ)

اس نے کاغذ کا پرزہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ "اچھا الوداع" اس کی لمبی مڑی ہوئی پلکیں اوپر کو اٹھیں۔ میں نے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور دانت سے دانت بج رہے تھے۔ شاید سردی سے۔ اس کی گہرائیوں میں اتر جانے والی آنکھیں میری آنکھوں سے ملیں۔ اور میری تمام روح کھنچ کر آنکھوں میں آگئی۔ وہ جانے کے لئے مڑ گئی۔

"عذرا" میں نے آہستہ سے کہا۔ لیکن اس نے جواب نہ دیا۔ اور چلنا شروع کر دیا۔ میں نے پھر پکارا۔ لیکن اس کے قدم تیز ہوتے گئے۔ اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ سسکنا شروع کر دیا۔ اور میری آوازوں کا کوئی جواب نہ دیا۔

اگر میں چاہتا۔ تو اسے دوڑ کر پکڑ لیتا۔ لیکن نہ جانے میں نے کیوں ایسا نہ کیا۔ میرا دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ عذرا نہ جاؤ۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ میرا رواں رواں مجھے اس کے پیچھے بھاگنے پر اکسا رہا تھا۔ لیکن میں جوں کا توں کھڑا رہا۔ میں اُسے دیکھتا رہا۔ دور تک حتیٰ کہ چاندنی میں وہ ایک نقطہ بن کر رہ گئی۔ اور پھر گم ہو گئی۔ میرا دل رو رہا تھا۔ "تم نے اُسے کیوں جانے دیا۔ آہ تم نے اسے کھو دیا۔" مجھے اپنی ہوش نہ تھی۔ یکایک مرغ سحر نے اذان دی۔ میں چونک پڑا۔ اُف میں ساری رات جاگتا رہا تھا۔ حالانکہ عذرا کو گئے کئی گھنٹے گذر چکے تھے لیکن میں اُسی سمت کو ایک ہی نقطے پر نظر جمائے کھڑا تھا۔ میرے ہاتھ میں کاغذ کانپ رہا تھا۔ میں نے اُسے جیب میں ڈالا۔ اور اپنے کمرے میں آکر بستر پر گر پڑا۔ کمرے میں آکر میں نے وہ پرزہ جو انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا:-

"میں جا رہی ہوں۔ نہ جانے کہاں۔ ایک مجروح ہرنی کی طرح میرا دل پاش پاش ہو چکا ہے نسیم صاحب! میں کنواری نہیں ہوں۔ عذرا نہیں میں جو ہوں۔ میں لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ لیکن والدہ چھوٹی عمر میں ہی جنت کو سدھار گئیں۔ والد صاحب نے پالا پوسا اور پڑھایا۔ میٹرک ہی میں پڑھتی تھی۔ کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ چچا میرے وارث مقرر ہوئے۔ لیکن جائیداد کے لالچ میں وہ میری جان کے پیچھے پڑ گئے۔ اس لئے گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ نوکری کرنے کی ٹھانی۔ لیکن جوان لڑکیوں کو کون گھر میں رکھتا ہے۔ جو کچھ پاس تھا سب خرچ ہو گیا۔ فاقوں تک نوبت پہنچی۔ تو بھیک مانگنے کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ آپ کی خالہ کا دروازہ پہلا اور آخری دروازہ تھا۔ انہوں نے مجھے نوکر رکھ لیا۔ آگے کا تمام حال آپ کو معلوم ہی ہے۔ نسیم صاحب! میری ایک خواہش تھی کہ میں آپ کو کسی طرح خوش کر سکوں کیونکہ مجھے آپ سے .... محبت ہے۔ لیکن قسمت میں ...."

اس کے آگے بے چاری کچھ لکھنا چاہتی ہوگی۔ لیکن میرے خیال

کی وجہ سے وہ مکمل ہو گیا۔ پرزے کو میں نے نہایت احتیاط سے صندوق میں بند کر دیا۔ اور خود پلنگ پر آکر لیٹ رہا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ آہ میں نے اس کی قدر نہ کی .... بس اس سے زیادہ میرے دماغ نے کام نہ کیا۔ درد کی وجہ سے سر پھٹا جا رہا تھا۔ پھر مجھے ہوش نہ رہا۔ جب اٹھا۔ تو حکیم صاحب کو اور نازلی کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ نازلی پریشان تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سب لوگ مجھے جگا جگا کر تھک گئے تھے۔ لیکن میں نہ اٹھا۔ شام کے چھ بجے حکیم صاحب کو بلایا گیا۔ انہوں نے کوئی دوا دی۔ تو میری نیند کھلی۔

"اور ہاں" نازلی کہنے لگی "عذرا بھاگ گئی ہے۔ آپ نے سچ کہا تھا۔ وہ ضرور کسی چوروں کے گروہ کے ساتھ ملی ہوئی تھی" میرے دل پر ایک دھکا سا لگا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور رات کے واقعات پر غور کرنے لگا۔

تین دن کے معمولی بخار کے بعد میں اچھا ہو گیا۔ نازلی کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں لیکن خالہ جان کے اصرار پر اس نے ایک اور ہفتے کی چھٹی منگائی تھی۔ جس دن میرا بخار ٹھیک ہوا۔ اُسی دن شام کو نازلی کو تھوڑی سی حرارت ہو گئی۔ لیکن اس نے کوئی پروا نہ کی۔ رفتہ رفتہ بخار تیز ہوتا گیا اور آخر کار بخار نے نمونیہ کی شکل اختیار کر لی۔ اب تو سب کو فکر ہوئی۔ بہت دفعہ خالہ جان سے کہا۔ کہ حکیموں کے علاج کو چھوڑ کر ڈاکٹری علاج کرنا چاہئے۔ لیکن اُن کو تو ڈاکٹروں سے شروع ہی سے نفرت تھی۔ نازلی کا رنگ روز بروز زرد پڑتا گیا۔ اس کے ہونٹ سوکھ گئے۔ میں ہر وقت اس کے پاس رہتا۔ خدا خدا کر کے پندرہ دن کے بعد اس کا بخار ٹوٹا۔ سارے گھر میں خوشی منائی گئی۔ میں بھی خوش تھا۔ لیکن دل میں ہر وقت عذرا کا خیال کانٹے کی طرح چبھتا رہتا۔ دو دن گھر میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ لیکن تیسرے دن یکایک نازلی کو پھر بخار ہو گیا۔ اور بخار بھی اتنا تیز۔ کہ خدا کی پناہ۔ بڑے بڑے حکیم بلائے گئے۔ لیکن کسی کا بھی علاج کارگر نہ ہوا۔ نمونئے کا دوبارہ حملہ بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ اس لئے سارے گھر والے گھبرائے ہوئے تھے۔ پانچویں دن نازلی کی حالت بے حد خطرناک ہو گئی۔ خالہ جان رو رہی تھیں۔ نوکر چاکر سب رو رہے تھے۔ میری آنکھ سے بھی کبھی کبھی کوئی آنسو ٹپک ہی پڑتا تھا۔ سچ پوچھئے تو اس وقت مجھے عذرا کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ میری نگاہیں نازلی کے حسین چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ لکھنؤ کے ایک حکیم صاحب کو تار دے کر بلایا گیا۔ لیکن مصیبت یہ ہوئی کہ شام کے وقت زور بارش شروع ہو گئی۔ بجلی کڑکنے لگی۔ بادل گرجنے لگے۔ اور آندھی اور بارش کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ آٹھ بجے کی بجائے دس بجے حکیم صاحب تشریف

تھے۔ اور انہوں نے نازلی کا اچھی طرح سے معائنہ کیا۔ لیکن پھر مایوسی سے سر ہلا دیا۔ اُن کے سر ہلانے کی دیر تھی کہ گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ خالہ جان تو دیواروں سے سر پھوڑ رہی تھیں۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو رواں تھے۔ سیلاب بھی بڑی بے رحمی سے برس رہی تھی۔ رات نہایت ہولناک تھی۔ میں نے اپنی ساری عمر میں ایسی اندھیری اور طوفانی رات کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا۔ پانی میں شرابور سہمی ہوئی عذرا کمرے میں داخل ہوئی۔ سیدھی وہ پلنگ کی طرف بڑھی۔ اور پھر میری طرف دیکھا۔ مجھے روتا دیکھ کر وہ بھی رونے لگی۔ حیرت سے میرے آنسو جہاں تھے وہیں جم گئے۔

"حکیم صاحب عذرا کے لئے اسے بچا لیجئے۔" وہ حکیم صاحب کی ٹانگوں سے چمٹ کر بچوں کی طرح بلکنے لگی۔ حکیم صاحب پر اس بات کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ اور انہوں نے اٹھ کر پھر نازلی کو دیکھا۔ "مرغی کے دو تازہ انڈے اگر مل جائیں۔ تو شاید یہ بچ جائے۔" حکیم صاحب نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔

خالہ جان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "میں ابھی منگواتی ہوں۔" اور انہوں نے دس روپے کا نوٹ نکال کر نوکر کو دیا۔ لیکن چاند پور کا سارا بازار بند تھا۔ ایسی طوفانی رات میں کون دکان کھولتا ہے۔ نوکر مایوس ہو کر واپس آ گیا۔

"اگر ایک گھنٹے کے اندر اندر انڈے نہ ملے۔ تو مریض کے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔" حکیم صاحب کی آواز گونجی۔

خالہ جان کا تو برا حال تھا۔

آخر بوڑھا رحمن بولا "یہاں سے دو میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ وہاں پر ہر وقت تازہ انڈے مل سکتے ہیں۔"

لیکن ایسی بھیانک رات میں کون جاتا۔ اور راستے میں ایک گھنا جنگل بھی پڑتا تھا۔ نوکروں کو بڑے بڑے لالچ دیئے گئے۔ لیکن سب کو اپنی جان پیاری تھی۔

"کیا کوئی بھی نہیں جائے گا" خالہ جان نے نہایت یاس آمیز چیخ کے ساتھ کہا۔ یکایک عذرا کھڑی ہو گئی "میں جاتی ہوں۔" اس نے کہا "رحمن وہ گاؤں کس طرف کو ہے۔" خالہ جان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔" انہوں نے ہزار روپے کے نوٹ اس کے پاؤں پر ڈال دیئے "میں ان کو کیا کروں گی" اس نے کہا۔ اور رحیم سے راستہ پوچھ کر چل دی۔ ایک نامعلوم کشش مجھے اس کے پیچھے لے گئی۔ میں نے صدر دروازے پر پہنچ کر اسے روک لیا

"عذرا نہیں ہرگز تمہیں نہیں جانے دونگا" میں نے کہا۔

"لیکن نازلی مر رہی ہے" اس نے کہا۔ میں چپ ہو گیا۔

اس نے پھر کہنا شروع کیا "اگر میں مر گئی۔ تو کوئی بات نہیں کیونکہ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ نازلی کے تو سب کوئی ہیں۔ ماموں ہیں۔ اور رشتے دار ہیں۔ والدہ ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر آپ کے سینے میں اس سے محبت کرنے والا ایک تڑپتا ہوا دل ہے۔ اس کی زندگی مجھ سے زیادہ قیمتی ہے۔" اس کی معصوم آنکھیں میرے چہرے پر گڑ گئیں۔ شائد وہ میری آنکھوں سے میرے دل کا حال پڑھ لینا چاہتی تھی۔

"ایسا مت کہو عذرا" بے ساختہ میرے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔

"کیا آپ کی خوشی نہیں ہے۔ کہ نازلی بچ جائے؟"

"ہاں"

"تو میری بھی یہی خوشی ہے" وہ اپنا بازو چھڑا کر باہر طوفانی رات میں کود پڑی۔ میں پکارا "عذرا عذرا خدا کے لئے واپس آ جاؤ۔ عذرا۔ واپس آ جاؤ۔ مجھے تم سے صرف تم سے محبت ہے" لیکن بادل کی گرج میں میری آواز گم ہو گئی۔ بجلی چمکی اور میں نے اُسے تیزی سے گاؤں کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا۔ مگر جلد ہی خوفناک تاریکی نے اسے نگل لیا۔ اور میں اسے دوبارہ پا کر بھی کھو بیٹھا تھا۔

"عذرا کو گئے ۴۵ منٹ گذر چکے ہیں۔ اور اگر وہ پندرہ منٹ تک نہ آئی تو میرا کیا حشر ہوگا" خالہ جان نے کہا۔

سب کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ صرف میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ میرے ہاتھ دعا کے لئے اٹھے۔ لیکن میں نے نازلی کے بجائے عذرا کا نام اپنے منہ سے نکلتے ہوئے پایا۔ ہاں میں عذرا کی سلامتی کی دعا مانگ رہا تھا۔

پانچ منٹ اور گذر گئے۔ خالہ جان نا امید ہو چکی تھیں۔ سات منٹ اور۔۔ دھک سے دروازہ کھلا۔ عذرا دیوانوں کی طرح بھاگتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ خالہ جان کے پاس پہونچ کر اس نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ اس میں مرغی کے تین چمکتے ہوئے تازہ انڈے تھے۔ خالہ جان نے پاگلوں کی طرح انڈے اس کے ہاتھ سے چھین لئے۔ عذرا دھم سے زمین پر بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ اس کے پاؤں سے خون جاری تھا۔ دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں بے خود ہو کر اس کی طرف لپکا۔ لیکن حکیم صاحب نے روک دیا "اس کی حالت زیادہ خطرناک ہے" انہوں نے نازلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ دو منٹ کے اندر اندر انڈوں کی دوا بن کر تیار ہو گئی۔ اور نازلی کے منہ میں قطرہ قطرہ ٹپکا دیا گیا۔ چند ہی قطروں کے بعد نازلی بے ہوش ہو گئی۔ شدتِ غم سے خالہ جان اس کے اوپر گر گئیں۔ حکیم صاحب نے انہیں اٹھایا۔ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"مریض خطرے سے نکل چکا ہے" حکیم صاحب کی آواز آئی۔

خالہ جان کے تو مردہ جسم میں جان آ گئی۔ اور وہ حکیم صاحب کی ٹانگوں سے لپٹ کر رونے لگیں۔

حکیم نے سب نوکروں کو باہر جانے کا حکم دیا۔ اور خالہ جان کو سونے

پڑتا یا۔ عذرا کے لئے میرا ہی کمرہ تجویز ہوا۔ اور میں نے عذرا کو اپنے کمرہ میں لے گیا۔ حکیم صاحب نے مجھے واپس چلے جانے کا اشارہ کیا۔ اور خود دوا بنانے لگے۔ میں بادل نخواستہ وہاں سے واپس لوٹا۔ اور نازلی کے کمرے میں آیا۔ نازلی کو ہوش آ چکی تھی۔ وہ میری اور خالہ جان کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ خالہ جان کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

"میں عذرا کو سونے سے تول دوں گی۔ اس نے میری بچی کی جان بچا لی" خالہ جان نے کہا۔ بظاہر میں چپ تھا۔ لیکن میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا میں عذرا کی ہمت پر حیران تھا۔ کہ اس نے ۲۵ منٹ کے اندر ۸ میل کا راستہ طے کر لیا۔ میں سنسان جنگلی راستے کا خیال کر کے کانپ اٹھا۔

ایک ہفتے کے بعد نازلی کا بخار اتر گیا۔ صرف نقاہت باقی تھی۔ لیکن عذرا اس دن سے بے ہوش پڑی تھی۔ اگر کبھی ہوش میں آتی۔ تو کبھی کسی کو پہچان نہ سکتی۔ اور بہکی بہکی باتیں کرتی تھی۔ خالہ جان اس کی بیماری پر روپیہ پانی کی طرح بہا رہی تھیں۔ اور میں نے اکثر ان کی آنکھیں پرنم دیکھی تھیں۔ پانچ دن اور گذر گئے۔ اب نازلی نوکر کے سہارے تھوڑا تھوڑا چل پھر لیتی تھی۔ شام کے وقت حکیم صاحب نے مجھے بلایا۔ اور پوچھا۔

"کیا عذرا کو کسی سے محبت ہے"؟

"جی ہاں مجھ سے"! میں نے آنکھیں جھکا کر جواب دیا۔

"اوہ"! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا! خیر اب بھی کچھ نہیں گیا اب جس وقت عذرا ہوش میں آئے۔ تمہارا ایک لفظ محبت اس کی صحت کے لئے کافی ہوگا۔ میں جانتا ہوں تمہیں اس سے محبت نہیں۔ لیکن اس کی جان بچانے کے لئے تم ایسا کر سکتے ہو۔

میرے جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں اسے بچا سکتا ہوں میں نے سوچا۔ سارا دن اس کے پاس بیٹھا رہا۔ لیکن اسے ہوش نہ آیا۔ اور وہ بہکی بہکی باتیں کرتی رہی ..... وہ گھوڑی ..... پانی گرم ہے۔ میں کمینی نہیں ہوں ..... بجلی سے لڑی ..... نازلی ناراض ہے ..... خوفناک رات ... اندھیرے کہاں گئے؟

بس وہ ایسی ہی باتیں کرتی رہی۔ رات بھی اسی طرح گذر گئی۔ صبح ہوئی۔ تو اس وقت اسے ہوش آیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دی میری آنکھوں سے مسرت کے آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے پھر اپنا کام سرانجام دینا چاہا۔ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ خالہ جان آ گئیں۔ وہ اس سے بڑی اچھی طرح سے باتیں کرتی رہیں۔ ان کے جانے کے بعد حکیم صاحب آن دھمکے۔ اور میں اپنا کام سرانجام نہ دے سکا۔ لیکن عذرا کی نظریں بار بار میرے چہرے پر گڑ جاتیں۔ گویا مجھ سے محبت کی التجا کر رہی ہیں۔ حکیم صاحب چلے گئے۔ میں نے

ابھی کرسی ٹھیک کی تھی"آپ خوش ہیں"؟ اس نے ٹک ٹک کر پوچھا۔

"بہت خوش" میں نے جواب دیا۔ میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اس کی پرنم آنکھیں دیکھ کر میری آواز بھرا گئی۔ اور میں کچھ نہ کہہ سکا۔

یکایک اس کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں گھبرا گیا۔ اور اس کی نبض دیکھنے لگا۔ لیکن اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ اور اپنے نازک اور کمزور ہاتھ سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ آہستہ آہستہ اپنے ہونٹ تک لے گئی۔ لیکن ہونٹوں تک پہونچنے سے پہلے ہی میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اور اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ میں اپنا ہاتھ اس کے ریشمی بالوں پر پھیرتا رہا۔ لیکن اسے کوئی جنبش نہ ہوئی۔ میں نے نبض دیکھی۔ وہ بند تھی دل کی حرکت بھی ساکت۔ میں پاگل سا ہو گیا۔ اور چلانے لگا۔ "عذرا خدا کے لئے دیکھو میں تم سے صرف تم سے محبت کرتا ہوں۔ عذرا عذرا۔ عذرا" میں اس سے لپٹ گیا۔ حکیم صاحب نے مجھے آکر اٹھایا۔ "وہ مر چکی ہے" انہوں نے کہا۔ "اب سب کوشش بے سود ہے" "آہ" میں تیسری بار پاکر بھی اسے ہمیشہ کے لئے کھو چکا تھا۔ لیکن میں تو سچ سچ اس سے محبت کرتا ہوں حکیم صاحب میں اس سے محبت کرتا ہوں"

ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نازلی خالہ جان کا سہارا لئے کھڑی تھی۔

"نازلی، خالہ جان آپ بھی سن لیجئے میں اس سے محبت کرتا تھا۔ کرتا ہوں اور کرتا رہونگا۔ اسنے میری خوشی کیلئے اپنی جان قربان کر دی۔ آہ میری عذرا میری عذرا"

نازلی اور خالہ جان رو رہی تھیں۔ حکیم صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ اس کے بعد مجھے اپنا ہوش نہ رہا۔ دیوانہ سا ہو گیا۔ ہر وقت عذرا عذرا پکارتا۔ والد صاحب کو تار دیکر بلایا گیا۔ انہوں نے مجھے واپس لیجانے کی کوشش کی لیکن میں نہ گیا چھ مہینے مجھ پر وحشت طاری رہی۔ اب سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ اس عرصے میں میں نے سنا کہ نازلی کی منگنی ہو گئی ہے۔ اور پھر شادی، وہ بڑی خوش تھی لیکن ان باتوں نے مجھ پر کوئی اثر نہ کیا۔

آج عذرا کو مرے پورا ایک سال ہو چکا ہے۔ میں دن رات اس کی قبر سے لپٹا پڑا رہتا ہوں۔ میں ایک منٹ کے لئے بھی قبر سے اپنی آنکھیں نہیں ہٹاتا۔ کیونکہ شائد عذرا باہر نکلے۔ اور مجھے غافل پاکر وہ پھر واپس چلی جائے۔ اور پہلے کی طرح میں اسے پھر دیکھوں۔ میری زندگی اب اس کی قبر سے وابستہ ہو چکی ہے۔ یہ چند سطور میں یادگار کے طور پر اس دنیا میں چھوڑے جا رہا ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں۔ کہ میری زندگی بہت کم رہ گئی ہے۔ مجھے ایک بات کی بے حد خوشی ہے۔ کہ مر کر میں عذرا کو پالوں گا۔

شرابِ غم

جہاں میں ہوں وہاں تک میری رسوائی نہیں جاتی

از حضرت باسط بھوپالی

کہاں کا دل کہ دل کی خاک بھی پائی نہیں جاتی
ارے اس طرح سے تو آگ برسائی نہیں جاتی

گزرتا جا رہا ہوں میں خودی کیا بیخودی کیسی
کوئی منزل ہو منزل میری ٹھیرائی نہیں جاتی

وہی محفل وہی جلوے وہی ذوقِ نظر میرا
طبیعت ہی مگر کچھ مطمئن پائی نہیں جاتی

سلامت یہ جنوں میرا مبارک بیخودی میری
جہاں میں ہوں وہاں تک میری رسوائی نہیں جاتی

بباطن دل پہ جو گزری ہو اس دردِ محبت میں
بظاہر تو مری شانِ شکیبائی نہیں جاتی

ہزاروں حسرتیں گھٹ گھٹ کے دل کی رہ گئیں دل میں
کبھی اس گھر سے باہر گھر کی رسوائی نہیں جاتی

کہاں تک بلبلِ بیتاب یہ رنگِ عزاداری
ترے نالوں سے گلشن میں بہار آئی نہیں جاتی

کوئی منظر ہو تیرا رنگ بھرتا جا رہا ہوں میں
مرے حسنِ نظر کی عالم آرائی نہیں جاتی

شکستِ ضبط اک الزامِ ناجائز ہے مرے دل پر
شرابِ غم چھلک جاتی ہے چھلکائی نہیں جاتی

کچھ ایسے ہر طرف بکھرے پڑے ہیں جلوہ رنگیں
نگاہِ شوق اک مرکز پہ ٹھیرائی نہیں جاتی

نہ جانے کس حسیں منظر میں باسط کھو گیا ہوں میں
یہاں میری نظر میری نظر پائی نہیں جاتی

مرزا دبیر رحمۃ اللہ علیہ

جن متفرق خیالات کو یک جا کرکے میں پیش کرتا ہوں۔ وہ نئی باتیں اور بالکل میرے ذاتی خیالات نہیں ہیں۔ جن کو بیان کرکے میں اپنے تفرد کا دعوے کرسکوں۔ ہاں میرا مقصد محض اتنا ہے کہ مختلف اور متفرق باتیں آپ کے پیش نظر ہو جائیں۔ اور نقد و تبصرہ کرکے آپ کو ایک فیصلہ کرنے کا خود موقع مل جائے۔ میرا موضوع بیان مرزا دبیر رحمۃ اللہ کا تذکرہ ہے، اور میں جانتا ہوں کہ سوء اتفاقات سے مرزا صاحب کی طرف سے بہت سی بدگمانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ ایسی صورت میں اگر کسی ایک شخص کو بھی میری اس تحریر کے بعدہ زا صاحب کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کا موقع مل جائے تو میں اس کو اپنی سعادت کا ذریعہ سمجھ کر اپنی سعی کو نتیجہ خیز سمجھوں گا۔ یہ التماس بھی ضروری ہے کہ میں نہ تو اصطلاحی دبیری ہوں۔ اور نہ انیسی بلکہ "خذما صفا ودع ماکدر" پر عامل (اچھی چیز لے لو اور بری کو چھوڑ دو) لہٰذا آپ حضرات بھی "انظر الیٰ ما قال ولا تنظر الیٰ من قال" کے زریں مقولے پر عمل پیرا ہوں گے (یعنی بات کو دیکھو کہنے والے کو نہ دیکھو) اس سلسلے میں جناب مولوی محمد سجاد حسینی صاحب مرحوم کوثر جونپوری کی رباعی مجھے بہت پسند آئی ہے

نکتہ سنجان سخن چرب زبانی دیکھیں۔ موسیٰ فکر کی اعجاز بیانی دیکھیں

پاک جھگڑوں سے انیسی و دبیری کے جو ہوں۔ وہ مری سحر طبیعت کی روانی دیکھیں

مرثیہ انسان کے خیالات کے ظاہر ہونے کے جب دو ہی طریقے قرار پائے۔ تحریر اور تقریر، اور تحریر کا وجود ہی درجہ بعد میں ہے تو آسانی کے ساتھ یاد رکھنے اور دیر تک محفوظ رہنے کے واسطے شعر عالم وجود میں لایا گیا جس کی ایک قسم مرثیہ بھی ہے۔ مجھے مرثیہ کی مفصل تاریخ سنانا اس وقت مطلوب نہیں ہے۔ البتہ ربط کی خاطر یہ لکھنا ضروری ہے۔ کہ مرثیہ کی ابتدا اس وقت سے ہے جبکہ انسانی آبادی کا ہ حصہ یک وقت ختم کر دیا گیا۔ یعنی ہابیل کے مقتول ہونے کے بعد حضرت آدم نے ان کا مرثیہ کہا۔ اور پڑھتے رہے۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ وہ کس زبان میں تھا۔ اس واقعہ کے بعد سے اب تک برابر ہر قوم ہر ملک اور ہر زمانے میں مرثیہ کا رواج رہا ہے۔ مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جس

ادبی تبصرہ

جناب مولوی محمد زوار حسین صاحب ماہر جونپوری

میں کسی مردہ شخص کے خصائص کا تذکرہ اور اظہار ہمدردی ہو عرف عام میں مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں۔ جو مذکورہ بالا تعریف کے ساتھ اہل بیت رسول اور ان کے معاون و مددگاروں سے مخصوص ہو۔ سیدنا امام حسین رضی کے الحوال کے مرثیے سب سے زیادہ ہیں

عرب کی شاعری کی ابتدا بھی مرثیہ سے ہوئی۔ مسلم حسینؑ کے حال کا مرثیہ بھی عربی زبان سے شروع ہوا۔ سب سے پہلے حسینؑ کی بہن زینب نے عربی میں مرثیہ کہا۔ اور پھر عربی زبان میں کافی رواج پانے کے بعد فارسی میں بھی مرثیے کہے جانے لگے۔ ملا محتشم کاشی رحمہ اللہ نے فارسی زبان میں بے مثل مرثیہ کہا۔ مگر طرز پرانی ہی رہی۔ اور کسی جدت کے بانی نہ ہوئے۔

اردو مرثیہ عربی اور فارسی زبانوں کے مرثیوں پر روشنی ڈالنا مقصود نہیں ہے۔ لہٰذا یہ بتانا ضروری ہے۔ کہ اردو زبان میں مرثیہ کب اور کہاں سے شروع ہوا۔ اردو کی شاعری موجودہ ہندوستان کے صوبہ دکن سے شروع ہوئی۔ اردو مرثیہ کی ابتدا بھی وہیں سے ہوئی۔ اور زبان و شاعری کے ابتدائی دور ہی میں دکن میں مرثیہ گو پیدا ہو گئے۔ علی عادل شاہ کے زمانے میں مرثیہ گوئی شروع ہوئی۔ محمد قلی قطب شاہ کی کلیات میں مرثیوں کا اچھا کافی حصہ موجود ہے۔ ابوالحسن تانا شاہ کے زمانے میں بھی مرثیہ گوئی کا رواج پایا جاتا ہے۔ شاہ قلی خاں متخلص بہ شاہی اسی عہد کا مرثیہ گو شاعر ہے۔ اردو شاعری کے باوا آدم ولی دکنی نے واقعات کربلا کی بابت ایک مثنوی لکھی جو زبان حال کے شواہد سے ثابت ہوگیا۔ کہ اردو میں مرثیہ گوئی کی بنیاد بہت پہلے پڑ چکی تھی۔ اور سودا کے زمانے تک اسی دیرینہ طریقہ پر مرثیہ گوئی ہوتی رہی۔ جو چار مصرعوں کی نظم ہوا کرتی تھی۔ اب یہاں پر مورخین میں اختلاف پیدا ہوگیا ہے بعض لکھتے ہیں کہ مرثیہ کی موجودہ صورت یعنی ۶ مصرعوں کی مسدس نظم سودا کی ایجاد ہے۔ جو اردو میں مرثیہ کی وسعت و ترقی کا پہلا قدم ہے۔ اگرچہ سودا کی کلیات میں اس چار قسم کا مرثیہ موجود ہے۔ مگر وہ مقبول عام ہوا بعض سودا کو طرز جدید کا موجد نہیں مانتے۔ اور انہیں کے ایک ہم عصر شاعر میاں سکندر کو اس کا موجد بتاتے ہیں۔ سکندر کا ایک مشہور مرثیہ جس کا پہلا مصرع ہے۔ "ہے روایت شتر اسوار کسی کا رسول" اب تک برابر مجلسوں میں پڑھا جاتا ہے

سکندر پنجاب کے رہنے والے تھے۔ اور معاش کی جستجو میں لکھنؤ میں آئے۔ اور اور ایسے بسے کہ لکھنؤ ہی کے ہو رہے۔ قرین تحقیق یہی خیال ہے کہ سکندر ہی کو یہ شرف مبدء فیض سے عطا ہوا کہ اردو میں سب سے پہلے مسدس مرثیہ لکھا۔ اور خلوص نے قبول عام کا خلعت فاخرہ مرحمت کیا۔ اب تک مجلسوں میں بار بار دہرایا جاتا ہے۔ اور سننے والوں پر کافی اثر ہوتا ہے۔

اردو مرثیہ کی ترقی

سودا اور سکندر کے بعد سے دبیر اور انیس کے دور تک میں چار مرثیہ گویوں کو شہرت حاصل ہوئی ضمیر، خلیق، دلگیر، فصیح۔ میر ضمیر مرزا دبیر کے استاد تھے۔ اور میر خلیق میر انیس کے باپ تھے۔ میر ضمیر مرثیہ گوئی میں شہرت کے تمغے حاصل کر رہے تھے۔ کہ مرزا سلامت علی آ کر اُن کے شاگرد ہوئے۔ اور رفتہ رفتہ خود وہ جوہر قابل اور ذی استعداد استاد کی برکتوں سے ایسی ترقی کی کہ مرثیہ گوئی کے عناصر اربعہ میں ایک کا اضافہ کر دیا اور یہ اس لوگ استاد کی برکتوں سے اتنی ترقی کی کہ مرثیہ گوئی کے عناصر اربعہ میں ایک کا اضافہ اور ہوا۔ اور یا خواص لوگ ان ظاہری پانچ بزرگوں کو استاد ماننے لگے۔ جن میں کی ایک فرد مرزا دبیر بھی تھے۔

دبیر علیہ الرحمۃ

مرزا صاحب کا نام سلامت علی اور دبیر تخلص تھا۔ مرزا غلام حسین کے لڑکے تھے۔ اور محلہ بلی ماراں شہر دہلی مولد تھا۔ مدفن کوچۂ دبیر محلہ خاص شہر لکھنؤ میں ہے۔ ۱۱ جمادی الاول ۱۲۱۹ھ تاریخ ولادت اور ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ تاریخ وفات ہے۔ بحساب قمری ۷۳ سال اور بحساب شمسی ۷۲ سال عمر پائی۔ سات سال کی عمر میں اپنے والد ماجد کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ اور ۱۲۳۰ھ میں میر مظفر حسین صاحب ضمیر ساکن گنگھو ضلع گوڑگانواں کے شاگرد ہوئے۔ دبیر تخلص استاد ہی کا تجویز کردہ ہے۔ سب سے پہلا کلام جو استاد کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کیا۔ اور استاد نے جس کو اسی حال پر باقی رکھا حسب ذیل ہے:-

کسی کا کندہ نگینہ پہ نام ہوتا ہے ؎ کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے۔
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر ؎ کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے۔

استاد نے اصلاح کی ضرورت نہیں پائی۔ سامعین نے تعریفوں سے دل بڑھایا دبیر دلیر ہو گئے۔ اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۲ برس کا بچہ طبیعت میں جوہر خداداد رکھتا تھا۔ اور بظاہر ضمیر مرحوم کے آگے زانوے تلمذ تہ کرنا پڑا۔ مگر حقیقتاً اس کو خدائی تائید حاصل تھی۔ یہ الشعراء تلامیذ الرحمان کے حقیقی مصداق ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ مرزا دبیر نے ایسی فضا میں آنکھ کھولی۔ اور پرورش پائی کہ گھر یا خاندان میں کسی کو شاعر نہیں دیکھا پھر بھی ایسی ترقی کی کہ ایک دن وہ آیا کہ جب ضمیر مرحوم ایسے جلیل الشان اور مسلم الثبوت استاد کو وقتی مجلسوں کے ماتحت شاگرد کے کلام کو اپنا ظاہر کر کے پڑھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اگرچہ درانداروں کی کوششوں سے اس کا موقع نہیں آیا۔

اختلافات

دبیر علیہ الرحمۃ کے متعلق ابتدا ہی سے اختلافات پیدا ہو گئے۔ مگر یہ بات انہیں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے مشکل ہے کوئی باکمال یا استاد ایسا پیش کیا جا سکے گا۔ جو متفقہ طور پر تسلیم کر لیا گیا ہو۔ اور جس کی بابت کوئی مخالف رائے قائم نہ کی گئی ہو۔ مگر اس سے اس کے کمال کے دامن پر دھبہ نہیں آتا ہے۔ کہ اکثر باکمال شعراء کی بابت مسلم الثبوت اساتذۂ فن کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ کہ اُن کا ایک شعر دو سرے شعرا کے دواوین کے برابر ہے۔ اس فیصلہ کے بعد سخت تعجب کے ساتھ جناب شبلی نعمانی کے موازنۂ انیس و دبیر کے حسب ذیل اقتباسات سنے جائیں گے۔ اس سے پہلے کہ موازنہ کا وہ حصہ جو دبیر علیہ الرحمۃ کی ذات خاص سے متعلق ہے۔ آپ کی خدمت میں پیش کر کے اس کی بابت اظہار خیال کروں اس امر کا اعتراف بے جا نہ ہوگا کہ جناب نعمانی صاحب نے فارسی اور اردو شعراء کی بابت جو کچھ ریسرچ (تحقیقات) ملک کے سامنے پیش کی ہیں۔ وہ قدر کے لائق چیزیں ہیں۔ ان کی وجہ سے دوسروں کے واسطے رستہ صاف ہو گیا۔ تاہم دبیر رحمۃ اللہ کی بابت جو رائے انہوں نے قائم کی تھی۔ خود اُن کو حیات دبیر کے شائع ہونے کے بعد اس کی بابت اعتراف کرنا پڑا۔ کہ واقعات کا علم نہ تھا۔ (ملاحظہ ہو یادگار انیس) موازنہ میں پہلے ہی صفحے سے دبیر علیہ الرحمۃ پر نکتہ چینی شروع ہو گئی ہے۔ جو آخر تک باقی ہے۔ اور تمام تر تصنیف میں حقیر نے حسب ذیل جملوں کو زیادہ حیرت کے ساتھ پڑھ دیا تے ہیں "طرفداری کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ (یعنی میر انیس) اور مرزا دبیر حریف مقابل قرار دیئے گئے" صلا یا یہ کہ "اردو علم ادب کی بدقسمتی کا ... ... اس کا سبب سے عجیب اثر و نتیجہ یہ ہوگا کہ مرزا دبیر کو ملک نے میر انیس کا مقابل بنا دیا" صفحہ ۲۳ موازنہ کی اشاعت کے بعد خود مولف نے جو مدافعت شائع کیا حوالے کے۔ الغرض اس کو عرض کر چکا ہوں کہ دبیر کے ماننے والوں کا ذکر نہیں ہے جس کی وجہ مولف سبع مثانی صفحہ ۳۲ پر لکھتے ہیں کہ "اصل یہ ہے کہ دبیر کا بہترین کلام علامہ شبلی کی نظر سے نہ گذرا تھا۔ ورنہ وہ دبیر کے متعلق ایسی غیر منصفانہ رائے قائم نہ کرتے۔ جیسی کہ موازنہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ صاحب موازنہ تحریر فرماتے ہیں کہ "انیر انیر میں وہ یعنی دبیر علیہ الرحمۃ میر انیس کی تقلید بھی کرنے لگے تھے۔ صفحہ ۲۳۵ مگر خود ہی میر ضمیر کا مصرع "دکھا اژدہائے موسیٰ عمراں کی دو زبان" نیزے کی تشبیہ میں تحریر کر کے میر انیس کا مصرع پیش کرتے ہیں "گویا زبان نکالے ہوئے اژدہا چلا" اور فرماتے ہیں کہ "نیزے کی یہی تشبیہ ہے جس کو میر انیس صاحب نے زیادہ صاف اور لطیف کر دیا ہے" اب ارباب ذوق خود غور فرمائیں کہ دبیر علیہ الرحمۃ پر یہ الزام کہ وہ تقلید کرنے لگے کہاں تک بجا ہے۔ صاحب مؤلف

دونو مصرعوں کا تقابل اسو تلمیح ضمیر صاحب کے یہاں زیادہ واضح ہے

مرزا دبیر پر اعتراضات

مرزا صاحب پر مختلف اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے کمال پر پردہ ڈالنے کے واسطے ان کے نسب پر بھی حملے کئے گئے۔ مگر حق ظاہر ہو کر ہی رہا۔ عام خیال ہے کہ میر صاحب کا کلام فصیح ہے۔ اور مرزا صاحب کا کلام بلیغ ہے۔ مگر مجھ کو تعجب ہوتا ہے۔ جب کسی با سواد شخص کی یہ رائے سنتا ہوں۔ اس واسطے کہ بلیغ کو فصیح ہونا لازم ہے۔ مگر فصاحت کے واسطے بلاغت لازم نہیں ہے۔ مزہ تو یہ ہے کہ مرزا صاحب کے خلاف رائے قائم کرنے والے اس بات پر غور نہیں کرتے کہ تمام لکھنؤ جو اس وقت شعر و سخن کی ٹکسال سمجھا جاتا تھا ان دونوں باکمالوں (دبیر و انیس) کو حریف مقابل سمجھتا تھا۔ کیا سب لوگ بد مذاق ہی تھے۔ یہاں تک کہ خود انیس رحمۃ اللہ نے جب حیدرآباد میں پہلی مجلس پڑھی۔ تو عام مجمع کے سامنے اس کا اعتراف کیا۔ کہ اگر اُن کے مقابلے میں کسی کا نام آ سکتا ہے۔ تو وہ دبیر کی ذات ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔ اور انیس کے پہلو بہ پہلو بلکہ اُن سے بہت پہلے دبیر کو قبول عام حاصل نہ ہوتا۔ اور اہل فن اساتذہ کی صف اول میں جگہ نہ پکے نہ ہوتے۔ تو ان کی شہرت نہ ہوتی۔ اور ان کا نام پردۂ گمنامی میں چھپ کر معدوم ہو جاتا۔

مُستند رائیں

دبیر کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے والوں میں ہم سب سے پہلے غالب مرحوم کو پیش کرتے ہیں۔ جو اپنے ہم عصر اساتذہ کی بہت مشکل سے اعتراف کمال کرتے تھے۔ فرماتے ہیں۔ "سوائے یہ حق دبیر کا ہے۔ دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اٹھا سکتا" یا یہ کہ "یہ حصہ دبیر کا ہے۔ ۵۰ مرثیہ کوئی (میں) نو دے گا"۔ یہ بھی حصہ قلیق کا دارد عہد دبیر سے طلامہ ہوتے ہیں۔ نیا مضمون ہوتا ہے۔ وہ لے جا کر دبیر کو دے آتا ہے۔ اور سب شعراء منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں"۔ اس شہادت کے بعد کسی دوسری شہادت کے پیش کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ مگر اختصار کے ساتھ دو ایک نام اور پیش کرتا ہوں۔ خواجہ آتش کے پاس ان کا کوئی شاگرد جب سلام و مرثیہ کہہ کر لاتا تھا۔ تو وہ خود اصلاح دینے کی بجائے مرزا دبیر کے پاس بھیج دیتے تھے۔ ایک مجلس میں خواجہ مرحوم نے عام لوگوں کے سامنے فرمایا "بھئی سلامت علی خدا تم کو سلامت رکھے۔ کون کہتا ہے۔ کہ تم فقط مضامین اچھے کہتے ہو۔ تم سے بہتر دوسرا شاعر زبان بھی نہیں کہہ سکتا"۔ اب تو معلوم ہو گیا۔ کہ اغلاق اور عربی الفاظ کے استعمال اور ربط نہ ہونے کے الزامات جو دبیر پر قائم کئے جاتے ہیں۔ کہاں تک درست ہیں۔ مضمون کا اختصار اجازت نہیں دیتا۔ ورنہ میر انیس مرحوم کے یہاں بھی اغلاق اور عربی الفاظ و تراکیب کی مثالیں بھی بکثرت مل سکتی ہیں۔ علامہ مغفور ستری مفتی محمد عباس رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔ کہ "میر صاحب کا کلام فصیح اور شیریں اور مرزا صاحب کا کلام دقیق اور نمکین ہے۔ ہر شخص کا ذائقہ و مذاق مختلف ہے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی ہے"۔

قدرشناسی

استاد باکمال نہ ہو۔ تو اس کے شاگردوں کا حلقہ وسیع نہیں ہوتا۔ مگر مرزا صاحب کے ان کثیر التعداد شاگردوں میں جو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے لکھنؤ کے رؤسا، نوابین، شہزادے اور بیگمات بھی شامل ہیں۔ آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ مرحوم کے امام باڑہ میں مرزا صاحب مجلس پڑھ رہے تھے۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے منبر کے اوپر کا شامیانہ اڑ گیا۔ تو قدرشناس اور علم دوست بادشاہ نے خود اپنے ہاتھوں سے چتر لگایا۔ یہ بھی کمال کی دلیل اور مذاق سلیم کا ثبوت ہے۔

خصوصیات

مرزا صاحب کے علم و کمال اور وسعت اخلاق پر روشنی ڈالنا اس مختصر مضمون میں مشکل ہے۔ ان کی شاعری کی چند خصوصیات اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ مرزا صاحب کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ (۱) ایک جلیل الشان اور جید عالم متبحر تھے۔ لہذا عربی الفاظ اور فقروں کا جوڑ اردو کے ساتھ خوب بٹھاتے تھے (۲) بہت پرگو اور زود گو تھے زود گوئی کا یہ عالم تھا۔ کہ میں نے اپنے والد مغفور اور دیگر باخبر حضرات سے سنا ہے۔ کہ مرزا صاحب کے پاس متعدد محرر موجود رہتے تھے۔ اور بیک وقت کئی کئی مرثیوں کے مسودے بولتے جاتے تھے۔ جن پر نظر ثانی کا بھی موقع کم ملتا تھا۔ (میر انیس رحمۃ اللہ اپنے مرثیے کو جب تک کئی کئی مرتبہ درست نہیں کر لیتے تھے مجلس میں نہیں پڑھتے تھے) مرزا صاحب نے کئی ہزار مرثیے لکھے ہوں گے سلام نوحوں اور رباعیوں کا تو شمار ہی نہیں ہے (۳) مرزا صاحب کے یہاں اچھوتی اور بہترین تشبیہیں بکثرت ہیں (۴) بدیہہ بہت شاندار نظم کہتے تھے (۵) مضامین بہت بلند پایہ ہوتے تھے (۶) طباعی و ذہانت جوہر خداداد تھا۔ طبیعت ایجاد پسند پائی تھی۔ اُن کے موجد ہونے سے دوسرے فائدہ اٹھاتے تھے (۷) جس کسی کی گفتگو نظم فرماتے۔ اسی کے رتبے سے مخصوص الفاظ استعمال کرتے تھے۔ (۹) الفاظ پر شکوہ ہوتے تھے۔ (۱۰) پڑھنے کا طریقہ بہت متین تھا۔ ہاتھ وغیرہ سے اشاروں کو ناپسند کرتے تھے (تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ) خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

نمونہ کلام

ایسے جلیل الشان خدائے سخن کے صحیفۂ قدرت سے کلام کا انتخاب اور وہ بھی اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے بہت مشکل بات ہے۔ تاہم نمونۂ کلام بالکل پیش نہ کرنا مضمون کو تشنہ رکھنا ہے لہذا چند اشعار پیش کر کے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

گھوڑے کی سرعت رفتار کے متعلق شعراء اور مرثیہ گویوں نے کیا اظہار کیا ہے؟ مرزا صاحب فرماتے ہیں:-

ہمیشہ اس کے منہ پہ جو وا اپنا ادا کرے ؛ یہ اُس میں اپنے عکس سے پہلے نذر کرے

تلوار کی بابت فرماتے ہیں۔

ہٹی، اگری، بلند ہوئی، پست ہو گئی ؛ پی پی کے سیکڑوں کا لہو مست ہو گئی۔

روز مرہ اور لطف زبان ملاحظہ ہو؟ اُس کا ایک بند جس کا مطلع ہے "جب حرم اللہ شبیر کے ہمراہ آئے" (دبیر)

مری بی بی کی میرانہ سواری ہو گی ؛ ناقے پر عرش کے انا بھاری ہو گی۔

مستایلوز پہ سری کی وہ بیاری ہو گی ؛ گھبا سب تفٹہ تو پوشاک بھی بھاری آر کی

ہیچیں لڑکی ہاتھوں میں کشادہ ہو گئی ؛ فوجیں ہوروں کی سواری میں پیادہ ہو گئی

وہ مرثیہ جس کا مطلع ہے "جب ہوئی ظہر تک قتل سپاہ شبیر" پورا مرثیہ ایسی پیاری اور فصیح زبان میں کہہ دیا ہے کہ اس سے آسان ہونا مشکل ہے۔ اسی میں یہ بیت تو سہل ممتنع کی مثال ہے جس پر پورے پورے مرثیے نثار ہوں

حلق پر تیغ رہے سینہ پہ جلاد رہے ۔ لب پہ ہو نام ترا دل میں تری یاد رہے

کیا خوب رباعی کہی ہے۔ جو مرحوم کے جنازے کے ساتھ پڑھی گئی۔

رحمت کا تری امیدوار آیا ہوں ؛ منہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں

چلنے نہ دیا بار گنہ نے پیدل ؛ تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

دنیا کی حقیقت ایک رباعی میں کیا خوب ظاہر کی ہے۔

کھانے کا مزا فقط زبانی نکلا ؛ باقی سامان عیش فانی نکلا

چاہا تھا کہ ہاتھ دھوئیں دنیا سے دبیر ؛ اتنا بھی نہ اس کنوئیں میں پانی نکلا

نہایت حقیقت کا کیسا اچھا عنوان اختیار کیا ہے، فرماتے ہیں۔

لاکھ اوج ہو شیشہ کا سما ہو نہیں سکتا ؛ ہمت سے بڑا ذرے سے خدا ہو نہیں سکتا

دوسری بیت میں کیا پیاری بات نظم کی ہے۔

رخ بندۂ آدم و ملک وجن کا ہو گیا ؛ یہ ہو گئے خدا کے، خدا ان کا ہو گیا

ایک رباعی اور ملاحظہ ہو۔ اور اسی پر ختم کلام

پہنچا جو کمال کو وطن سے نکلا ؛ قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا

تکمیل کمال ہے غریبی کی دلیل ؛ پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا

طلبہ ہمیشہ عالم اسلام کا قیمتی سرمایہ رہے ہیں

نجم

پھول

ڈراما

از جناب احمد شجاع پاشا جالندھری

افراد تمثیل

۱ موہن ———
۲ چمپا ——— (مسز موہن)
۳ چندر ———
۴ کشور ———
۵ بندو ——— (مسز کشور)
۶ پھول
۷ جمنا۔ پلاس رام وغیرہ وغیرہ

زمانہ:۔ آج کل کا .. جگہ ... لاہور

ایکٹ پہلا

[موہن کا گھر .. ایک پرتکلف کمرہ ۔ موہن اور چمپا (مسز موہن) محو گفتگو ہیں۔]

موہن:۔ "خاک سمجھ میں نہیں آتا عقل کے ناخن جھڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں"

چمپا:۔ کچھ کہو تو سہی کیا سمجھ میں نہیں آتا۔ کونسی مشکل آ پڑی جو منہ بگڑا ہوا ہے"

موہن:۔ "اسی اس کمبخت چندر کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ اس کا کیا کیا جائے۔ لڑکا ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے"

چمپا:۔ کس نے بگاڑا اسے۔ یہ کام کوئی میں نے تھوڑا ہی کیا ہے

موہن:۔ نہ جانے تمہاری عقل کہاں کھو گئی ہے۔ خواہ مخواہ گلے پڑی جاتی ہو۔ میں نے تو سرسری بات کی تھی۔ نامراد پیدا ہوتے ہی مرجاتا"

چمپا:۔ "اے ہے لے دے کے ایک ہی تو بچہ ہے۔ بڑے پان سات ہیں"

موہن:۔ "وہ تو اچھا ہوا کہ ایک ہی ہے کہیں اور ہوتے۔ تو ہم لوگوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی"

چمپا:۔ "جبھی تو کہتے ہیں۔ کہ ماں بچوں سے زیادہ پیار کرتی ہے۔ ورنہ باپ اگر آپ ایسے ہو جائیں۔ تو اولاد بے چاری کا تو پوچھو ہی مت"

موہن:۔ "ارے بی بی کیا کہہ دیا تمہارے لاڈلے کو جو ساون کی گھٹا کی طرح برس رہی ہو"

چمپا:۔ اور میں نے کیا کہہ دیا جو ایسی جلی کٹی سنا رہے ہیں"

موہن:۔ "کاہے کو لڑتی ہو۔ سوچو تو سہی ہم اولاد کے لئے کیا کیا تکلیف برداشت کریں۔ اور وہ ہیں کہ الٹا ہماری ہی ناک کاٹ کے دھر دیں۔ ہماری داڑھی نوچ کر پاؤں تلے روند ڈالیں ..."

چمپا:۔ "اور چندر نے ایسا بڑا کام کر دیا جو جلے دل کے پھپھولے پھوڑے جا رہے ہیں"

موہن:۔ "کہتی ہیں کیا کام کر دیا۔ جانے جانتی ہی نہیں۔ تمہارے لاڈ پیار نے اس کی زندگی تباہ کر دی ہے .."

چمپا:۔ "یہ بھی ایک ہی کہی۔ اس کی عادات تو ..."

موہن:۔ .. (الفاظ کاٹ کر) "یہ تو تم جانتی ہو۔ وہ کوئی بڑا کام کر دے۔ تو اسے میرا بیٹا بنا دیتا"

چمپا:۔ "ہاں ہاں بیا۔ ہاں بیا۔ بس بری .. میرا سب کچھ برا ..."

موہن:۔ "ارے لو جھگڑے کو طول دینے کے لئے ایک اور قصہ لے بیٹھیں۔

چمپا:۔ "اور جانے آپ جھگڑا چکانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ صاف کیوں نہیں کہہ دیتے میں اچھا تو بری میری تو قسمت ہی ایسی ہے"

موہن:۔ "قسمت تو میری بری جو ہمیں تم سے ایسی بات کہہ بیٹھا۔ کیا کریں۔ ہمیں اپنے ارادے مجبوری کے دیوتا کی بھینٹ چڑھانے ہی پڑتے ہیں ..."

چمپا:۔ "میں تو کہتی ہوں۔ اس موذی کالے کو جی بھر کے کوس و خوب گالیاں دے لو۔ اس بدبخت کو تو تمہارا بیٹا بن گیا"

موہن:۔ "عجیب مصیبت ہے سمجھتی ہی نہیں ..."

چمپا:۔ "ہاں مصیبت کیوں نہ ہوں۔ آپ کے ہاں دو چپاتیاں جو کھا لیتی ہوں۔ اس میں کیا ہے۔ میں آج میکے چلی جاؤں گی"

موہن:۔ "بائی جی .. اے لو کان پکڑتا ہوں میں بھولا۔ بات تو کچھ

کچھ تھی۔ مگر۔۔۔"

چمپا:۔ "آپ جان بوجھ کر تو ایسی بات کرتے ہیں۔ جو مری رگ رگ میں انگارے بھر دیتی ہے"

موہن:۔ "میں نے تو چندر کی بابت کہا تھا تم ہی کہو لڑکے کا گھر سے بھاگ جانا کیا کم بے عزتی ہے۔ اور ابھی تو ہم چھپائے جاتے ہیں کسی کو کان و کان خبر نہیں ہوتی۔ اس کے سسرال میں یہ خبر پہنچ گئی۔ تو ساس سسر کیا کہیں گے۔ سر پیٹ کے رہ جائیں گے غریب ۔۔۔۔"

چمپا:۔ "اگر پہلے ہی سے دھیمے دھیمے رہتے۔ تو میرا جی بھی نہ کڑھتا اور آپ کو بھی تشفی آمیز جواب مل جاتا۔۔۔"

موہن:۔ "وہ تو تمہارے غصے کا بند ٹوٹ گیا۔ میں تو چپ چاپ بیٹھا تھا"

چمپا:۔ "آپ چپ چاپ بیٹھے تھے۔ سچ کی ٹانگ کاہے کو توڑتے ہیں"

موہن:۔ "تم ہی بتاؤ میں کیا کہہ رہا تھا۔۔"

چمپا:۔ "آپ ہی نے خود غصے کے خس و خاشاک پر چنگاری پھینکی۔ اور جب آگ بھڑک اٹھی۔ تو اس پر تیل ڈالنا شروع کر دیا"

موہن:۔ "چھوڑو ۔۔۔ خیر گذری سب کچھ نپٹ گیا"

چمپا:۔ "تو اب؟"

موہن:۔ "اب اس آزاد خیال اور آوارہ لڑکے پر قابو کس طرح پایا جائے۔ ایک ماہ ہو گیا حضرت گھر ہی نہیں آتے۔ اور ہم دریافت کرنے والوں سے یہی کہہ رہے ہیں۔ کہ کلکتہ اپنے چچے کے ہاں گیا ہوا ہے"

چمپا:۔ "جتنا جاگتی ہو۔ کہیں ہو"

موہن:۔ "تم غصے کی چنگاری کو پھر ہوا دینے لگیں۔ ایسے سرکش لڑکے کا زندہ رہنا ہمارے لئے باعث عذاب ہوگا"

چمپا:۔ "خود را فضیحت دیگراں را نصیحت۔ خود وہ بات کرنے لگے۔ جس سے مجھے روکا تھا"

موہن:۔ "اچھا میں بھی چپ سادھ لیتا ہوں۔ تم بھی لبوں پر مہر سکوت لگا لو۔ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔۔۔"

چمپا:۔ "خوب کہی۔ پھانس نکالنے کی بجائے انگلی کاٹنے لگے"

موہن:۔ "پھانس نکالنا بس میں جو نہ ہوا"

چمپا:۔ "واہ بس میں کیسے نہیں"

موہن:۔ "اچھا دیکھو بات بڑھ جائے گی ۔۔۔ سمجھیں"

چمپا:۔ "سمجھیں"

موہن:۔ "یعنی ہماری عزت کا جو سوال ہو گھر سے نکل بھاگنا چھوٹی سی بات تھوڑی ہے۔ اب تو اسے گھرانے کی لڑکی ملی ہے۔ سسرال والے پوچھیں دیکھیں گے۔ تو انکار کر دیں گے۔ پھر دو کوڑی کی رہ جائے گی ہماری عزت۔"

چمپا:۔ "ماں کی ممتا اولاد کے لئے اسے بڑے سے بڑے عزم کو پیچھے ڈالنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ جب سے گیا ہے۔ میں ہی جانتی ہوں۔ جو میرا حال ہے۔ گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے"

موہن:۔ "تمہیں تو گھر کی چار دیواری کے اندر رہنا ہے۔ ہدف ملامت تو ہم بنیں گے۔"

چمپا:۔ "اسے کہیں ڈھونڈیئے بھی"

موہن:۔ "مغرور مجرم کا بھی کہیں پتہ ہو سکتا ہے۔ اس کی حیثیت تو ایک بھاگے ہوئے قیدی ایسی ہے۔ جو اپنی جان بچانے کی تگ و دو اور بے فکری کی جستجو میں ادھر ادھر بھاگا پھرے"

(جمنا داخل ہوتی ہے)

جمنا:۔ "بابو جی"

موہن:۔ "کیا ہے جمنا؟"

جمنا:۔ "سیٹھ پارس رام آئے ہیں"

موہن:۔ "کون سیٹھ پارس رام"

جمنا:۔ "بھول گئے آپ۔ ہمارے پڑوس میں ان کا گھر ہے۔ وہ جن کی دہلی میں کپڑے کی دوکان ہے"

موہن:۔ "اچھا۔ پارس رام جی۔ (چمپا سے) تم دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔ میں انہیں یہیں لاؤں۔ کہیں گے گھر میں گھسنے تک نہ دیا"

چمپا:۔ "آپ بلا لیجئے۔ کچھ ان سے بھی پوچھئے گا۔ جاؤ۔ جمنا۔ میں جاتی ہوں۔"

(چمپا بغلی دروازے سے باہر چلی جاتی ہے۔ سیٹھ پارس رام داخل ہوتے ہیں)

موہن:۔ "آداب عرض پارس رام جی"

پارس رام:۔ آداب عرض۔

موہن:۔ "کہیئے۔ مزاج تو اچھے ہیں آپ کے۔ بیٹھئے۔ (قالین پر بیٹھ جاتے ہیں)

پارس رام:۔ شکریہ۔

موہن:۔ "اور سب خیر خیریت ہے نا"

پارس رام:۔ "مہربانی"



حسن ۔ پابند سلاسل

موہن :۔ "کیسے آنا ہوا؟"

پارس رام :۔ یوں ہی دہلی میں گھبرا سا گیا۔ جی میں آئی۔ گھر ہو آؤں۔

موہن :۔ خوب۔ خوب۔"

پارس رام :۔ اور آپ سے ایک کام بھی تھا؟"

موہن :۔ "کہئے کہئے۔ زہے قسمت جو میں آپ کے کام آ سکوں۔"

پارس رام :۔ یوں تو کام آپ کا ہی ہے۔"

موہن :۔ "میرا!"

پارس رام :۔ "جی ہاں۔ بات یہ ہے کہ آپ کے صاحبزادے نے چند دن ہوئے مجھ سے کچھ روپے قرض لئے تھے۔"

موہن :۔ راجندر نے کہا... کہاں!"

پارس رام :۔ "اجی وہیں دہلی میں اور کہاں... وہ آپ سے آج کل کچھ روٹھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

موہن :۔ "کچھ ایسی ہی بات ہے۔ زمانہ ہی الٹا ہے سیٹھ جی۔ ہاں تو اس نے آپ سے روپیہ قرض لیا۔ کیوں؟"

پارس رام :۔ "کیا کہوں بھائی صاحب آج کل کے لونڈے لڑکیوں کے پیچھے لگے پھرتے ہیں۔"

موہن :۔ "مطلب!"

پارس رام :۔ دل چھوٹا نہ کیجئے۔ چندر صاحب نے مجھ سے ایک لڑکی کے لئے ایک ہزار روپیہ تو نقد لیا اور تین ساڑھیاں خریدیں۔ میں انہیں دینے پر مجبور ہی ہو گیا۔

موہن :۔ اُف۔ اُف۔"

پارس رام :۔ اور اسی لڑکی کے لئے انہوں نے جوہری کی دوکان سے کچھ قیمتی زیورات چرائے۔

موہن :۔ "راجندر نے چوری کی۔"

پارس رام :۔ اور بدقسمتی سے پکڑے بھی گئے۔ آج کل جیل میں ہیں۔ میں نے سوچا آپ کو خبر کر دوں۔

موہن :۔ پارس رام جی آپ نے مجھے بتلا دیا مہربانی۔ اس بدنصیب کی کچھ نہ کچھ تو مدد کر سکوں گا۔"

پارس رام :۔ اجی وہ کچھ نہیں۔ جوہری میرا دوست ہے۔ پولیس نے ابھی چالان بھی نہیں کیا۔ کچھ دے دلا کے اپنا تو سیدھا کر لیں گے۔ آپ میرے ساتھ دہلی ہو آئیں تو اچھا ہے۔

موہن :۔ یونہی کیا جائے گا سیٹھ جی۔"

پارس رام :۔ تو پرسوں میں جا رہا ہوں۔ آپ بھی تیار ہو جایئے نا؟"

موہن :۔ بہت بہتر۔"

پارس رام :۔ (کچھ توقف کے بعد) "مجھے اجازت دیجئے۔"

موہن :۔ بیٹھئے نا۔ رات کا کھانا یہیں کھایئے۔ کبھی کبھار تو آتے ہیں آپ۔

پارس رام :۔ مہربانی۔ گھر پر بھی تو آپ کا ہی کھاتے ہیں۔ اچھا آداب!"

موہن :۔ "آداب۔ جنا سیٹھ جی کے ساتھ ہو جانا... (پارس رام دھیرے دھیرے باہر نکل جاتے ہیں) آؤ نا بیوی تمہیں تمہارے لاڈلے کی کرتوت سے آگاہ کریں۔ دیکھو اس آزادی نے کیا گل کھلائے ہیں۔ (چمپا داخل ہوتی ہے)

چمپا :۔ کیا ہوا۔ پارس رام کیا کہہ گئے آپ کو؟۔

موہن :۔ راجندر کا پتہ بتا گئے ہیں۔"

چمپا :۔ کہاں ہے میرا لال"

موہن :۔ "جیل میں"

چمپا :۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ آپ کو دکھ نہیں ہوتا۔ اس کے دشمن جائیں جیل میں۔"

موہن :۔ "جھوٹ تھوڑا کہہ رہا ہوں۔ سیٹھ صاحب یہی تو بتاتے تھے۔ چھوکرے نے چوری کی اور پکڑا گیا۔

چمپا :۔ آپ جایئے ضرور جایئے۔ دیکھئے میری گود پر لات نہ مارتے جایئے"

موہن :۔ کیا بہکی بہکی باتیں کرتی ہو بیوی۔ پرسوں پارس رام جی کے ساتھ ہی آفت کو مول لینے جاؤں گا۔"

چمپا :۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ پاؤں پڑتی ہوں۔ میری طرف دیکھئے ماتھ میری التجا کو نہ ٹھکرا دیجئے۔"

موہن :۔ جی تو نہیں چاہتا کہ اس بلا کو پھر گلے میں ڈالوں۔ پاؤں کاٹنے والے کو سر بھی کاٹ لینے دوں۔ ہر پر رنگینی ہمتی چیونٹی کو مارنے کے لئے پہاڑ اٹھا کر ٹپک لوں۔ مگر کیا کروں۔ آخر باپ ہوں۔ مجھ سے اس کی حالت نہ دیکھی جائے گی۔

چمپا :۔ (روک کر) اسے لائے گا نا آپ...."

موہن :۔ لاؤں گا۔ اپنی عزت کی جھوٹی ہڑی کے لئے تباہ کن آگ ضرور ڈھونڈ کر لاؤں گا۔ (آنکھوں میں از خود آنسو آ جاتے ہیں)

چمپا :۔ آپ بھی روتے ہیں۔ انسان ٹھوکر کھا کر ہی سنبھلتا ہے۔ شائد چندر کو بھی سمجھ آ جائے۔ "صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آ جائے۔ تو اسے بھولا نہ کہنا چاہئے۔" مت رو دیجئے۔ مجھے حوصلہ کون دے گا۔ میری ڈھارس کون بندھائے گا۔"

موہن: "چوری، رونا تو قسمت میں لکھا ہے" (بے اختیار ہو جاتا ہے۔ چپ ابھی رو رہی ہے)

پردہ

ایکٹ دوسرا

منظر (کشور کا گھر۔ ایک کمرہ۔ بندو (مسز کشور) اخبار پڑھ رہی ہیں۔ کشور گھبرائے ہوئے داخل ہوتے ہیں)

بندو: "آج پھر جلدی ہی آ گئے آپ۔ دفتر میں کام نہیں تھا؟"

کشور: "کام تو بہت تھا۔ مگر جب دل و دماغ کو یکسوئی حاصل نہیں ہوتی پھر کروں کیسے"

بندو: "نہ جانے آپ کو کیا ہو گیا؟"

کشور: "مجھ سے پوچھتی ہو کیا ہو گیا ہے۔ اسے پوچھو جس کے گلے پر چھری پھیر دی جائے جس کے کلیجے میں خنجر گھونپ دیا جائے۔ جیسے انگاروں پر لٹا دیا جائے وہ تڑپے نہ تو اور کیا کرے۔۔"

بندو: "پھول کے خیال نے مزید متفکر بنا رکھا ہے آپ کو؟"

کشور: "اور کیا کہوں۔ اونچے بات کرتے بھی ڈرتا ہوں۔ آخر لڑکی ٹھیری جانے کچھ کی کچھ بات اڑ جائے۔ اور رہی سہی عزت جاتی رہے"

بندو: "اسے کالج میں بھیج کر ہم نے خود ہی تو بے عزتی کو بلاوا بھیجا"

کشور: "مگر اب تو پانی سر سے اوپر گزرتا جا رہا ہے۔ آج شرما جی کا خط بھی آیا ہے"

بندو: "کیا لکھتی ہے"

کشور: "لکھنا کیا ہے"

بندو: "مطمئن رہیے۔ میں وہ ماں نہیں جو لاڈ پیار سے بچوں کی زندگی دنیا کے لئے عبرت بنا دوں"

کشور: "نہ جانے کہاں چلی گئی وہ۔ خاندان کی ناک کاٹ دی ہمیں چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہئے۔"

بندو: "خط کہاں سے آیا ہے۔ اس میں کیا لکھا ہے"

کشور: "بمبئی سے۔۔۔ لکھا ہے کہ گیارہ تاریخ کو لاہور پہنچیں گی یعنی آج"

بندو: "اس کے لئے اس گھر میں بالکل جگہ نہیں۔ یہ زمین اس کے لئے تنگ ہو چکی ہے"

کشور: "تو تمہارا مطلب ہے اسے گھر سے نکال دوں۔"

بندو: "اس ناگ کو پھولوں کا ہار سمجھ کر گلے میں ڈالنا اچھا نہیں"

کشور: "اور اسے دوسروں کے ڈسنے کو چھوڑ دینا بھی تو برا ہے"

بندو: "دونوں پہلو غور طلب ہیں"

کشور: "وہ تو اچھا ہے کہ چند لپنے چچا کے ہاں گیا ہوا ہے۔ ورنہ ہمیں تو کب کا انکا سا جواب مل جاتا۔"

بندو: "آپ نے بھی تو پھول کے سسرال ایسا ہی کچھ کہلوا بھیجا تھا"

کشور: "مگر انہیں یقین نہیں آئے گا۔ ہم لوگوں کی زبان نہیں بند سکتے۔ کیا معلوم انہیں کیا بتایا گیا ہو"

بندو: "کیسے؟"

کشور: "سوچ سمجھ سے کام لو۔ ہم ہر اتوار ان کے ہاں کھانے پر جایا کرتے تھے۔ مگر اب کئی اتوار گزر گئے۔ ہم مدعو ہی نہیں کئے گئے۔"

بندو: "اس کی وجہ"

کشور: "اور وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ دیکھیں ابھی اور کیا گل کھلتے ہیں۔ لڑکی کو کالج بھیج کر اپنے وقار کی جڑوں کو خود ہی کھوکھلا کر دیا"

بندو: "تو آپ تعلیم نسواں کے خلاف ہیں۔"

کشور: "میں بحث و تمحیص نہیں چاہتا۔ تعلیم نسواں کے خلاف میں کیوں ہونے لگا۔ آخر تم نے بھی تعلیم پائی ہے۔ میں تو اس تعلیم کے خلاف ہوں۔ جس سے رگ و ریشہ میں مغربیت سرایت کرتی جا رہی ہے نا۔۔۔"

بندو: "میں ماں ہوں۔ مگر یہ نہیں چاہتی کہ بیٹی ہمارے لئے مصیبت بن کر رہے۔۔ آنے تو دیجئے۔"

کشور: "کیا کرو گی تم۔۔"

بندو: "کیا کروں گی۔۔۔ آپ میری زبان مت کھلوایئے۔ زخم خوردہ دل پر نمک پاشی مت کیجئے۔"

کشور: "خیر کچھ گناہ کئے ہیں ہم دونوں نے جن کی پاداش میں سخت سزا مل رہی ہے۔ کیا کیا جائے۔ ہم میں سے ہی کسی نے ہمارے سر پر گڈا پھینکا ہے۔ ہمارے دانتوں نے ہی ہماری زبان کاٹی ہے۔ ہمارے ہاتھ نے ہی گردن پر وار کیا ہے۔ ہماری جوتی ہمارے ہی سر پر پڑی ہے۔ کسی دوسرے کو کیا کہیں۔۔"

(قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ پھول کمٹ پٹ کرتی کمرے میں داخل ہوتی ہے)

پھول: "ہیلو پتا جی۔۔۔ آپ اچھے تو ہیں۔ اور آپ ماتا۔۔۔"

کشور۔ پتاجی اچھے تو ہیں۔ کہاں سے آئی ہو...؟"

پھول۔ چہ خوب سرمنڈاتے ہی اولے پڑنے لگے گھر میں گھستے ہی گالیوں کی بوچھاڑ۔

بندو۔ بتاؤ نا... پندرہ دن کہاں رہیں...؟

پھول۔ اوے واہ۔ گویا دونوں متحد ہو کر پورش کرنے والے ہیں

کشور۔ بے ہودہ بکواس بند کرو۔ سوال کا جواب دو۔

پھول۔ مجھے بیٹھ تو لینے دیجئے۔ اور جو یوں تنگ کریں گے آپ تو میں چلی جاؤں گی۔

کشور۔ ہماری عزت کا خون چوس کر ہمیں رسوا و بدنام کر کے کہاں جاؤگی تم۔؟

پھول۔ پتاجی!"

کشور۔ تم گھر سے ایک قدم بھی باہر نہیں نکال سکتیں سمجھیں۔

بندو۔ کان کھول کے سن لو۔

پھول۔ آپ مجھے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتے ہیں۔ اور دکھ دینا چاہتے ہیں۔

کشور۔ ابھی میں نے کیا ہی کیا ہے۔ ابھی تو خنجر چھوا ہی ہے محتوڑا کلیجہ تو کاٹ لینے دو۔

پھول۔ پتاجی۔ خواہ مخواہ ناک بھوں مت چڑھائیے۔ آپ نے سوال کیا تھا۔ میں جواب دے دیتی ہوں۔

بندو۔ کہاں رہیں۔ شریمتی کے مزاج کا پارہ تو جانو کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہے۔

پھول۔ رہی کہاں۔ سیر و تفریح کی غرض سے بمبئی چلی گئی تھی۔

کشور۔ بمبئی۔ سیر و تفریح کی غرض سے۔ بغیر پوچھے کیا مطلب...؟

پھول۔ کوئی خاص وجہ تو نہیں تھی۔ میرے ایک کلاس فیلو ہیں مسٹر پریم وہ بمبئی میں ایکٹر ہیں۔ انہوں نے مدعو کیا میں جا پہنچی۔

بندو۔ مگر اتنے دن...

پھول۔ ٹھہریئے تو۔ یہ بھی سن لیجئے۔ ایک رات پریم کے ہاں کھانے پر.... آ.... مجھ.... سے.. کافی کی بجائے شراب پی ہو گئی۔

کشور۔ کیا بکتی ہو۔ ہندوستانی لڑکی اور شراب!

پھول۔ واہ پتاجی... اس میں کیا ہے..."

کشور۔ پوچھتی ہو۔ اس میں کیا ہے۔ میری لاش کو اپنی ٹھوکروں میں رکھ کر انجان بنی پھرتی ہو۔ ماتھے پر کلنک کا ٹیکا لگا کر پوچھتی ہو کس نے لگایا ہے۔ ہماری عزت کے خون سے ہولی کھیل کر خوش ہوتی ہو۔ کاش تم ایسی عالم وجود میں آنے سے پہلے ہی مر گئی ہوتی۔ تمہیں زمین ہڑپ کر لیتی۔ آسمان اٹھا لیتا۔ کچھ تو ہوتا۔ کہیں یہ دن دکھانے کو موجود نہ ہوتیں۔

بندو۔ تمہاری غیرت کو کیا ہو گیا ہے۔ تمہیں شراب پیتے ہوئے شرم نہ آئی۔ اپنے پتا کا بھی کچھ خیال نہ آیا۔

کشور۔ جلنے دو بیوی۔ میں ایسے الفاظ نہیں سن سکتا۔ یہ الفاظ بھالے کی نوک کی طرح میرے دل میں چھید کر رہے ہیں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ (دل پکڑ کر) ہوا باہر نکل جاتا ہے۔)

پھول۔ ماتا پتاجی کے حواس ٹھکانے نہیں ہیں۔ انہیں ٹھنڈا پانی پلاؤ۔

بندو۔ بے شرم بے حیا لڑکی جس درخت پر تم نے اپنا ناپاک بسیرا بنایا۔ اس کی قطع و برید بھی ہو چکی ہے۔ موت کے دروازے ماں باپ کی گود سے زیادہ وسیع ہیں۔ موت کے گہرے گڑھے میں گناہ ہضم ہو جاتے ہیں۔ کوئی عجب نہیں۔ کہ دنیا بھر کی ٹھکرائی اور دھتکاری ہوئی پر موت کو رحم آ جائے۔

پھول۔ آپ کے الفاظ میرے کانوں تک پہنچتے ہیں۔ دل پر اثر پذیر نہیں ہو سکتے۔ میں نے ایسا کیا گناہ کیا ہے جو خودکشی کروں۔

بندو۔ گھر سے بھاگ جانا گناہ کبیرہ ہے۔!

پھول۔ میں کب بھاگی۔ میں تو واپس آ گئی ہوں۔

بندو۔ یہ اس سے بھی بدتر ہے۔ تمہارے سسرال والے سنیں گے۔ تو کیا کہیں گے۔ لوگ سوال کریں گے۔ تو کیا جواب دو گی۔ وہ سر جو کبھی کسی کے آگے نہ جھکا تھا۔ اب بار ندامت سے اٹھ نہ سکے گا بیٹی کا گناہ ماں کے دامن پر ایک بدنما دھبہ ہے۔

پھول۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا گناہ کیا میں نے!

بندو۔ جب شراب پی لی۔ تو اور کیا کیا نہ کیا ہو گا۔

پھول۔ دیکھئے ماتا جی۔ آپ بہت کچھ کہہ چکیں۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ گناہ نہیں ہوا غلطی گناہ کے مترادف نہیں ہے۔ اور مجھے تو اس کی کافی سزا مل چکی ہے۔ کئی روز ہسپتال میں رہی۔ آپ بجائے دلجوئی کرنے کے.....

بندو۔ (الفاظ کاٹ کر) اور تمہیں سر پر بٹھاؤں۔ آخر یہ بیٹی بڑا اچھا کام کر کے آئی ہے۔ بڑی دیوی ہے۔ جو گھر سے نکل بھاگی

بڑی چالاک ہے۔ جو کسی کو کان دکان خبر نہ ہونے دی۔ بڑی عقل مند ہے۔ جو پھر واپس آگئی۔ بہت مہذب ہے جو پتا کو کھری کھوٹی سنا دیں پھول تم مجھے اپنے باپ سے بڑھ کر سمجھنا:

پھول: ۔ اچھا اب کان مت کھائیے ۔ میرا تو سر بھی درد کرنے لگا۔

بندو: ۔ ٹھیک ہے بیٹی ٹھیک ہے ...

پھول: ۔ اُف ... تو پیچھا نہیں چھوڑیں گی (آواز دیتی ہے) ہالی۔ ہالی۔ (کچھ دیر خاموشی کے بعد ہالی داخل ہوتی ہے) ہالی میرے لئے چائے بناؤ میں غسل کر کے چلئے ہوں گی ... سمجھی ...

ہالی: ۔ بہت اچھا بائی جی۔

پھول: ۔ ماتا جی آپ میری ایک سفید ساڑھی نکال دیجئے۔ ابھی ماتا ... غصہ تھوک دو نا ...

بندو: ۔ چل ہٹ ...

پھول: ۔ میں خود ہی نکال لوں گی۔ جا کر ہونٹ (کھٹ پٹ کھٹ پٹ کرتی باہر نکل جاتی ہے۔

بندو اس کی طرف غصے سے گھور کر دیکھ رہی ہے)

پردہ

ایکٹ تیسرا

منظر: ۔ (موہن کا گھر۔ ایک کمرہ۔ چمپا اور بندو محو گفتگو ہیں)

بندو: ۔ شادی ہو ہی جائے تو اچھا ہے:

چمپا: ۔ ہمیں اس میں کیا عذر ہے:

بندو: ۔ آپ جانتی تو ہیں کہ آج کل لڑکی کو دیر تک گھر بٹھا کے رکھنے کا زمانہ نہیں:

چمپا: ۔ چندر بھی آگیا ہے۔ اس کے پتا سے بات کروں گی آج پھر وہ جو کہیں ...

بندو: ۔ ہاں ... انہوں نے کیا کہنا ہے۔ کوئی بھگوان نہ کرے وہ نہیں تھوڑی ہی کہیں گے ...

چمپا: ۔ ارے نہ نہ ... یہ بات نہیں:

بندو: ۔ اور ہاں۔

چمپا: ۔ اچھا بتائیے ہماری بیٹی کیسی ہے:

بندو: ۔ پھول؟ ... اچھی ہے:

چمپا: ۔ چچی کے ہاں گئی ہوئی تھی نا ... لیبتی ہی؟:

بندو: ۔ تین ایک دن ہوئے:

چمپا: ۔ تاریخ کب مقرر کیجئے گا۔

بندو: ۔ آپ ان سے بھی پوچھ لیں:

چمپا: ۔ ہاں ہم لکھ بھیجیں گے:

بندو: ۔ چندر کدھر ہے:

چمپا: ۔ آپ کے آنے سے آدھ گھنٹہ پہلے تو یہیں تھا۔ جانے اب کدھر ہے:

بندو: ۔ مدت ہوئی اسے ...

چمپا: ۔ بلواؤں کیا؟ ..

بندو: ۔ ہاں بلوائیے۔

چمپا: ۔ دیکھوں جو گھر رہی ہو۔ (آواز دیتی ہے) جمنا ری، او جمنا۔ ادھر آ ...

(جمنا داخل ہوتی ہے)

جمنا: ۔ جی ...

چمپا: ۔ باہر کیا کر رہی ہے۔ تیری چائے بنی ہے یا نہیں۔

جمنا: ۔ ابھی لاتی ہوں بائی جی۔

چمپا: ۔ وہ پان زن تو اٹھا لاتی۔ ہمارے ہاں مہمان آتے ہیں۔ اور تم باورچی خانے میں جا کر سو رہتی ہو ...

بندو: ۔ اپنا ہی تو گھر ہے۔ اس قدر تکلیف کی کیا ضرورت ہے

چمپا: ۔ تکیہ ڈھنگا سے لی (جمنا سے) چھوٹے بابو گھر پر ہیں ..

جمنا: ۔ جی:

چمپا: ۔ نہیں بھیج دینا (جمنا جانا چاہتی ہے) اور سن۔ باہر چھولو سے کہہ کہ کچھ پھل ول تو منگا دے ... جا جلدی کر۔ (جمنا تیزی سے باہر نکل جاتی ہے)

بندو: ۔ آپ تکلیف کر رہی ہیں۔

چمپا: ۔ رہنے بھی دیجئے۔ مجھے نادم کیوں کرتی ہیں آپ:

بندو: ۔ اور چندر ایک دن میں پھر تو روز آیا کریں گے۔

چمپا: ۔ کیوں نہیں آپ ہی کا تو گھر ہے ... (چندر داخل ہوتا ہے)

چندر: ۔ آداب ... چچی ..

بندو: ۔ آؤ بیٹا۔ جیتے رہو:

چندر: ۔ کہئے خیریت سے تو ہیں آپ؟ ... اور چچا ..

بندو: ۔ سب اچھے ہیں ..

چندر :- اور وہ ..

بندو :- وہ کون ؟

چندر :- اجی وہی (سٹھتے ہوئے) میرا مطلب پھول سے ہے !

چمپا :- چندر ....

چندر :- ماما تم ابھی تک قدامت پسند ہی رہیں ۔ اپنی منگیتر ہی کا نام لیا ہے ۔ کسی غیر کا تو نہیں لیا ۔

چمپا :- شرم و حیا بیچ کھائی چندر ۔

چندر :- اور میں نے ایسی کیا حرکت کردی "

بندو :- کچھ نہیں ۔ کچھ نہیں ۔

چندر :- دیکھو نا چچی ۔ ماما تو عقل کے پیچھے لٹھ لئے پھرتی ہیں لٹھ !

بندو :- ہاں کہیں ملازمت نہیں ملی تمہیں ۔

چندر :- آج کل ملک کی حالت سے تو آپ واقف ہی ہیں لڑکے اور چوری کے سوا اور کیا کریں گے ۔

بندو :- کیا کہتے ہو بیٹا ۔

چندر :- یقین مانئے سچ کہہ رہا ہوں !

چمپا :- جب تو باپ دادا کا نام اچھی طرح روشن کر سکو گے ۔

چندر :- لو ... نام تو ہوگا ،

بندو :- ایسی باتیں نہیں کیا کرتے چندر ۔

چندر :- جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہا ہوں میں تو .. (جمنا پھل لے کے داخل ہوتی ہے)

چمپا :- یہاں رکھ دے ... اری ادھر .. ہاں لیجئے ..

بندو :- تم بھی لو چندر ...

چمپا :- جمنا چائے بھی لے آؤ ۔

بندو :- انہاں رہنے دیجئے ... مجھے جانا ہے ۔

چمپا :- زیادہ وقت نہیں لگے گا مطمئن رہئے ..!

بندو :- بس مہربانی تکلف بھی ٹھیک نہیں ہوتا ۔

چمپا :- ہی ہی ہی ... (خفیف ہنسی)

بندو :- آپ میری بات چندر کے پتاجی سے کہہ دیجئے گا !

چمپا :- بہتر !

بندو :- اور اس کا جواب !

چمپا :- کہلوا بھیجوں گی ۔ بس تیاری ہی سمجھئے ..!

بندو :- خوب تو مجھے اجازت دیجئے ۔

چمپا :- ابھی سے !

بندو :- جی ... وہ دفتر سے آنے والے ہوں گے ۔ پھر سہی اب کی بار معافی چاہتی ہوں ..!

چمپا :- پھر کب آئیے گا ۔!

بندو :- آپ کا جواب پہنچنے پر ... اچھا چلتی ہوں ..!

چمپا :- آداب !

بندو :- آداب !

چندر :- چلئے میں آپ کو چھوڑ آؤں ..!

بندو :- اونہوں موٹر جو موجود ہے ... (دھیرے دھیرے باہر نکل جاتی ہے)

چندر :- تیاری شروع کر دو ناماما ..!

چمپا :- تمہارے پتا تو آجائیں ۔

چندر :- آنے والے ہی ہوں گے " (موہن داخل ہوتا ہے) ..."

موہن :- کون آیا تھا ۔ جو یہ پھل بکھرے پڑے ہیں ..

چمپا :- پھول کی ماتا آئی تھیں ...

موہن :- (بیٹھتے ہوئے) " پھول کی ماتا ... کیوں ؟ "

چمپا :- شادی کی تاریخ ٹھہرانے ۔

موہن :- تم نے کیا کہا ...

چمپا :- میں نے کہا آپ سے پوچھ لوں ۔

موہن :- یہ آج کیا دن ہے ۔ جو میری رائے پوچھی جا رہی ہے !

چمپا :- ہونہہ ۔ جانے پہلے کبھی پوچھا ہی نہیں ..!

موہن :- پوچھتیں تو یہ بات کیوں کہتا ..!

چمپا :- اور چندر سے بھی تو پوچھنا تھا ۔

موہن :- وہ کیوں ۔

چندر :- کیوں نہیں ... آخر شادی تو میری ہے !

موہن :- تمہاری ہو یا کسی اور کی ۔ جو ماں باپ کریں ۔ ماننا پڑیگا ۔

چندر :- اور میں رضامند نہ ہوں تو شادی کر سکتے ہیں آپ ۔

موہن :- کیوں نہیں ۔

چندر :- میں تو ایسا کبھی نہ ہونے دیتا ..

موہن :- چپ رہو تم بڑھتے جا رہے ہو ۔

چندر :- یہ کام تو آپ کر رہے ہیں !

چمپا :- آتے ہی اس پر کیوں برس پڑے !

موہن :- اسے نہیں کہتی باپ کے سامنے کیا واہی تباہی بکے جا رہا ہے !

چندر:۔ پتا جی۔۔

موہن:۔ خاموش۔۔۔

چمپا:۔ اے ہے۔ میں نے تو کچھ کہا۔ یہاں باپ بیٹا جھگڑنے بیٹھ گئے

موہن:۔ کیا کروں۔۔ مجبور ہوں۔۔۔

چمپا:۔ میری بات کا جواب دیجئے۔ نہیں کیا کہوں،

موہن:۔ ہاں کرو۔ اچھا ہے سسرال رہا کرے گا۔ نہیں تو سکھ سے رہ نہ سکے گا۔

چمپا:۔ آپ ابھی تیاری شروع کردیں۔ ہمارے پاس صرف دس دن تو ہیں

موہن:۔ دس دن۔۔ اتنی بھی کیا جلدی ہے۔۔۔

چمپا:۔ جلدی تو ہے۔ بس میں جو کہتی ہوں آپ کیجئے۔۔۔

موہن:۔ اچھا۔ سر پڑی اٹھانے ہیں۔

(چندر اور چمپا مسکرا رہے ہیں)

پردہ

ایکٹ چوتھا

منظر: لکشمی داس کا مکان۔ ایک کمرہ۔ پھول گا رہی ہے)

پھول:۔ ہم دل میں سوزِ عشق کو پنہاں کئے ہوئے۔

بیٹھے ہیں اپنی موت کا ساماں کئے ہوئے۔

(چندر داخل ہوتا ہے۔ ہاتھ میں ایک خط ہے۔ ہونٹ غصے سے پھڑپھڑا رہے ہیں)

چندر:۔ (خط دکھلاتے ہوئے) پھول۔۔ یہ کیا بے ہودگی ہے۔

پھول:۔ کیا ہوا۔۔۔ اور میرا خط۔۔۔ یہ تم نے کیوں کھولا۔۔۔

چندر:۔ میرا حق ہے۔

پھول:۔ ہونہہ۔۔ حق ہے تمہارا۔۔ چندر تم خاوند ہو کوئی لاٹ صاحب نہیں۔ میں بیوی ہوں۔ کوئی باندی نہیں۔

چندر:۔ کچھ بھی ہو۔ میں اپنے سوال کا جواب طلب کرتا ہوں۔

پھول:۔ میں اس کے لئے ہرگز تیار نہیں۔

چندر:۔ تم میری عزت کا خون آزادی کو پلانا چاہتی ہو۔ پریم ایک ذلیل لیڈر ہوتے ہوئے تمہیں اس طرح مخاطب کرے۔

پھول:۔ محبت آمیز الفاظ لکھ دئے تو کیا ہے۔۔۔

چندر:۔ پوچھتی ہو کیا ہے۔ اس خط کا ایک ایک لفظ اٹھ کر میرا گلا گھونٹنے کو ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ میں ایسی نازیبا حرکت برداشت نہیں کرسکتا۔

پھول:۔ ذکر۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔

چندر:۔ پروا نہیں! تم میری بیوی ہو۔

پھول:۔ بیوی ہوں۔ نوکرانی نہیں۔

چندر:۔ پریم سے کیوں شادی نہ کرلی تم نے۔ وہ ہماری آبرو کو گالی دے رہا ہے۔

پھول:۔ چندر۔ ہوش کے ناخن لو۔ وقت وقت کا گیت گایا جاتا ہے۔

چندر:۔ بڑی متانت اور سنجیدگی سے مجھے سمجھا رہی ہو۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

پھول:۔ اور تمہارے آگے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے سے تو رہی۔ کس برتے پر اکڑ رہے ہو۔ میرے پتا کے ٹکڑوں پر تو تمہارا گذر ہے۔

چندر:۔ یہ میری اپنی غلطی ہے۔ میں والدین سے جھگڑ کر تمہارے ہاں آگیا۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں بھوکا ہوں۔ مجھے تن ڈھانپنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی نہیں ملتی۔

پھول:۔ اتنی لمبی چوڑی تقریر سے تمہارا مطلب۔

چندر:۔ خاک۔

پھول:۔ اپنے سر میں ڈال لو۔

چندر:۔ پھول حد سے گزر جانا بھی اچھا نہیں میں نے کچھ کہہ دیا۔۔۔ تو تو۔ میں تمہارے اعمال سے اچھی طرح واقف ہوں۔

پھول:۔ اور جانتے ہیں کچھ جانتی ہی نہیں۔

چندر:۔ تم نے بیٹی بنا کر کیا کچھ نہیں کیا۔ مجھے شادی سے پہلے معلوم ہو جاتا۔ تو آج یہ نوبت ہی نہ آتی۔

پھول:۔ تم نے دہلی کے اجڑے ہوئے جیل خانے کو آباد کردیا۔ مجھے شادی سے پہلے یہ معلوم ہو جاتا۔ تو میری صورت بھی نہ دیکھتی۔

چندر:۔ خود چو پارسا نقیں۔

پھول:۔ اپنے گریبان میں تو منہ ڈالو۔

چندر:۔ گئی گزری بات کو چھوڑ دو۔ اب تمہیں میرا کہا ماننا پڑیگا۔

پھول:۔ میں عزت کے دیوتا کے لئے آزادی کی قربانی نہیں دے سکتی

چندر:۔ تو تم یہاں نہیں رہ سکتیں۔

پھول:۔ یوں کہو۔ تم یہاں نہیں رہ سکتے۔۔۔ میں تو خود ہی رہنا نہیں چاہتی۔ کہیں اسکول کالج میں لڑکیوں کو پڑھا کر بھی روزی کما سکتی ہوں۔۔۔

چندر:۔ میں تم سے کم نہیں۔

پھول: ایک ایل۔ ایل۔ بی کی دم زیادہ ہے۔

چندر: پھول ابھی ایک ماہ ہماری شادی کو ہوا ہے۔ تم یہ چاہتی ہو کہ ہم جدا ہو جائیں۔

پھول: چاہتی تو نہیں۔ مگر جب میرے راہ میں کانٹے بچھائے جائیں گے۔ تو مجھے الگ ہونا پڑے گا۔

چندر: غلطی تو تمہاری ہے۔ شادی کے بعد بھی تم نے وہی کام جاری رکھا۔ آج یہ خط دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جس سے بو پھوٹ پھوٹ کر آتی ہے

پھول: تم یہ چاہتے ہو کہ مجھے زر خرید غلام کر رکھو۔ میری آزادی مجھ سے چھین لو۔ مجھے گھر کی چار دیواری میں قید کر دو۔ چندر یہ نہ ہوا ہے نہ ہو سکے گا!

چندر: تمہیں کرنا ہوگا۔

پھول: ہونہوں۔۔۔

چندر: کیا کہا۔

پھول: کہا نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ایک خط ہی مجھے دکھایا جا رہا ہے۔ میں بھی تو تمہیں جانتی ہوں۔۔۔ بابا۔۔۔

چندر: الفاظ کاٹ کر۔ تم اسے جانتی ہو۔

پھول: اب جگر تھام کے بیٹھو۔ میری باری آئی۔ گھبرا کیوں گئے

چندر: اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔

پھول: ہونٹ تو کپکپانے لگے۔ چہرے کا رنگ تو پھیکا پڑ گیا۔

چندر: بابا۔۔

پھول: ہاں بابا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔

چندر: تم بابا کے ساتھ ملتی ہو۔ جب تمہارا چال چلن بھی مشتبہ ہے

پھول: چندر۔۔۔ زیادہ زبان مت چلاؤ

چندر: سچ کڑوا ہوتا ہے۔

پھول: چپ رہو۔

چندر: جس نے خراب پی ہی اس نے اور کیا نہ کیا ہوگا۔

پھول: خاموش۔ تمہاری حیثیت ایک نوکر سی ہے۔ میرے باپ کے ٹکڑوں پر رہنے والے کو میرے خلاف زبان تک ہلانے کی جرأت نہ ہونی چاہئے۔

چندر: مجھے بار بار یہ الفاظ نہ کہو۔ ان کا نتیجہ برا ہوگا۔

پھول: ہونے دو۔۔ پروا نہیں۔

چندر: میں بے عزتی کا بدلہ لوں گا۔

پھول: جس کی عزت نہ ہو۔ اس کی بے عزتی کیسی؟

چندر: چپ رہو۔

پھول: ماں باپ نے بھی ہمیں چھوڑ رکھا ہے۔ ہمیں تنگ کرنے کو۔ بیٹے کو روٹی تک نہیں دے سکتے۔

چندر: پھول بہت کچھ کہہ چکیں تم۔ اب جو ایک لفظ بھی زبان سے نکالا۔ تو زبان کھینچ لوں گا۔ تم ہم سب کو برا بھلا کہتی ہو۔ لے لو۔۔ میں جاتا ہوں ہمیشہ کے لئے پھر کبھی یہاں نہ آنے کے لئے۔

پھول: او پروا نہیں۔

چندر: پچھتاؤ گی۔

پھول: اچھا ہے۔ بلا ٹلے گی۔

چندر: پھر الٹا لوگی۔

پھول: ہونہہ۔ تم ایسے اور بہت ہیں۔

چندر: میں پھر کہتا ہوں۔

پھول: میرا پھر وہی جواب ہے۔

چندر: بہتر۔۔۔ (تیز قدمی سے باہر نکل جاتا ہے)

پھول: ہونہہ۔ احمق۔ کمینہ مجھے لونڈی بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ پگلے کے حواس ہی ٹھکانے نہیں۔۔۔ (پھول کی ماں داخل ہوتی ہے گھبرائی ہوئی سی ہے)

بندو: چندر کہاں گیا ہے۔ کیا کہہ دیا اسے۔ میں نے بلایا جب بھی نہیں بولا۔

پھول: اچھا ہوا چلا گیا۔

بندو: کہاں چلا گیا۔

پھول: جہنم میں

بندو: کیا کہہ رہی ہو تم۔

پھول: آج اس کے سر پر جن سوار ہے۔ مجھ سے لڑ کر گیا ہے۔

بندو: تم نے کچھ کہا ہوگا

پھول: کچھ بھی تو نہیں کہا۔ بس جیسا منہ تھا۔ ویسا ہی چانٹا لگایا گیا ہے۔

بندو: یعنی؟

پھول: وہ لگا وہی تباہی بکنے۔ میں نے بھی اسے کھری کھری سنا دیں۔۔۔

بندو: آن۔۔ تم تو بیچ چھاڑ کے ہماری عزت کے پیچھے پڑی ہو۔

پھول: جانے دو ماما۔۔۔

بندو: بس زیادہ ٹر ٹر نہ کرو۔ قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے

(کشور لڑکھڑاتا ہوا داخل ہوتا ہے)

کشور:۔ اُف! ارے ستّ ... (بیٹھ جاتا ہے)

بندو:۔ کیا ہوا ناتھ؟ ....."

کشور:۔ کیا ہوا ہے؟ بیری ... پھول نے ہمارے گال پر ایک اور زور کا طمانچہ مارا ....."

بندو:۔ ناتھ! ..

کشور:۔ چندر میرے پاس دفتر میں آئے تھے۔ سامان بندھا ہوا موٹر میں رکھا تھا۔ کہنے لگے "آپ کی بیٹی عزت کا خون چوسنا چاہتی ہے میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ میری طرف سے اب انہیں آزادی ہے۔"

بندو:۔ مطلب؟ ۔

کشور:۔ طلاق دے گئے ہیں۔ کل لکھ کر بھیج دیں گے۔ قسمت نے اک بار پھر اداس کے قعرِ عمیق میں دھکیل دیا۔

بندو:۔ ہائے رے قسمت۔

پھول:۔ وہ تو اچھا ہی ہوا میں خود اسے طلاق دینے والی تھی

کشور:۔ بے ہودہ باتیں مت بناؤ۔ کیا یہ خط تمہارا ہے۔ مجھے چندر دے گئے ہیں۔

پھول:۔ یہ ہے تو میرا ..... دیکھئے نا اس نے ..... میری ڈاک کیوں . .

بندو:۔ اس کا حق ہے۔

کشور:۔ واقعی اس خط نے اسے مشتعل کیا۔ موت کی سیاہ چادر سب گناہ ڈھانپ لیتی ہے پھول ..... یہ لو اسے کھا لو ..۔

پھول:۔ یہ کیا ہے پتا جی؟۔

کشور:۔ زہر۔

بندو:۔ زہر۔

کشور:۔ ہاں اسے کھا لینے دو۔ سب نپٹ جائے گا۔

پھول:۔ ہرگز نہیں۔ میں خودکشی نہیں کروں گی۔

کشور:۔ تمہارے سارے تمہارے گناہ۔

پھول:۔ میرے گناہ ..... آپ کو ان سے کیا سروکار۔

کشور:۔ خیر باتیں نہ بناؤ اسے چپ چاپ کھا لو۔

پھول:۔ اونہوں ....."

کشور:۔ اسے لو ..،

بندو:۔ ناتھ۔

کشور:۔ بیوی اپنے دامن سے اس سیاہ دھبے کو دھو لینے دو

پھول:۔ آپ خود ہی کھا لیجئے۔

بندو:۔ پھول۔

پھول:۔ آپ بھی کھا لیجئے۔ تاکہ دونوں کو میری صورت دکھائی نہ دے۔"

کشور:۔ (جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے) "کھا لو ....."

پھول:۔ نہیں۔

کشور:۔ "نہیں؟ یوں نہیں یوں سہی۔" (جیب سے ایک چھوٹا سا چاقو نکالتا ہے)

پھول:۔ پتا جی ... مجھے مت ماریئے .. پتا جی ..."

کشور:۔ میرا دل پتھر ہو چکا ہے۔ تمہارا زندہ رہنا ٹھیک نہیں۔"

بندو:۔ ناتھ۔ ناتھ۔ (پھول بھاگنا چاہتی ہے)

کشور:۔ ٹھہرو۔ کہاں جاتی ہو۔

بندو:۔ ٹھہریئے ... ٹھہریئے۔

کشور:۔ اب ضبط کا یارا نہیں رہا۔ اب نہیں ٹھہر سکتا۔"

(ہاتھ اوپر اٹھاتا ہے پھول چلاتی ہے۔ بندو اسے اپنی آڑ میں لے لیتی ہے۔ کشور وار کرتا ہے۔ چاقو بندو کی گردن میں پیوست ہو جاتا ہے)

بندو:۔ ناتھ ... میرا ... کیا ... قصور تھا۔

کشور:۔ (گھبرا کر) بیوی ... تم ...."

بندو:۔ سو ..... ا ..... می (ایک ہچکی سی آتی ہے)

پھول:۔ (چلا کر) "ماتا"

کشور:۔ بیوی ٹھہرو ... مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا میں دیوانہ ہوں سودائی ہوں، پاگل ہوں، مجھے پھول۔ ہاں پھول نے یہ کام کرنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے معاف کر دو! مجھے معاف کر دو میں بھی آتا ہوں۔ آتا ہوں

(دیوانہ وار چلاتا باہر بھاگ جاتا ہے)

پھول:۔ ماتا جی ... ماتا جی۔ آنکھیں کھولئے۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے مجھے معاف کر دیجئے۔ اچھی ماتا ... یہ سب میری آزادی کا قصور ہے۔ میں اکیلی رہ جاؤں گی۔"

بندو:۔ بیٹی اچھے کام ... کرنے .. والوں ... کے ... ساتھ .. بھگوان ہوتا ہے۔

پھول:۔ (ایک ہچکی آتی ہے۔ روح نفسِ عنصری سے پرواز کر جاتی ہے۔ پھول بے ہوش ہو کر گرتی ہے۔ کمرے میں مکمل سکوت ہے)

پردہ

تنہائے وفا

دلگداز نظم

از حضرت مخمور جالندھری

ٹاٹ کے پردے کے پیچھے یوں اُٹھی چیخ اور پکار
پڑ رہی ہو جس طرح معصوم اک بچے پہ مار

سسکیاں لینے کی رُک رُک کر صدا آنے لگی
گریہ کی آواز کانوں پر ستم ڈھانے لگی!

میں نے جھانکا تو نظر محو تماشہ ہو گئی
منظرِ پُر ہول کی گہرائیوں میں کھو گئی

پھول سی اک نازنیں بھیگی ہوئی راتوں کا خواب
چاند کی نازک کرن اور بند کلیوں کا شباب

سہ رہی ہے بدچلن شوہر کے ظلم ناروا
گولیوں کی گونج تھی سنگیں طمانچوں کی صدا

بن گئی تھیں یوں حسیں گالوں پہ پانچوں انگلیاں
جس طرح تازہ کنول کی پتیوں پر دھاریاں

بال تھے بکھرے ہوئے اور ہر نفس اُلجھا ہوا
یورشِ بیداد سے چہرہ بھی تھا اُترا ہوا

فرش پر بکھری ہوئی تھیں یوں شکستہ چوڑیاں
تیرتی ہوں جس طرح پانی میں نازک مچھلیاں

آنکھ میں آنسو جگر میں درد ہونٹوں پر فغاں
بن گئی تھی حُسن کی تصویرِ غم کی داستاں

ہائے جس کی طرزِ گریہ بھی ترنم ریز ہو
جسم جس کا خلد ہو اور زلف عنبر بیز ہو

جس کا بھولا پن بھی جادو ہو خطائیں بھی حسیں
ناز جس کا خوبصورت ہو جفائیں بھی حسیں

جو محبت کے بغیر اک لمحہ رہ سکتی نہ ہو،
جو نگاہِ قہر کی مضراب سہ سکتی نہ ہو

وقف تھیں اس کے لئے شام و سحر بدبختیاں
اک شرابی شوہرِ آوارہ خو کی سختیاں

"ہائے امّاں مار ڈالا" کی صدائے دلخراش
کر رہی تھیں سننے والوں کا کلیجہ پاش پاش

جی میں آیا شوہرِ بدخو کی گردن توڑ دوں
دست و پا بیکار کر دوں اور آنکھیں پھوڑ دوں

یہ خیال آیا ہی تھا، ہاتھ اُٹھ گیا بے اختیار
گر پڑا تیورا کے سر کے بل زمیں پر بادہ خوار

بد دعا دیتی ہوئی مجھ کو اُٹھی وہ باوفا
اور شوہر کو کنارِ نازنیں میں لے لیا

اپنے آنچل کی ہوا سے عطر برسانے لگی
شوہرِ آوارہ سر کو ہوش میں لانے لگی

اپنی اس حرکت سے میں شرمندہ ہو کر رہ گیا
جلوۂ عفت سے دل تابندہ ہو کر رہ گیا

تیرھویں صدی ہجری کا بیہقی اعظم

حضرت مفتی اعظم قاضی ثناء اللہ پانی پتی

از الحاج مولانا عبد القیوم ندوی

آج سے تقریباً دو صدی پہلے جبکہ مسلمانوں کا ستارۂ عروج چراغ سحری کی طرح جھلملا رہا تھا سرزمین پانی پت سے علم و عمل اور حق و معرفت کا وہ آفتاب اپنی پوری گھرباریوں اور ضیا پاشیوں کے ساتھ بلند ہوا جس نے وہ نقش عمل اور نمونۂ علم پیش کیا جو رہتی دنیا تک صلحا و عارفین اور علما و کاملین کے دلوں میں گھر کئے ہوئے رہے گا۔ اور جس کی چمکیلی روشنی اپنوں کے علاوہ غیروں کو بھی روشن اور تابناک بنائے رکھیگی۔ یہی وجہ تھی کہ قدوۃ المحدثین و زبدۃ المفسرین حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی جو خاندان ولی اللہی کے روشن چراغ تھے آپ کو بیہقی وقت کے معزز لقب سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ امام بیہقی ایک زبردست امام اور جلیل القدر محدث گزرے ہیں جن کی تالیفات سے آج کوئی بڑا کتب خانہ خالی نہیں اور جن کی سند آج بھی اکثر عربی درسگاہوں میں داخل ہے آپ کیلئے اور آپ کے زبردست علم کیلئے یہ عظیم الشان سند تھی۔ عمل اور معرفت کی یہ حالت تھی کہ مشہور صوفی اور اللہ کے سچے دوست حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ جو آپ کے پیر و مرشد تھے آپ کو علم الہدیٰ یعنی ہدایت کا نشان فرمایا کرتے تھے۔ یہ آپ کے عمل صالح اور معرفت حقہ کی سب سے بڑی سند تھی۔

حسبی و نسبی فضیلت:۔ آپ نسباً عثمانی مذہباً حنفی اور مشرباً مجددی تھے اور ان خوش نصیب بزرگوں سے تھے جن کے آبا و اجداد علما و فقہا تھے اور ہمیشہ علم و عمل کی مسندوں کو رونق بخشتے تھے چنانچہ آپ خود اپنے وصیت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ "درخاندان فقیر ہمیشہ علما رشدہ آمدہ اند کہ در ہر عصر ممتاز بودند از فرزندان فقیر احمد اللہ ایں دولت رسانیدہ بود خدایش بیامرزد رحلت کرد.... " (صفحہ ۱۹۹ مطبوعہ مجیدی کانپور) ترجمہ "فقیر کے خاندان میں ہمیشہ علما ہوتے آئے ہیں جو ہر زمانہ میں ممتاز رہے ہیں۔ میرے لڑکوں میں بھی احمد اللہ اس دولت کو پہنچا تھا خدا اس کو بخشے رحلت کر گیا۔" جس طرح علم و معرفت آپ ہی کے گھر کے تھے افتا و قضا جیسے جلیل القدر اور عظیم الشان مناصب بھی کئی پشتوں سے آپ کے خاندان میں تھے لیکن آپ کو اس عہدے سے کچھ زیادہ رغبت نہ تھی بلکہ خدا کی اور آزمائشوں کی طرح اس کو بھی اپنے لئے اور اپنے بزرگوں کے لئے ابتلا و آزمائش خیال فرماتے تھے اور ہمیشہ اس سے بچنے کی ہدایت فرماتے تھے چنانچہ اپنے اسی وصیت نامے میں جہاں اور بہت سی چیزوں کی وصیت کی ہے وہاں اس چیز سے بچنے کی بھی وصیت فرمائی ہے تحریر فرماتے ہیں۔ "فقیر و برادر فقیر و پدر فقیر و جد فقیر بخدمت قضا مبتلا شدند"

آپ ابتدا ہی سے اس قدر ذہین و عالی دماغ تھے کہ سات سال کی عمر میں پورے قرآن حکیم کے حافظ ہو گئے تھے اور سولہ برس میں تمام علوم عقلیہ و نقلیہ مروجہ و غیر مروجہ سے فراغت پالی تھی (تذکرہ مصنف ملا بد منہ صفحہ ۱۲۶) سولہ سال کی عمر میں آپ نے نہ صرف فراغت اور فضیلت ہی حاصل کر لی تھی بلکہ اس تھوڑی سی عمر میں ساڑھے تین سو سے اوپر علاوہ کتب درسیہ کے عربی اور فارسی کی بہترین اور چوٹی کی کتابیں بالاستیعاب نظر سے گزر چکی تھیں۔

منصب قضا اور مسند علم:۔ یہ عجیب بات تھی کہ جس قدر آپ اپنے آبائی منصب قضا سے دور بھاگتے تھے اتنے ہی قضا و قدر کے کارکن آپ کو اس سے قریب سے قریب تر کرنا چاہتے ابھی آپ کچھ زیادہ عمر کے نہ تھے کہ آپ نے اس وقت کے بڑے ولی اللہ اور مشہور سالک طریقت حضرت محمد عابد سامی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ ارادت میں آ گئے اور کسب کمال باطنی و فیوض روحانی کی تحصیل کچھ اس سرعت اور عجلت سے فرمائی کہ خود صاحب سلوک اکثر عش عش کرنے لگتے اور تعجب فرماتے۔ آپ کو اپنے مرشد روحانی سے اس قدر شغف تھا کہ کسی طرح ان کا آستانہ چھوڑنے کو جی نہ چاہتا تھا، لیکن قضا کے آگے کس کا زور چلتا ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ان کا وصال ہو گیا اور اب آپ کو پھر ایک سچے دینی و دنیاوی ہادی طریقت کی سچی تلاش تڑپانے لگی۔ آپ اسی فکر و تفکر میں تھے کہ حضرت محمد عابد شاہ رحمۃ اللہ کی روح خواب میں ظاہر ہوئی اور ایسا معلوم ہوتا ہوا نظر آیا کہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں قدس سرہٗ کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ دے رہے ہیں اور فرماتے ہیں ؎ سپردم بتو مایہ خویش را   تو دانی حساب کم و بیش را، اور یہ کہہ کر اور ان کے پاس آپ کو جانے کی تاکید کر کے آپ کی روح غائب ہو جاتی ہے آنکھ کھلتی ہے اور ہونے والے مرشد کی ملاقات کے لئے دل بیقرار ہے ادھر حضرت مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ صبح کو اپنے مریدوں سے فرماتے ہیں کہ آج ایک ایسا شخص میرے پاس آنے والا ہے جس کو اللہ اور اس کے نیک بندے دوست رکھتے ہیں اور علم و ہدایت کا نشان ہے۔" چنانچہ آپ

ملاحظات

ادارہ

عالمگیر کا سالانہ نمبر سنہ ۱۹۴۰ء عالمگیر کے دور جدید کا پہلا سالنامہ تھا اور ہم نے اسے نہایت محنت و کاوش اور احتیاط سے مرتب کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ قارئین نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور مبصرین و ناقدین نے اس کا پرجوش خیر مقدم کر کے ہمارا حوصلہ بڑھایا یوں تو سالنامہ کی تعریف میں صدہا خطوط موصول ہوئے ہیں لیکن دو ایک کا خلاصہ ملاحظہ فرمایئے۔

الحاج مولانا عبدالقیوم ندوی تحریر فرماتے ہیں "عالمگیر سالنامہ نے اہل علم و ادب اور فصاحت و بلاغت کا وہ معیار قائم کر دیا ہے کہ حقیقتاً اگر اس کی اتباع کی جائے تو ہندوستان کا ادبی معیار اس قدر بلند ہو سکتا ہے جن کی تقلید وہ قومیں اور ممالک بھی کرنے لگیں جن کو اپنے ادب پر بڑا ناز ہے"۔

محمد یونس صاحب آحمر کلکتہ سے رقمطراز ہیں ——" سالنامہ کے ایک ایک مضمون کو بغور پڑھا۔ ہر مضمون اپنے اندر اعلیٰ درس و تدریس کا حکم رکھتا ہے بعض افسانے جدت و ندرت کا بہترین نمونہ ہیں۔ غرض سالنامہ کا ہر ورق قیمتی پایا ——"

ہم انشاءاللہ آئندہ بھی عالمگیر کا معیار بلند سے بلند رکھنے کی کوشش کرینگے ہمیں امید ہے کہ قلمی معاونین اس باب میں ہم سے تعاون کرینگے اور اپنے بہترین جواہر افکار ہمیں ارسال فرما کر ممنون کرینگے۔

زیر نظر شمارہ کے مضامین نظم و نثر بہت سی خوبیوں کے حامل ہیں۔ "حقائق و معارف" اس مرتبہ حضرت مولانا ظفر علی خاں نے تحریر فرمائے ہیں۔ آپ نے "دولت کا دشمن" کے عنوان سے علم و حکمت کے جو جواہر بکھیرے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہیں۔ جناب ابراہیم صاحب زبیری کا افسانہ "سحر نغمہ" بہت کیف انگیز ہے اس میں مذہب و محبت کی کشمکش کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ زبیری صاحب کو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے اس افسانہ پر پہلا انعام ملا۔ "زیب النسا اور عاقل خاں" کے فرضی معاشقے کا افسانہ بعض کندۂ ناتراش جاہلوں اور تاریخ ناآشنا ناول نویسوں نے اپنے فتور دماغ اور فساد ذہنیت کے باعث تراش رکھا ہے، ابو المکارم محمد نعیم اللہ صاحب نے اس طومار خرافات پر حقیقت کی ہلکی سی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے تاہم یہ مقالہ ایک نیم تاریخی غلط فہمی کا ازالہ کرتا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مسئلہ پر شرح و بسط سے بحث کی جائے۔ اگر فرصت ہوئی تو انشاءاللہ ہم بھی کبھی اس موضوع پر تفصیلی مقالہ سپرد قلم کرینگے۔ جناب جعفر فاطمی شاہ آبادی نے اپنے افسانہ میں مرد کی نفسیات کا نہایت خوبی سے تجزیہ کیا ہے اور بتلایا ہے کہ حالات کے ساتھ ساتھ مرد کی محبت میں کیا تغیر آجاتا ہے مولانا آگھپنوی نے قدیم آریائی موسیقی پر ایک تحقیقی اور معلومات افزا مضمون لکھا ہے جس میں آریاؤں کی قدیم مذہبی موسیقی۔ عناصر پرستی اور شوق عبودیت کی ترانہ ریز کارفرمائیوں کا جائزہ لیا ہے۔ مس جمیلہ عبداللہ مغل عالمگیر میں پہلی مرتبہ شامل ہو رہی ہیں اور ان کی طرز سعی سے معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل قریب میں اچھے افسانہ نویسوں کی صف میں جگہ حاصل کر لینگی۔ اس اشاعت میں آپ کا ایک افسانہ "سوز ناتمام" شایع ہو رہا ہے جو امید ہے کہ شائقین بہت پسند کریں گے۔

مرزا دبیر ان مرثیہ گو شاعروں میں قائمانہ حیثیت رکھتے ہیں جنہوں نے اس فن کو ثریٰ سے اٹھا کر ثریا تک پہنچا دیا لیکن جب سے علامہ شبلی نے دبیر کو انیس کے مقابلہ میں ہیچمدان ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے کسی جلیل القدر ناقد نے اس یکتائے روزگار شاعر کی طرف توجہ نہیں کی۔ مولوی مرزا حسین کا یہ مقالہ اس ناروا غفلت کا کسی حد تک ازالہ کرتا ہے۔ جناب پاشا جالندھری پنجاب کے ذہین و فطین افسانہ نویسوں اور مترجمین میں سے ہیں آپ نے پھولا ممیے کے قلم سے ایک دلچسپ ڈراما لکھا ہے جس میں قدیم و جدید تہذیب و معاشرت کی آویزش کا نہایت عمدگی سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ مولانا قاضی ثناءاللہ پانی پتی تیرھویں صدی کے وہ جلیل القدر عالم دین تھے جن کے تبحر علمی نے ملا علی قاری کے بہتم کے کارناموں کو زندہ کر دیا۔ مولانا عبدالقیوم ندوی محقق تبرکی نے اپنے مضمون میں اس نابغۂ روزگار ہستی کو ایک بار پھر دنیا کے تعارف میں لانے کی کوشش کی ہے۔ جناب اعجاز زیدپوری جہاں ایک بلند مرتبہ شاعر ہیں وہاں ایک بہت اچھے افسانہ نویس بھی ہیں۔ آپ نے "حیلہ جو" میں میاں بیوی کی دلچسپ اداکاری کے لطف کو نکھار کر غیر شعوری محبت کو خوب نمایاں کیا ہے۔

منظومات کے متعلق کچھ لکھنا دوپہر کے سورج کو شمع دکھانے کے مرادف ہے۔ جس محفل میں سید محمد عسکری طباطبائی۔ باسط بھوپالی، امین حزیں، راز چاندپوری، مخمور جالندھری اور آرزو سہارنپوری شامل ہوں اس کی صہبائے کیف کی کیفیات کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے۔

(ادارہ)

پہنچ گئے اور اب مرزا مظہر جانجاناں کے خدام میں داخل تھے۔ اس اثناء میں امام وقت حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ سے بھی استفادہ فرماتے رہے یہاں تک کہ بیہقی وقت کا معزز لقب حاصل فرمایا۔ اساتذہ ظاہری و باطنی کی برکات اور اللہ بزرگ و برتر کی توفیق و مدد نے وہ کرشمہ دکھایا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کا چرچا دور دور ہونے لگا یہاں تک کہ بادشاہ وقت کے کانوں تک آپ کا شہرہ پہنچا اور اس نے ان کا انتخاب عہدۂ قضا کے لئے کیا آپ کسی طرح راضی نہ تھے مگر بمجبوری اور اطاعت حاکم کے خیال سے با دل ناخواستہ قبول فرمایا اور اس فریضہ کی ادائی میں جو کارہائے نمایاں کئے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

دو زبردست علمی و عملی خدمات: آپ ان بزرگ قضاۃ میں سے تھے جنہوں نے باوجود منصب قضا پر بیٹھنے کے علم و عرفان اور درس و تعلیم کے دامن کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ آپ کے متعلق مشہور ہے کہ دن تو حکومت کے کاروبار اور مقدمات کے فیصلوں میں گزرتا مگر راتیں علوم کی اشاعت اور فیوض و برکات ظاہری و باطنی اور تعلیم و تعلم میں صرف فرماتے چنانچہ "تذکرہ" کی اس عبارت سے اسی طرف اشارہ ہے: "در عمر طویل در تحصیل علوم و افاضہ فیض ظاہر و باطن و فصل خصومات و افتا سوالات مصروف بودند۔۔۔" (صفحہ ۱۹۷) آپ کی مشہور تصانیف اسی زمانہ کی ہیں یوں تو آپ کی مستقل تصانیف کی تعداد چالیس سے بھی اونچی ہے مگر خاص خاص کا نام حسب ذیل ہے

تفسیر مظہری ۔ یہ زبردست اور ضخیم تفسیر کلام حکیم ہے اور سات جلدوں میں۔ تفسیر کیا ہے علم و معرفت کے انبار ہیں جو کاغذ کے صفحات پر بکھیرے گئے ہیں اس میں ہر قسم کے علوم و فنون سے کامل بحث کی گئی ہے لیکن تصوف کلام اور فقہ کے مسائل پر خاص زور دیا گیا ہے اس کا نام اپنے ہادی و مرشد حضرت مرزا مظہر جانجاناں رح کے نام مبارک پر رکھا ہے اس سے اپنے پیر کی نہایت درجہ الفت و محبت کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

السیف المسلول ۔ علم کلام میں ایک نادر اور جامع کتاب ہے جو متداول اور مقبول ہے۔

ارشاد الطالبین ۔ تصوف میں ہے اور اس علم شریف کے گوہر بے بہا اس میں لٹائے گئے ہیں۔

مالا بد منہ ۔ فارسی زبان میں فقہ حنفی کا وہ جامع اور مبسوط رسالہ ہے جس کی تعریف میں زمانہ رطب اللسان ہے اس کے ایک سے زائد حاشئے ہیں جس میں مفتی عنایت اللہ صاحب مرحوم اور حضرت مولانا محب اللہ صاحب پانی پتی کے حاشئے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ سب سے پہلے یہ کتاب سنہ ۱۲۸۰ھ میں مطبع نظامی میں چھپی پھر اس وقت سے لیکر اب تک متعدد بار چھپ چکی ہے

بہت سی درسگاہوں میں داخل نصاب ہے اس میں مصنف کی جو وصیت ہے جس کو اسّی سال کی عمر میں تحریر فرمایا ہے دیدۂ عبرت کے لئے سرمۂ بصیرت ہے تذکرۃ الموتیٰ والقبور ہے۔ تذکرۃ المعاد، حقوق الاسلام، شہاب ثاقب، حرمت واباحت سرود اور حرمت متعہ وغیرہ بہترین کتابیں ہیں مگر بہ نظر اختصار ان پر تنقیدی نظر نہ ڈال سکا۔

وفات اور عبادت و ریاضت ۔ جس طرح مادی آفتاب اپنا دور پورا کرکے اور سارے عالم کو جگمگا کر اپنے مقرر وقت پر روپوش ہو جاتا ہے اسی طرح علم و معرفت عبادت و ریاضت کا یہ آفتاب اپنی نورانی شعاعیں پھیلا کر یکم رجب ۱۲۹۵ھ کو عالم مادی سے عالم روحانی میں روپوش ہو گیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بیشمار تاریخیں اور قطعات کہے گئے جن میں آپ کے ہم وطن ہم مشرب حضرت مولانا محب اللہ کی تاریخ اب تک ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے۔ فہم کرہون فی جنّت النعیم۔ پس وہ معزز ہیں نعمت والی جنت میں آپ انتہائی درجہ کے عابد مرتاض تھے اور یہ تو بارہا گزرا ہے کہ عشا کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی اور اتباع سنت نبوی میں پاؤں سوج سوج گئے۔ تقویٰ و طہارت کا یہ عالم کہ مصنف تذکرہ لکھتے ہیں "زبدۂ علماء پرہیزگار و عمدۂ اتقیاء روزگار بود ندؒ"

آپ کے اخلاق و معاشرت کا یہ حال ہے جس کو آپ نے اپنی وصیت میں فرمایا ہے ؎

آسائش دو گیتی تفسیر این دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

تجلیات!

گلبانگ حیات کا ایک ورق

از حضرت امین حزیں سیالکوٹی

۱

غریق رحمت نظارہ ہے نگاہ مری — لبوں پہ بن کے تبسم رُکی ہے آہ مری
اگرچہ نغمہ خاموش ہے سکوت آموز — مگر کہاں ہے مرے لب میں واہ واہ مری

۲

پڑی ہے جب سے مرے حُسن پر نگاہ مری — تبسم گل تر بن گئی ہے آہ مری
زبان اہل چمن میں یہی ہے بوئے لطیف — نکل رہی ہے جو سینے سے واہ واہ مری

۳

وفور شوق کا آئینہ ہے نگاہ مری — اور اس کا جوہر بیتاب واہ واہ مری
نظر نواز ہے جس کی تلاش ہے مجھکو — بنی ہے داد جبھی آہ داد خواہ مری

۴

نہ واہ واہ مری اور نہ آہ آہ مری — وہ میرا انجم سحر یہ شب سیاہ مری
جمال مہر محبت نے شاد کام کیا — مثال غنچہ کھلی بیتاب آمیں نگاہ مری

حیلہ جُو

میاں بیوی کی دلچسپ اداکاری

(از ڈاکٹر وکیل احمد صاحب حافظ غازیپوری)

منصور اپنے حلقہ کے رائے دینے والوں کو انتخاب اور اس کے فرائض سمجھا بجھا کر اپنے گھر کی طرف جا رہا ہے۔ دل میں کامیابی کے تصور کی خوشیاں ہیں، دماغ میں احباب و ارکان کی مبارک بادیوں کی مسرت بھری لہریں، خیال میں جمہور کی ہم نوائی کا تشکر ہے اور ماحول میں گونہ بے پروائی جو عموماً لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد قدرتی طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔

ایسے میں اگر کوئی اسے بغور دیکھے تو یہی قیاس کرے گا کہ دنیا میں اس سے زیادہ مطمئن اور بے فکر کوئی اور نہ ہوگا۔ اور یہ امر واقعہ بھی تھا کہ اس کو اپنی کامیابی میں کوئی شبہ نہ تھا۔ اسی لئے اس نے اپنے سامنے سے فکر و اضطراب کے تمام حجابات ہٹا دئے تھے اور چونکہ آج اسے ایک محفل رقص میں شریک ہونا ہے۔ اس لئے وہ کسی قدر تیز قدمی سے گھر کی طرف جا رہا ہے تاکہ شرکت سے پہلے نپولین کی طرح ایک جھپکی لے لے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ جنگ میں شرکت سے پہلے ایک نیند سو لیا کرتا تھا، اور یہ "محفل رقص" میں شرکت سے پہلے سو لینا چاہتا ہے:

دورہ ختم کر کے، جیسے ہی وہ کوٹھی میں داخل ہوا۔ اس کا پرانا ملازم رحمت اس کے پیچھے پیچھے اس انداز سے ہو لیا کہ موقع پا کر کچھ کہنا چاہتا ہے۔ منصور نے اس کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا:۔

"کیوں رحمت؟ کیا بات ہے؟ کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

رحمت: "اگر آپ گستاخی تصور نہ فرمائیں تو . . . . "

منصور: "معذرت کی ضرورت نہیں، کہو کیا کہتے ہو، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے"

رحمت: "کیا آپ کو یاد ہے کہ آج کون سا دن ہے؟"

منصور: "(متردد ہو کر) نہیں، آخر اس سے تمہارا مطلب؟"

رحمت: "حضور! آج آپ کی سالگرہ ہے"

منصور: "(جیسے کچھ یاد کر کے) ہاں یاد آیا۔ لیکن . . . . "

رحمت: آج کے دن گھر بھر میں پھولوں کی بہار ہوتی تھی۔ اور مہینوں کے

منصور: ٹھیک ہے، تم سچ کہتے ہو، ایسا ہی ہوتا تھا، مگر رحمت وہ دن گزر گئے"!

رحمت: "(ایک میز پر سے گلپوش ہٹاتے ہوئے) حضور! یہ گلدستہ حاضر ہے"

منصور: رحمت! تم نے پرانی اور بھولی ہوئی باتیں یاد کرا دیں میں تمہاری وفاشعاری کی پوری پوری قدر کرتا ہوں (دل کے غم اور جذبات کو دبا کر) اچھا، خدا حافظ۔ میں سونے کے لئے جا رہا ہوں، تم مجھے ٹھیک آٹھ بجے جگا دینا"

رحمت: "نہیں حضور!"

منصور: "آخر یہ کیوں؟"

رحمت: "وہ اس لئے کہ آج میری عدم موجودگی میں، جب برکت یہاں آیا تھا تو ایک خاتون آپ سے ملنے کے لئے آئی تھیں۔ لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ آپ موجود نہیں ہیں تو وہ واپس جاتے وقت کہہ گئیں کہ اپنے آقا سے کہہ دینا میرا سات بجے شام تک ضرور انتظار کریں۔ مجھے بہت ضروری مسئلہ پر تبادلۂ خیالات کرنا ہے"

منصور: "مگر اس خاتون کا نام"

رحمت: انھوں نے اس کے ظاہر کرنے سے انکار کر دیا"

منصور: (حیرت کے ساتھ) اچھا! تو برکت نے کچھ یہ بتایا کہ اس کا حلیہ کیا تھا؟"

رحمت: "جی ہاں، وہ نوعمر، بلند بالا اور ملیح خاتون تھی، سر سے پاؤں تک لباس فاخرہ سے ملبوس"

منصور: "خوب! اس حلیہ سے تو میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا خیر! تو کیا میں تمہاری رائے میں ایک نامعلوم خاتون کی خاطر اپنی نیند ترک کر دوں"

رحمت: "حضور! (گھڑی کی طرف دیکھ کر) سات تو بجا ہی چاہتے ہیں۔ آپ لیٹنے بھی نہ پائیں گے کہ وہ آ جائیں گی۔ اور پھر آپ آٹھ بجے اٹھنا بھی چاہتے ہیں"

منصور" اچھا میرا اخبار تو دینا۔ جب تک وہ آئیں۔ اسی کو دیکھوں"

"ملیح و بلند بالا" کون ہو سکتا ہے شہزادی شگوفہ تو صبیح و رعنا ہے۔ اتنی اور ایسی تبدیلی کیونکر ممکن ہے۔ اور اگر وہ نہیں ہے تو پھر دوسرا کون آنے والا ہے۔ ریحانہ ہرگز نہیں، وہ اب کہاں؟ کبھی شریک حیات تھی۔ اب تو اجنبی کی حیثیت بھی دور ہے، اللہ اللہ، وہ دن!

جب ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر سانس نہ لے سکتے تھے، مگر دا رے اختلاف طبع، ذرا سی غلط فہمی اتنی بڑھی کہ میری مسرت۔ مجھ سے کوسوں دور۔ تو پھر اب کون ہو سکتا ہے؟ اسے دردِ دل تو ہی بتا، وہ مجھ سے دور ہو چکی ہے، لیکن تو اپنی تڑپ کے ساتھ ہنوز موجود ہے۔ دو سال گزر چکے، برابر اس امر کی کوشش کرتا رہتا ہوں کہ بھول جاؤں اور بھلا دوں، اسی لئے اپنی معاشرت کا رخ بھی تبدیل کر چکا ہوں، اب زندگی کی جگہ دنیا کی تمام رنگینیوں کا آرائیوں، رنگ رلیوں نے لے لی ہے، مگر تیری کسک نہیں جاتی، خیال آ ہی جاتا ہے۔ آہیں لب تک آ ہی جاتی ہیں۔ آنکھوں کی نمی سے آستین اکثر و بیشتر نم ہوتی ہی رہتی ہے"

منصور ابھی انہیں متضاد خیالات کا آئینہ بنا ہوا تھا کہ رحمت نے واپس آ کر کہا!

"حضور، یہ اخبار حاضر ہے"

منصور" (اخبار لیتے ہوئے) اور وہ خاتون؟"

رحمت " ملاقات کے کمرے میں

منصور" کیا تم انہیں جانتے پہچانتے ہو؟"

رحمت۔" نہ... نہیں حضور!"

منصور اٹھا اور ملاقات کے کمرے کا پردہ ہٹا کر داخل ہوا، تو اس کی نظر ایک ایسے مجسمہ پر پڑی، جس کی پیٹھ اس کی طرف تھی، تاہم اسے اندازہ کرنے کا موقع مل گیا کہ وہ واقعی ملیح و بلند بالا خاتون تھی اور نہایت نفیس ریشمی لباس میں ملبوس۔ تقاضائے وقت تو یہ تھا کہ کچھ دیر اور اس کی بے خبری سے لطف اندوز ہوتا مگر تہذیب مانع آئی اور وہ یوں مخاطب کرنے پر مجبور سا ہو گیا۔

"خاتون عالی!"

اپنے کو مخاطب پا کر وہ منصور کی طرف مڑی، نگاہیں چار ہوتے ہی دونوں نے اپنی اپنی جگہ پر محسوس کیا کہ بجلیاں دوڑ گئیں مگر اپنے اپنے جذبات جو چہروں سے ظاہر ہو رہے تھے ہی کو تھے چھپانے کی غرض سے دونوں نے جھک جھک کر ایک دوسرے کو تعظیم دی اور نووارد خاتون نے معذرت خواہ ہوتے ہوئے کہا۔

خاتون۔ میں نے آپ کی لطیف شام خراب تو نہیں کی؟ مخل تو ضرور ہوئی"!

منصور" اوقات ضرورت کے لحاظ سے صرف ہوں تو خراب نہیں ہوا کرتے، میں ہمہ تن آپ کی خدمت کو حاضر ہوں"!

خاتون " غور کر لیجئے کہ جو کچھ آپ فرما رہے ہیں محض رسمی تو نہیں، میں آپ کی خدمات حقیقی طور پر چاہتی ہوں'

منصور" (متبسم ہو کر) میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ سوچ کر کہہ رہا ہوں، فرمائیے تو سہی، کچھ حکم تو دیجئے!!"

منصور کے اس سوال پر خاتون جس کا نام ریحانہ تھا، کچھ دشوش سی نظر آنے لگی، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن، بات حلق میں پھنس رہی تھی منصور انتظار جواب کے ساتھ یہ بھی محسوس کرنے لگا کہ وہ ہنوز اتنی ہی خوب صورت ہے، جتنی اس وقت جب کہ اس نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا، بلکہ اس وقت اس کے حسن میں ایک خامی سی تھی، جسے گدرا ہٹ نے اب مکمل کر دیا ہے۔ سرو پا موزوں تر ہو گیا ہے۔ رخساروں کی ہلکی سرخی، آنکھوں کے گلابی ڈورے پہلے سے زیادہ شوخی کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ نگاہوں کی خردمندیاں بڑھی ہوئی ہیں۔ اور بشرے سے شرارت کی جگہ متانت ٹپکتی ہے۔ تاہم چہرے سے یہ بھی ٹپک رہا تھا کہ وہ کسی اضطراب انگیز خیال کا شکار ہو رہی ہے"

منصور تخیل کی اسی منزل تک پہنچنے پایا تھا کہ ریحانہ نے کلام کے سلسلہ کو یوں ملا دیا۔

ریحانہ " کیا آپ نے کبھی کسی تفریحی اداکاری میں حصہ لیا ہے؟"

منصور " میں تو ہنوز مصروف ہوں۔ مگر وہ ختم ہی ہونے میں نہیں آتی؟"

ریحانہ " تو میرا تذبذب فضول تھا، خیر! تو میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ اب اسے پھر سے شروع کریں۔ مگر آپ کے حصہ کا کام ذرا مشکل ہوگا۔ اور کامیابی کی حد تک اسے سنبھال لے جانا کچھ آسان نہ ہوگا"

منصور: یہ تو سب کچھ اداکاروں کی مشق اور دیکھنے والوں کی توجہ اور دلچسپی پر منحصر ہے۔"

ریحانہ: "اور میں آپ کی شریک کار رہوں گی۔"

منصور: "میں آپ کی ذہانت کا پہلے سے قائل ہوں۔"

ریحانہ: "یعنی اس سے جو اداکاری سے متعلق ہے؟"

منصور: "نہیں، مکالمہ اور معاملہ کے لحاظ سے! کیا وہ کوئی راز ہے، جس کو تمثیلی ضرورت پیش آگئی ہے؟"

ریحانہ: "ہاں، کچھ یوں ہی ہے مگر نتیجہ کی خبر نہیں، اچھا یہ تو فرمائیے آپ والد صاحب کو اب تک خطوط لکھتے جاتے ہیں"

منصور: "آخر کیوں نہ لکھتا، کیا وعدہ نہیں کر چکا ہوں۔ مگر پچھلے تین ہفتوں سے انھوں نے میرے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔"

ریحانہ: "میرے پاس کل ایک خط آیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کل دس بجے یہاں آرہے ہیں۔"

منصور: "(حیرت کے ساتھ)۔ کل؟"

ریحانہ: "ہاں آنے والا کل"

منصور: "آپ کے والد، حضرت جیلانی جو کبھی اپنی جگہ سے ٹلتے ہی نہ تھے!"

ریحانہ: "یہ سفر مجبوری کا سفر ہے۔ لاہور کی واپسی ہے۔ رستہ میں ایک روز کا سفر ترک کر کے ......"

منصور: "اپنی چہیتی لڑکی ریحانہ کو دیکھنے آرہے ہیں۔"

ریحانہ: "اور اپنے چہیتے داماد کو بھی!"

منصور: "تو پھر؟"

ریحانہ: "(ایک مخملی تپائی کو اپنی نازک انگلیوں سے کریدتے ہوئے) تو پھر یہی کہ ہماری حالت بہت خوش گوار ہے"!

منصور: "خوش گوار! اس کو صرف تم خوش گوار کہہ سکتی ہو!!"

ریحانہ: "اس بحث سے تو کوئی فائدہ ہو نہیں سکتا۔ کوئی صورت نکالنی چاہیئے۔"

منصور: "مجھے تو کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

ریحانہ: "بس! ایک ذرا سے خانگی معاملہ کو سلجھانے میں اتنا عجز؟ آپ کو تو دعوائے سیاست دانی ہے، فرمائیے تو آپ کے موجودہ انہماک سے فائدہ۔ تحریر و تقریر میں سیاسی الفاظ و محاورات کے استعمال کا نتیجہ۔"

منصور: "سبحان اللہ! میری سیاست دانی، اور آپ کی مفروضہ اداکاری، دونوں کو ایک دوسرے سے کیا نسبت ناپیں ہمہ، اگر آپ کی گفتگو کا یہی پہلو رہا تو میرے رہے سہے حواس کی خیر نہیں ہے!"

ریحانہ: "آپ کی سیاست دانی اور میری مفروضہ اداکاری میں نسبت نہ سہی لیکن میں یہ ضرور جانتی ہوں کہ وہ حسین ہاتھ ہے۔ اور یہ قسمت آزمائی"

منصور: "ممکن ہے کہ تمھارا خیال صحیح ہو مگر اس پر کاربند ہونے کے بعد اس کا دلچسپ نہ ہوتا۔ اداکار و تماشائیں۔ دونوں کے لئے شرمناک ہے!"

ریحانہ: "مجھے تدابیر انسانی کی ناکامی کا اتنا تجربہ نہیں ہے جس پر حیرت ضروری ہو، عزت نفس اور خودداری کے سوال کے سامنے ہر ممکن تجویز کو عملی جامہ پہنانا ہی پامردی کی دلیل ہے!"

منصور: "اس کے تو یہ معنی ہیں کہ آپ کے پیش نظر کوئی تجویز کوئی پروگرام ضرور ہے!"

ریحانہ: "(بے پروائی کے ساتھ) کیوں نہ ہوتی! میں یہاں جذبۂ انکسار لے کر نہیں آئی ہوں!"

منصور: "مجھے یقین تھا کہ ضرور ہوگی، لیکن میں بھی تو سنوں"

ریحانہ: "مگر تجویز سے پہلے اس امر کی توثیق چاہتی ہوں کہ آپ محض رسمی طور پر میری ہمنوائی نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ مجھے یقین دلانا چاہیئے کہ آپ کا حسن اخلاق، سرگرمی سے خالی نہ ہوگا؟"

منصور: "کاش یہ خیال ہمیشہ رہا ہوتا۔ اور ......"

ریحانہ: "سنئے سنئے، میں کسی طرح پسند نہیں کر سکتی کہ والد صاحب کو حقیقت کی خبر ہو!"

منصور: "کم بخت حقیقت!"

ریحانہ: "ہر اسم کے ساتھ صفت کا استعمال اچھا نہیں ہوا کرتا بہر نوع آپ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ والد صاحب کو اگر ہماری بدمزگی کی خبر ہو گئی تو اس بڑھاپے میں اور اس صورت حال کے ہوتے ہوئے ان کو بہت صدمہ ہوگا۔ اس لئے میں نہیں پسند کرتی کہ بچوں کی تمام غلطیاں اور بے کیفیاں ماں باپ پہ ظاہر ہوں۔ آج تک آپ نے میری ہم نوائی کی۔ جس کا بہت بہت شکریہ، والد صاحب کو کچھ نہ معلوم ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ لاہور میں کوئی اس بات کو نہیں

جاتا تھا کہ ہم دونوں میں کوئی بدمزگی یا ناچاقی ہے۔ مگر اب ہماری مصنوعی پاکیزگی، فریب اور مکاری کا راز کھل جانے کا اندیشہ ہے۔ خدا معلوم اس کا کیا نتیجہ نکلے۔ اسی واسطے میں آپ کے پاس آئی ہوں کہ جس طرح سے بھی ممکن ہو اس کو پوشیدہ رکھا جائے۔ ایک دن کی تو بات ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ بول چال، اور طور طریقہ سے ہماری منافرت ہماری علٰحدگی چھپ جائے؟"

منصور:۔ "تم تو اس وقت تقریر کر رہی ہو۔ تمہارے لفظ لفظ میں اثر، جوش اور استقلال ہے، کیا میں تمہاری اس آمادگی کو حقیقت تصور کر لوں؟"

ریحانہ:۔ (منصور کی تعریض کو بالکل نظر انداز کر کے) "مگر اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ ہے کہ جو کچھ بھی ہوگا یا کیا جائے گا، اس کو وقتی اور تفریحی اداکاری سے زیادہ حیثیت نہ مل سکے گی۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ہم ایک ایسے کھیل میں حصہ لیں گے جس کی صورت خیراتی ہوگی۔ میرے خیال میں اس بناوٹ اور اس دکھاوے میں آپ کا کچھ زیادہ خرچ نہ ہوگا"!

منصور:۔ "میں تو پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مجھے بہرحال آپ کی خاطر منظور ہے۔ مگر کیا آپ کو یہ خطرہ محسوس نہیں ہوتا کہ ذرا سی چوک سے سارا کھیل بگڑ گیا تو ......"

ریحانہ:۔ "آخر بھول چوک ہوگی کیوں؟ اپنے نئے نوکروں کو ایک روز کی رخصت دے کر ان کے گھروں کو بھیج دیجئے اور رہ گیا رحمت۔ اسے میں سمجھا لوں گی"!

منصور:۔ "خیر یہ بھی ہو جائے گا۔ اگر احباب میں سے کوئی آ نکلا تو ......"

ریحانہ:۔ "کوئی آ جائے گا آ جائے۔ کہہ رحمت یہ بہانہ نہیں کر سکتا کہ موجود نہیں ہیں؟"

منصور:۔ "اچھا چلیئے، یہ بھی ہوا۔ مگر ہم کو اسٹیشن تک لوگ ساتھ دیکھ کر کیا کہیں گے؟"

ریحانہ:۔ "اوہ! ہم بند گاڑی میں جائیں گے، اور ایسے وقت سے کہ اُدھر گاڑی آئے اور ہم اسٹیشن پر ہوں۔ ایسے میں جو ہنگامہ ہوتا ہے۔ اس میں کوئی کسی کا زیادہ خیال نہیں کیا کرتا"!

منصور:۔ "اچھا یہ بھی ہو رہے گا۔ مگر تیسے میاں تو یہاں دن بھر قیام کریں گے، کیا ان کو صورت حال سے اندازہ نہ ہوگا کہ یہ مکان

کسی مجرد شخص کے رہنے کا ہے؟"

ریحانہ:۔ "یہ تبدیلی تو ابھی ہوئی جاتی ہے۔ میں اپنے کام کاج کی تپائی، سینے پرونے کے سامان، گانے بجانے کی چیزیں منگائے لیتی ہوں اور سب کو ان کے قرینے سے لگائے دیتی ہوں"۔

منصور:۔ "لیکن کمروں ......"

ریحانہ:۔ "(بات کاٹ کر) شاید کمروں میں آپ نے مزید تبدیلیاں کر دی ہیں"؟

منصور:۔ "نہیں ہر چیز اپنی پہلی صورت میں ہے جس طرح تم ان کو چھوڑ گئی تھیں"۔

ریحانہ:۔ "آخر یہ کیوں؟ محض تقاضائے تخیل سے"؟

منصور:۔ "نہیں، بلکہ بہ تقاضائے عزت و ......"

ریحانہ:۔ "اس غائبانہ عنایت کا شکریہ۔ اخیر!! یہ تو سب کچھ ہوا اب فرمائیے کچھ اور شکوک تو نہیں ہیں"؟

منصور:۔ "نہیں، کوئی نہیں، تاہم یہ خیال ضرور ہے کہ کیا ہم بڑے میاں کو فریب دے سکیں گے؟"

ریحانہ:۔ "مجھے تو یقین ہے کہ ہم کامیاب ہوں گے بشرطیکہ مثل خیالی زن و شوہر کے ہم ان تمام ناتجربہ کاریوں، بیوقوفیوں اور الھڑپنے کو جو شادی سے قبل اور اس کے بعد لمحات وصل میں سرزد ہوتے رہے اپنے اوپر طاری کر لیں"۔

منصور:۔ "آہ! میں تو ان سب کو کب کا بھول چکا! (استفسارانہ انداز سے) کیا تم کو (معاف کیجئے) کیا آپ کو ......"

ریحانہ:۔ "(دانستہ طور پر ٹالتے ہوئے) غالباً یہ میری خود غرضی ہوگی اگر آج کی طرح میں آپ کا وقت کل بھی مانگ لوں؟ آپ کو کوئی خاص کام تو نہیں ہے؟"

منصور:۔ "مجھے کوئی کام نہیں ہے اور ہوتا بھی تو اسے چھوڑ دیتا"!

ریحانہ:۔ "شکریہ اور مزید شکریہ، لیکن آج کی شام کو تو آپ قطعی آزاد ہیں۔ مجھے آپ کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی"!

منصور:۔ "میں نہیں سمجھا"!

ریحانہ:۔ "نہیں سمجھے تو اس کو یوں سمجھئے کہ میں یہیں ٹھیروں گی تاکہ تمام چیزوں کو قرینے سے کروں، ایسے میں آپ کا میرے ساتھ کام ہی کیا ہوگا۔ سوا اس کے کہ میں کام کاج میں لگی رہوں اور آپ بیٹھے دیکھا کریں، اس لئے کل دس بجے تک آپ

جہاں جہاں جاتے رہے ہوں جائیں اور جو کچھ کرتے رہے ہوں کریں؟"

منصور "میں ایک محفل رقص میں جا رہا تھا، لیکن ...."

ریحانہ "کس لئے؟ نہیں نہیں، جب تک آپ رہیں گے بات چیت ہوتی جائے گی، کچھ نہ کچھ کہنا سننا پڑے گا، اور اب سب کچھ طے ہو چکا ہے۔ مجھے کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں"

منصور "کچھ نہیں! یا کافی سے زیادہ؟ (نگاہیں ملا کر) اچھا اگر حکم ہو تو میں لباس تبدیل کر لوں؟"

ریحانہ نے جھک کر اپنی ایمار کا اظہار کر دیا۔ منصور، نہایت اطمینان سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ واقعات حاضرہ سے وہ بالکل متأثر نہ تھا۔ تاہم وہ مطمئن ہونے کی جگہ کچھ کھویا ہوا سا تھا۔ کپڑے تبدیل کئے محفل رقص میں پہنچا۔ مگر وہاں کی تمام لطف سامانیوں کے باوجود اس کی بددلی نہ گئی۔ شہزادی شگوفہ بھی جس کو اس سے بے حد دلچسپی تھی، باوجود اپنی تمام سحر کاریوں کے افسردگی نہ مٹا سکی۔ رقص جاری تھا۔ عطر و تبسم سرود و نغمہ، حسن اور اس کی نزاکتوں سے فضا مسرور تھی حسینوں کی سبک خرامیاں۔ ان کے ہلکے قہقہے۔ ان کی کیف آور لغزشیں، اور ان کی اضطراب انگیز ادائیں پیش نظر تھیں۔ مگر وہ خوش ہونے کی جگہ گھبرا رہا تھا بالآخر شگوفہ کی فضا بچا کر، اٹھ گیا اور سیدھے مکان پہنچا تو اندر داخل ہوتے ہی دیکھا کہ ہر چیز تبدیل ہو گئی ہے۔ موم بتیاں جل رہی ہیں۔ کپڑوں کی الماریاں کھلی ہوئی ہیں۔ پائیں باغ کی لطیف ہوا۔ گل شبو اور عروس نیل کی لپیٹ کے ساتھ کمرے میں داخل ہو رہی ہے۔ تمام ظروف اور گلدانوں میں گلدستے ترتیب سے لگے ہوئے ہیں، ریحانہ گھر کی مالکہ ریحانہ! چائے توشی کے لباس میں کھڑی ہوئی ایک چوکھٹے میں تصویر لگا رہی ہے"!

منصور نے یہ سب کچھ دیکھ کر ایسا محسوس کیا کہ گویا خواب دیکھ رہا ہے۔ دو برس کی طویل جدائی۔ دونوں کی ان بن۔ ریحانہ کا الوداع کہنا، سب کچھ سامنے آ گیا۔ مگر وہ وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا، ریحانہ نے اس کا آجانا محسوس کیا مگر اپنے کام میں مصروف رہی، بالکل متوجہ نہ ہوئی!

حالانکہ شادی سے قبل دونوں کی محبت۔ بے وقوفی کی حد تک پہنچ چکی تھی، منصور ریحانہ کے پیچھے پیچھے لگا رہتا تھا۔ اکثر و بیشتر راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کی کھڑکی کے نیچے کھڑا رہتا کہ شاید ایک جھلک ہی دکھائی دے۔ ریحانہ بھی محبت کرنے دینے اور محبت کئے جانے کے جذبات سے خالی نہ تھی۔ بسا اوقات گھنٹوں اپنے بالا خانے میں کھڑی رہتی کہ اسے گزرتا ہوا ہی دیکھ لے۔ جب کبھی منصور اپنے گھر چلا جاتا تو آٹھ آٹھ دس دس صفحوں کے خطوط روزانہ لکھنا اس کا فرض ہوتا تھا اور ان کے جواب کے انتظار میں ہجر کی تمام تلخ کامیاں برداشت کرنی پڑتیں وہ خاک

اسی کے ساتھ یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک دوسرے سے روٹھ جاتے تھے اور اس کیف کے بعد ان کو

"کبھی وہ تنے ہوئے ہیں کبھی ہم تنے ہوئے ہیں"!

جہاں تک طبائع کا تعلق ہے، ریحانہ میں کسی قدر حسد کا مادہ تھا۔ اور والدین کے بڑے ہوئے پیار سے جلد بازی کی عادت پڑ گئی تھی، برخلاف اس کے منصور نرم مزاج تھا اور اپنے فطری توازن کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ تاہم منطقی طور پر اس کی نرم مزاجی بعض وقت ایسا پہلو اختیار کر لیتی تھی جس سے نفرت و کشیدگی ظاہر ہونے لگتی تھی، اور ایسے میں ریحانہ کی کسی بات پر اس کا تبسم "زخم و نمک" کا منظر پیش کر دیا کرتا تھا۔ جسے محسوس کر کے ریحانہ اکثر چڑ جاتی تھی۔ اور دونوں میں زیادہ گرم جوشی کے ساتھ پھر ملنے کی تمنائیں پیدا ہونے لگتی تھیں، اور زیادہ دیر نہ ہوتی تھی کہ شوریدگی ہجر نوید صلح پر آمادہ ہو جاتی اور دونوں کا ملاپ اس حسن کے ساتھ ہو جاتا تھا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا!

دونوں کی شادی ہو جانے کے بعد ایک دن منصور کو ایک ایسی خاتون سے ملنے کا اتفاق ہوا جسے وہ کبھی "پرستیدہ جذبات" سمجھ چکا تھا۔ ریحانہ کو اس کی خبر ہو گئی تو اس نے اس پر یہ الزام لگایا کہ اس نے اس راز کو مخفی کیوں رکھا؟ منصور اس الزام "بے سبب" پر کسی قدر برہم سا ہوا، نہ اس لئے کہ الزام صحیح تھا یا غلط! بلکہ اس لئے کہ ریحانہ نے اس کی وفا شعاری کو شک بھری نگاہوں سے دیکھا ہی کیوں؟ بات تو کچھ نہ تھی، مگر بڑھ گئی منصور کی خاموشی، ریحانہ کی جلد بازی رنگ لائی اس نے تصور کر لیا کہ وہ ہنوز اسی عورت کا دلدادہ ہے اور عورت اپنی دنیائے محبت میں کسی رقیب کا وہم بھی گوارا نہیں کر سکتی بدگمانی دل میں رہ رہ کے چٹکیاں لینے لگی محبت کے رخ پر نفرت کے پردے پڑنے لگے۔ بالآخر اس نے ایک روز منصور سے کہہ دیا کہ دونوں کی ایک دوسرے سے علیحدگی بہتر ہے منصور نے جب معاملہ کو اس

حد تک طول کھنچتے دیکھا تو گھبرا سا گیا اسے بے پروائی کی سطح سے اٹھ کر بگڑی ہوئی ریحانہ کو منانے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر ریحانہ کی سرد مہری بڑھتی ہی گئی اور وہ اسی بات پر تل گئی کہ علیحدگی کے سوا ان کی منافرت کا کوئی علاج ہی نہیں۔

ریحانہ کے چلے جانے کے بعد منصور نے محسوس کیا۔ دنیا میں اس کا سا بدنصیب۔ دل شکستہ اور غیر مطمئن کوئی انسان نہ ہوگا تنہائی ہمت شکن۔ گھر اور اس کی تمام سکوں کاریاں تیر و نشتر بن گئیں۔ احباب و اعزا کی تسلی بازیاں بے کار ثابت ہوئیں۔ سچ ہے۔

دل شکستہ کے لئے کوئی خوشی ممکن نہیں
زندگی ممکن ہے لیکن تازگی ممکن نہیں

مگر خیریت یہ ہوئی کہ منصور نے مایوسی کو جنون کی حد تک بڑھنے نہ دیا اور ہمت کر کے تجرد کی دوسری زندگی میں قدم رکھ دیا۔ گزشتہ واقعات کو بھول جانے اور بھلا دینے کے لئے اب اس کے لئے سیاسی میدان تھا۔ اور بزم کی تمام شعلہ سامانیاں۔ دن رات انہیں میں غرق و محو رہتا اور زندگی کے دن گزارے جاتا۔ لیکن جب تنہائی ہوتی۔ حجابات خارجی الگ ہو جاتے تو وہ ایسا کچھ محسوس کرنے لگتا کہ شکستہ دل کا گھن اسے اندر اندر چاٹے جاتا ہے!

اس دورِ مفارقت میں دو چار بار ریحانہ سے غیر ارادی طور پر ملاقات بھی ہو گئی مگر بالکل اجنبیوں کی طرح۔ ریحانہ نے یہ دیکھ کر کہ وہ سوسائٹی میں برابر کا شریک ہے کنارہ کشی اختیار کر لی کہ سامنا بھی نہ ہو۔ بایں ہمہ ان کا یہ عہد و پیمان کہ ان کی علیحدگی کی خبر بڑے میاں (ریحانہ کے والد) کو نہ ہو برابر قائم رہا۔ اور دونوں ان کو خطوط پہلے ہی کی طرح لکھتے رہے۔ ریحانہ لکھتی تو یہ ضرور لکھتی کہ:۔

"منصور کو آج کل فرصت کم رہتی ہے۔ سیاسی انہماک نے تو نجی مشاغل میں کمی پیدا کر دی ہے۔ مگر خدا رکھے بہت خوش ہیں۔"

منصور لکھتا تو یہ ضرور لکھتا کہ:۔

"ریحانہ کے خط سے آپ کو میرے مشاغل کا حال معلوم ہی ہوا ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ آج کل اکثر و بیشتر آپ کو لکھ نہیں سکتا۔ ریحانہ کی صحت ماشاءاللہ پہلے سے بہت اچھی ہے۔ آپ کو بہت یاد کیا کرتی ہے"!

اس طرح اعتبارات و تصورات کی دنیا میں بڑے میاں کی زندگی خوش خوش بسر ہو رہی تھی . . . . اس لئے ان کی آمد کے سلسلہ میں منصور و ریحانہ کا پھر ملنا، تین برس کے بعد اور کسی مشترکہ غرض کے ماتحت کچھ کم اہم نہ تھا۔ ریحانہ کو نخوت و غرور کو دور ہٹا کر اپنے شوہر کی ڈیوڑھی میں داخل ہونا پڑا۔ اور یہ التجا کرنی پڑی کہ:۔

"بوڑھے باپ کی خاطر، آؤ ایک روز کے لئے میل کر لیں، اپنے چہروں پر فریب کے پردے ڈال لیں"

منصور نے بھی جیسا کہ گزشتہ گفتگو سے ظاہر ہے۔ نہایت نرم مزاجی سے کام لیا۔ گزشتہ محبت۔ حال کی نفرت اور مستقبل کے تصورات کا کوئی تذکرہ بیچ میں آنے نہ دیا۔ اشارے اور کنائے کی اور بات ہے۔ ورنہ دونوں محض اداکار کی حیثیت سے آگے نہ بڑھے مگر سوال یہ تھا کہ کل کیا ہوگا؟ . . . . یہی کہ، استقلال کے ساتھ مکاری اور فریب کاریوں کا اظہار، بغیر کسی جھجک کے زن و شوہر کی رواداری، جھوٹ اور سفید جھوٹ کی نمائش، بوڑھے باپ کی خوشنودی کے لئے ہر طرح کا بہروپ، ہر سوال کا جچا تلا جواب، اور پھر جب بڑے میاں تشریف لے جا چکیں گے تو ایک دوسرے کو اجنبی کی طرح، خدا حافظ کہہ کر اپنے اپنے رستوں پر گامزن ہونا . . . . . . رجعت، یا تجدیدِ محبت! اس کا گمان بھی نہ تھا۔ منصور کو اقدام کرنے سے گریز، ریحانہ معاف کرنا نہیں چاہتی! . یہ تھے وہ خیالات، جس سے دونوں اپنی اپنی جگہ متاثر تھے!

دسترخوان بڑھ چکا ہے۔ بڑے میاں نہایت مسرور نظر آ رہے ہیں۔ بچوں کی خوشنودی سے پھولے نہیں سماتے۔ دونوں اداکار بھی مسکرائے جاتے ہیں۔ مگر ان کی ہنسی میں اضطرابی لہریں بھی پوشیدہ ہیں۔ کیونکہ جس کام کو انہوں نے کل آسان سمجھا تھا۔ وہ ہر قدم پر مشکل ہوتا جاتا ہے۔ منصور کے چہرے پر مسرت کی جھلک، اس کی تہ میں اضطراب، ریحانہ کے چہرے پر شرم و حیا کے ساتھ گھبراہٹ کہ کہیں پردے کا راز فاش نہ ہو جائے۔ ایسی باتیں تھیں جو قدم قدم پر مشکل تر ہوتی جاتی ہیں۔ تاہم چونکہ وہ پہلے سے تیار ہو چکے تھے، اس لئے بڑی حد تک غیر محسوس طریقے پر اپنا کام کئے جا رہے ہیں

دونوں کے دل میں قدرتی طور پر یہ خیال بھی پیدا ہو رہا تھا کہ یہ کھیل، یہ ڈھونگ۔ یہ مصنوعی اداکاری کسی اہم تبدیلی کا ذریعہ نہ بن جائے اور دونوں کی زندگی میں نئے انقلاب کے ساتھ "دورِ نو" کا سبب نہ بن جائے . . . . . الغرض انہیں تصورات کے۔ ۔

بڑے میاں آگے آگے اور یہ دونوں پیچھے پیچھے بالاخانے کی طرف جارہے ہیں۔ ریحانہ کی تھرائی ہوئی نگاہیں کہہ رہی ہیں کہ :۔

"ابھی زور سامان باقی ہے کس طرح گزرے گا۔ اگر خدانخواستہ ۔۔۔!"

منصور کا سنجیدہ چہرہ اس امر کا آئینہ دار ہے کہ :۔

"خواہ کچھ بھی ہو۔ اب تو شروع کئے ہوئے کام کو ختم کرنا ہی ہوگا نتیجہ جو کچھ بھی ہو!"

اوپر پہنچ کر بڑے میاں کرسی پر بیٹھتے ہی بولے :۔

"میرے بچو! تمھارے ساتھ مل بیٹھ کر میں بہت خوش ہوں۔ اتنا خوش کہ بیان کے لئے الفاظ نہیں ملتے ریحانہ! تمھارے خطوط برابر ملاقات کا مزا دیا کرتے تھے۔ لیکن وہ محض پڑھ لینے اور واقف ہو جانے تک محدود تھا۔ میں نے دیکھنے کو بہتر جانا۔ اور ایک ہی دن کے لئے چلا آیا۔ ریحانہ تجھے تیرا بچپن یاد ہے، اُف کیسی گڑیا سی بچی تھی۔ اور اب ماشاء اللہ۔ کیوں منصور پہلے کی نسبت بہت پیاری پیاری ہے!"

"بے شک" منصور نے کہا: "میں ہمیشہ اس سے یہی کہا کرتا ہوں۔ مگر وہ مذاق تصور کرکے ٹال دیا کرتی ہے"۔

"ہاں ہاں" بڑے میاں نے گرم جوشی کے ساتھ کہا "تم نے اپنے خطوط میں بھی اس کو اکثر لکھا ہے۔ واقعی ریحانہ منصور کی عادت ہے کہ وہ اپنے خطوط میں تیرے تذکرہ کے سوا اور کچھ کم لکھتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تو نے اس کو بالکل اپنا لیا ہے۔ منصور یقیناً شوہریت کا مجسمہ ہے!"

"بے شک" ریحانہ نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا "وہ ایسے ہی ہیں"

"تمھاری چچی زہرا اور بہن شگفتہ نے تم کو بہت بہت پوچھا ہے۔ ریحانہ!"

"مجھکو ابا" ریحانہ نے ادب کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں تجھکو" بیٹی۔ بڑے میاں نے کہا: "مگر بیٹی! شگفتہ بڑی مصیبت ہے"

"آخر کیوں ابا" انھوں نے تو اپنی پسند کے موافق بھائی پرویز سے شادی کی تھی۔ اب مصیبت کیسی؟"

"ہاں بیٹی" اس نے شادی اپنی پسند کے موافق کی تھی، مگر نہ معلوم کیوں نبھ نہ سکی۔ اور شگفتہ اب اپنے میکے میں ہے"۔

ریحانہ :۔ "یہ اس نے اچھا کیا"

بڑے میاں :۔ "غالباً تم یہ کہنا چاہتی تھیں کو برا کیا! میری اچھی بچی! یاد رکھ۔ بیوی کو شوہر سے کبھی علیحدگی نہ چاہئے، وہ تو کہو بڑی خیریت ہوئی میری نصیحت کام آگئی۔ اور دونوں میں صلح ہو گئی شگفتہ نے شوہر کی خامیوں کو بھلا دیا، اور شوہر نے شگفتہ کی گستاخیوں کو معاف کر دیا"!

ریحانہ۔ "آپ کی نصیحت سے ابا؟"

بڑے میاں : "ہاں بیٹی! مجھے اس کا فخر ہے، کیا تجھے یاد نہیں کہ تیری ماں جب زندہ تھی تو کہا کرتی تھی کہ :۔

"بیوی کو شوہر کی ہمیشہ محبت کرنی چاہئے۔ اور ہر اس بات سے جو اس کو پسند نہ آئے درگزر کرتے رہنا چاہئے کیونکہ محبت وہی زیادہ کر سکتا ہے۔ جو سب سے زیادہ درگزر بھی کرے"!

ریحانہ: "اور اگر کوئی ایسی بات ہو کہ جو نہ درگزر کی جا سکے تو؟"

بڑے میاں : "بیٹی، کوئی ایسی بات ہو ہی نہیں سکتی جو درگزر نہ کی جا سکے۔ ہر قصور معاف کیا جا سکتا ہے۔ اور ہر غلطی درگزر کی جا سکتی ہے۔ یاد رکھو، تم اپنی آپ مقصود ہو۔ اس لئے ہر اچھائی یا برائی تم ہی سے ہے۔ اگر تم روٹھ سکتی ہو تو مان جانا بھی تمھارا ہی کام ہے"!

ریحانہ : "بجا ارشاد ہے ابا۔ مگر ۔۔۔۔۔"

بڑے میاں : "اچھا بیٹی۔ اس مسئلہ پر پھر گفتگو کرنا۔ تم اپنا مکان تو دکھا دو۔ وقت کم ہے"

منصور "تشریف لے چلئے، پہلے ملنے والے کمرے سے شروع کیں"

"یہ کمرہ تو بہت وسیع اور آراستہ ہے" بڑے میاں نے کہا "کیا تم یہاں اکثر تفریحی مجالس کیا کرتے ہو"؟

"جی ہاں۔ اب سے پہلے" منصور نے کہا: "اکثر دعوتیں ہوتی رہتی تھیں"۔

"مگر اب؟" بڑے میاں نے پوچھا: "سیاسی مصروفیت کی وجہ سے نہ ہوتی ہوں گی۔ بایں ہمہ یہ کمرہ بہت خوب ہے اور ستھرے مذاق کا آئینہ۔ اور ہاں یہ بغلی کمروں میں، ریحانہ تمھارے پسند کی چیزیں ہیں۔ شاید تم انھیں میں رہنا پسند کی چیزیں ہیں۔ مگر یہاں ۔۔۔۔۔"

"تو آنے جانے والوں کی نگاہیں" بڑے میاں نے کہا "تم تو

خوش قسمت ہوں گی۔ منصور، تم رشک تو نہیں کرتے؟"

"مجھے اپنی اہلیہ پر" منصور نے کہا، "پورا بھروسہ ہے"

"اور تم ریحانہ" بڑے میاں نے پوچھا" پریشان تو نہیں ہوتیں"؟

"ابا" ریحانہ نے شرما کر جواب دیا" مجھے اپنے شوہر کا پورا پورا احترام کرنا آتا ہے"

"مگر" تعجب کے ساتھ بڑے میاں نے پوچھا" آخر تمہاری ماں کی شبیہ کیا ہوئی؟!"

"ابا" ریحانہ نے گھبرا کر جواب دیا۔ ہم لوگ باہر گئے ہوئے تھے ابھی ہمارے تمام سامان واپس نہیں آئے"

"یہ سچ ہے" بڑے میاں نے افسوس کے ساتھ کہا" مگر تم کو اپنی ماں کی تصویر نہ بھولنی چاہئے تھی۔ منصور تم کو بھی اس کا لحاظ واجب تھا کیونکہ مرحوم آخر ریحانہ کے لئے اُنھوں نے مجھ سے تمام قربانیوں کا وعدہ لے لیا تھا۔ اور جب وہ یہ کہتی تھی کہ ابا میں بغیر منصور کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور تم کہا کرتے تھے کہ ریحانہ نہ ملی تو میں پاگل ہو جاؤں گا اس وقت مرحومہ ہی کا درمیان سامنے آجاتا تھا اور میں تم دونوں کے حق میں فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اچھا! یہ کیسا کمرہ ہے۔

(اس کمرے کی طرف اشارہ کرکے جو فی الحال منصور کے استعمال میں تھا اور مقفل تھا۔ کیونکہ ریحانہ نے اس میں داخل ہونا مناسب نہ سمجھا تھا۔ اور نہ اسے یہ خیال تھا کہ بڑے میاں ہندی کی چندی نکالیں گے)"

"یہ ایک فاضل کمرہ ہے ابا" ریحانہ نے ٹالنے کے طور پر کہا" اور بے ترتیب سا"

"ہونا بھی چاہئے"۔ بڑے میاں نے تبصرہ کے طور پر کہا۔ "اگر میں قیام کرنا تو میرے واسطے خوب ہوتا۔ مگر افسوس کہ میں تو آج ہی واپس جا رہا ہوں"

"کیا عرض کروں" منصور نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "کاش آپ رک سکتے؟"

"تاہم مجھے کمرہ تو دیکھ لینے دو" بڑے میاں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا" اسی سے تسلی رہے گی کہ میں رہتا تو اس میں ٹھہرتا"

"مگر یہ اچھی حالت میں نہیں ہے" ریحانہ نے گھبرا کر جواب دیا" ابا، اسے نہ دیکھئے تو بہتر ہے"

"بیٹی۔ اس میں حرج کیا ہے" بڑے میاں نے ضد کرتے ہوئے کہا" مجھے معلوم ہے۔ لیکن میرا جی یہی چاہتا ہے کہ اسے دیکھوں"

"ہاں ہاں ضرور دیکھ لیجئے" منصور نے قفل کھولتے ہوئے کہا۔ "ریحانہ تو ناحق ضد کر رہی ہے"

"اوہو" بڑے میاں نے خوش ہو کر کہا" یہ تو بڑا اچھا کمرہ ہے ریحانہ اس میں تمہاری تصویر بھی ہے۔ ہاں میں سمجھا منصور نے میری شفقت کا تقاضا سمجھ کر لگا دیا ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ میں اس مرتبہ نہیں ٹھہر سکتا۔ اگرچہ جی تو یہی چاہتا ہے کہ نہ جاؤں"

پورے مکان کا چکر کر لینے کے بعد، سب کے سب نشستگاہ میں واپس آگئے۔ ریحانہ و منصور اپنی اپنی جگہ پر کسی خیال میں گم تھے، سچ تو یہ ہے کہ بڑے میاں کی نباضی اچھی نہ تھی۔ ورنہ چہروں کے اُتار چڑھاؤ سے اصل حال معلوم کر چکے ہوتے۔ مگر دونوں اداکار کی خوش نصیبی سے وہ ایسا نہ کر سکے اور گفتگو کا سلسلہ ملاتے ہوئے کہا۔

"ریحانہ! مجھے افسوس ہے کہ تم کو اتنا اچھا مکان چھوڑنا ہوگا"

ریحانہ" (دل کی دھڑکن محسوس کرتے ہوئے) آخر یہ کیوں ابا جان؟"

بڑے میاں" (نہایت سادگی کے ساتھ) اس لئے کہ اگر منصور انتخاب میں کامیاب ہو گئے تو تمھیں ان کے ساتھ دلی میں بھی رہنا ہوگا۔ ایسی صورت میں دو مکانوں کی ضرورت ہوگی ایک یہاں اور دوسرا وہاں۔ اگرچہ اس میں فضول خرچی ہے۔ مگر مجھے کچھ زیادہ افسوس نہ ہوگا۔ کیونکہ میں تم لوگوں کو دلی میں زیادہ آسانی سے دیکھ لیا کروں گا۔ لاہور سے دلی دور بھی نہیں ہے اور سفر بھی آسان ہے"

شام کی گاڑی سے جب بڑے میاں تشریف لے گئے تو ریحانہ و منصور بند گاڑی میں بیٹھ کر واپس ہوئے۔ باپ کے جانے کا ریحانہ کو افسوس ضرور تھا۔ مگر اداکاری کا خوب صورتی کے ساتھ ختم ہو جانا اس کے لئے بہت سکون بخش تھا۔ دونوں اپنی اصلی زندگی کی طرف لوٹ رہے تھے مصنوعی یگانگی، بیگانگی سے بدلتی جا رہی تھی۔ منصور خاموش کسی خیال میں کھویا ہوا سا تھا۔ ریحانہ کھڑکی کی طرف رخ کئے ہوئے برستے ہوئے بادلوں کی سیر دیکھ رہی تھی کہ یکایک، بجلی چمکی، اور بالکل اضطرابانہ حالت میں منصور کا ہاتھ ریحانہ کے ہاتھ پر جا لگا۔ اس نے اسے محسوس کیا اور بہ تقاضائے تہذیب یوں عذر خواہ ہوا۔

منصور" امید کہ آپ مجھے معاف کر دیں گی"

معاونین عالمگیر کی خدمت میں ضروری گزارش

گو ہمارا مصلیب میں ایک ہنگامۂ آتش وخون برپا ہے جس کی آواز یہاں بھی کاغذ اور سامان طباعت کی ہوشربا گرانی کے بھیس میں سُنی جارہی ہے اگر جنگ فرنگ اسی طرح کچھ عرصہ جاری رہی تو رسائل وجرائد یا تو بند ہو جائیں گے یا انھیں موت کی راہ میں ہمہ تن چشم انتظار بن کر کھڑا ہونا پڑے گا۔ کیونکہ اردو رسائل کے کاندھے اتنے قوی نہیں کہ وہ مشکلات کا پہاڑ اٹھا سکیں۔ تاہم قارئین یہ سن کر خوش ہونگے کہ اس پرآشوب زمانہ میں بھی عالمگیر خدا تعالےٰ کے فضل وکرم اور معاونین کے لطفِ توجہ سے اسی بلند سطح پر کھڑا ہے جس پر وہ ہمیشہ اپنی امتیازی حیثیت کا اعتراف کراتا رہا ہے بلکہ مشکلات کے باوجود عالمگیر کی لکھائی گنجان کرادی گئی ہے۔ صفحات میں بھی اضافہ کر دیا گیا ہے اور قارئین خود اعتراف کرینگے کہ رسالہ عالمگیر کو اب پہلے کی بنسبت زیادہ محنت ددکاوش سے مرتب کیا جاتا ہے بایں ہمہ سالانہ چندہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا بلکہ اس دفعہ سالانہ نمبر کی قیمت ایک روپیہ چار آنے کی بجائے صرف ایک روپیہ رکھی گئی تھی۔ الغرض عالمگیر کا ہر قدم پیچھے کی بجائے آگے کی طرف بڑھ رہا ہے لیکن یہ عالم اسباب ہے یہاں ہر چیز امداد ومعاونت کی محتاج ہے۔ عالمگیر بہت کثیر المصارف رسالہ ہے اس کی ظاہری وباطنی تزئین وآرائش پر بیشمار روپیہ خرچ ہوتا ہے اس لئے جنگ کے زمانے میں اس کے رستے میں عارضی مشکلات کا حائل ہونا لازمی تھا اس کے باوجود ہم ازراہ عنایت یا خیراتی چندہ کے تمنائی نہیں البتہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ معاونین کرام عالمگیر بکڈپو سے اپنی ضرورت کی زیادہ سے زیادہ کتابیں خرید فرمائیں تاکہ ایک طرف علم وادب کی خدمت ہو تو دوسری طرف اس نازک وقت میں عالمگیر بکڈپو کے فنڈ کو تقویت بھی پہنچے۔ یہ ادارہ ہر قسم کی علمی وادبی کتابیں واجبی قیمت پر مہیا کرتا ہے اور اس کے دار الاشاعت کی طرف سے حال ہی میں چند بہترین کتابیں شایع کی گئی ہیں جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں

۱۔ دنیائے اسلام کا ماضی و مستقبل، ۲۔ روپ متی اور باز بہادر ۳۔ تاج شاہی حسن کے قدموں میں،
۴۔ موتیوں کا درخت (علامہ جرجی زیدان کے معرکۃ الآرا عربی ناول کا ترجمہ) ۵۔ مسلم لیگ ۶۔ ماہ وانجم،

ان علمی جواہر ریزوں کے علاوہ قارئین کی نظر سے عالمگیر بکڈپو کی فہرست کتب بھی گزری ہوگی اگر قارئین کرام اپنی پسند کی تمام کتابوں کے مہیا کرنے کی خدمت عالمگیر بکڈپو کے سپرد کر دیں تو اس کے فوائد حسب ذیل ہونگے۔

۱۔ قارئین کو مختلف دار الاشاعتوں کی کتابیں ایک ہی جگہ سے بارعایت مل سکیں گی اور محصول ڈاک میں کافی فائدہ رہے گا۔

۲۔ عالمگیر فنڈ کو بہت تقویت پہنچے گی اور یہ رسالہ اپنی روایتی شان سے اردو ادب کی خدمت کر سکے گا۔

اس کے بعد ہم قارئین کی توجہ ان دو معرکۃ آرا تصانیف کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جو عنقریب عالمگیر بکڈپو کے زیر اہتمام مطلع اشاعت پر جلوہ گر ہونگی۔ ان میں سے ایک کتاب "خونیں تحریکیں" (از مولانا اظہر امرتسری) اور دوسری "حقیقت وافسانہ" (از مولانا ظفر علی خاں) ہے اگر قارئین ان دونوں کی مجموعی قیمت (یعنی صرف ڈھائی روپے) پیشگی دفتر میں جمع کرا دیں تو یہ کتابیں شایع ہوتے ہی ان کی خدمت میں ارسال کر دی جائیں گی اور ان سے محصول ڈاک وصول نہیں کیا جائے گا۔

خونیں تحریکیں یہ ان تحریکوں کے تذکروں پر مشتمل ہے جو اسلامی حکومتوں کو مسلسل انقلابات، غیر مختتم شورش اور باہم کشت وخون کا نشانہ بناتی رہیں ہر تحریک ایک مستقل مذہب کی طرح صدیوں جاری رہی اور والیانِ تحریک نے جس خونریزی، بہادری شجاعت، بغاوت انگیزی اور دلیری کا اظہار کیا اس کے تصور سے بھی دماغ تاریخ لرز اٹھتا ہے تمام واقعات مستند تواریخ سے اخذ کئے گئے ہیں اس کتاب میں جن تحریکوں کی مورخانہ داستان درج ہے ان میں سے بعض یہ ہیں۔ ۱۔ علویہ ۲۔ عباسیہ ۳۔ قرامطہ۔ ۴ باطنیہ ۵۔ مہدویہ،

حقیقت وافسانہ یہ مولانا ظفر علی خاں کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ علم وتحقیق اور ادب وشعر کی دنیا میں مولانا کو جو قائدانہ امتیازات حاصل ہیں ان سے ہر ذی علم اچھی طرح واقف ہے اس لئے "حقیقت وافسانہ" کی نسبت اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے کہ یہ مولانا ظفر علی خاں کے خامۂ بہار آفریں کا کارنامہ ہے۔ خونی تحریکوں کی قیمت صرف عہ اور "حقیقت وافسانہ" کی صرف عہ ہوگی،

ہم امید کرتے ہیں کہ قارئین کرام ہم خرما وہم ثواب کے مطابق اس درخواست کو ضرور شرف توجہ بخشیں گے۔

منیجر عالمگیر لاہور

ریحانہ: کوئی بات بھی ہو۔ میں نے معاف کیا"!
منصور: اچھا تو کیا آپ براہِ راست اپنے گھر جانا پسند کریں گی"
ریحانہ: نہیں میں ابھی آپ کے گھر چلوں گی۔ تاکہ اپنی خادمہ کی
مدد سے پھیلی ہوئی چیزوں کو سمیٹ دوں۔ اور پھر جب یہ
ہو لے گا تو میں چلی جاؤں گی!"
منصور۔ جواب بھی دینے نہ پایا تھا کہ کوٹھی آ گئی۔ ریحانہ نہایت
تیزی کے ساتھ اتری، اِدھر اُدھر کی چیزوں کی دیکھ بھال، رکھ
اٹھا میں مصروف ہو گئی۔ منصور ایک صوفے پر بیٹھ کر بظاہر اخبار
پڑھنے لگا۔ مگر اصل میں کنکھیوں سے ریحانہ کی نقل و حرکت دیکھتا
رہا۔ وہ بجلی کی طرح کبھی اِدھر سے اُدھر پہنچ جاتی۔ اور کبھی تیتری
کی طرح کسی جگہ ٹھہر کر کچھ سوچنے لگتی، چلتے چلتے تھک سی
گئی تھی۔ منصور سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے مخاطب کر کے کہا
"تم! . . . آپ بہت تھک گئی ہوں گی۔ کیا
میں کچھ ہاتھ بٹا سکتا ہوں؟"
"نہیں نہیں" ریحانہ نے جواب دیا "شکریہ، میں سب
کچھ ختم کر چکی ہوں"
ضد اور ہٹ کی وجہ سے وہ یہ جواب تو دے گئی مگر تھوڑی
ہی دیر بعد، وہ بے حد تھک گئی، مضطرب و ہراساں نشستگاہ
میں آ کر ایک خالی صوفے پر بیٹھ گئی، دن بھر کی "محنت و اکاری"
دوڑ دھوپ، عورت کا نازک سا دل، افسردہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا
دل کی بات چہرے تک آ ہی گئی۔ منصور نے اسے محسوس کیا۔ اخبار
علیحدہ رکھ کر مخاطب ہونا چاہتا تھا کہ ریحانہ نے خود ہی پوچھا:۔
"کیا ابھی بارش ہو رہی ہے"؟
منصور: "جی ہاں۔ ابھی تو مسلسل پانی پڑ رہا ہے"
ریحانہ: "گاڑی بھی ابھی نہیں آئی"؟
منصور: "میں جا کر دیکھوں؟"
ریحانہ: "نہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دم بھر میں
آتی ہی ہوگی؟"
منصور: "کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ میں آپ کو مکان تک پہنچا آؤں؟"
ریحانہ: "آپ کی مہربانی کا شکریہ، مگر یہ کیوں؟"
منصور: "موسم خراب ہے اور اکیلے . . . . . "
ریحانہ: "وہ گاڑی بان آ گیا، اچھا مجھے تیار ہو جانا چاہئے"
وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر، آئینہ کے برابر پہنچی۔ کپڑے درست
کیے۔ دستانے چڑھائے۔ برساتی اوڑھی۔ بکھری ہوئی زلفوں کو
سمیٹا۔ اور منصور کی طرف مڑ کر بولی:۔
"اچھا خدا حافظ"
منصور۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کا چہرہ بحال
زرد ہو رہا تھا لب سے لب پیوست تھے۔ آنکھیں وحشت زدہ ہو
رہی تھیں۔ ریحانہ کوئی جواب نہ پا کر غرور کے ساتھ آگے بڑھی۔
اس کے قدموں میں اضطراب نہ تھا، وہ نہایت اطمینان سے آگے
بڑھی جا رہی تھی۔ منصور بھی مثل ایک مجسمۂ ساکت کے پیچھے پیچھے چلا
آ رہا تھا۔ ریحانہ نے چاہا کہ مخملی پردہ اٹھا کر باہر قدم رکھے۔ منصور
نے قدم بڑھا کر پردہ اٹھا دیا۔ اس مرتبہ پھر نادانستہ طور پر اس کا
ہاتھ ریحانہ کے ہاتھ سے چھو گیا۔ منصور نے عذرخواہ ہوتے ہوئے
کہا:۔
"ریحانہ۔ اسٹیشن سے واپسی پر تم نے مجھے معاف کر دیا
تھا۔ کیا تم اتنے جلد بھول گئیں؟!"
ریحانہ، منصور کی طرف پلٹی۔ اس کی گود کھلی ہوئی تھی۔ وہ سراپا
سپردگی بنی ہوئی شانہ و گردن کے بیچ کے حصہ کی طرف مائل ہوئی
اور نہایت تیزی سے اپنا چہرہ منصور کے گریبان میں چھپا لیا۔
آنکھیں برس پڑیں۔ آنسو موتی کی طرح ڈھلکنے لگے۔ منصور کے لب
اس کے گیسو سے مس ہونے لگے۔ جذبات کے تلاطم سے اس کے
سینے پر مد و جزر کا عالم تھا۔ آنکھیں خوشی کے آنسو رو رہی تھیں۔
آواز میں تھرتھری تھی۔ ایسی لرزش جو دل کے بھر آنے ہی پر رونما
ہوتی ہے۔ منصور نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:۔
"ریحانہ۔ کیا تم اب نہ جاؤ گی؟"
ریحانہ: "منصور! پیارے منصور!! (سسکتی ہوئی) میں اب
کہاں جاؤں گی؟ چلو، ہم دونوں مل کر اماں کی تصویر
اٹھا لائیں"!!!

وجدانیات!

جلوہ جسے کہتے ہیں بے قیدِ رگِ جاں ہے!

از حضرت آرزو سہارنپوری

جو آنکھ ہے ششدر ہے جو جلوہ ہے حیراں ہے
انوارِ تجلّی میں نظّارہ پریشاں ہے

اب اسکو خدا جانے قربت ہے کہ ہجراں ہے
وہ قلب کی دھڑکن میں خود سلسلہ جنباں ہے

تو حُسن کی فطرت سے واقف ہی نہیں ورنہ
جلوہ جسے کہتے ہیں بے قیدِ رگِ جاں ہے

جذباتِ وفا شاید انجام کو آپہنچے
جب عشق پریشاں تھا اب حسن پریشاں ہے

یہ عشق ہو جو کچھ بھی لیکن یہ حقیقت ہے
ہر سانس کے پردے میں خود حُسن خراماں ہے

عرفانِ محبّت کی اللہ رے تاثیریں
اب حُسن بھی خود میری صورت سے نمایاں ہے

آنکھوں کو تحیّر ہے نظروں کو تواجد ہے
اے عشق ترے کُل کا ہر جزو پریشاں ہے

اک رقص کی کیفیت طاری ہے دو عالم پر
ہے کون جو یوں اے دل محسوسِ رگِ جاں ہے

اُس دل کو خدا رکھے محفوظ بلاؤں سے
جس دل کا ہر اک ذرّہ خاکِ رہِ جاناں ہے

اے آرزو اب میں ہوں اور حسن کے جلوے ہیں
اب میری نگاہوں میں صحرا بھی گلستاں ہے

رفتار زمانہ

فرانس کی شکست

ماہ جون میں جنگ کی مشینری اپنی قوت سے متحرک رہی، اور اس نے نہ صرف قوموں اور ملکوں کی قسمت پلٹ دی بلکہ دنیا کی ایک بہت بڑی جمہوریہ کو بھی صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا۔ ماہ مئی کے تبصرہ میں ہم لکھ چکے ہیں کہ انگریزی فوجوں نے محاصرہ سے بچنے کیلئے فلانڈرس کو خالی کرنا ضروری سمجھا اور اس طرح نازی فوجوں کو رود بار انگلستان سے آرگون کے جنگلات تک ایک زبردست محاذ قائم کرنے کا موقع مل گیا بلکہ فرانسیسیوں کی کمر ہمت بھی ٹوٹ گئی اور وہ زیادہ دیر تک حملہ آوروں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ویگاں لائن پر کہیں کہیں زبردست معرکے ہوئے لیکن نازی ٹکڑیوں کے سامنے فرانسیسیوں کی کچھ پیش نہ گئی اور وہ پسپا ہونے پر مجبور ہوئے۔ خیال تھا کہ رستے کے دریا درمیان میں حائل ہو جائیں گے لیکن جرمنوں نے انہیں بھی عبور کر لیا اور بالکل پیرس کے دروازے پر آ پہنچے جب صورت حال بہت گھناؤنی ہو گئی تو مسٹر رینو نے تمام مہذب دنیا کے نام عموماً اور امریکہ کے نام خصوصاً اپیل کی کہ مصیبت زدہ فرانس کی مدد کی جائے لیکن اس نفسی نفسی کے زمانہ میں دوسروں کے دکھ درد میں کون شریک ہوتا ہے؟ صدر امریکہ نے فرانس سے اپنی ہمدردی ظاہر کی لیکن کسی عملی اقدام پر آمادہ نہ ہوئے آخر مسٹر رینو اپنے آپ کو بے دست و پا اور مجبور پا کر مستعفی ہو گئے اور ان کی جگہ مارشل پتیاں نے "وزارت عظمی فرانس" کا عہدہ سنبھال لیا۔ مارشل پتیاں نے فرانس کے چیدہ چیدہ فوجی افسروں کو اپنی وزارت میں لے لیا اور نازی فتنون قاہرہ کا پوری جوانمردی سے مقابلہ کرنے کا عزم ظاہر کیا۔ لیکن حالات بہت نازک صورت اختیار کر چکے تھے وہ ابھی مدافعت کے وسائل و ذرائع پر غور ہی کر رہے تھے کہ نازی پیرس میں داخل ہو گئے۔ پتیاں حکومت نے پیرس ایسے خوبصورت شہر کو بچانے کی خاطر اسے "کھلا شہر" قرار دیدیا اور خود ٹورس چلی گئی۔ نازیوں نے تعاقب کیا اور بمباری کر کے فرانسی حکومت کو وہاں سے بھی بھگا دیا۔ آخر فرانس نے اپنے دفاتر بورڈو کے مقام پر کھولے اور اعلان کر دیا کہ ہم صلح کرنے پر آمادہ ہیں چنانچہ ۲۱ جون کو فرانس و جرمنی کے نمائندوں نے کمپین کے تاریخی جنگل میں جمع ہو کر ہٹلر کے مرتب کئے ہوئے ایک صلحنامہ پر دستخط کئے جس کی منظوری ۲۲ جون کو بورڈو گورنمنٹ نے بھی دیدی۔

عالمگیر واقعات پر ماہانہ تبصرہ

از شبلی۔ بی۔ کام،

صلحنامہ کی شرائط

صلحنامہ کی شرائط حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جنگ فوراً بند کر دی جائے جن فرانسی افواج کا محاصرہ کیا گیا ہے وہ ہتھیار ڈال دیں ۲۔ جرمن مفاد کے تحفظ کے لئے مندرجہ ذیل لائنوں کے شمالی اور مغربی علاقے جرمن قبضہ میں رہینگے جنیوا سے ڈولے تک۔ چلنور سوں۔ پیرے لے مونیل مولینز بورجیس۔ ویرزن اور اس کے بعد ٹورس سے ۲۰ کیلو میٹر تک بطرف مشرق اور اس کے بعد انگولیما ریلوے کے متوازی جنوبی سمت سے لیکر مانٹ ڈی مارسین ڈو سینٹ جین پیڈ ڈی پورٹ تک۔ اس علاقہ میں جن مقامات پر ابھی تک قبضہ نہیں ہوا ان پر فوراً ہی قبضہ کر لیا جائے۔ ۳۔ مقبوضہ علاقے میں جرمنی کو وہی اختیارات حاصل ہونگے جو ایک فاتح یا قابض حکومت کو ہوا کرتے ہیں سابقہ مقامی انتظامات میں جرمنی دخل نہ دیگا۔ حکومت فرانس جرمنی کو تمام ضروری سہولتیں بہم پہنچائے گی برطانیہ سے جنگ ختم ہونے کے بعد جرمنی فرانس کے مغربی ساحل پر اپنا تصرف کم کر دیگا حکومت فرانس کو اختیار ہوگا کہ وہ غیر مقبوضہ علاقہ میں اپنا پایہ تخت قائم کرے یا اگر چاہے تو پیرس میں بھی قائم کر سکتی ہے۔ موخر الذکر صورت میں جرمنی حکومت فرانس کو پیرس سے مقبوضہ اور غیر مقبوضہ علاقوں کا انتظام کرنے میں آسانیاں بہم پہنچائے گی ۴۔ فرانسی بری، بحری اور فضائی افواج ایک معینہ میعاد تک منتشر اور غیر مسلح کی جائیں البتہ اندرونی نظم و نسق قائم کرنے کے لئے ضروری فوج اس فیصلے سے مستثنیٰ ہوگی۔ نظم و نسق قائم کرنے کے لئے جو فوج رکھی جائیگی اس کی تعداد اور اسلحہ کا تعین جرمنی اور اٹلی کے فیصلہ کے مطابق ہوگا۔ مقبوضہ علاقوں میں جو فرانسی مسلح افواج ہیں ان کو غیر مقبوضہ علاقوں میں بلا لیا جائیگا اور غیر مسلح کر دیا جائے گا۔ التوائے جنگ کے وقت یہ فوجیں جس جس مقام پر ہونگی ان کو وہیں اسلحہ رکھنے ہونگے ۵۔ جس علاقہ پر جرمنی قبضہ نہیں کریگا وہاں کے تمام توپخانے ٹینک ٹینک شکن اسلحہ ہوائی جہاز۔ رسالہ کا سامان (یعنی گھوڑے اور رسالہ کا سفری سامان) ٹریکٹر اور گولہ بارود کا (اچھی حالت میں) جرمنی ضمانت کے طور پر جس مقدار میں چاہے مطالبہ کر سکتا ہے ۶۔ وہ تمام اسلحہ اور جنگی سامان جو غیر مقبوضہ علاقہ میں رہے گا اور جو فرانس کی فوج کے استعمال کے لئے نہیں ہوگا ان تمام کو ایک گودام میں جمع کر دیا جائے گا۔ گودام جرمنی یا اٹلی کی نگرانی میں رہے گا غیر مقبوضہ

علاقہ میں جنگی سامان بنانے کا کام فوراً روک دینا ہوگا۔ ۷۔ مقبوضہ علاقہ کے ساحلی و اندرونی محافظت و مدافعت کا تمام سامان اچھی حالت میں جرمنی کے حوالے کیا جائیگا۔ تمام مورچے، میدان، پل وغیرہ بھی جرمنی کے حوالے کئے جائیں۔ ۸۔ فرانسیسی بیڑہ بجز اس حصے کے جو فرانس کی نوآبادیات کی حفاظت کے لئے آزاد چھوڑا جائیگا سب کا سب بندرگاہوں میں جمع کر دیا جائے تاکہ اس کی جانچ پڑتال کیجائے اور اس کو بھی جرمنی یا اٹلی کی نگرانی میں منتشر یا غیر مسلح کیا جائے گا۔ حکومت جرمنی ایمانداری سے اعلان کرتی ہے کہ وہ بندرگاہوں میں جمع کردہ فرانسیسی بیڑے کو دوران جنگ میں اپنے مفاد کیلئے استعمال نہیں کریگی البتہ بیڑے کے اس حصے سے جو ساحلی علاقہ کی حفاظت کیلئے ضروری ہوگا کام لیگی (اس حصہ کی تعداد اور طاقت کا فیصلہ بعد میں ہوگا) نوآبادیات کی حفاظت کے لئے جو جہاز مقرر کئے جائینگے ان کے علاوہ وہ تمام جہاز جو فرانسیسی سمندر سے باہر ہیں واپس بلا لئے جائیں۔ ۹۔ بحری اور دوسری مدافعت کے متعلق اطلاعات ملنی چاہئیں بحری سرنگوں کو صاف کرنے کا کام فرانسیسی افواج کے ذمہ ہوگا۔ ۱۰۔ حکومت فرانس باقیماندہ مسلح فوج سے کسی قسم کا مخالفانہ (جنگی) کام نہیں لے سکیگی۔ فرانسیسی فوج کا کوئی سپاہی (بحری، بری، فضائی، فوجی) فرانس کے علاقہ سے باہر نہیں جاسکے گا۔ برطانیہ کو کسی قسم کا سامان نہیں بھیجا جائیگا۔ کوئی فرانسیسی دوسری حکومتوں کے زیر اثر جرمنی کے مقابلہ میں نہیں آئے گا۔ ۱۱۔ کوئی فرانسیسی تجارتی جہاز بندرگاہ سے باہر نہیں جاسکے گا۔ تجارتی آمد و رفت کا سلسلہ جرمن یا اطالوی حکومت کی منظوری سے دوبارہ شروع کیا جاسکے گا۔ فرانس کے جتنے تجارتی جہاز فرانسیسی علاقہ سے باہر ہیں وہ واپس بلا لئے جائیں ۔ اور یہ ممکن نہ ہو تو انہیں غیر جانبدار بندرگاہوں میں جانے کا حکم دیا جائے ۱۲۔ کوئی فرانسیسی طیارہ اڑ نہیں سکے گا۔ تمام فضائی مستقر جرمنی یا اطالوی نگرانی میں رہینگے تمام بیرونی (غیر ممالک کے) طیارے جو غیر مقبوضہ علاقہ میں ہیں وہ جرمنی حکام کے حوالے کئے جائیں۔ ۱۳۔ تمام سامان، فوجی اشیاء اور ذخیرے جو مقبوضہ علاقہ میں ہیں وہ سب کے سب جرمنی کے حوالے کئے جائیں بندرگاہیں، مستقل مورچے اور بحری عمارات وغیرہ موجودہ حالت میں رہنے دیئے جائیں ان چیزوں کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا جائے۔ یہی طریقہ (یعنی موجودہ حالت میں رہنے دینا) تمام ذرائع رسل و رسائل خاص کر ریلوے لائن، سڑکوں، نہروں، ٹیلیفون، ٹیلیگراف، جہاز رانی اور ساحلی روشنی کے نشانات کے ساتھ بھی برتا جائے مرتب کرنے کا سامان بنایا جائے۔ ۱۴۔ فرانسیسی علاقہ کے تمام وائرلیس اسٹیشن بند رہیں ۱۵۔ حکومت فرانس غیر مقبوضہ علاقہ میں سے جرمنی اور اٹلی کے بین تجارتی سامان کی آمد و رفت کے لئے سہولتیں پہنچائے۔ ۱۶۔ فرانسیسی حکومت کو چاہئے کہ مقبوضہ علاقہ میں باشندوں کو دوبارہ بلائے ۱۷۔ فرانسیسی حکومت مقبوضہ علاقہ سے بیرونی غیر مقبوضہ علاقوں کو قیمتی اشیاء ذخیرے وغیرہ منتقل نہ کرے ۱۸۔ مقبوضہ علاقوں میں جرمن فوج کے اخراجات فرانس کو دینے ہونگے ۱۹۔ جرمنی کے تمام جنگی قیدی رہا کئے جائیں۔ فرانس یا فرانس کے بیرونی علاقہ میں جو جرمن باشندے ہیں اگر حکومت جرمنی ان میں سے کسی کا مطالبہ کرے تو حکومت فرانس کو فوراً انہیں جرمنی کے حوالے کر دینا چاہئے۔ ۲۰۔ جو فرانسیسی جنگی قیدی اس وقت جرمن میں قید ہیں وہ اسی طرح صلح ہونے تک جرمن قید میں رہینگے ۲۱۔ حفاظت کے لئے سامان کے ذرائع فراہمی جرمنی کے حوالے ہیں ۲۲۔ ایک جرمن فوجی مشن اطالوی فرانسیسی معاہدہ التوائے جنگ کے مطابق شرائط التوائے جنگ کی نگرانی کیلئے بروئے کار لایا جائے گا۔ ۲۳۔ اس معاہدہ التوائے جنگ پر اس وقت سے عمل شروع ہوگا جبکہ بعینہ اسی طرح کا صلحنامہ اٹلی سے ہو جائے۔ اٹلی کے التوائے جنگ کی منظوری کے چھ گھنٹے بعد جنگ بند ہوگی التوائے جنگ کا اعلان حکومت جرمنی وائرلیس کے ذریعہ کریگی۔ ۲۴۔ یہ معاہدہ التوائے جنگ پر اس وقت تک عمل درآمد ہوگا جب تک کہ صلح کا عہد نامہ نہ ہو جائے اور اگر حکومت فرانس ان شرائط کو پورا کرنے سے قاصر رہا تو یہ معاہدہ ہر وقت منسوخ کیا جاسکے گا۔

شکست و ذلت کے اسباب

عہد نامہ کی دفعات کا سرسری نظر سے بھی مطالعہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جرمنی نے عہد نامہ ورسائی کا پوری طرح سے انتقام لیا ہے اور فرانس کو نہایت ذلت آمیز شرائط پر صلح کیلئے مجبور کیا ہے اس ذلت و شکست کے اسباب کیا ہیں؟ مارشل پیتاں نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ فرانس کی فوجی طاقت جرمنی کے مشینی طرز جنگ کے سامنے ہیچ اور ناکارہ ثابت ہوئی جرمنی کے پاس ہوائی جہاز اور ٹینک بہت زیادہ تعداد میں تھے اور فرانس کے لئے اس کا مقابلہ کرنا طوفان کے بالمقابل تنکے کی [illegible] مترادف تھا لیکن سوال یہ ہے کہ فرانس نے اپنی فوجی طاقت سے غفلت کیوں برتی؟ جنرل ڈیگال نے مارشل پیتاں کو خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے اور لندن میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے "تم کہتے ہو کہ فرانس کو دشمن کی مشینی طاقت نے مار گرایا لیکن سوال یہ ہے کہ اگر فرانس کے پاس مشینی طاقت نہ تھی تو اس میں قصور کس کا ہے؟ تم ۱۹۱۸ء میں جنگ کے بعد ہمارے فوجی نظام کے صدر تھے تم ۱۹۳۲ء تک ہمارے سپہ سالار رہے تم ۱۹۳۵ء تک وزیر جنگ تھے تم ہمارے ملک کے سب سے بڑے فوجی ماہر تھے کیا تم نے کبھی فرسودہ اور کہنہ نظام جنگ کی اصلاح کا مطالبہ کیا ہے؟" دراصل فرانس و برطانیہ دونوں اس غلط فہمی میں رہے کہ معاہدہ ورسائی نے جرمن عقاب کو بالکل بے دست و پا کر دیا ہے اور اب اس میں دوبارہ اٹھنے کی طاقت نہیں رہی لیکن ہٹلر نے مردہ جرمنی کے قالب میں زندگی کی

طرح چھوڑ کر یہ اور سیگفرڈ لائن کے عقب میں ایک ایسا فتنہ برپا کیا جو بگولے کی طرح اٹھا آندھی کی طرح تمام یورپ پر چھا گیا اور اب ہیبتناک طوفان بن کر بحیرۂ روم اور بحیرۂ اوقیانوس کی موجوں سے الجھنا چاہتا ہے۔

کیا فرانس بچ سکتا تھا؟ اس کا صحیح جواب تو یہ ہے کہ واقعات کی رفتار اور حوادث کے طوفان کو روکنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں جو ہونا تھا وہ ہو گیا لیکن بعض ماہرین کا خیال ہے کہ اگر فرانس اپنی سلطنت کو عارضی طور پر برطانیہ کے ساتھ ملا لیتا تو اس کے بچنے کی کوئی صورت ہو جاتی لیکن یہ بھی محض قیاس ہے اور جیسا کہ فرانسیسی ماہرین کا خیال ہے اس راہ میں عملی مشکلات بھی بہت زیادہ تھیں۔ ہمارے خیال میں فرانس اگر اپنی سلطنت برطانیہ کو نہ بھی تفویض کرتا اور صرف اپنا بحری بیڑہ ہی برطانیہ کو دے دیتا جب بھی اس کے مستقبل کی شمع جھلملاتی رہتی اور کبھی نہ کبھی اس کی قسمت کا ستارہ ضرور اوج پر ہوتا لیکن افسوس مارشل پیتاں نے یہ بھی نہ کیا اور دشمن اس کے تمام وسائل پر قابض ہو گیا حاصل یہ فرانسیسی جرنیلوں کے باہمی اختلافات اور ملک کا نہتہ پن فرانس کو لے ڈوبا اور اب سوال یہ ہے کہ ہم اس کی شکست پر اظہار ماتم کریں اور کیا کر سکتے ہیں؟

اٹلی میدان جنگ میں

گزشتہ اشاعت میں ہم نے لکھا تھا کہ اٹلی کے سیاسی مطلع پر جنگ کی گھٹا ٹوپ گھٹائیں امنڈ امنڈ کر چھا رہی ہیں آخر یہ گھٹائیں ۱۰ جون سنہ ۱۹۴۰ء کو مسولینی کی استعمار پرستانہ گرج کے ساتھ ہی برس پڑیں اور اٹلی بھی میدان جنگ میں کود پڑا۔ اٹلی میدان جنگ میں کیوں کودا؟ اس کی وجوہ کی تفصیل تو بہت لمبی ہے البتہ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۔ اتحادیوں کی اقتصادی ناکہ بندی سے اٹلی بہت برافروختہ ہوا اور اس نے اعلان کر دیا کہ ہم یہ قید و بند برداشت نہیں کر سکتے ۲۔ مسولینی مدت مدید سے روما الکبریٰ کے خواب دیکھ رہا ہے اس کا خیال تھا کہ شاید اس جنگ میں جرمنی کی لوٹ کھسوٹ سے اسے بھی کچھ حصہ مل جائے ۳۔ افریقی نو آبادیاں حاصل کرنے کے لئے وہ ہٹلر کا رستہ صاف کرنا چاہتا تھا۔ یہاں اس کی نظریں نیس، کارسیکا اور تیونس کی طرف اٹھ رہی تھیں اس لئے خیال کیا یہ مقامات حاصل کرنے کے لئے موجودہ جنگ سے بہتر اور کوئی موقع نہیں ۴۔ بحیرۂ روم، شمالی افریقہ اور ممالک عربیہ پر قبضہ جمانا چاہتا تھا اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن تھا کہ فرانس و برطانیہ مشکلات میں مبتلا ہوں۔

قلت گنجائش کے باعث ہم یہاں اٹلی کے مطالبات کی معقولیت پر بحث نہیں کرنا چاہتے البتہ یہ جانتے ہیں کہ اتحادیوں نے اطالوی مطالبات پر غور کرنے کا حتمی وعدہ کیا تھا لیکن مسولینی تو جنگ میں کودنے پر تلا ہوا تھا۔ کوئی ہوشمندانہ گفتگو اسے اپنے وحشیانہ ارادے سے باز نہ رکھ سکتی تھی چنانچہ اٹلی بھی جنگ میں شامل ہو گیا اور مالٹا اور عدن پر کسی قدر بمباری کی لیکن اتحادیوں کے ہاتھوں اسے سخت نقصان اٹھانا پڑا اس کے متعدد جہاز غرق ہوئے اور ابی سینیا اور لیبیا میں رائل ایئر فورس کے جہازوں نے اس کے ہوائی اڈوں اور اہم مقامات کو کافی نقصان پہنچایا اتنے میں جرمنی و فرانس کی صلح ہو گئی اٹلی چونکہ جرمنی کا حلیف تھا اس لئے قرار پایا کہ فرانس اٹلی کے مطالبات کے سامنے بھی سر تسلیم خم کر دے چنانچہ ۲۵ جون کو اطالیہ و فرانس کا بھی معاہدہ ہو گیا جس میں فرانس نے جن توہین آمیز شرائط پر دستخط کئے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

اطالیہ و فرانس کا صلحنامہ

۱۔ فرانس اپنی تمام نو آبادیات اور ممالک محروسہ میں بری، بحری یا ہوائی جنگ فوراً بند کر دے گا۔ ۲۔ صلحنامہ کے بعد اطالوی فوجیں جنگ کے تمام میدانوں میں آگے بڑھنے سے رک جائیں گی۔ ۳۔ فرانسیسی علاقوں میں جہاں اطالوی فوجیں رک جائیں گی وہاں سے پچاس کیلو میٹر تک کا علاقہ غیر معسکر قرار دیا جائے گا۔ ۴۔ الجزائر، لیبیا اور تونس کے سرحدی علاقے فرانسیسی فوجوں سے خالی کر دیئے جائیں گے ۵۔ طولون (فرانس)، بائی زرطہ (فرانس) اجیکسیو (کارسیکا) اور ماہران (الجزائر) کی بندرگاہیں فوجوں اور جنگی ساز و سامان سے

خالی کردی جائیگی۔ ۶۔ جبوتی (فرانسیسی سمالی لینڈ) کی بندرگاہ اٹلی کے حوالے ہو گی اٹلی ان تمام علاقوں کی فوجوں کا پورا ساز و سامان لے سکے گا۔ ۷۔ بعض چھوٹی اور چھوٹی جائز علاوہ دوسرے امور کے متعلق اٹلی کی شرائط وہی ہیں جو جرمنی کی تھیں ـــــ یہ شرائط اپنی تشریح خود کرتی ہیں چنانچہ یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ اطالیہ نے اپنے قریباً تمام مطالبات فرانس سے منوالئے ہیں اور جنگ کی لوٹ کھسوٹ سے جو فائدہ اٹھانا اس کے مدنظر تھا وہ اس نے اٹھا لیا ہے۔

اس معاہدہ کا سب سے افسوسناک پہلو وہ ہے جو فرانسیسی نوآبادیوں کے متعلق ہے خیال تھا کہ یہ نوآبادیاں جرمنی اور اٹلی کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھیں گی لیکن اٹلی نے جنگ فشیر سے بھی بند کرا دیا شام میں کچھ ہنگامہ ہوا تھا لیکن جنرل ویگاں نے یہ چنگاری بھی دبا دی۔

رومانیہ میں روس کی چیرہ دستی

عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ فرانس کی شکست کے بعد روس خاموش ہو جائے گا لیکن وہ اٹلی اور جرمنی کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کیسے دیکھ سکتا تھا اور علی الخصوص جبکہ اتحادیوں کی وجہ سے اپنے انجام کا بھی ڈر ہے اس لئے جنگ کی شورش سے فائدہ اٹھا کر روس نے پہلے تو استھونیا، لٹویا اور لتھونیا کو مجبور کیا کہ وہ اپنے علاقوں میں سرخ فوج کے دستے زیادہ تعداد میں رکھیں اور اس کے بعد اچانک رومانیہ کو الٹی میٹم دیدیا کہ روس کے پرانے صوبے بسربیا اور بکووینا واپس کر دیئے جائیں رومانیہ بے دست و پا تھا انگلستان نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا لیکن جرمن حملہ کے پیش نظر انگلستان اس کی مدد کو نہ آسکا چنانچہ رومانیہ نے چپ چاپ یہ علاقے بالشویک روس کے قبضہ میں دیدیئے۔ بسربیا کی آبادی ۲۸ لاکھ ۶۵ ہزار اور بکووینا کی آبادی ۸ ۱/۲ لاکھ ہے۔ گویا روس کے اس اقدام سے قریباً ۳۷ لاکھ آبادی اور ایک بہت بڑا علاقہ رومانیہ کے ہاتھ سے نکل گیا۔

بالشویک کہتے ہیں کہ بسربیا اور بکووینا چونکہ پہلے بھی روس کے قبضہ میں تھے اس لئے روس کا مطالبہ بالکل جائز ہے حق بحقدار رسید لیکن سلطنت و حکومت کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ یہ ضروری نہیں کہ جو علاقہ ایک دفعہ کسی کے ہاتھ آگیا ہو اس پر ہمیشہ اسی کا قبضہ رہے اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو روس کو بھی بہت سے ایسے علاقوں سے دست بردار ہونا پڑے گا جو پہلے مسلمانوں کے قبضہ میں تھے اور آج کل ان پر روسیوں کا تسلط ہے دراصل لوٹ کھسوٹ کے لئے کسی وجہ جواز کی تلاش کرنا ہی بے سود ہے جو قوم ڈاکہ زنی اور قزاقی پر تلی ہوئی ہو اس کے افعال میں نیکی کا جز تلاش کرنا ببول سے انگور تلاش کرنے کے مترادف ہے۔ رومانیا کی مصیبت بسربیا اور بکووینا کی جدائی پر ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ہنگری اور بلغاریہ بھی اپنے اپنے دعاوی کا لٹھ لیکر کھڑے ہو رہے ہیں۔ ہنگری ٹرانسلوینیا کا علاقہ لینا چاہتا ہے۔ بلغاریہ ڈوبروجہ کی واپسی کا طلبگار ہے ہنگری جو کچھ کریگا جرمنی کے مشورے سے کریگا بلغاریہ بھی جرمنی کے زیر اثر ہی معلوم ہوتا ہے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اگر بلقانی ریاستوں میں پھوٹ پڑ گئی تو رومانیہ اور ہنگری الجھیں گے۔ نیز رومانیہ اتحادی ہو گا۔ یوگوسلافیہ اور یونان کی خیر نظر آتی ہے کیونکہ جرمنی سنبھال لے گا۔ کسی پر اٹلی چڑھ دوڑے گے۔ بہرحال روس کی موجودہ نقل و حرکت سے بلقانی ممالک اور یورپ کا مستقبل بہت تشویشناک ہے۔

امید کی آخری شعاع

بین الاقوامی حالات کے اس مختصر تبصرے سے یہ ظاہر ہے کہ دنیا حرص و آز کا ایک جہنم زار بن چکی ہے اور تہذیب و تمدن کا مستقبل اضطراب و تشویش کے تاریک بادلوں میں پوشیدہ ہے۔ کیا اس اندھیر نگری میں امید کی بھی کوئی روشنی ہے؟ فرانس، برطانیہ اور امریکہ جمہوریت کے سب سے بڑے علمبردار ہیں اور یہی تینوں وحشت و بربریت کی فوجوں کے مقابلہ میں صف آرا تھے۔ ان میں سے فرانس ختم ہو گیا۔ امریکہ کو غالباً یورپی سیاسیات سے کوئی دلچسپی نہیں وہ جنگ سے روپیہ کمانے کی فکر میں ہے۔ باقی رہا انگلستان اس میں ابھی جرات و ہمت کافی ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت صرف برطانیہ ہی ایسا ملک ہے جو مہذب دنیا کو لوٹ کھسوٹ سے بچانے کیلئے انتہائی کوشش کریگا۔ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد یورپ میں کل ۲۷ ملک تھے ان میں سے ۲۰ کسی نہ کسی طرح جرمنی، اٹلی یا روس کے زیر اثر یا زیر اقتدار آگئے باقی سات زیادہ تر بلقانی ریاستوں پر مشتمل ہیں جن کا مستقبل ہم کہہ چکے کہ بہت خطرناک ہے اور وہ بھی جلد یا بدیر روس، جرمنی یا اٹلی کے پنجۂ استبداد میں جکڑے جائیں گے اس طرح گویا صرف برطانیہ ہی ایک ایسا ملک رہ گیا ہے جو دنیا میں تہذیب و تمدن اور جمہوریت و آزادی کا واحد محافظ ہے۔ کیا برطانیہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گا؟ غیب کا علم تو صرف خدا کو ہے البتہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ کی اقتصادی، معاشی و حربی قوت بہت زیادہ ہے اور علی الخصوص فرانس کی شکست کے بعد اس نے اپنی حفاظت کے سامان میں بہت زیادہ اضافہ کر لیا ہے اس لئے یقین کیا جاتا ہے کہ برطانیہ پوری قوت سے لڑے گا اور جرمنی و اطالیہ کی بڑھتی ہوئی شرارت کو جڑوں سے کاٹ کے رکھ دیگا۔

اسلامی ممالک

یہ مہینہ اسلامی ممالک کیلئے بھی بہت تشویش انگیز رہا۔ فرانس کی "اطاعت" کے بعد سوال پیدا ہوا کہ شام کا رویہ کیا ہوگا۔ یہ ملک ترکی کے معاہدہ

اہمیت رکھتا ہے اس لئے جمہوریہ ترکیہ کبھی برداشت نہ کرسکتی تھی کہ شام پر جرمنی یا اٹلی کا تسلط ہوجائے اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ترکی و شام کے نمائندوں کی ایک مشترکہ کانفرنس ہوئی اور ترکی کی وزارت بھی اس مسئلہ پر غور کرچکی ہے لیکن نتیجہ ابھی تک کوئی برآمد نہیں ہوا۔ اسکندرونہ کی حوالگی کے بعد شام فرانس کے لئے بہت زیادہ مفید نہیں رہا۔ اس لئے خیال یہی ہے کہ شام ترکوں کے حوالے کردیا جائے گا برطانیہ بھی اس باب میں ترکوں کا ہمنوا ہے۔

مسولینی نے اعلان کیا تھا کہ مصر پر حملہ نہیں کیا جائے گا لیکن چونکہ سرحدات پر شورش تھی اس لئے مصر نے بھی جنگ میں حصہ لینا شروع کردیا ہے۔ بعض لوگوں نے خیال کیا کہ مصر شاید برطانیہ کی شہ پر لڑرہا ہے اور غالباً اسی وجہ سے علی ماہر پاشا نے وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دیدیا۔ شاہ فاروق نے نحاس پاشا کو وزارت مرتب کرنے کی دعوت دی لیکن انہوں نے انکار کردیا آخر حسن صبری پاشا نے جو پہلے لندن میں مصری سفیر اور وزیر حرب بھی رہ چکے ہیں مصر کی نئی وزارت مرتب کی۔ اٹلی کی موجودہ روش نے شمالی افریقہ کے اسلامی ممالک میں بھی بیداری کی لہر پیدا کردی ہے اور کوئی عجب نہیں کہ ان کا عمل وجہاد ان ممالک کی غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھینکے۔ مثلاً طرابلس میں اطالوی قوتوں نے "سنوسی جہاد" کا آتش کدہ نہایت بیدردی سے دبادیا تھا لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ موجودہ جنگ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سنوسی دوبارہ نہ اٹھ کھڑے ہونگے اور شمالی افریقہ میں مسولینی کی رہی سہی تمناؤں پر پانی نہ پھیر دینگے چنانچہ سیدی محمد الادریس السنوسی نے اپنے آپ کو مصر میں اطالویوں کے خلاف لڑنے کے لئے پیش بھی کردیا ہے۔

اٹلی کی نظریں بحیرۂ احمر کے ساحلی علاقہ اور علی الخصوص یمن پر بھی ہیں کیونکہ یہاں قابض ہوکر وہ شمالی افریقہ میں اپنے قدم باسانی جما سکتا ہے اور دیگر ممالک عربیہ کے "سیال سونے" سے بھی مستفید ہوسکتا ہے۔ الغرض جنگ کے موجودہ مرحلے پر اسلامی ممالک کا مستقبل بھی خطرہ سے خالی نہیں۔

سیاسیات ہند

اطالیہ کے جنگ میں شامل ہونے سے جنگ ہندوستان کے عین دروازے پر آچکی ہے چنانچہ ابھی چند دن ہوئے بحر ہند میں ایک اطالوی کا بدوز پکڑی گئی ہے اور "پٹھان" نامی ایک جہاز بھی غرق ہوچکا ہے۔ پھر روس کی طرف سے ہر وقت ہوائی حملہ کا خطرہ ہے ان خوفناک حالات میں ہندوستان کے آئینی تعطل کو دور کرنے اور مختلف اقوام میں اتحاد و تعاون کی روح پھونکنے کی جتنی ضرورت ہے اتنی کبھی نہ ہوئی ہوگی ہز ایکسی لینسی وائسرائے ہند نے ایک مرتبہ پھر مسٹر جناح اور مسٹر گاندھی سے ملاقات کی۔ لیکن اس گفت و شنید کا نتیجہ کیا برآمد ہوا؟ اس کا ابھی تک علم نہیں ہوسکا۔ تاہم حالات امید افزا نظر نہیں آتے۔ چونکہ خطرہ تھا کہ کسی وقت انگلستان اور ہندوستان کے درمیان آمد و پیام کے وسائل منقطع ہوجائیں اس لئے پارلیمنٹ نے وائسرائے کو ہنگامی اختیارات دیدیئے ہیں۔ حکومت ہند نے ہندوستان کو اپنی حفاظت کے لئے زیادہ سے زیادہ تیار کرنے کی غرض سے ایسے احکام صادر کئے ہیں جن کی رو سے ۱۔ ملک کی صلاحیت کے مطابق زیادہ سے زیادہ دفاعی افواج کو جنگی اور ان کے لئے ضروری ساز و سامان مہیا کیا جائے گا۔ ۲۔ ٹیریٹوریل فورس اور ہندوستانی ریاستوں کی فوجوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے گا۔ ۳۔ ہندوستانی ہوائی فوج کے مزید دستوں کے قیام انتخاب اور تربیت کا کام فوراً شروع کیا جائے گا۔ ۴۔ جدید بری افواج میں مشین کا استعمال زیادہ کیا جائے گا۔ ۵۔ ملک میں زیادہ سے زیادہ جنگی ساز و سامان تیار کیا جائیگا چنانچہ یورپینوں اور مستریوں کی جبری بھرتی کا اعلان ہوگیا ہے۔

اندرونی حفاظت کے لئے حکومت نے شہری پہرہ داروں کی رضاکارانہ طور پر تنظیم کا اعلان کیا ہے اس مقصد کے لئے تمام صوبوں میں "وار بورڈ" یا جنگی کمیٹیاں قائم کی جائینگی۔ کانگرس اور مسلم لیگ نے ان کمیٹیوں سے عدم تعاون کا فیصلہ کیا ہے۔

ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت تمام ایسے لوگوں کو گرفتار کیا جارہا ہے جو کسی نہ کسی جہت سے دشمن کے لئے مفید ثابت ہوسکتے ہیں مثلاً پنجاب میں خاکساروں، ان کے ہمدردوں اور کمیونسٹ ورکروں کو اور صوبہ بنگال میں مسٹر سبھاش چندر بوس کو اسی قانون کی ماتحت گرفتار کیا گیا ہے۔

لاہور۔ یکم جولائی ۱۹۴۰ء

ضروری اطلاع

رسالہ عالمگیر عموماً ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوتا ہے اور متعدد بار چیک کرنے کے بعد نہایت احتیاط سے سپرد ڈاک کیا جاتا ہے۔ پھر بھی ہر ماہ ہمیں متعدد خطوط موصول ہوتے ہیں کہ پرچہ نہیں ملا۔ قارئین ایک ہفتہ انتظار کرکے اپنے مقامی ڈاکخانہ کو بھی تنبیہ کریں اور پھر پرچہ کے لئے ہمیں لکھیں۔ بعض حضرات یکم تاریخ ہی سے خط لکھنے لگتے ہیں کہ پرچہ نہیں پہنچا وہ حضرات مطلع رہیں کہ پرچہ پہلے ہفتہ کی کسی نہ کسی تاریخ کو یہاں سے روانہ کیا جاتا ہے۔

خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا لکھنا اشد ضروری ہے۔

فولادی

رستم کو رستم زماں بنانے والی اکسیر

مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کی بیاض کا نادر نسخہ

جسے

عالیجناب مسیح الملک حکیم جمیل خاں صاحب رئیس اعظم

جدید سائنٹفک طریقہ پر ترمیم کر کے سہل الاستعمال اور زود اثر بنا دیا ہے۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے اپنی سیاحت عالم کے دوران میں ایک عجیب غریب نسخہ کا پتہ لگایا ہے

جو

رستم اور سہراب کی طاقت کا ضامن ہے

اور سلاطین عالم کی لاثانی قوت کا بھید تھا۔ اجمل خاں اعظم نے اس نسخہ کے نادر اجزا سے ایک معجون تیار کی

یہ نواب صاحب رامپور اور مہاراجہ پٹیالہ کی پسندیدہ معجون تھی جو اکثر والیان ریاست کے استعمال میں رہی مسیح الملک حکیم جمیل خاں صاحب رئیس اعظم نے اس معجون کو جو صرف رؤسا کے استعمال کیلئے خاص طور پر تیار ہوتی تھی جدید اصول پر ترتیب دیکر زیادہ پر اثر بنا کر قرصوں کی شکل میں تبدیل کر دیا اور رفاہ عام کیلئے ہندوستانی دواخانہ کو مرحمت فرما دی۔ اب یہ

فولادی قوت پیدا کرنے والی اکسیر

جو قوت باہ کی لاثانی دوا ہے اعضائے رئیسہ میں حیرت انگیز قوت پیدا کرتی ہے

اعصاب کو طاقت بخشتی ہے بدن میں قوت، دل میں جوش، جسم میں چستی اور چہرہ پر رونق پیدا کرتی ہے

سال نو کا لاثانی تحفہ

فولادی سے جوانی کی طاقت، ولولہ اور جوش شباب کچھ پیدا کرتی ہے اس سے جوانی کی امنگیں از سر نو پیدا ہوتی ہیں اور

چند روز استعمال سے

بوڑھے بھی جوان ہو جاتے ہیں!

قیمت:- نو قرص دوا نے ۲ روپیہ، ۱۰ یوم کی مکمل خوراک ۲۰ قرص کی سربند شیشی ہے۔ صبح دو قرص دودھ کے ساتھ کھلائے جاتے ہیں۔

منیجر ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس ۲۴ دہلی

تار کا پتہ: ہندوستانی دہلی — ٹیلیفون نمبر ۵۵۴۲۲

[illegible]

اخبار و افکار

ادارہ

امپیریل لائبریری کی رپورٹ

امپیریل لائبریری کلکتہ کی سالانہ رپورٹ (بابت سنہ ۱۹۳۹ء - ۱۹۳۸ء) شائع ہوئی ہے جس پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سال زیر تبصرہ میں ۱۱۱۰۹ کتابیں لوگوں کو پڑھنے کے لئے دی گئیں۔ اس سے پہلے سال میں ۱۱۸۰۸ کتابیں دی گئی تھیں۔ عوام کے علمی مذاق کا اندازہ ان کتابوں سے ہوسکتا ہے کہ جو پڑھنے کے لئے حاصل کی جاتی ہیں۔ اس معیار کے مطابق پہلے کی طرح اب بھی ادبیات کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہے اس کے بعد تاریخ کا نمبر آتا ہے سنہ ۳۷ء میں تاریخ کی کتابیں کم کردی گئی تھیں لیکن قانونی کتابوں کے مقابلہ میں تاریخ کی کتابیں اب کے زیادہ تعداد میں مانگی گئیں۔ ملک کی موجودہ سیاسی بیداری کے پیش نظر ظاہر ہے کہ دوسرے مضامین کے مقابلہ میں تاریخ کو ترجیح دی جاتی ہے تیسرا نمبر انجینیرنگ کی کتابوں کا ہے اس کے بعد جغرافیہ اور سیاحت کی کتابیں ہیں۔ رسالوں کو پانچواں نمبر حاصل ہوگیا ہے حالانکہ پچھلے چند سالوں میں رسالوں کا نام ابتدائی دس عنوانات کی فہرست میں بھی نہ آتا تھا۔

علم الارضیات کو ساتواں درجہ حاصل ہے۔ تعلیم دو درجہ گھٹ کر آٹھویں نمبر پر آگئی ہے۔ پہلے دس عنوانات میں ایک نیا اضافہ سوانح کا ہوا ہے اور علم الادویہ کا دسواں نمبر ہے۔

بعض مضامین کی بہت زیادہ کتابیں مانگی گئیں۔ ریڈنگ روم میں کل ۱۶۴۷۲ آدمی آئے۔ گزشتہ سال ۴۳۵۷۶ آدمی آئے تھے۔ روزانہ آنے والوں کا اوسط ۲۰۶ رہا۔ گزشتہ سال اوسطاً ۱۹۰ آدمی روزانہ آئے تھے لائبریری میں مختلف قسم کی ۷۰۰۱ کتابوں کا اضافہ ہوا۔ گزشتہ سال ۶۷۶۸ کتابوں کا اضافہ ہوا تھا گویا اس سال ۱۳۰۲ کتابیں زیادہ آئیں۔

ان اعداد و شمار سے جہاں لائبریری کے وسیع حلقۂ عمل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے وہاں یہ حقیقت بھی بے نقاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ بنگال کے اہل علم ادبیات کی طرف بہت زیادہ مائل ہیں۔ ادبیات کے بعد تاریخی کتب کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے لیکن یہ چیز بھی ادبیات کے وسیع حلقہ سے خارج نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بنگالی دماغ کا رجحان ادبیات کی طرف ہے۔ رپورٹ کا جو خلاصہ ہمارے سامنے ہے اس میں کتابوں کی لسانی تقسیم کا تذکرہ نہیں اس لئے یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ بنگال میں کس زبان کو زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ بہرحال لائبریری کی رپورٹ حد درجہ حوصلہ افزا ہے۔

علماء اور اُردو

تمہارا امت کا ہر فیصلہ مسلمانوں کے لئے باعث تقلید ہوتا ہے یہ جانشینان رسول ملت کی نبضیں ہیں جن کی حرکت سے قوم کی زندگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے لیکن قوم چونکہ نیم مُردہ ہو رہی ہے اس لئے قوم کی نبض بھی خلل پذیر ہوئے بغیر نہ رہی چنانچہ جمعیت علمائے ہند کا ایک اجلاس جو پٹنہ میں منعقد ہوا جس کے لئے ہندی رسم الخط میں اشتہار شائع کیا گیا لیکن ہمارے دینی رہنماؤں نے صرف غیر اسلامی اور غیر قومی رسم الخط ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حروف کے قالب میں جو لسانی روح پھونکی وہ بالکل "سنسکرتی زمانہ" کی یادگار معلوم ہوتی ہے چند جملے ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) ریلوے اسٹیشن سے سبھاپتی کا جلوس نکلے گا۔ (۲) ۸ جون کو صبح آٹھ بجے اجرا سوین سیوک سمیلن شروع ہوگا۔ (۳) ۹ جون کو جمعیت علماء کا کھلا ادھیویشن ہوگا۔

سبحان اللہ یہ سبھاپتی۔ سوین سیوک سمیلن اور ادھیویشن کے جناتی الفاظ ان حضرات کی زبان "شریعت ترجمان" سے ادا ہوئے ہو رہے ہیں جو ہر چیز کو قال اللہ و قال الرسول کے معیار پر پرکھتے ہیں۔ ہم سوء ادب کے ڈر سے علماء کرام کی دکھتی ہوئی رگ نہیں چھیڑنا چاہتے ورنہ بصد احترام پوچھتے کہ کیوں حضرات اگر سرسید احمد خاں آپ کے فتاویٰ کی روشنی میں غیر اسلامی رسم الخط اور غیر اسلامی زبان کو فروغ دینے کے جرم میں کافر، ملحد اور بے دین تھے تو آپ اپنے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ کیا ایک اسلامی جلسہ کی منادی ہندی زبان و حروف میں کرنا سرسید کے مزعومہ "کافرانہ فعل" کا اعادہ نہیں، ہم حدیث نبوی کی روشنی میں یہ بھی کہنا نہیں چاہتے کہ "جو کسی قوم کی تشبیہ بنے گا وہ انہی میں سے ہوگا" ہم یہ بھی کہنے کی جسارت نہیں کرسکتے کہ آپ حضرات کی پرورش تو ہوتی ہے مسلمانوں کی روٹیوں سے لیکن کام کرتے ہیں نامسلمانوں کی حمایت میں۔ ہم تو صرف اس قدر عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ آپ کانگرس میں اس لئے گئے تھے کہ غیر مسلم کارکنوں کو اسلام کے اوصاف و محاسن بتا کر دین فطرت کی طرف لائیں۔ لیکن "جو کان نمک"

عالمگیر جنگ کے بعد تازہ ترین اور قابلِ قدر کتابیں!

دنیائے اسلام ماضی و مستقبل

اسلامی تاریخ پر سینکڑوں کتابیں غالباً لکھی گئی ہیں لیکن سیاسی کتاب جس سے ملکی تاریخ کی سیاسی رفتار بتائی جائے ابھی نہیں لکھی گئی تھی۔ اس ضرورت کو مصنف نے پورا کیا ہے۔ اس میں تمام اسلامی ممالک، ترکی، ایران، مصر، مراکش، الجزائر، تونس، طرابلس، حجاز، عراق، نجد، فلسطین، یمن، سعودی عرب، شام، افغانستان کی تاریخ سیاسی انقلابات کی روشنی میں لکھی ہے۔ واقعات و معلومات سے لبریز کیا گیا ہے۔ موجودہ انقلاب انگیز دور میں اسلامی ممالک کی راہِ عمل کیا ہے اور جنگ کے بعد ان ملکوں کے مستقبل کی تعمیر ہونی ہے اس میں سامان کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب اس علمی طرزِ نگارش کی آئینہ دار ہے جو تاریخ و سیاست کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔ خشک حقیقتوں کو ادبی لطافت کے گلفشاں لباس میں پیش کیا گیا ہے۔ ریاست، تاریخ، تنقید اور ادب کا اتنا جامع مجموعہ آپ کی نظر سے نہ گزرا ہوگا۔ مصنف مولانا اختر امرتسری سابق مدیر زمیندار۔ کتاب کی خوبیاں مصنف کے نام ہی سے ظاہر ہیں۔ کاغذ لکھائی چھپائی اور ترتیب دلکش۔ جلد رنگین و نظر افروز۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے علاوہ محصول ڈاک۔

روپ متی اور باز بہادر

باز بہادر اور روپ متی کا افسانۂ محبت تاریخِ ہندوستان کا وہ رومان انگیز واقعہ ہے جس کا ذکر لطف و حسن و محبت کے ہنگامہ کا مظہر ہے۔ لیکن یہ رنگین داستان ہندوستان کی تاریخ کا ایک مرقع ہی تھا۔ اسی کو اختر صاحب عابدی کے خامہ سحر آفریں نے از سرِ نو تازگی بخشی ہے۔ اختر صاحب کا یہ ڈرامہ تاریخی حقیقت کو حسن و عشق کی رنگینیوں افسانوی رنگ اور دنیا کی سچائیوں کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ڈرامہ فنی اعتبار سے ایک شاہکار تصنیف ہے جس کے مطالعہ سے کسی صاحبِ ذوق کو محروم نہیں رہنا چاہیے۔ جلد نظر افروز۔ قیمت ایک روپیہ۔

ماہ و انجم

مختصر افسانہ کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد ہی مطالب کا آغاز ہو، انسانی ذہن اور دماغ کی چھپی ہوئی حقیقتیں سامنے آئیں۔ سوسائٹی اور معاشرت کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ اور حسن و محبت، ناز و نیاز اور سوز و گداز دامانِ احساس میں دکھایا جائے۔ اگر آپ اس قسم کے جامع الصفات افسانے پڑھنا چاہتے ہیں تو "ماہ و انجم" کا مطالعہ کیجئے۔ یہ کتاب حضرت کوثر چاند پوری کے دماغِ آفرینش کی تخلیقات پر مشتمل ہے۔ ہر افسانہ نیاز عشق اور ناز حسن کی بولتی چالتی تصویر ہے۔ زبان سلیس اور عام فہم۔ انداز بیان منفرد گداز میں ڈوبا ہوا۔ "ماہ و انجم" کی ہر سطر ان کیفیات قلبی کی آئینہ دار ہے جن کا بیان بے اختیار چھپنے والے سنسنوں سے کیا جا سکتا ہے لیکن زبان و گفتار اس کے اظہار سے قاصر ہے۔ جلد جاذبِ توجہ۔ طباعت و کتابت عمدہ۔ کاغذ شاندار۔ قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے۔

تاج شاہی عشق کے قدموں میں!

شاہانِ یورپ کی عہد اندیشی محتاجِ تشریح نہیں لیکن جب عشق اسیر کر کے شاہانِ کشاں کشاں محبت میں لے جاتا ہے تو تاجِ شاہی حسن کے قدموں میں پڑا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ بات افسانہ نہیں، کہانی نہیں، حکایت نہیں بلکہ ایک زندہ جاوید تاریخی حقیقت ہے۔ "تاجِ شاہی عشق کے قدموں میں" کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اس کتاب میں روس، آسٹریا، سوئیڈن، ہنگری، ہسپانیہ، انگلستان اور دوسرے یورپی بادشاہوں کی محبت کے سچے افسانے درج ہیں۔ ہر افسانہ تاریخی حقائق سے لبریز اور سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے۔ آئینہ دارِ وقارِ شاہی کی عشق و حسن پر بے بسی دیکھیے۔ کاغذ، کتابت، طباعت نہایت عمدہ۔

... علمی و ادبی رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے!

جلد ۳۴ فہرست مضامین ماہ ستمبر [illegible] شمارہ ۴

مقالات مدیری

علمی و ادبی مضامین

افسانے اور ڈرامے

منظومات

...کفایت اس نقشے کو ترک کر دیا گیا۔ اور اس نقشے کی جگہ ایک سوال نے
...لی جو ملازمت کے متعلق تھا۔ اس سوال نے جو دقتیں پیدا کیں (خصوصاً
...متعدد ترجموں کی صورت میں) انھوں نے جواب کی قدر و قیمت گھٹا دی۔
...نتیجہ یہ ہوا کہ کفایت کے خیال سے ان جوابات کو نقشہ کی شکل میں نہیں
...پیش کیا گیا۔ موجودہ سوال کہ "اگر تم کسی اور کے ملازم ہو تو اس کا کاروبار

۴۔ مذہب
۵۔ شادی شدہ، غیر شادی شدہ، بیوہ، یا مطلقہ۔
۶۔ عمر
۷۔ تعداد اولاد (جو اس وقت تک شادی شدہ عورت کے ہوئی ہوں)
۸۔ پہلا بچہ ہونے کے وقت عورت کی عمر کیا تھی؟

ملاحظات

اس میں شک نہیں کہ کاغذ اور سامان طباعت ناقابل برداشت حد تک گراں ہو چکے ہیں اور اکثر رسائل و جرائد نے اپنے خاص نمبروں اور سالناموں کی اشاعت ملتوی کر دی ہے لیکن خدا تعالےٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ رکھتے ہوئے ہم یہ اعلان کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں کہ رسالہ عالمگیر کا ہنگامہ خیز خاص نمبر اپنی تمامتر روایتی خصوصیات کے ساتھ اوائل دسمبر میں مطلع اشاعت پر جلوہ گر ہوگا اور نامساعد حالات کا اس کی ظاہری و معنوی حیثیت پر کوئی ناخوشگوار اثر نہیں ہوگا۔ عالمگیر کے تمام مستقل قلمی معاونین سے درخواست ہے کہ وہ اپنے اپنے جواہر افکار **زیادہ سے زیادہ ۱۵ ر اکتوبر ۱۹۴۲ء تک** دفتر میں بھجوا دیں تاکہ ان کی کتابت و طباعت اطمینان سے ہو سکے اس تاریخ کے بعد موصول ہونے والے مضامین نظم و نثر کی اشاعت ممکن نہ ہو سکے گی۔ قارئین یہ سن کر خوش ہوں گے کہ خاص نمبر کے لئے بالکل تازہ اور اعلیٰ پایہ کی تصاویر کا انتخاب عمل میں آچکا ہے اور ٹائٹل بھی بےحد دیدہ زیب تیار کرایا گیا ہے۔

زیرِ نظر اشاعت میں سید اخلاق حسین صاحب رضوی کا ایک شاندار افسانہ "رقص شیطانی" کے عنوان سے شایع ہو رہا ہے اردو میں جنگل کی کہانیوں کی جس قدر کمی ہے۔ وہ قارئین کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رضوی صاحب نے یہ افسانہ لکھ کر اردو ادب کا ایک بہت بڑا خلا پُر کیا ہے، اس کہانی میں فاضل افسانہ نویس نے جنگل ہاتھیوں کی نفسیات کا نہایت عمدگی سے تجزیہ کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ اگر ایک طرف خانہ بدوش قبیلوں میں باہمی رقابت پائی جاتی ہے تو دوسری طرف ان آزاد منش لوگوں کی بیویاں بھی بہت جاں نثار اور بے لوث قربانیاں کرنے والی ہوتی ہیں

خاص نمبر عالمگیر کی آمد آمد

از:- ادارہ

جناب رفعت ہاشمی نے حسن و عشق کے عنوان سے سندھی کا ایک دلچسپ پارۂ ادب پیش کیا ہے۔

سید ارشاد حسین صاحب ازہر کا افسانہ "گومتی کے ساحل پر" بہت دلگداز ہے اور اس میں ایک مصیبت زدہ عورت کے جذبات کی تصویر کشی نہایت عمدگی سے کی گئی ہے۔

مولانا عبدالقیوم ندوی عربی ادب کے معلومات افزا پہلوؤں پر دلچسپ مضامین لکھتے رہتے ہیں اس اشاعت میں آپ نے پہلی صدی ہجری کے ایک سحر طراز ادیب عبدالحمید کاتب کے حالات لکھے ہیں۔

الیگزنڈر پشکن روس کا معجز نگار افسانہ نویس ہے جناب سید ... نے پشکن کے ایک شجاعت آموز افسانے کا ترجمہ پیش کیا ہے۔

نازی دستور اساسی کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ جرمنی کی حکومت کس حد تک آمرانہ ہے؟

نائک بیجو باورہ۔ عہد مغلیہ کا ایک بہت بڑا گائیک تھا۔ جناب امجد یوسف زئی مستحق تبریک ہیں کہ انھوں نے باورا کے دلچسپ حالات لکھ کر عالمگیر کے لئے ارسال فرمائے۔

جناب محمد یونس احمر نے بنگالی کے ایک دلگداز افسانے کا ترجمہ بھیجکر ہمیں ممنون فرمایا ہے۔

منظومات کی کامیابی کے لئے۔ شفق رضوی۔ ماہر القادری۔ فہ... جالندھری۔ آرزو سہارنپوری۔ عاصم جے پوری۔ کوکب شاہجہانپوری اور سید محمد عسکری طباطبائی کے نام ہی کافی سے زیادہ ضامن ہیں۔

ہمارے محترم دوست، مایہ ناز ادیب شاعر اور عالمگیر کے قلمی معاون خصوصی حضرت اطہر امرتسری ان دنوں آنکھوں کی تکلیف کے باعث ...

مینجر شاہجہاں محل ہوٹل۔ پلٹن روڈ۔ کرافورڈ مارکیٹ۔ بمبئی نمبر (۱)

اخبار و افکار

ہندوستان کی مردم شماری ۱۹۴۱ء

انر :— ادارہ

اس سے قبل ہم ایک شندہ "مردم شماری" پر عالمگیر کی کسی گزشتہ اشاعت میں سپردِ قلم کر چکے ہیں۔ اب معلوم ہوا ہے کہ کل ہند کی آٹھویں مردم شماری میں جو مسٹر ایم۔ ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ایم۔ ییٹس سنسس کمشنر کی زیرِ نگرانی ۱۹۴۱ء کے ابتدائی موسم سرما میں ہوگی۔ ذرائع معاش کے مختلف پہلوؤں مثلاً جزوی دست نگری۔ افراد خاندان کا عملی حصۂ کار۔ بے روزگاری۔ تعلیم یافتہ طبقہ کی بیروزگاری۔ فصلی و عارضی بیکاری اور اس طرح کے دوسرے مسائل کی کافی چھان بین کی جائے گی اور ایک دوسرے سے مربوط پیشوں یا منظم حرفت کے سوال کو بھی حل کرنے کی کوشش کی جائیگی۔

ذرائع معاش کے سوال کے جواب کے سلسلے میں اس طرح کی مبہم اصطلاحات جیسے "ملازمت"۔ "تجربہ" یا "مزدوری" ترک کر دیئے جائیں گے۔ مثلاً مزدوری کے بارے میں یہ صراحت کر دی جائے گی کہ یہ مزدوری کاشت یا کوئلہ کی کان یا جوٹ کے کارخانے یا روئی کے کارخانے یا لاکھ کی حرفت یا مٹی کے کام کے سلسلے میں ہے۔ زراعت کے بارے میں اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ ان لوگوں میں امتیاز کیا جائے جو خود جوتتے بوتے نہیں ہیں یا خود جو اپنی زمین پر کاشت کرتے ہیں۔ جو لگان کی زمین لے کر کاشت کرتے ہیں اور جو محض کرایہ کے مزدوروں کی حیثیت سے کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان اشیاء کو جنھیں وہ بیچتا ہے خود ہی بناتا ہے تو اس کا اندراج ان اشیاء کے "بنانے یا بیچنے والے" کی حیثیت سے کیا جائیگا۔

گزشتہ برسوں میں حرفتی معلومات ایک علیحدہ نقشے کے ذریعہ سے حاصل کی جاتی تھیں اور جو بہت پیچیدہ ہوتا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں بہ نظر سہولت و کفایت اس نقشے کو ترک کر دیا گیا۔ اور اس نقشے کی جگہ ایک سوال رکھا گیا جو منظم حرفت کے متعلق تھا۔ اس سوال نے جو دقتیں پیدا کیں (خصوصاً متعدد ترجموں کی صورت میں) انھوں نے جواب کی قدر و قیمت گھٹا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کفایت کے خیال سے ان جوابات کو نقشہ کی شکل میں نہیں پیش کیا گیا۔ موجودہ سوال کہ "اگر تم کسی ادارے کے ملازم ہو تو اس کا کاروبار کس قسم کا ہے"۔ اس ڈھنگ پر اس غرض سے بنایا گیا ہے کہ خود مردم شماری کرنے والا مفہوم کو زیادہ سے زیادہ سمجھ سکے۔

ایک شادی شدہ عورت کی اولاد کی تعداد معلوم کرنا اور یہ معلوم کرنا کہ اس کی پہلی اولاد کس عمر میں ہوئی تھی شرح افزائش نسل کے اہم مسئلہ کے قریب پہنچا دیتا ہے اس کا پتہ چلانا ہر ملک کے لئے ضروری ہے خصوصاً ایسے ممالک کے لئے جن کی آبادی ایک حال پر قائم ہے یا برابر گھٹ رہی ہے۔ بہرحال یہ سوال ہندوستان جیسے ملک کے لئے بھی کچھ کم ضروری نہیں ہے۔ پچھلی مردم شماری کے موقع پر ایک ایسے سوال کے ذریعے اس قسم کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ جس کا جواب دینا یا نہ دینا محض خود اختیاری تھا۔ مردم شماری کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنے کا صرف ایک ہی قابل اطمینان طریقہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ اس غرض کے لئے چند آسان اور قابل قبول سوالات مردم شماری کی عام سکیم میں شامل کر لئے جائیں لہذا اب یہ سوالات اس ڈھنگ پر بنائے گئے ہیں کہ شوہر یا باپ سے بہ آسانی جوابات حاصل ہو سکیں۔ عورتوں سے اس بارے میں مطلق کوئی سوال جواب نہ کیا جائے گا۔

تمام سوالات اس اصول پر ترتیب دیئے گئے ہیں کہ خود مردم شماری کرنے والے شخص کے ذہن میں بہ آسانی اتر سکیں۔ اگر وہ خود ان سوالات کو سمجھ سکتا ہے جو وہ دوسروں سے کرتا ہے تو وہ ضرور کسی حد تک اس قابل ہوگا کہ وہ دوسروں سے تسلی بخش اور معقول جواب حاصل کر سکیگا۔

حسب ذیل سوالات ترتیب دیئے گئے ہیں۔

۱۔ نام
۲۔ جنس
۳۔ نسل، قبیلہ، ذات،
۴۔ مذہب
۵۔ شادی شدہ، غیر شادی شدہ، بیوہ، یا مطلقہ۔
۶۔ عمر
۷۔ تعداد اولاد (جو اس وقت تک شادی شدہ عورت کے ہوئی ہوں)
۸۔ پہلا بچہ ہونے کے وقت عورت کی عمر کیا تھی؟

۹- کیا آپ کسی اور کے سہارے مطلقاً یا جزوی زندگی بسر کر رہے ہیں؟

۱۰- اگر ایسا ہے تو اس شخص کا ذریعہ معاش کیا ہے؟

۱۱- کیا آپ (الف) تنخواہ دار مددگار (ب) افراد خاندان کو کام پر لگائے ہوئے ہیں اگر ایسا ہے تو کتنے کو؟

۱۲- کیا آپ اس وقت کام سے لگے ہوئے ہیں۔

۱۳- (صرف ان لوگوں کے لئے جو سوال نمبر ۱۲ کا جواب نفی میں دیں) کیا آپ کام کی تلاش میں ہیں؟

(جو اس سوال کا جواب اثبات میں دیں ان سے مزید سوال کیا جائے)

۱۴- ذرایع معاش اہمیت کے مطابق ترتیب کے ساتھ۔

۱۵- (ذرائع معاش کے سلسلے میں صرف ان لوگوں سے جنھوں نے سوال نمبر ۹ کے ماتحت اپنے کو جزوی طور پر دوسروں کا دست نگر بتایا ہے یا جنھوں نے سوال نمبر ۱۴ کے ماتحت معاش کے دوسرے معاون ذرائع بتائے ہیں) کیا معاش کا ذریعہ پورے سال قائم رہتا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو سال کے کس حصہ میں قائم رہتا ہے؟

۱۶- اگر آپ کسی اور کے ملازم ہیں تو وہ دوسرا شخص جس کے آپ ملازم ہیں کیا کاروبار کرتا ہے؟

۱۷- کیا آپ اس ضلع میں پیدا ہوئے تھے؟ اگر نہیں تو کس ضلع میں۔

۱۸- مادری زبان

۱۹- دوسری مستعمل ہندوستانی زبانیں۔

۲۰- کیا آپ پڑھ لکھ سکتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو آپ کون سا رسم الخط استعمال کرتے ہیں؟

۲۱- آپ نے کہاں تک پڑھا ہے؟ کوئی امتحان جو پاس کیا ہو بتایئے۔

۲۲- کیا آپ انگریزی پڑھے ہوئے ہیں؟

ان میں سے زبان کا خانہ سب سے اہم ہے۔ قارئین عالمگیر کو چاہیئے کہ وہ اس کے پُر کرنے اور کرانے میں خاص توجہ سے کام لیں ورنہ ان کا یہ دعویٰ کہ صرف اُردو ہی ہندوستان کا واحد ذریعہ اظہار ہے اعداد و شمار کی رو سے ثابت نہ ہو سکیگا۔

پتہ اُردو میں یا انگریزی میں؟

کلکتہ اور بمبئی سے جن کے مغربا ہمیں اکثر لکھتے رہتے ہیں کہ ان کے نام کی ڈاک پر پتہ اُردو کی بجائے انگریزی میں لکھا جائے اس سلسلہ میں انجمن ترقی اُردو ہند کا مندرجہ ذیل تشذرہ "خاص طور پر قابل توجہ ہے:-

"ڈاک کے محکمہ سے یہ عام شکایت ہے کہ اُردو میں لکھے ہوئے پتوں کے خط اور پارسل وغیرہ دیر سے پہنچائے جاتے ہیں۔ پتہ اُردو زبان میں لکھے ہونے کی وجہ سے وہ خط ڈیڈ لیٹر آفس میں بھیجدیئے جاتے ہیں اور وہاں مقام کا نام انگریزی میں لکھا جاتا ہے۔ اس صورت سے دو تین دن کی دیر ہو جاتی ہے۔ صوبہ بمبئی کے ڈاکخانوں میں یہ طریقہ بہت عام تھا، اور اس کی وجہ سے اُردو والوں کو بڑی زحمت کا سامنا ہوتا تھا چنانچہ مسٹر کے۔ اے۔ صدیقی (نہاد بمبئی) نے اس کی شکایت پوسٹ ماسٹر جنرل بمبئی سے کی اور یہ جواب ملا کہ "اُردو اس صوبہ کی زبان نہیں ہے" مسٹر صدیقی نے صوبہ بمبئی کے ڈائرکٹر آف انفارمیشن سے اس بارے میں استفسار کیا اور یہ جواب ملا کہ "اُردو اس صوبہ کی تسلیم شدہ زبانوں میں داخل ہے"

مسٹر صدیقی نے حکومت بمبئی کے اس جواب کا حوالہ دے کر پوسٹ ماسٹر جنرل بمبئی کو پھر ایک خط لکھا جس میں بمبئی کے محکمہ ڈاک کی اس غفلت پر اظہار افسوس کیا گیا تھا اور یہ درخواست کی گئی تھی کہ آئندہ سے محکمہ ڈاک میں اُردو زبان کا واجبی لحاظ رکھا جائے۔

اس خط کے جواب میں پوسٹ ماسٹر جنرل کی طرف سے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ یہ انتظام کیا جا رہا ہے کہ ان ڈاکخانوں کے نام جہاں کے لئے کوئی خط یا پارسل وغیرہ بھیجے گئے ہیں اس ڈاکخانہ ہی میں جہاں سے ان کو ڈاک کے سپرد کیا گیا ہے انگریزی میں لکھ دیئے جایا کریں تاکہ وہ اشیا براہ راست اپنی منزل پر پہنچ جائیں اور ان کو ڈیڈ لیٹر آفس تک بھیجنے کی ضرورت نہ ہو۔ پوسٹ ماسٹر جنرل بمبئی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا بھی انتظام ہو رہا ہے کہ جہاں تک ممکن ہوگا حسب ضرورت چند اردو جاننے والے ملازمین ڈاکخانوں میں رکھے جائیں اس انتظام میں کچھ دیر ہوگی لیکن اس کے مکمل ہونے کے بعد امید ہے کہ ایسی شکایتوں کا موقع نہ آئیگا۔

مسٹر صدیقی قابل مبارکباد ہیں کہ ان کی کوشش اس حد تک بار آور ہوئی اب بمبئی کے اُردو والوں کا فرض ہے کہ ڈاک کے ذریعے بھیجی جانے والی اشیا پر ہمیشہ اُردو ہی میں پتے لکھا کریں تاکہ محکمہ ڈاک جلد سے جلد اُردو جاننے والے ملازمین کا تقرر کرنے پر مجبور ہو جائے۔

پوسٹ ماسٹر جنرل بمبئی نے مسٹر صدیقی کے موسومہ خط میں بھی لکھا ہے کہ ان ڈاکخانوں میں اُردو جاننے والے نئے ملازمین مقرر کئے جائینگے جہاں ایسی اشیاء قابل لحاظ تعداد میں وصول ہونگی جن پر اُردو میں پتے لکھے ہوں۔ اس شرط میں بڑی گنجائش ہے اور سخت ضرورت ہے کہ ڈاکخانے میں بھیجی جانے والی اشیاء پر اُردو کے تمام بہی خواہ لازماً اُردو ہی میں پتے لکھا کریں تاکہ بعد کو یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ اُردو میں پتے لکھی ہوئی اشیاء اتنی کم تعداد میں آتی ہیں کہ ان کیلئے نئے ملازمین کا تقرر ممکن نہیں۔ اس کے بعد بھی اگر اُردو کا مناسب لحاظ ڈاکخانوں میں نہ رکھا گیا اور اُردو پتوں والی اشیاء مرسل الیہ کو دیر سے پہنچیں تو اسکی اطلاع محکمہ کے ذمہ دار عہدیداروں کو اس مراسلے کے حوالے سے دیدی جائے جو پوسٹ ماسٹر جنرل بمبئی نے مسٹر صدیقی کے نام روانہ کیا ہے اور اس میں وعدہ کیا گیا ہے کہ اُردو پتوں والی اشیاء کے لئے معقول انتظام کیا جائیگا۔ پوسٹ ماسٹر جنرل بمبئی کے اس مراسلہ کا نمبر (CL-22/39) ہے اور بمبئی کے انفارمیشن ڈائرکٹ کے اس مراسلہ کا جس میں اُردو کو بمبئی کی تسلیم شدہ زبانوں میں شامل بتایا گیا ہے نمبر (1/624) ہے۔"

اگر قارئین عالمگیر کو بھی اس قسم کی شکایت ہو تو انھیں چاہیئے کہ متذکرہ حوالے سے وہ فوراً ایک چٹھی افسران بالا کو لکھیں اور ہمیں بھی اس کی اطلاع دیں۔

آل انڈیا ریڈیو کی نو سالہ رپورٹ

"براڈ کاسٹنگ آسانی سے نکتہ چینیوں کا نشانہ بن جاتا ہے اور ہمیشہ بنے گا۔ پروگرام مرتب کرنے والے کیلئے سب سے الجھن کی بات یہ ہے کہ وہ بیک وقت ایک مطلق العنان حاکم اور ایک غلام ہوتا ہے۔"

یہ ہیں وہ الفاظ جو آل انڈیا ریڈیو کی ۳۱ مارچ ۱۹۳۹ء تک کی پہلی سالانہ رپورٹ میں جو حال ہی میں شایع ہوئی ہے کنٹرولر آف براڈ کاسٹنگ نے تحریر کئے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کے موجودہ کارکن "غلام ہونے کی بجائے "مطلق العنان حاکم" زیادہ ہیں ورنہ کیا وجہ ہے کہ سامعین کے پیہم احتجاج اور مخالفانہ رائے عامہ کے باوجود وہ پروگرام تقسیم کرنے میں ہمیشہ جانب داری، اعزا پروری اور دوست نوازی سے کام لیتے ہیں؟

اس کے بعد ڈائرکٹر صاحب ہندوستان میں براڈ کاسٹنگ کی مشکلات کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہندوستان میں براڈ کاسٹنگ کا مسئلہ بہت سے عام اسباب کی بنا پر اور زیادہ پیچیدہ بن گیا ہے زبان، فرقہ پرستی، مفلسی، سستے خانہ ساز آلات سماعت کا میسر آنا، ہندوستانی موسیقی کے مسلمہ معیار دل اور اُسے ضبط تحریر میں لانے کے طریقے کی عدم موجودگی، بعض حلقوں میں آج بھی ہر قسم کی تفریح کے خلاف تعصب کا پایا جانا، بعض حلقوں میں ہر قسم کے سامان تفریح کی کامل عدم موجودگی۔ مذہبی روایات۔ عوام کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ لوگوں کی بھی نسبتہً محدود دلچسپی۔ سیاسی بےچینی کی حالت اور اسی طرح کی دوسری باتیں ہیں جو ہندوستان میں ریڈیو کی ترقی کی راہ میں سنگ گراں بنی ہوئی ہیں پروگرام ترتیب دینے والا نہ صرف فضا کی قدرتی پابندیوں سے مجبور ہے بلکہ اس کی راہ میں یہ مجبوری بھی حائل ہے کہ موجودہ صورت حالات میں قومی زندگی کے کسی عملی پہلو پر تلخ ترین مخالفت وعداوت پیدا کئے بغیر پروگرام مرتب نہیں کر سکتا۔"

اگر غور کیا جائے تو ان میں سے اکثر مشکلات خود ریڈیو والوں نے اپنے رستہ میں پیدا کی ہیں۔ مثلاً یہ سامعین کا قصور نہیں بلکہ ریڈیو والوں کا ہے کہ ان کا پروگرام اتنا دلچسپ نہیں ہوتا کہ عوام یا تعلیم یافتہ طبقہ اس میں دلچسپی لے سکے۔ پھر "فرقہ پرستی" کا بھوت بھی سامعین کے گھروں میں نہیں بلکہ نشر الصوت کے دفتروں میں ناچ رہا ہے اسی طرح زبان کے مسئلہ میں بھی الجھن خود ریڈیو والوں نے پیدا کی ہے اور وہ سامعین کی متفقہ رائے کے صریح خلاف ایک علیحدہ زبان وضع کرکے نشر کر رہے ہیں۔ سستے آلات سماعت مہیا کرنا حکومت ہند کا کام ہے اور ہمارے خیال میں یہ مشکل یوں دور ہو سکتی ہے کہ باہر سے آنیوالے ریڈیو سیٹوں پر درآمد کا محصول نہ لگایا جائے۔ "سیاسی بےچینی" کا ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ ریڈیو کی ترقی کے ساتھ کیا تعلق ہے کیا دوسرے ملکوں میں "سیاسی بےچینی" نہیں ہے اور کیا وہاں کے ریڈیو اپنے فرائض بوجوہ احسن انجام نہیں دے رہے، کاش

براڈ کاسٹنگ کا محکمہ اس لاعلمی اور لاپروائی کی بجائے اس طرف توجہ کرے۔ (ادارہ)

جس کی فضا منّ و تو کے غبار سے پاک تھی جس کے گلزاروں میں ماسوائیت کا کوئی کانٹا دامن کو نہ الجھا سکتا تھا اور انہیں حکم دیا یا آدم اسکن انت وزوجک الجنۃ و کلا منھا رغدا حیث شئتما (اے آدم اپنی بی بی سمیت اس جنت میں زندگی بسر کرو اور اس کی جو بھی پیداوار ہے بفراغت کھاؤ پیو۔ ولا تقربا ھٰذہ الشجرۃ فتکونا من الظّلمین ہ لیکن اس درخت کے پاس بھی ہو کر نہ گزرنا ورنہ تمہارا شمار ظلم کرنے والوں میں ہوگا۔ قرآن کی اصطلاح میں "ظلم" سے مراد "شرک" ہے۔ گویا آدم و حوا کو متنبہ کیا گیا تھا کہ اگر تم نے امر خداوندی سے سرتابی کی تو تم مشرک سمجھے جاؤ گے اور خدائے واحد کی ذات و صفات میں دوسرے کو شریک کرنے کا وبال تمہاری گردن پر ہوگا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ درخت جس کے نزدیک جانے سے آدم منع کئے گئے تھے کس قسم کا تھا اور اسکی حقیقت کیا تھی ہمارے مفسرین کہتے ہیں کہ یہ درخت گندم تھا لیکن اس تاویل سے ان لوگوں کی تشفی نہیں ہو سکتی جو الفاظ کے لغوی مفہوم پر ہی قناعت کرنے کے خوگر ہیں اور سطح سے نیچے جانے کی زحمت گوارا نہیں کرتے گیہوں حلال و طیب رزق ہے اور عقل کو باور نہیں آ سکتا کہ اسے کھا کر انسان خدا کی وحدانیت سے منکر ہونے کا مجرم کیونکر ہو سکتا ہے مفسرین کا یہ ظاہر بین طبقہ اگر شجرہ ممنوعہ سے گیہوں کی بجائے انگور کی بیل مراد لیتا تو خیر ایک بات بھی تھی انگور سے شراب پیدا ہوتی ہے اور شراب عقل انسانی کی دشمن ہونے کے لحاظ سے حرام مطلق ہے لیکن شراب پی کر بھی انسان گنہگار تو ہو جاتا ہے ظالم یعنی مشرک نہیں ٹھہرتا اور آفرینش کے اس اوّلیں عہد میں تو شراب حرام بھی نہ ہوئی تھی۔ پھر اگر خدا تعالیٰ نے اگر آدم کو درخت زیر بحث کا پھل کھانے سے روکا تو ظاہر ہے کہ یہ درخت از قبیل نباتات نہ تھا بلکہ کوئی تمثیلی استعارہ تھا جو آدم کی نوزائیدہ فطرت کو اس بدترین گناہ کی آلائش سے پاک رکھنے کے لئے تخویف و ترہیب کے طور پر استعمال کیا گیا تھا جس کا ارتکاب انسان کو کفر کی حد تک پہنچا دیتا ہے اس بدیہی حقیقت کو قرآن حکیم نے خود یہ کہہ کر بے نقاب کر دیا ہے کہ الم تر کیف ضرب اللہ مثلا کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء تؤتی اکلھا کل حین باذن ربھا ویضرب اللہ الامثال للناس لعلھم یتذکرون ہ ومثل کلمۃ خبیثۃ کشجرۃ خبیثۃ اجتثت من فوق الارض ما لھا من قرار ہ (اے محمد کیا تم نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ خدا نے نیک بات کو کس طرح ایک پاکیزہ درخت سے تشبیہ دی ہے جس کی جڑ زمین کی گہرائی میں پیوست ہے جسکی ٹہنیاں پھیل کر آسمان تک جا پہنچی ہوں اور جو اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا رہتا ہو خدا انسانوں کو ہدایت کیلئے اس طرح کی مثالیں اس غرض سے بیان کرتا ہے کہ وہ سوچیں اور سمجھیں علیٰ ہذا القیاس ناپاک باتیں اس ناپاک درخت کے مشابہ ہیں جسے زمین کی سطح سے جب چاہا اکھاڑ پھینکا اور جس کی ہستی بالکل ناپائدار ہے) ان آیات ربانی سے صاف ثابت ہو گیا کہ جس درخت کے قریب جانے سے آدم کو روکا گیا تھا وہ کلمہ خبیثہ کا تمثالی درخت تھا اور از بسکہ سب سے گندی، گھناؤنی اور ناپاک بات جس کے کہنے اور کرنے سے انسان ظلم عظیم کا مرتکب ہو کر عتاب خداوندی میں گرفتار رہتا ہے شرک ہے اس لئے اس امر کا

سحرِ نغمہ

کیف یار افسانہ

از جناب ابراہیم احمد صاحب زبیری

"بھگوان اگر قسمت میں اتنے ہی دکھ لکھے تھے تو جنم دینا ہی کیا ضرور تھا ---" یہ الفاظ ایک نوجوان پجاری کی زبان سے ادا ہوئے جو گیا کے ایک عالیشان مندر میں اکیلا دو زانو بیٹھا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ دن کی شورشیں ایک سکون پرور خاموشی میں جذب ہو چکی تھیں۔ سامنے پتھر کے ایک عالیشان استادہ چبوترے پر مہاتما بدھ کا پروقار مجسمہ نصب تھا۔ عہد قدیم کی سنگتراشی کا بہترین نمونہ، حسن تناسب کا ایک خواب حسین، نہایت نازک نقش، کشادہ پیشانی، پتلے پتلے باریک ہونٹ، لمبی پتلی ستواں ناک، کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھوں پر پلک ڈھکے ہوئے جیسے کوئی گیان میں کھویا ہوا مراقبہ میں گم، سامنے ایک بڑا شمعدان روشن تھا، فضا مذہبی تقدس وجلال سے معمور تھی۔ ہلکی ہلکی خوشبوؤں سے مہک رہی تھی، نوجوان پجاری نے اپنی سرخ غلافی آنکھوں سے آہستہ آہستہ پلکوں کو اٹھایا اور بصد احترام اپنی نظروں کو مہاتما بدھ کے چہرے پر چھائی ہوئی امن وعافیت کی ایک دنیا میں پیوست کر دیا لیکن آج خود اس کی نگاہوں کو وہ سکون میسر نہ تھا جس کی پجاری کو اس وقت تلاش تھی۔ اس نے اپنے قلب کی فضاؤں میں تلاطم برپا ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ درِ دل پر ایک نئی دستک کی آواز سنی تھی۔ اس کے دل کی دنیا میں ایک نیا شہر آرزو بسا تھا اور پجاری اس میں کھویا جا رہا تھا۔ اندر ہی اندر کچھ طوفان اُٹھ رہے تھے اور وہ اُسے بہا لے جانا چاہتے تھے۔ اس نے اپنی ہی خاک کے ذروں کو آمادہ بہ فساد دیکھا تھا۔ کوئی غیر مرئی قوت تھی جو اس کی زندگی کو اپنے امن اور مستقر سے ہٹا کر ایک بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالے جا رہی تھی۔ اس کی فطرت کے ذرے ذرے نے اس بھڑکتی ہوئی قوت کا مقابلہ کیا۔ پجاری پہلے پہل ایک کوہ گراں تھا جس نے اپنے پروقار دباؤ سے اس قوت کو کچل ڈالنا چاہا۔ شروع شروع میں اس نے سمجھا کہ اس کی مساعی منصور و مشکور ہوئیں۔ لیکن دھوکا، دھوکا ہی تھا، اس غیر مرئی قوت نے جستجو کر کر پہاڑ کو ہلا ڈالا۔ ٹکڑے کر کے اڑا دیا۔ اب پجاری ایک ہلکا سا تنکا تھا اور سامنے ایک سیلاب عظیم۔ وہ مفسد امواج کو دیکھ کر کانپ کانپ جاتا تھا۔ پجاری نے مہاتما بدھ کو حسرت و لجاجت سے دیکھ کر نظریں جھکا لیں اور آہستہ سے بولا۔ "اب نہیں سہا جاتا بھگوان ---!"

یہ کہہ کر پجاری اٹھا اور مندر سے باہر نکل گیا۔

پجاری جنگل میں ایک درخت سے ٹیک لگائے کھویا ہوا بیٹھا تھا۔ قریب قریب صبح ہو چکی تھی۔ سامنے سے اس کا دوست کیشب آ رہا تھا اس کی عمر تقریباً پچاس سال کی تھی۔ وہ بہت عرصہ سے مندر کا پروہت تھا اور اب مندر کی فضاؤں ہی میں اس کی زندگی گھل مل گئی تھی۔ وقار، سنجیدگی اور متانت اس کے چہرے سے نمایاں تھی۔ وہ پجاری کو بہت عزیز رکھتا۔ وہ اس کا ہمراز اور ہمدرد تھا۔ وہ پجاری کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اس پر ایک گہری نظر ڈالی اور ان تمام پوشیدہ افکار کو تاڑ گیا جن کی کشمکش سے پجاری اپنے سینے میں تنگی محسوس کر رہا تھا اس نے ہمدردانہ انداز میں پجاری کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگا۔

"دوست! میں جانتا ہوں تمہارے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ میں اپنی زندگی کی پچاس منزلیں طے کر چکا ہوں۔ میں نے زبردست طوفان میں تباہ و برباد ہوتی ہوئی کشتیوں کو بھی دیکھا ہے اور راگ و رنگ کی محفلوں میں مطرب کی نوا سازیوں اور مہ جبینوں کے نغمہ ریزیوں کے تموج میں روحوں کو رقص کرتے بھی، مگر دوست یقین کرو کہ امن وعافیت آستانۂ الوہیت کے سوا دنیا میں اور کہیں نہیں ملتی۔ زندگی صرف وجود ظاہری ہی کا نام نہیں کبھی تم نے رات کو جب آسمان پر بادلوں کے کالے کالے ٹکڑے موجود ہوں چاند کو غور سے دیکھا ہے۔ وہ بادل کے کالے کالے پردوں میں چھپا ہوتا ہے ہم اسے نہیں دیکھ سکتے۔ یکایک وہ ٹکڑے ہوا کے ساتھ اڑ جاتے ہیں اور چاند چمکنے لگتا ہے لیکن تھوڑی ہی دیر میں بادل کا ایک اور ٹکڑا آگے بڑھتا ہے اور چاند پھر اس میں چھپ جاتا ہے۔ بس یہی انسان کی زندگی ہے۔ ہم اس کے آغاز و انجام سے واقف نہیں مگر محض اس بنا پر اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ ہم صرف اس کی درمیانہ منزل کے چند ظاہری وقفوں کو دیکھتے ہیں۔ دوست! ان ہی وقفوں کے چند لمحوں کی تابش کو قائم رکھنا انسان کی زندگی کا کمال ہے ---- اور اسی پر اس کی آئندہ زندگی کی کامیابی کا دارومدار ہے۔"